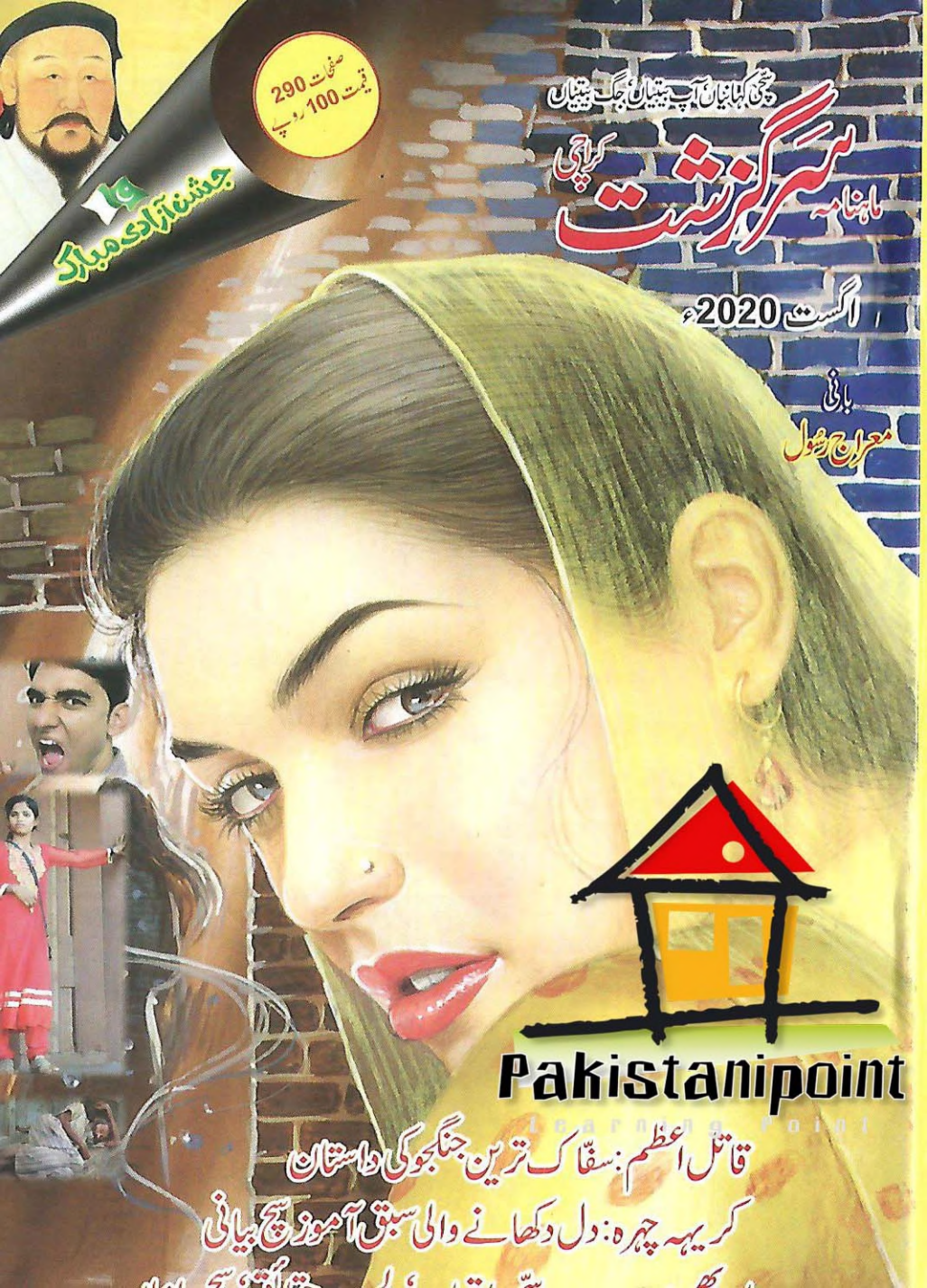

Pakistanipoint
Learning Point

سرگزشت
محقق — 07
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل مختصر مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت و شنید
شہرِ خیال — 08
مدیر/قارئین
آپ کی باتیں آپ سے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت
قاتلِ اعظم — 16
زویا اعجاز
ظالم و سفاک شخص کی زندگی نامہ

عکسِ زندگی
جنگجو دوشیزہ — 47
ببرک کارمل جمالی
بلوچستان کی دوشیزہ نے جنرل ڈائر کو جھکا دیا

معلومات
مارگلہ کا تندوا — 53
طارق عزیز خان
اسلام آباد کے آس پاس کا قصہ

جرم و سزا
حاضر دماغ — 61
ابوالفراح ہمایوں
ایسے جرائم جو یورپ کا خاصہ ہیں

دلچسپ و عجیب
کالے میگھا — 65
شیراز خاں
عالمی توہمات کا تذکرۂ خاص

تذکرہ
گائیڈ — 71
منظر امام
ایک دلچسپ محبوب شے کا ذکرِ خاص

فلم نگری
پردۂ سیمیں — 77
انور فرہاد
پاکستانی فلمی صنعت کی ان کہی داستان

تحقیق
فلم سازی — 97
شکیل صدیقی
سینما کی تاریخ پر مختصر مگر جامع تحریر

سفر کہانی
سفر پہلا پہلا — 125
ندیم اقبال
الفاظ کی جادو بیانی کا شہکار ایک الگ انداز کی سفر کہانی

دہشت گردی
زندہ موت — 149
کوثر اسلام
وہ سانس لیتی موت کہلاتا تھا

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

معاشرت
روسیاہ 158
عاطر شاہین
ایک شوریدہ سر نوجوان کی جنوں خیزی

پہلی سچ بیانی
کریہہ چہرہ 196
کنیز زہرہ
لوگ چہرے پر چہرہ سجا لیتے ہیں

دوسری سچ بیانی
آبگینے 207
سنبل
ایک صبر آزما دوشیزہ کی دلچسپ کتھا

تیسری سچ بیانی
بڑے گھر کی بیٹی 215
محمد جمشید
انہوں نے اس لڑکی کو امیر کبیر سمجھا تھا

چوتھی سچ بیانی
تھپڑ 221
ایم زید انصاری
الفاظ کے تھپڑ کا کوئی جواب نہیں

پانچویں سچ بیانی
خواب 233
اعتزاز سلیم وصلی
اس کے سارے خواب چکنا چور ہوئے

چھٹی سچ بیانی
سرپرائز 242
محمد امجد
کیسا عجیب سرپرائز تھا

ساتویں سچ بیانی
خضر راہ 255
موناشہزاد
بیٹی بیاہی تو لوگوں نے زندگی عذاب بنادی

آٹھویں سچ بیانی
گول میز 261
علی عمران ممتاز
ایک باہمت دوشیزہ کی داستان

نویں سچ بیانی
کون بہتر 265
محمد اکرم انصاری
انسان و جانور میں اب فرق نہیں ہے

دسویں سچ بیانی
جنونِ عشق 273
خلیل جبار
اس نے عشق کی خاطر کیسے قدم اٹھائے تھے

سوغات
پارچے **
قارئین/ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلوماتی اتفاقی پارچے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر

جلد 30 ❖ شمارہ 6 ❖ اگست 2020ء

ماہنامہ
کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول
مدیر : پرویز بلگرامی
نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◈◈◈
منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789
◈◈◈
سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269
◈◈◈

قیمت فی پرچہ 100 روپے ❖ زرسالانہ 1500 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ❖ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER
APNS
CPNE

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام
السلام علیکم!

اس وقت دنیا کے تمام براعظموں کے ممالک ایک جیسی صورتِ حال سے نبرد آزما ہیں۔ ہر ملک کی معیشت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ بیروزگاری کا اژدھا منہ کھولے بڑھا آرہا ہے۔ خود ہمارے ہاں بھی معیشت کو زبردست جھٹکا لگا ہے اور اس کے نتائج سامنے آنے والے ہیں۔ یہ وقت ایسا ہے کہ ہر قدم پھونک پھونک کے رکھنے کا متقاضی ہے۔ حکومت کی اپنی ذمے داری ہے لیکن انفرادی طور پر بھی ہمیں اپنا احتساب کرتے رہنا ہے کہ اس بحرانی دور کا مقابلہ ہم کس طرح کریں؟ اس لیے کہ معیشت کی بحالی میں انفرادی کردار بھی اہم ہوتا ہے۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

محقق

سرگزشت

25 صفر 1116 ہجری کو محلہ میدان پورہ قصبہ بلگرام صوبہ اودھ یوپی میں وہ پیدا ہوئے۔ حضرت زید شہید سے سلسلہ نسب ملتا ہے۔ کچھ بڑے ہوئے تو خاندانی رسم کے مطابق میر طفیل محمد قدس سرہ سے بسم اللہ کرائی گئی۔ ابتدائی درس سے فارغ ہونے کے بعد میر عبدالجلیل بلگرامی جیسے جید عالم کے درس میں بھیج دیے گئے۔ حدیث و سیرت نبوی اور فنونِ ادب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علامہ سید میر محمد خلف سے عروض و قوافی کی تعلیم حاصل کی پھر شیخ محمد حیات سے اسلامی علوم کا درس لیا۔ ان کے بعد شیخ عبدالوہاب طنطاوی سے مکہ معظمہ جا کر علم حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ 1137 ہجری میں میر سید لطف اللہ بلگرامی سے بیعت کی رسم پوری کی۔ اب عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے کہ روزگار کی فکر کی جائے اس سلسلے میں پہلا سفر شاہ جہاں آباد کا کیا کیونکہ وہاں میر عبدالجلیل بلگرامی ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ اپنے ساتھ میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی کو لے کر بلگرام سے نکلے تھے۔ شاہ جہاں آباد میں دو سال تک رہے اس تمام عرصے میں وہ میر عبدالجلیل بلگرامی سے شاہی تربیت حاصل کرتے رہے۔ دو سال کا عرصہ گزرا تو بلگرام کی یاد بے چین کرنے لگی اور وہ بلگرام واپس آ گئے پھر کافی وقت گزار کر 1143 ہجری میں شاہ جہاں آباد، لاہور، ملتان، اوچ وغیرہ سے ہوتے ہوئے 10 ربیع الاوّل 1143 کو سیوستان سندھ پہنچے۔ وہاں اس کے ماموں میر سید محمد، بادشاہ دہلی کی طرف سے میر بخشی واقعہ نگار کے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے اسے اپنا نائب مقرر کر لیا اور کچھ دن کی تربیت کے بعد اپنا عہدہ اسے سونپ کر خود بلگرام کے لیے نکل پڑے۔ چار سال بعد واپس آئے سیوستان کا ماحول انہیں پسند نہیں آ رہا تھا اس لیے ماموں کے لوٹتے ہی انہوں نے وطن واپسی کی اجازت لی اور بلگرام کے لیے چل پڑے۔ کچھ دن الہ آباد اور بلگرام میں وقت گزارا پھر 3 رجب 1150 کو زیارت حرمین کے لیے روانہ ہو گئے۔ خشکی اور تری کی راہوں سے ہوتے ہوئے چوتھے ماہ مکہ معظمہ پہنچے۔ دو سال مکہ و مدینہ شریف میں گزار کر ہند واپس آیا تو نواب نظام الدولہ نے جو اورنگ آباد کے صوبے دار تھے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ اس دوران انہوں نے ''ید بیضا'' کی تکمیل کی جس میں 532 نامور شعرا کی حالاتِ زندگی رقم کی پھر ''مآثر الکرام تاریخ بلگرام'' مرتب کی جس میں 80 صوفیا کرام اور 70 جید علما کا تذکرہ ہے۔ سرو آزاد مرتب کی جس میں ہند بھر کے 143 شعرا پر مضامین ہیں۔ خزینہ عامرہ مرتب کیا جس میں 135 معروف شعرا کا تذکرہ درج ہے۔ روضۃ الاولیا مرتب کی جس میں خلد آباد میں مدفون صوفیوں کا تذکرہ ہے۔ غزالان ہند جس میں نسوانی شاعری پر بحث ہے۔ انیس المحققین سوفیائے ہند پر لکھی۔ ان کے علاوہ بھی کئی ایک کتابیں لکھیں اس محقق کا انتقال 14 ستمبر 1786ء میں 80 سال کی عمر میں ہوا۔ اس عظیم قلمکار کو دنیا میر غلام علی حسینی واسطی آزاد بلگرامی کے نام سے پہچانتی ہے۔

☆☆☆

www.paksociety.com

شہر خیال

مدیر اعلیٰ

☆ ندیم اقبال کا مشی گن امریکا سے تبصرہ۔ ''پچھلے ماہ بھی میں شہر خیال میں آیا اور اس بار بھی۔ وجہ ایک ہے کہ ثابت کریں کہ اس مشکل دور میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ ہمارے دل ایک تال پر دھڑکتے ہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ ملک عزیز پاکستان میں وبائی مرض کرونا دب رہا ہے، اگر آپ لوگوں نے عید پر احتیاط برتیں تو انشاءاللہ یہ جنگ ہم آپ جیت جائیں گے۔ اللہ آپ کی اور ہم سب کی حفاظت کرے (آمین)۔ کچھ قارئین متواتر یہ شکایت کر رہے ہیں کہ میں نے ''شمشال سے ٹورنٹو تک'' کو ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ بہت سے یہ پوچھتے ہیں کہ نسرین کا کیا ہوا؟ وہ کہاں ہیں اور کیسی ہیں اور اس سفرنامے کو ادھورا کیوں ختم کیا۔ عزیزو، وہ ابھی ختم کہاں ہوا ہے؟ یہ تو آگے چلے گا۔ یہ وہاں سے شروع ہوگا جہاں سے ختم ہوا تھا۔ دراصل ٹورنٹو کی روداد لکھتے ہوئے میں خود اتنا جذباتی ہوگیا کہ مجھے بیچ میں بریک لگانی پڑی۔ نسرین جہاں بھی ہے مکمل خیریت سے ہے۔ زیادہ بتا کر سسپنس ختم نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو اب اس سے جیلس ہو رہا ہوں کہ سفرنامہ میں نے تحریر کیا اور شہرت اسے ملی مگر کیا کروں میں اس سے جیلس ہو ہی نہیں سکتا۔ اب آتے ہیں نئے شمارے کی طرف جسے میں نے طوفانی رفتار سے ختم کیا۔ پاکستان کے قارئین خوش قسمت ہیں کہ ادھر شمارہ بازار میں آیا اور ادھر ان کی ٹیبل پر۔ لیکن ہم پردیسیوں کو سو پریشانیاں، اگر پوسٹ آفس سے منگواؤں تو پندرہ سے بیس دن میں پہنچتا ہے۔ یہ تو کوریئروں کا کمال ہے کہ تیسرے دن ہم تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک پرچے کا خرچ آتا ہے تقریباً چار ہزار روپے۔ لیکن یہ پھر بھی مہنگا نہیں ہے کہ شوق کی کوئی قیمت نہیں، اس میں وطن کی خوشبو بسی ہوتی ہے۔ تو جناب اس بار کے شمارے میں سب سے پہلے پڑھی اودھ کی بیٹی۔ مسلمان خواتین نے تاریخ میں بے شمار کارنامے انجام دیے ہیں۔ دورِ حاضر میں بھی دے رہی ہیں۔ کشمیر اور فلسطین اس کی مثال ہے۔ بیگم حضرت محل کی سوانح حیات لاجواب تھی۔ ماہ رخ ارباب نے بھی خوب روداد قلمبند کی ہے۔ سید احتشام نے بھی روپ بہروپ میں لاجواب کردار تلاش کیا ہے۔ گو کہ اس کردار پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ایک عورت ہو کر اس نے خود کو مرد بتا کر فوج کا ایک اہم منصب سنبھالے رکھا۔ ''قلم کا مزدور'' بھی پسند آئی۔ بائسکوپ کی ملکہ کا تو جواب نہیں، مختصر سا مضمون لیکن لکھا ہے ایک معروف محقق نے، عقیل عباس جعفری کی محنت کو سلام۔ نیلو اور ریاض شاہد پر انور فرہاد نے کھل کر لکھا۔ ریاض شاہد میں وطن سے محبت بھری تھی۔ وطن پرستی پر یاد آیا ''ہمزاد دادکھ'' کے خالق قابل احترام طارق عزیز بھی ہم سے جدا ہوگئے۔ وہ طارق عزیز جس کی رگ رگ میں پاکستانیت دوڑتی تھی کیونکہ والد بھی تو پاکستان کی محبت میں سرشار تھے اور پاکستان کے قیام سے دس سال قبل خود کو پاکستانی کہلانے لگے تھے۔ ''ایک شہر آبدار'' بھی خوب لکھا، عبدالغفور حیدری جیسے محقق جب قلم اٹھائیں گے تو ایسے ہی گوہر آبدار برآمد ہوں گے۔ تحقیق پر ان کی کئی کتابیں نظروں میں ہے جلد انہیں بھی پڑھوں گا۔ دوہری خوشی اور رد نگ نمبر بھی اچھی سچ بیانی تھی۔ ''اے پتر .....'' کا تو جواب نہیں، یہ سچ بیانی ہمارے محافظین، پاک فوج کے خلاف بھونکنے والوں کے منہ پر جوتا ہے، یہ چھوٹی سی سچ بیانی اپنے اندر بہت گہرائی رکھتی ہے۔ ''بندھن'' اور ''بھرم'' کے مصنف سلمان بشیر اور عالی مان آفاقی کو اچھی تحریر پر مبارکباد۔ ''بڑا آدمی'' بھی اچھی لگی۔ ''تہی دست'' لاجواب تھی۔ سرگزشت کی آخری سچ بیانی ہمیشہ بہت مزہ دیتی ہے۔ خط طویل ہو رہا ہے اس لیے ''رب راکھا۔''

☆ سید امتیاز حسین بخاری، تحصیل و ضلع سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ ''ماہ اپریل کا سرگزشت 19 مئی کو مل گیا تھا۔ مگر ادبی،

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ثقافتی وصحافتی مصروفیات اور لاک ڈاؤن کی سختی تبصرہ کرنے سے گریزاں رہا۔ جون جولائی کا سرگزشت 19 جولائی کو ملا۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا جو موجودہ حالات کی عکاسی کر رہا تھا یہ بڑا ہی نازک ترین دور ہے، واقعی سال 2020 خزاں بن گیا ہے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی اداسی ہی اداسی ہے۔ کیسے کیسے درخشندہ ستارے تابندہ ماہتاب آسمان علم و ادب، دین و مذہب، فن و ثقافت صحافت وسیاست سے غروب ہوگئے اور کیسے کیسے یکتائے روزگار گوہر ہائے بے بہا کھو گئے جن کا ذکر حسرت و یاس غم و دکھ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ علامہ طالب جوہری، آصف فرخی آسمان علم و ادب کے منور ترین سورج تھے ایک علامہ مصطفیٰ جوہر کے قابل فخر سپوت دوسرا ڈاکٹر اسلم فرخی کے جلیل القدر فرزند ار جمند تھے اور ہزار ہا ایسے تھے جن کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، یہ دنیا تو امتحان گاہ ہے مگر انسانیت سے سارے ممالک کوسوں دور ہو گئے تو اللہ تبارک تعالیٰ قادر مطلق نے ایک معمولی وائرس بھیجا جس نے دنیا کا سارا نظام مفلوج کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ اس وسیع کائنات کا مالک و خالق مختار میں ہی ہوں۔ نفع و نقصان زندگی و موت، رزق، عزت و ذلت، بیماری و شفا میرے ہی قبضہ قدرت میں ہے، یہ سچ ہے کہ ہم ایک منتخب امت ہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے پیروکار ہیں مگر ہماری حرکات ہمیں امت محمدؐ کہلانے سے روکتی ہیں۔ بقول ''اقبال زبان نے کہہ دیا لا الہ تو کیا حاصل۔ نگاہ و دل مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں۔'' خالق ہمزاد وادکھ۔'' یک صفحی طارق عزیز کا تعارف پڑھ کر دل مسرور ہوا۔ طارق عزیز ایک عہد ساز شخصیت اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے محبّ الوطن اور انسان دوست تھے بلند پایہ شاعر اور کمپیئر تھے۔ نیلام گھر میں ملتان اور لاہور کے طالبات کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ ہو رہا تھا ملتان کی ایک لڑکی نے میرا کہا ہوا یہ شعر پڑھا۔ ''دل کی آغوش میں ہوتا ہے بہاروں کا سماں، جب تصور میں تیری شکل نظر آتی ہے'' تو اس نے یہ شعر دوسرے نمبر پر قرار دے کر لڑکی کو انعام سے نواز دیا۔ شو کے اختتام پر اپنی گرج دار آواز میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتے تھے تو سننے والے جھوم جھوم اٹھتے تھے اور ان کے دل پاکستان کی محبت میں رقص کرنے لگتے تھے۔ شہر خیال میں داخل ہوئے تو اعجاز حسین سٹھار کرسی صدارت پر جلوہ فگن تھے ہلکا پھلکا تبصرہ تھا۔ دماغ پراگندہ اور منتشر ہو تو ایسا ہی تبصرہ ہوتا ہے۔ اس بار تو شہر خیال میں نئے نئے تبصرہ نگار تھے خوش آمدید کہتا ہوں۔ محمد عزیز مئے، رانا محمد شاہد، احمد رضا اعوان، رانا محمد سجاد، عبدالحکیم ثمر اعجاز حسین لدھیانہ، نزاہت افشاں، عبدالجبار رومی انصاری غائب تھے۔ محترم آفتاب احمد نصیر اشرفی نے سفارش خوب کی کہ میری ادبی کاوش کو ثمر بار دیکھنا چاہتے ہیں شکر گزار ہوں۔ ندیم اقبال نے بھی شہر خیال میں اظہار خیال و جذبات کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ اودھ کی بیٹی، زرین قمر کی مٹھاس اور شیرینی میں ڈوبی ہوئی شاہکار تحریر تھی جسے میں نے ایک ہی نشست میں پڑھا، بہت ہی بے پایاں لطف و سرور آیا۔ حسن و جمال رقص و موسیقی جنگ و جدل کا ایک حسین امتزاج تھا۔ حضرت محل ملکہ اودھ واقعی صاحب بصیرت و فراست بہادر جنگجو مجاہدہ تھی۔ آزادی بڑی نعمت ہے مقبوبہ کشمیر 80 سال سے اور افغانستان 41 سال سے جل رہے ہیں، امن اور آزادی اب بھی دور دور ہے۔ حضرت محل جیسی شجاعت اور محب الوطنی کی ضرورت ہے۔ واجد علی شاہ تو رقص و موسیقی شاعری کا دلدادہ گرویدہ تھے (جب آپ سے آپ کا سب کچھ چھین لیا جائے معذور بنا دیا جائے تو آپ کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی؟ یہی کچھ واجد علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہوا) مگر حضرت محل شجاع اور محب الوطن تھی۔ انگریزوں سے ٹکر لینا خالہ جی کا گھر نہیں تھا چالاک اور شاطر حکمران تھا جنگ جو مجاہدین غداروں کی وجہ سے ہار گئے۔ عالمی وبا پر شیراز خان نے مفصل معلومات سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ نے بیماری پیدا کی ہے تو بیماری کی دوا بھی پیدا کی ہے گھبرانے کی ضرورت نہیں بہر حال ہمیں اللہ تبارک و تعالیٰ پر مکمل بھروسا کرنا چاہیے۔ جو اللہ پر توکل کر لیتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ ندیم اقبال کا سفر پہلا پہلا اس بار بے کمال خوبیاں لیے ہوئے ہے جو قابل مطالعہ ہے ہر لفظ سے سحر انگیزی پھوٹ رہی ہے اور الفاظ جادو اثر ہیں باقی مضامین اور کہانیاں زیر مطالعہ ہیں اقتباسات معلومات افزا تھے۔''

☆ صغیر احمد چیمہ، کنگ مت پور ضلع گجرات سے لکھتے ہیں۔ ''معراج رسول (صاحب) نے جو ڈائجسٹ شائع کیا ہے اتنا پرواز و معلوماتی رسالہ آج تک نہ شائع ہوا ہے نہ ہوگا اس مجلّے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ آپ کے والد صاحب کے دور سے ہم آپ کے رسائل پڑھ رہے ہیں لیکن یہ رسالہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کے والد بھی علوم مخفیہ کے ماہر تھے اور آپ نے علوم ظاہریہ اور باطنیہ اپنے والد صاحب سے ورثے میں پائے ہیں اس لیے ماہنامہ سرگزشت کے بارے میں ایک تجویز ہے اُمید ہے کہ پذیرائی بخش کر ممنون فرمائیں گے۔ آپ جس بھی مصنف، سائنس دان اور عالم کا تذکرہ فرماتے ہیں وہ واقعات کے لحاظ سے تو مکمل ہوتا ہے لیکن کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ جب بھی آپ کسی عالم، سائنس دان اور مصنف کا تذکرہ فرمائیں تو یہ بھی ساتھ بتائیں کہ اس نے کتنی کتابیں تحریر کیں، کس کس زبان میں تحریر کیں، ان کا کس کس زبان میں ترجمہ اور شرح لکھی گئی اور کہاں سے یعنی کس کتب خانے نے شائع کیں اور کون کون سی کتاب کہاں سے مل سکتی ہے۔''

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

☆ قیصر خان کی بھکر سے تشریف آوری۔ ''اداریہ میں جن عظیم اشخاص کا دنیا سے چلا جانا بتایا گیا ہے وہ نادر لوگ تھے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے (آمین)۔ یک صفحی میں طارق عزیز کے بارے میں بہت کچھ پڑھنے کو ملا۔ واقعی وہ عظیم آدمی تھے ان پر ایک مفصل مضمون آنا چاہیے۔ شہر خیال میں حاجی اعجاز کو کرسی صدارت پر بہترین تبصرے کے ساتھ موجود پایا۔ بہت سے نئے لوگ بھی شامل تھے جو کہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ اودھ کی بیٹی پر تو فلم یا ڈراما بننا چاہیے تاکہ معلوم ہو کہ لڑکی ذات بھی برابر ہے۔ شوق گزیدہ میں آزادی لینے کا بہت غلط طریقہ استعمال ہوا ہے۔ یہ صحیح طریقہ نہیں ہے۔ روپ بہروپ ... دیر سے .... تحقیق ہونے کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے اگر یہ سچ ہے تو واقعی عجیب ہے کہ ایک عورت اتنے عرصے تک فوج کی افسر رہی اور کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ (ان پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جنگ کے دوران ہر آدمی جنگ میں الجھا ہوتا ہے اس کا فائدہ اسے ملا اور اس کا راز کھل نہ سکا) قلم کا مزدور ہمارے معاشرے میں سچی قلم کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن ماضی کے ایک ادیب کے بارے میں پڑھ کر محسوس ہوا کہ ذہانت کسی کی معراج نہیں ہے۔ انکل ندیم اقبال کا سفرنامہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ کرونا کی وجہ سے اب کی بار سفرنامے کا لطف بھی دوبالا ہوا ہے۔ ''دوہری خوشی'' محبت میں قربانی کا انعام ملتا ہے اور ظرف والی عورتیں بہت کم ہیں ہمارے معاشرے میں۔ ''رونگ نمبر'' موبائل فون نے تو پاکستان میں ستر فیصد آبادی کو خراب کیا ہے۔ رونگ نمبر میرے گاؤں میں دو حادثے کا سبب بنا ہے۔ اس ٹیکنالوجی نے عزت کے جنازے نکال دیئے ہیں۔ ''اے پتر'' ہماری پاک فوج پر ہر شمارے میں کہانی آنی چاہیے بہت قربانیاں دی ہیں فوج نے۔ ''برادری'' پاکستان پہلے برادری ازم پھر فقہ ازم ضلع ازم گاؤں ازم صوبائی تعصب کے بعد پاکستان آتا ہے اس روایت نے کئی دل اجاڑے ہیں اور بہت سے انسانوں کا قتل ہوا ہے برادری ازم میں۔ ''دیر آید'' سانپ اونٹ اور عورت انتقام نہیں بھولتے ہیں۔ حرام خور کے ساتھ اب بھی اچھا ہوا ہے، مار دینا چاہیے تھا اس ظالم انسان کو۔ ''بڑا آدمی'' انسانیت کی خدمت بھی اصل کام ہے فوزان ایک عظیم ذہن کا مالک تھا۔ ''انوکھا پیار'' پاکستان میں ہر چھٹا آدمی مجھے نفسیاتی لگتا ہے، معلوم نہیں کیا ہوگا۔ اس کا علاج تو روزینہ نے ڈھونڈ لیا تھا لیکن جنسی بے راہ روی جو کہ بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ آئے دن کے واقعات سن کر دل دہل جاتا ہے۔''

☆ عاطر شاہین کا خلوص نامہ ملتان سے۔ ''اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ کافی عرصے کے بعد ''شہر خیال'' میں شرکت کر رہا ہوں۔ اُمید ہے خوش آمدید کہیں گے۔ خوف کی اس فضا میں زندگی کیا سے کیا ہوگئی ہے۔ لاک ڈاؤن پھر اوپر سے مہنگائی نے ہر طبقہ فکر کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ بجلی کے بل کے نام پر جو رعایت دی گئی تھی اب اس رعایت کی کسر بھی آئندہ کے بلوں میں نکالی جا رہی ہے۔ جہاں کورونا سے ملکی معیشت تباہ ہوئی ہے وہاں لاکھوں لوگ بھی بے روزگار ہو گئے ہیں۔ ان لاکھوں لوگوں میں، میں بھی شامل ہوں۔ میں نے بھی پاکستان کے میڈیا کے دو بڑے اداروں میں 23 سال کام کیا ہے لیکن آخر میں صلہ یہ ملا کہ ڈاؤن سائزنگ کی آڑ میں جاب ختم ہوگئی۔ جون، جولائی کے سرگزشت کے لیے میں نے کتنی بے چینی سے انتظار کیا تھا یہ الگ داستان ہے۔ جب مجھے پتا چلا کہ شمارہ مارکیٹ میں آچکا ہے تو میں ہر روز بک اسٹال والے سے پوچھتا تو وہ یہی کہتا کہ ابھی ملتان میں نہیں آیا۔ حالانکہ دوسرے کئی شہروں میں پہنچ چکا تھا۔ بہرحال میں ایجنسی سے لے آیا تو وہاں پتا چلا کہ رسالہ تو چار دن پہلے ہی آچکا ہے پھر اللہ جانے ملتان کے بک اسٹالوں پر کیوں نہیں پہنچا۔ سب سے پہلے زرین قمر کی کہانی پڑھی جو تاریخی کرداروں کے گرد گھومتی تھی۔ شوق گزیدہ بھی دلچسپ کہانی تھی۔ ''روپ بہروپ'' میں سید احتشام نے معلومات میں اضافہ کیا۔ ''بے مثال'' میں فلم اسٹار نیلو کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ واقعی محترم انور فرہاد نے علی سفیان آفاقی مرحوم کی جگہ لے لی ہے اور انتہائی محنت اور جانفشانی سے کسی نہ کسی اسٹار کے بارے میں معلومات دیتے ہیں۔ سفر پہلا پہلا بھی بہت دلچسپ اور معلوماتی سفرنامہ ہے، ایسا لگتا ہے کہ ہم بھی ندیم اقبال کے ساتھ ہیں۔ سچ بیانیاں پڑھنے کے بعد یہی نتیجہ نکالا ہے کہ کسی نہ کسی کو کوئی نہ کوئی دکھ ضرور ہے۔ حرص و ہوس نے لوگوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی ہیں۔ آخر میں، میں ان سب کا بھی بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں جو میری تحریر ''روسیاہ'' کو پسندیدگی کی سند عطا کر رہے ہیں۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ سرگزشت ٹیم نے مجھے رسالے میں جگہ دی، میرا حوصلہ اور مان بڑھایا۔ سرگزشت کی بدولت آج میری پہچان بن رہی ہے۔ میں سرگزشت ٹیم کا تہہ دل سے مشکور و ممنون ہوں اور آپ سب کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔'' ---

☆ زویا اعجاز کی خوشہ چینی لاہور سے۔ ''دلی دعا ہے کہ یہ سال کرونا ہی نہیں بلکہ ہماری ہر انفرادی و اجتماعی کوتاہی کا خاتمہ بھی دیکھنا نصیب فرمائے۔ لاک ڈاؤن میں ڈائجسٹس کی اشاعت میں تعطل صدیوں کی مسافت معلوم ہوا۔ دل لگتا ہی نہ تھا کہیں..... اُمید ہے آئندہ یہ حالات نہ دیکھیں گے۔ شہر خیال میں بھی اسی افسردگی اور اُمیدوں کا موسم تھا۔ بے اماں اور جہاں

www.pakistanipoint.com

گردی پسندیدگی کے لیے سب کی مشکور ہوں۔ میرے ہم شہر عرفان خلیل کا تبصرہ پڑھ کے مجھے دو سال قبل جولائی کی وہ چلچلاتی دوپہریں یاد آئیں جب میں ابتدائی صفحات کے پہلے پروجیکٹ محسن نقوی کے حالاتِ زندگی کے حصول کی خاطر لاہور کی ہر پبلک اور پرائیویٹ لائبریری کی خاک چھان رہی تھی۔ تحقیق آسان ہے اور نہ کوئی مقام حاصل کرنا۔ لگن نیت قلم سے خلوص استاد محترم کی رہنمائی اور آپ سب کی محبتوں نے یہ سفر کامیاب کیا اور آج آپ سب میری تحریر کو سراہ رہے ہیں۔ عبدالحکیم ثمر صاحب کی رائے دلچسپ تھی۔ عطاء اللہ شاہ محترم آپ پڑھتے رہیے گا تو ہم بھی لکھتے رہیں گے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس کی مشکلات کی آسانی کے لیے دلی دعائیں۔ نزابت افشال آپ کے نام پر قارئین کی رائے محفوظ کرتی رہی۔ آفتاب احمد نصیر کی ذرہ نوازی پر بہت مشکور ہوں۔ اس بار یک صفحی سرگزشت میرے بچپن کی ایک حسین یاد طارق عزیز کے متعلق تھی۔ پروردگار انہیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ انور فرہاد کی ''بے مثال'' نے ریاض شاہد کا معتقد بنا دیا۔ اب میں لازمی ان کی مووِیز تلاش کر کے دیکھوں گی۔ عالمی وبا کورونا بہت زیادہ تباہیاں سامنے لائی جس کا ادراک آپ سب کو ہوگا۔ سفر پہلا پہلا دلچسپ ترین موڑ پر ہے، ندیم اقبال ایک منجھے ہوئے قلم کار ہیں، رواں تحریر خوب مزہ دے رہی ہے۔ روسیاہ میں فی الحال بھاگ دوڑ کا موسم ہے۔ شانی اور شانزے کے بارے میں اندازہ درست ثابت ہوا اب دیکھنا ہے کہ علی کس طرح ٹریک کرتا ہے۔ کوئی گھڑی خصوصی چپ یا کچھ اور..... ماہ رخ ارباب کا اندازِ بیان پسند آیا۔ سچ بیانیوں میں ''اے پتر'' ان سب افراد کو پڑھنی چاہیے جو افواج سے خوانخواہ بھیڑ چال میں نالاں ہیں۔''

☆ ابصار احمد، قومی ترانوں کے محقق کراچی سے رقمطراز ہیں۔ ''شہرِ خیال میں پہلی بار شرکت کر رہا ہوں، یہی وہ بزم ہے جہاں سب ہم خیال ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ سرگزشت وہ ادبی و تاریخی جریدہ ہے جس میں حقائق کو کہانیوں کے انداز میں پیش کر کے عوام کے ذہنوں پر نقش کر دیا جاتا ہے جو مدتوں قلب و ذہن پہ موجود رہتے ہیں جس کے لیے ہم سب شکر گزار ہیں کہ اس بے ادب اور قحط الرجال کے دور میں بھی وہ اپنی سعی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لاک ڈاؤن کے تعطل کے بعد جون، جولائی کا مشترکہ شمارہ بازار میں آیا جو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں پہنچا جس میں ''خالق ہمزاد دادھ'' پر طارق عزیز کو شاندار خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ اودھ کی بیٹی محترمہ زریں قمر کی اچھی تحریر تھی ویسے یہ بھی سچ ہے بقول عبدالحلیم شرر ہم نے ''مشرقی تمدن کے آخری نمونے'' کو فراموش کر دیا ہے یا پھر اس کا ذکر صرف امام بارگاہوں کے ذکر کے ساتھ ہی وابستہ ہے، ہاں موسیقی میں اختر بائی فیض آبادی کی بدولت کچھ اہلِ ذوق اس کا ذکر ضرور کر جاتے ہیں۔ ماہ رخ ارباب کی تحریر ''شوق گزیدہ'' خواتین کے لیے ایک بہترین تحریر تھی مگر جناب عقیل عباس جعفری کی صبیحہ خانم پر مضمون نے پورے شمارے میں سبقت حاصل کر لی۔ صبیحہ خانم کی وفات سے فلم نگری کا ایک درخشاں باب تو بند ہو گیا لیکن ان جیسی فنکارہ دوبارہ نہ آسکی اور نہ ان کی اداکاری پر کسی نے خود کو ڈھالا۔ شیراز خان کی حالیہ وبائی دور میں تحریر ''عالمی وبا'' بھی تاریخی جائزے پر مشتمل تھی جس نے کئی اہم معلومات فراہم کیں جبکہ ایم الیاس کی تحریر ''شوہر خور'' مغربی دنیا کا ایک کریہہ چہرہ بھی دکھاتی ہے جہاں خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہے اور اب یہ وبا کورونا سے زیادہ خطرناک بن کر ہمارے معاشرے کا شکار کر رہی ہے۔ انور فرہاد نے بھی ہمیشہ کی طرح فلم نگری کے گمشدہ پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ ان کے علاوہ ندیم اقبال، فرزانہ نگہت، رانا محمد شاہد، زین مہدی، عبدالغفور کھتری، ابوالفرح ہمایوں، مظہر مشتاق، سلمان بشیر، عالی مان آفاقی، سعدیہ خان، محمد احتشام رضا، زرینہ شاکر اور عاطر شاہین کی تحریریں بھی عمدہ تھیں جبکہ آخر میں پارچے بھی ادارے کی جانب سے ایک اچھا سلسلہ ہے جسے جاری رہنا چاہیے۔ الغرض جولائی کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ میں ان تمام قارئین کا بھی شکر گزار ہوں جو میری تحریروں پر پسندیدگی کی سند مثبت کرتے ہیں۔ سرگزشت میرا پسندیدہ پرچہ ہے اسی وجہ سے میں اس کے لیے کسی نہ کسی طرح تحریر کے لیے وقت نکال لیتا ہوں لیکن پڑھتا پابندی سے ہوں۔ یہاں تک کہ شہرِ خیال کے خطوط بھی۔''

☆ رانا محمد شاہد کی آمد بورے والا سے۔ ''اپریل کا شمارہ چونکہ جون میں ملا تھا اس لیے جون، جولائی کے شہرِ خیال کا حصہ نہ بن سکے۔ شاید اسی لیے شہرِ خیال کی روایتی رونق کم تھی (بعد میں آنے والے خطوط بھی شامل تھے جو عام طور پر شائع نہیں ہوتے)۔ سرگزشت 15 جولائی کو موصول ہو گیا تھا اس لیے تبصرہ بھیجنے کا بھی موقع مل رہا ہے۔ سرگزشت کی تاریخ میں شاید ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ مئی کا شمارہ شائع نہیں ہوا اور جون، جولائی کا مشترکہ شمارہ نکالنا پڑا۔ مجبوری ہے کہ جب ہر طرف لاک ڈاؤن ہے تو رسالے کیوں کر چھپ سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کورونا کی اس عالمی وبا نے سب کچھ تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ لوگ تو اب یہ سوچتے ہیں کہ کورونا سے پہلے دنیا کیا تھی اور جب اس وبا کا خاتمہ ہوگا تو دنیا کس طرح کی ہو جائے گی۔ اداریے میں آپ نے صحیح لکھا۔ وبا کے ان دنوں میں کیسے کیسے گوہرِ نایاب ہم نے کھو دیئے۔ یک صفحی سرگزشت ایک ایسی شخصیت پر تھی جن کے ساتھ

www.paksociety.com

ہمارے بچپن کی سنہری یادیں وابستہ ہیں۔ جی ہاں طارق عزیز وہ شخصیت تھے کہ جن کے پروگرام ''نیلام گھر'' کو دیکھتے ہوئے ہم بڑے ہوئے۔ نیلام گھر اور طارق عزیز لازم وملزوم تھے۔ طارق عزیز 84 برس کے ہوگئے تھے مگر اس کے باوجود ان کے لہجے کی توانائی اور آواز میں ویسی ہی گھن گرج تھی جیسی جوانی میں ہوتی تھی۔ بڑھاپے نے ان کی آواز کو چھوا تک نہ تھا مگر اس سب کے باوجود وقت اپنا اثر دکھا چکا تھا کہ بات کرتے ہوئے یا چائے کی پیالی لبوں تک لے جاتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپنے لگتے تھے۔ اکتیس سال کے تھے جب سے ذیابیطس کو لے کر چل رہے تھے، حقیقت تو یہ ہے کہ طارق عزیز فلم، ٹی وی، ریڈیو اور سیاست کی چلتی پھرتی تاریخ تھے۔ شہر خیال میں اعجاز حسین سٹھار صدارت پر تھے۔ ویسے کورونا کی اس بیماری نے بتا دیا ہے کہ انسان اپنی خواہشات کی تکمیل، اپنی سوچ اور اپنے فیصلے کرنے میں مادر پدر آزاد نہیں ہے، اس کی سوچ، اس کی روح حواس خمسہ خالق کے عطا کردہ ہیں اور اس کی طے کردہ حدود میں رہتے ہوئے ہی انسان سکون و اطمینان پا سکتا ہے۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی! واقعی اضافی 50 روپے اس باکر کا حق تھے کہ جس نے اپریل کا سرگزشت آپ کو صرف 3 دن میں پہنچایا۔ جبکہ ہمیں یہ سرگزشت مارکیٹ میں آنے کے باوجود جون کی 15 تاریخ کو ملا تھا۔ آپ نے اس وائرس کے حوالے سے انسانی بداعمالیوں و بے عملی کا ذکر کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اکثر انسان پر مصیبت اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے آتی ہے مگر انسان سمجھتا نہیں، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ رب جب اپنے بندے سے ناراض ہوتا ہے تو اس کا رزق بند نہیں کرتا، سجدے کی توفیق چھین لیتا ہے، حج کا محدود ہو جانا، مسجدوں کا بند اور پھر محدود ہونا یہ بتاتا ہے کہ رب انسان سے ناراض ہے اور یہ کہ اللہ کی بھیجی ہوئی وبا سے پناہ مانگنی چاہیے۔ اس سے بچنے کی دعا کرنی چاہیے یہ کہنا کہ کورونا سے ہمیں ڈرنا نہیں، لڑنا ہے غلط ہے، اس لیے کہ انسان بے بس ہے، لاچار ہے، وہ ایسی کسی بیماری سے نہیں لڑ سکتا۔ لاکھوں انسانوں کا اس بیماری سے چلے جانا یہ بتاتا ہے کہ انسان بے بس مخلوق ہے۔ مسز افتخار نے معروف سیاح ابن بطوطہ کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کیں۔ اسلام کی ترقی و ترویج کے لیے ان کی کوشش پڑھ کر تجسس ہوا کہ ان کے بارے میں مزید تحقیق کی جائے۔ ندیم اقبال مشی گن امریکا کے حالات سے آگاہ کر رہے تھے کہ کورونا وائرس کے حوالے سے امریکا کے حالات پوری دنیا سے زیادہ خراب ہیں کہ جہاں روزانہ ہزاروں مریض اس کا شکار ہو رہے ہیں۔ عالمی ادارہ صحت کی ہدایات پڑھیں اور اسلامی نظام طہارت کو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس عظیم دین نے ہمیں کتنی بڑی مصیبتوں سے بچایا ہے۔ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں دنیا میں جتنے بھی خطرناک وائرس یا جراثیم سامنے آئے ان میں سے کوئی بھی اسلامی ملک سے نہیں نکلا۔ روبینہ نفیس انصاری سرکاری اسپتالوں کے جو حالات ہیں وہاں جا کر تو ایک صحت مند شخص بھی بیمار ہو جائے۔ سرگزشت اعزازی بھیجنے والا آپ کا کام لائق ستائش ہے۔ آتی جاتی رہا کریں شوق کی خاطر تو بندہ نام نکال ہی لیتا ہے۔ مغلیہ عہد کے آخری دور کی اس بہادر خاتون حضرت محل کے جذبۂ حریت کی داستان زریں قمر نے بڑے اچھے انداز میں لکھی۔ حضرت محل کی یہ داستان رات 12 بجے پڑھنا شروع کی تو ڈیڑھ بجے ختم کر کے دم لیا۔ ان کی اپنی رعایا سے محبت اور انداز حکمرانی دونوں منفرد تھے ورنہ حکمران اپنی رعایا کا اس قدر خیال رکھتے ہوں کہ اپنے زیورات نکال کر دینے کو تیار ہو جائیں۔ ایسا کم کم ہی ہوتا ہے، تحریر بہت اچھی تھی۔ اگر زریں قمر تھوڑی اور تفصیل لے کر آتیں تو اور بہت سی باتیں سامنے آتیں۔ سید احتشام کی ''روپ بہروپ'' واقعی حیران کر دینے والی روداد تھی۔ زین مہدی کی ''قلم کا مزدور'' پڑھنا شروع کی تو معلوم نہ تھا کہ یہ ایک ایسے شخص کی داستان ہے جن کے نام سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ پڑھ کر حیرت اور خوشی ہوئی کہ وہ اتنے زیادہ رسالوں سے وابستہ رہے۔ واقعی انہوں نے حقیقی معنوں میں قلم کے مزدور کے طور پر زندگی گزاری۔ یہ پڑھ کر بالکل عجیب نہیں لگا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے ملنے والا سونے کا صدارتی ایوارڈ بیچ ڈالا اس لیے کہ ایک لکھاری ساری زندگی جتنا بھی لکھتا رہے وہ معاشی آسودگی حاصل نہیں کر پاتا کیونکہ پیسا اس کا مقصد و منزل نہیں ہوتی۔ عقیل عباس جعفری معلومات کا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ حال ہی میں انتقال کر جانے والی صبیحہ خانم کی زندگی پر ان کی تحریر متاثر کن تھی۔ درختوں والی تحریر کی اشاعت کا شکریہ۔''

☆ روبینہ نفیس انصاری، بھکر سے لکھتی ہیں۔ ''یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ سرگزشت 2 ماہ کا ایک ساتھ ملے؟ یہ تو ہمارے ساتھ ناانصافی ہے لیکن کیا کیا جائے۔ پوری دنیا کی معیشت کو جھٹکا لگ چکا ہے اور ہم بھی اسی دنیا میں رہ رہے ہیں اس لیے معاف کیا۔ سرگزشت دو دن پہلے ملا سمجھے، جب سرگزشت آیا تو میں کوٹ ادو گئی ہوئی تھی میرے بڑے بھائی لیاقت نفیس فوت ہو گئے۔ بہت مشکل سے خود کو سنبھال پائی ہوں۔ اللہ پاک بھائی لیاقت نفیس کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین) شہر خیال میں اعجاز حسین سٹھار ایک طویل تبصرے کے ساتھ پہلی صف میں جگہ بنائے ہوئے تھے۔ آفتاب احمد نصیر آپ نے کہا کہ میں اپنا دکھ درد شیئر کر لیتی تو اچھا ہوتا۔ جب دکھ ہی اتنے ہوں تو کیا کیا جائے۔ پہلے ہی ہر انسان کی زندگی پریشانیوں سے بھری پڑی ہے اور ویسے بھی

www.pakistanipoint.com

دکھ درد بھی زندگی کا حصہ ہیں۔ چلو خیر ہے کوئی بات نہیں ہم تو خوش ہیں وہ جس حال میں رکھے۔ شہر خیال میں پمہ پراے ساتھی نظروں سے اوجھل ہیں، ارے کہاں گم ہیں آپ لوگ۔ اپنی خیریت کی اطلاع دیں۔ سعید احمد چاند کے انتقال کے بعد ہم سب نے انہیں بھلا دیا۔ ایک سورہ فاتحہ سے یاد کرلیا کریں۔ چاند سے یاد آیا آپ سب کو میری جانب سے ذی الحج کا چاند بہت مبارک ہو۔ گو کہ اس سال بے شمار لوگ حج کی سعادت سے محروم رہ جائیں گے پھر بھی شکر ہے کہ حج پڑھا جائے گا۔ اللہ پاک تمام مسلمانوں کو حج بیت اللہ کی زیارت اور ادائیگی کی سعادت عطا فرمائے۔ (آمین) ساتھ ہی آپ سب کو عید الضحیٰ بہت مبارک ہو۔ ویسے اس عید کو جب تک بکرا عید نہ بولا جائے مزہ بھی نہیں آتا۔ جہاں آج کل ہر طرف پریشانیاں منہ کھولے کھڑی ہیں وہیں مسلمانوں کے لیے بہت بڑی اور بہت ہی زیادہ خوشی کی خبر نے زندگی کی کایہ پلٹ دی۔ مجھے تو یقین مانیے بے پناہ خوشی ہوئی کہ ترکی میں آیا صوفیا کو بحال کرکے ''مسجد'' کا درجہ دے دیا گیا۔ سچ بیانیوں میں ''اے پتر'' پڑھ کر آنکھوں سے آنسو آگئے۔ میجر شجاع جیسے نہ جانے کتنے فوجی اس دھرتی پر اپنی جان نچھاور کرچکے ہیں۔ ہمارے فوجی ہمارا فخر ہیں۔ میرے سب سے بڑے بھائی حاجی شوکت انصاری بھی فوج میں تھے۔ جب میں چھوٹی تھی جب بھائی شوکت انصاری کو شہادت کا شرف حاصل ہوا۔ پنڈی سے کوٹ ادوان کے جسد خاکی کو لایا گیا، وہیں بھائی کو دفنایا گیا۔ انشاء اللہ اگر زندگی رہی تو یہ سارا واقعہ آپ لوگوں کو سناؤں گی۔ اللہ پاک ہمیں بھی شہادت کی موت عطا فرمائے۔ (آمین) ''بھرم'' بھی دکھی کردینے والی کہانی لگی۔ اگر رمضان جیسی سعادت مند اولاد ہو تو والدین کو ان کی قدر کرنی چاہیے تاکہ اس کی محنت سے کمائی کو اپنی عیاشیوں میں اڑا کر حالات کو خراب نہیں کرنا چاہیے۔ لو جی ''دیر آید'' کہانی پڑھ کر منہ کا ذائقہ بدل گیا۔ ظالم جتنا بھی ظلم کرے ایک نا ایک دن پکڑ میں ضرور آتا ہے۔ سارہ نے اپنی ذہانت سے جس طریقے سے بدلہ لیا وہ قابلِ تعریف ہے۔ کسی کو بھی برباد کرنا بہت آسان ہوتا ہے مگر اس کی آہ سے بچنا بہت مشکل...... باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ آپ سب کی دعاؤں کی مجھے بہت ضرورت ہے۔ اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔''

☆ انجم فاروق ساحلی لاہور سے رقمطراز ہیں۔ ''کورونا کی آفت پوری دنیا پر چھا گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ لکھنے پڑھنے والے اس مصیبت سے زیادہ متاثر ہوئے۔ بہرحال اعداد و شمار کم ہو رہے ہیں۔ اس بار سرگزشت کا ٹائٹل دلکش اور جاذبِ نظر ہے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور یہ پھل تو اور بھی مرغوب ہے۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ تساہل پسندی کے زمانے میں مدیر سرگزشت عرق ریزی سے پرچہ مرتب کرتے ہیں۔ سرگزشت میں دیس دیس کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ ادارہ اور قارئین کو بقرعید مبارک۔ معلوماتی مضامین اس بار بھی خوب ہیں۔ خطوط کی محفل ہری بھری اور جامع تبصروں سے بجی ہوئی تھی۔ اس بار ادارتی گفتگو فکر انگیز اور جھنجھوڑ دینے والی ہے۔ ہمارے اردگرد واقعی بھیڑیئے گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ ''اودھ کی بیٹی'' تاریخی مناظر میں معیاری کاوش اور ''روپ بہروپ'' خوب ہے، ''روسیاہ'' اور ''سفر پہلا پہلا'' قسط وار تحریریں اچھی چل رہی ہیں۔ شوہر خور بھی خوب ہے۔ اک شہر آبدار دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ آپ بیتیوں میں ''بندھن''، ''بھرم''، ''تہی دست'' خوب ہیں۔ باقی ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ آپ کی خدمت میں نئی طبع زاد کہانی ''اندھا شکاری'' محمد علی کا کارنامہ روانہ کردی گئی ہے۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کی آمد کراچی سے۔ ''اداریہ ہمیشہ کی طرح فکر انگیز تھا۔ کتنے شاندار لوگ ہم سے بچھڑ گئے۔ ہمزاد داد کھ دے کر طارق عزیز ہم سے رخصت ہوگئے کیا شاندار انسان تھے۔ جماعت اسلامی کے سابق امیر جناب سید منور حسن صاحب سے دو ملاقاتیں ہماری یادوں کا سرمایہ ہیں۔ کورونا کے حوالے سے ہمارا قومی رویہ بڑی حد تک قابلِ مذمت ہے۔ شہر خیال میں جناب اعجاز حسین سٹھار کو مبارک باد۔ ان کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح پُرمغز تھا۔ آخری سچ بیانی تک ان کے ٹمپو میں کمی نہیں آئی۔ روبینہ نفیس انصاری کو مبارک باد کہ ان کی بھابی کورونا کی شیطانی سے محفوظ رہیں۔ رانا محمد شاہد کی غیر حاضری اچھی نہیں لگی لیکن جب درختوں کی دنیا میں پہنچے تو خوشگوار حیرت ہوئی رانا محمد شاہد کا نام دیکھ کر غیر خاصری کا گلہ جاتا رہا۔ ان کی طرح ان کی تحریر بھی انتہائی معلوماتی اور متاثر کُن تھی۔ مزہ تو اس مرتبہ ''سفر پہلا پہلا'' کرکے بھی بہت آیا۔ ندیم اقبال کا خاصہ ہے کہ اپنے ہر سفر میں اپنے قاری کو ساتھ ساتھ رکھتے ہیں۔ اس مرتبہ بھی جھیل سیف الملوک کی سیر میں ہم نے یہ ہی محسوس کیا کہ ہم خود وہاں موجود ہیں۔ یہ قسط سفری داستان کے عین مطابق تھی۔ مزاح نگاری خاص کر سائیں اور چاچا شفیع کے تذکرے میں عروج پر تھی مسکرانے پر مجبور ہوگئے۔ شہر خیال میں ان کی آمد ہمیں بہت بھلی لگتی ہے۔ زویا اعجاز کو اس مرتبہ اپنی دونوں پوزیشنز پر موجود نہ پاکر مایوسی ہوئی۔ شہر خیال کے باقی خطوط بھی اچھے تھے خاص کر عطاء اللہ شاہ اور نئی مہمان مسز افتخار کے تبصرے اچھے لگے۔ زرین قمر کو اپنا آپ منوانا آتا ہے۔ اودھ کی بیٹی آغاز میں کیا تھی ہمیں تو وہ مجاہدہ کے روپ میں بہت اچھی لگی۔ ایک خاتون کی دلیری نے تاریخ میں اسے زندہ رکھا ہوا ہے۔ ماہ رخ شوق گزیدہ میں بریرہ کی خودکشی کو خراجِ تحسین پیش کر رہی تھیں جبکہ خودکشی کا پس منظر نہایت بودا تھا۔ اسلامی ریاست کی شہری

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ہونے کے ناطے اپنے دستور کی پابندی اس کا فرض عین تھا۔ حقوقِ نسواں کا خیال جتنا ہمارا مذہب رکھتا ہے کوئی دوسرا مذہب رکھ ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ جدو جہد کا راستہ اختیار کرتی تو بھی خدا اسے کامیابی سے ہی نوازتا۔ کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کتاب زیست کے اگلے صفحے پر ہمارے لیے کیا لکھا ہے۔ جسے ہم پڑھے بغیر ہی بند کر دیتے ہیں۔ بریرہ کی طرح ڈاکٹر جیمز بیری بھی اگر اپنے ملک کے قانون سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لیتی تو عورت ہو کر مردانہ روپ میں ساری زندگی کامیابی سے نہ گزار پاتی۔ ''دوہری شخصیت'' میں تو سید احتشام نے کمال ہی کر دیا۔ ایک عورت کے عزم و حوصلہ کو بنیاد بنا کر ایک شہکار ڈھونڈ لائے۔ زین مہدی کا قلم، ایک قلم کے مزدور کو سراہ رہا تھا۔ فقیر محمد نے بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنا گولڈ میڈل بیچ دیا، تعلیم کی قدر و منزلت ایسے ہی باپوں کی وجہ سے قائم ہے (ذہن میں رکھیں کہ وہ گولڈ میڈل صدر پاکستان نے تعلیم کے موضوع پر بنائی فلم پر دیا تھا)۔ عقیل عباس جعفری نے اداکارہ صبیحہ خانم کو ان کی موت پر بروقت خراجِ تحسین پیش کیا۔ انور فرہاد ہمیشہ ہی ''بے مثال'' فنکاروں سے ملواتے ہیں پچھلے شمارے میں ریاض شاہد اور خلیل قیصر مرحوم تھے تو اس مرتبہ اداکارہ نیلو ہیں۔ نیلو کی کردار نگاری میں مہارت پر دو رائے نہیں ہوسکتیں لیکن خطرناک جیسی فلموں نے انہیں گہنا دیا تھا۔ ان کے کریڈٹ پر شاندار کام موجود ہونے کے باوجود انہیں ایسی فلموں میں کام کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اداکار کمال نے نیلو سے ''جٹ کڑیاں تو ڈردا'' اور راج دیاں کڑیاں میں اچھا کام لیا تھا۔ اداکار شان ہماری فلموں کو اس خوبصورت جوڑی کا تحفہ ہے۔ کشمالہ حسن خطروں کے کھلاڑی کی شان میں رطب اللسان تھیں۔ فرزانہ نگہت مسافر قطب جنوبی کو سرد جہنم پار کر واری تھیں خدائے بزرگ و برتر ستاروں پہ کمند ڈالنے والوں کو بلاتفریق کامیابی سے نوازتا ہے۔ شیراز خان عالمی وباؤں سے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ بحیثیت پاکستانی انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے کورونا جیسی وبا کو علامتی طور پر لفٹ نہیں کروائی۔ ایم الیاس نے تو حد کر دی کہ شوہر خور عورتوں کو ڈھونڈ لائے اور انہیں قانون کے شکنجے میں بھی نہیں آنے دیا، خدا کرے کہ دوسروں کے شوہروں کی دعاؤں سے وہ پکڑی جائیں۔ شوہر ہونے کے ناطے ٹیز راور اونیل کو ہماری بددعا ہے کہ ان کا ککھ نہ رہے۔ ابوالفرح ہمایوں کا جنتر منتر ہمارے سر سے گزر گیا۔ عبدالغفور کھتری آپ شہر آباد کی عظمت بیان کر رہے تھے۔ منگھو پیر کے مزار پر موجود گرم چشمے کے پانی میں نہا کر ہم بھی فیضیاب ہو چکے ہیں۔ عاطر شاہین کا روسیاہ قسمت کا دھنی ہے بار بار موت کے منہ میں جانے سے بچ جاتا ہے۔ شانزے چوہدری باسط کی بیٹی نکل آئی ہے۔ اسماعیل شاہد کا کردار بھی کھل گیا ہے اب دیکھیں الماس حیدر کا کیا روپ سامنے آتا ہے۔ علی بار بار آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جاتا ہے۔ سچ بیانیوں کا آغاز ''دوہری خوشی'' سے ہوا زرینہ شاکر کو اس کی نیک نیتی کا پھل اولاد اور شوہر کی شکل میں مل گیا۔ رونگ نمبر روایتی سی تحریر تھی جو آج بھی ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ پاک فوج کے جذبے کو سلام کرتی ہوئی کہانی نئی اس لیے نہیں کہی جاسکتی کہ میجر شجاع، حائمہ اور پری جیسے کردار فوج میں بھرے پڑے ہیں اور آئے دن وہ قربانیوں کا حصہ بھی بنتے ہیں۔ نور جہاں نے نصف صدی قبل ہی کہہ دیا تھا کہ ''اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے'' ''بندھن'' دوستی کی معراج کو چھوتی ہوئی دل گداز کہانی تھی۔ دوستی کا ''بھرم'' تو آصف نے بھی نبھایا اپنے دوست رمضان کے بچوں کی کفالت کر کے جیسے بندھن میں ساجد نے کیا۔ ''برادری'' کا طرۂ امتیاز یہی ہے کہ دینی تعلیم بھی انہیں اپنی ناک سے آگے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ دیر آید ہماری پولیس کی پیٹھ پر تازیانہ ہے اگر کوئی محسوس کرے تو۔ فوزان جیسے نوجوان اگر مثبت ہو جائیں تو دنیا انہیں خود ہی ''بڑا آدمی'' مان لیتی ہے۔ ''انوکھا پیار'' نفسیاتی الجھنوں کو سلجھاتا ہوا اچھا لگا۔ آخری ''تہی دست'' سب سے دلچسپ کہانی تھی۔ نگہت نے کامران کو سزا دلوا کر اچھا کیا۔ پارچے ہمیشہ کی طرح شاندار رہے آخر میں اراکین ادارہ کو سلام اور جناب معراج رسول صاحب کی خدمت میں ایصال کا تحفہ خلوص نیت اور عمل کے ساتھ۔''

☆ زرین قمر کا اظہار یہ کراچی سے ''کافی عرصے سے سرگزشت میں لکھنے کا موقع مل رہا ہے جس کے لیے ممنوں ہوں۔ یوں تو کئی دہائیوں سے ڈائجسٹوں کی دنیا میں حاضری دے رہی ہوں، مختلف موضوعات پر لکھتی رہی ہوں اس سلسلے میں زہے نصیب کہ تعریفی خطوط سے بھی نوازی گئی جس کے لیے میں اپنے قارئین کی مشکور ہوں جو میری کوشش کو اہمیت دیتے ہیں، پڑھتے ہیں اور پھر اپنی قیمتی رائے سے بھی نوازتے ہیں۔ سرگزشت میں میری کہانیاں نمایاں جگہ لیتی رہی ہیں جس میں میری محنت کم اور مدیر کی کاوشیں بہت زیادہ ہیں۔ میں حیران ہوں مدیر جیسی اہم جگہ پر ہوتے ہوئے یہ کیسے وقت نکال لیتے ہیں کہ ہر کہانی کا ایک ایک لفظ پڑھ کر مصنف کو گائیڈ کرتے ہیں۔ ان کا سمجھانے کا انداز بہت خوب ہے۔ کم از کم مجھے تو برا نہیں لگتا اور اصلاح بھی ہو جاتی ہے۔ میں خود کو بڑی مصنفہ نہیں سمجھتی کیونکہ بہتری کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے اور اگر تحریر میں بہتری لانے کے لیے کوئی بھی مفید مشورہ دے تو شکریے کے ساتھ مان لینا چاہیے۔ کم از کم آج کل کے وقت میں ایسے مدیروں کی کمی ہے جو رائٹر کی اصلاح کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ مدیر محترم بلا امتیاز گر کی باتیں بتاتے ہیں اور تحریر میں چار چاند لگوا دیتے ہیں کہ تحریر پہلے نمبر پر آجاتی ہے اور سرگزشت میں شرکت کے ساتھ ساتھ تاریخ کا حصہ بھی بن جاتی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

سرگزشت جیسے ڈائجسٹ میں لکھتی ہوں جسے ملک کے مایہ ناز، تعلیم یافتہ اور ادب دوست پڑھتے ہیں۔ میں اپنے قارئین کی بھی شکر گزار ہوں کہ ان کی تعریفوں کی بدولت میری ہمت بڑھ جاتی ہے اور مجھ میں مزید لکھنے کی لگن جاگتی ہے۔ میں نئے نئے موضوعات کے لیے اپنے سرچ کی رفتار بڑھا دیتی ہوں اور تاریخ کے پرانے اوراق سے کوئی نہ کوئی قابلِ ذکر شخصیت ڈھونڈ کر اس کی کہانی آپ کی خدمت میں پیش کر دیتی ہوں۔ آیندہ میری کوشش ہوگی کہ اس محفل میں حاضر ہوتی رہوں۔ میری تحریروں پر صرف تعریف نہیں بلکہ تنقید بھی کیجیے گا جو یقیناً میرے لیے مشعلِ راہ ہوگی۔''

☆ ممتاز کنول کا اظہار یہ کراچی سے ''چھ سات سال پہلے چھوٹے بھائی کے ذریعے میں امی اور میری چھوٹی بہن حنا ثمرین سرگزشت سے متعارف ہوئے تھے اور بس پھر ہم سب کا تعلق سرگزشت سے جڑ گیا جو ابھی تک قائم ہے ویسے تو میرا تعلق بھی قلمکار قبیلے سے ہے اور کافی عرصے تک میں خواتین کے رسالوں میں لکھتی رہی ہوں اور حنا بھی نہایت ذوق وشوق سے یہ رسالے پڑھتی رہی ہے لیکن سرگزشت پڑھنے کے بعد دوسرے رسالوں کے ساتھ اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہوگئی تھی بک اسٹال والا خاص طور پر حنا کے لیے نئے نئے پرانے سرگزشت لاکر رکھتا وہ جب جاتی نہایت خوش ہوکر چھ سات رسالے لے کر آتی، کہانیاں پڑھنے کے بعد ہم دونوں کتنی کتنی دیر تک کہانیوں پر تبصرے کرتے۔ سرگزشت پڑھنے کے بعد حنا سارے رسالے مجھے دے دیتی۔ غرض ہمارے پاس ڈھیروں ڈھیر سرگزشت جمع ہوگئے ہیں۔ یہ سب بتانے کا میرا مقصد یہ ہے کہ میری ''حنا'' سرگزشت کی خاموش قاری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی دیوانی بھی تھی۔ اس نے مجھے بھی سرگزشت پڑھنے کی ایسی عادت ڈالی تھی کہ کوئی اور رسالہ پڑھ کر مزہ ہی نہیں آتا تھا۔ جنوری 2020ء تک اس نے سرگزشت لیا پھر اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی تو اس نے فروری کا رسالہ نہیں لیا میں بار بار فون کر کے پوچھتی تھی کہ ''گڑیا رسالہ لے آئی ہو، وہ کہتی طبیعت ٹھیک ہوجائے پھر لاؤں گی مگر پانچ مارچ 2020ء کو آپ کی یہ خاموش قاری خاموشی کے ساتھ ہی ابدی سفر پر روانہ ہوگئی۔ پانچ مارچ کو ایک بلڈنگ جس گھر پر گری تھی وہ میری حنا کا گھر تھا۔ جہاں وہ اپنے دو یتیم بچوں، امی اور بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اپنی پندرہ سالہ بیٹی، ماں، بھائی فرخ عثمان جو وفاقی اردو یونیورسٹی کے طلبا کے پسندیدہ لیکچرار تھے۔ فرخ کی وائف دو سالہ بیٹا حسن چھوٹے بھائی کی وائف، دو معصوم بچے تین سالہ بیٹی چھ ماہ کا حیدر کے ساتھ بلڈر مافیا کی بے رحمی اور سفاکی کا شکار ہوگئی۔ حنا ثمرین 42 سال کی تھی اور باقی سب 40 سے بھی کم تھے سوائے ہماری بوڑھی پیاری سی ماں کے۔ سرگزشت میں جب ہم ظلم کی یا کسی کے ساتھ زیادتی کا یا کوئی بھی دکھی قصہ پڑھتے تھے تو بہت روتے تھے۔ پتا نہیں تھا کہ قدرت ایک دن ہمیں بھی مظلوموں میں شامل کردے گی۔ ایک گھر سے ایک ہی وقت میں 9 جنازے اٹھنا معمولی بات نہیں ہے، ہے ناں حیرت کی بات کہ ہم اپنے 9 پیاروں کو ایک ساتھ رخصت کر کے بھی زندہ ہیں۔ میرا میکہ ختم ہوگیا، گھر ہی نہ رہا۔ میرا فرخ، تین چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر چلا گیا۔ ان بچوں کی نہ ماں ہے نہ باپ ہے۔ میرے معظم کی بھی ماں ہے نہ باپ ہے۔ میرے خرم کی نہ بیوی ہے نہ دو بچے اور نہ ہی پیاری سی بہن بھانجی اور ماں ہے۔ وہ جن کے ساتھ زندگی کا احساس ہوتا تھا شہید ہوگئے اور کس بے بسی اور بے کسی کا شکار ہوئے اللہ جانتا ہے۔ میرے پاس بہت ڈھیر سارے سرگزشت پڑے ہیں اور کتنے بے شمار رسالے بلبے تلے دب گئے جب جب سرگزشت اٹھاتی ہوں گڑیا کی آواز آتی ہے باجی آج میں پانچ رسالے لائی ہوں۔ بڑی زبردست کہانیاں ہیں، سب پڑھ لی ہیں آپ آکر لے جائیں۔ وہ میری چھوٹی لاڈلی پیاری سی گڑیا تھی جو جاوید بلڈرز کی غفلت اور ظلم کا شکار ہوئی۔ اتنی چھوٹی سی جگہ پر سات آٹھ فلیٹ بنا کر اس نے میرے گھر کے چنے ہوئے نو افراد شہید کردیے۔ بلبے میں سے زندہ انسانوں کے بجائے ڈیڈ باڈیز نکلتی رہیں اور ہماری دنیا اجڑتی رہی قرار نہیں آتا، سکون نہیں ملتا، کوئی ایسا اسم ہو کوئی ایسا حرفِ تسلی ہو جو ہمارے دل کو قرار دے دے، نہیں کچھ بھی ایسا نہیں ہے، یہ دکھ ہم سب کو گھن کی طرح کھا جائے گا۔ کوئی لفظ کوئی عمل اس غم کا مداوا نہیں کرسکتا، میں اپنی گڑیا ''حنا ثمرین'' کی کہانی لکھوں گی۔

نہ مکاں رہا نہ مکیں رہے نہ وہ چہرے دل نشیں رہے
جنہیں تھی اڑان کی جستجو پسِ مرگ زیرِ زمیں رہے
تری رحمتیں سدا ساتھ ہوں میرا کنبہ جہاں کہیں رہے
جو دعائیں کرتے تھے روز و شب وہ میرے عزیز اب نہیں رہے

تاخیر سے موصول خطوط:

ریاض تبسم، کراچی۔ غلام فرید ساحر، رحیم یار خان۔ سلام اختر، بنوں۔ ریاض الدین، بھکر۔ اشتیاق حسین، ساہیوال۔ مہتاب خان، پھالیہ۔ شگفتہ منیر، وہاڑی۔ خلیل احمد، ملتان۔ شاہینہ ممتاز سموں، لاڑکانہ

www.paksociety.com

قاتلِ اعظم

زویا اعجاز

وہ چہروں کو پڑھنے سمجھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اس نے اپنی روایت کا پاس رکھتے ہوئے ظلم کی ایسی داستانیں رقم کیں کہ دنیا انگشت بہ دنداں رہ گئی۔ اس کا نام داخلِ و شنام تھا مگر وہ خود پر نازاں تھا اس نے مفتوحان سے وہ سلوک کیا کہ تاریخ شاہد ہے کہ کسی بادشاہ نے بھی نہیں کیا ہوگا، نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد اور نہ آج۔ اس کا فکری انداز حکمرانِ عالم سے بالکل مختلف تھا۔ وہ چالاک و مثالی سیاس، تلوار کی سیاست کا دھنی، وہ فتح یابی کے گُر جانتا تھا۔ اس میں مقناطیسیت تھی بڑے سے بڑا دشمن بھی اس کے آگے ڈھیر ہوجاتا تھا۔

ایک ظالم وسفاک حکمران کا احوالِ زیست

وہ تمدن سے عاری خانہ بدوش شکاریوں کا علاقہ تھا۔ سرزمین ایسی انوکھی کہ مویشیوں کی بے شمار چراگاہوں کے باوجود وہاں درخت نہیں اگتے تھے۔ موسم کی سختی بیان سے بالاتر ہی سمجھئے۔ گرما تک کا یہ عالم تھا کہ وسط گرما میں بادو رعد کے شدید طوفان اٹھتے۔ برفباری ایسی ہولناک ہوتی کہ سرد طوفانی جھکڑ گھوڑے پر سوار ہونا مشکل کردیتے۔ گرد وغبار کی وجہ سے نزدیکی اشیاء بھی دیکھنی دشوار ہوتی تھیں۔ اس انوکھی سرزمین کے باشندے بھی اپنی نوعیت میں اتنے ہی منفرد تھے۔ چھریرے بدن، سخت جلد، مضبوط ہاتھوں اور کندھوں کے مالک۔ پٹھوں میں ایسی طاقت کہ مقابل کی کمر مروڑ کر دہری کردیں۔ سخت جانی ایسی کہ الاؤ جلا کر اس کے گرد سویا کرتے اور جب اس الاؤ سے چنگاریاں اڑ کر ان کے جسم پر گرتیں تو انہیں کسی معمولی کیڑے کے کاٹنے سی تکلیف بھی محسوس نہ ہوتی۔

تموچن بھی اسی علاقہ کا سپوت تھا۔ اپریل 1162ء (بارہ جانوروں کی جنتری کے مطابق خنزیر کا سال) میں پیدا ہونے والا یہ بچہ بظاہر اپنے آباؤ اجداد ہی کی طرح چپٹے نقوش، مندی آنکھوں اور کڑے تیوروں کا حامل تھا لیکن اس کی پیدائش کے وقت ایک غیر معمولی واقعہ نے سب ہی کو چونکا دیا تھا۔ شکم مادر سے دنیائے فانی میں قدم رکھتے ہی اس کی ہتھیلی خون سے بھری نظر آئی۔ سنسنی، حیرت، تجسس اور گھبراہٹ کی لہروں نے ہر کسی کو گھیر لیا۔ تکلیف سے نڈھال والدہ کے پاس موجود ہر عورت کی آنکھیں پھٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ والد 'یسوکائی' اس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ وہ اپنے قبیلے کے ایک دشمن کو دھول چٹانے گیا ہوا تھا۔ اس حملے میں اسے کامیابی نصیب ہوئی۔ دشمن قید کرلیا گیا اور واپسی پر اسی قیدی دشمن کے نام پر بیٹے کا نام بھی 'تموچن' رکھ دیا۔ اس نادر روزگار بچے کی پرورش کا مرحلہ شروع ہوگیا۔

☆☆☆

ہوش سنبھالتے ہی تموچن نے اپنا گھر سمور کے ایسے خیمہ کے روپ میں دیکھا جس کا ڈھانچا بانسوں سے بنا تھا۔ دھوئیں کے اخراج کے لیے ایک حصہ کھلا رکھا ہوا تھا۔ سمور پر چونے کی سفیدی پھیری گئی تھی۔ زیبائش کے لیے تصویریں بھی بنی تھیں۔ اس خیمہ کو مقامی زبان میں 'یورت' کہا جاتا تھا۔ یہ یورت ایک گاڑی پر کھڑا کردیا جاتا اور اسے درجن بھر سے زائد بیل کھینچ کر چراگاہوں اور میدانوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لیے پھرتے۔ گنبد نما چھت ہوا کے جھکڑوں کی روک تھام کیا کرتی۔ ضرورت پڑنے پر اس خیمہ کو بیل گاڑی سے اتار لیا جاتا..... ہوش سنبھالنے کے بعد یورت سے باہر نکلنا شروع کیا تو تموچن کا تعارف اس صحرائے گوبی سے ہوا جہاں زندگی بے وقعت تھی۔ یہاں بلند و بالا ہموار ٹیلوں پر تیز ہواؤں کے جھکڑ چلتے تھے۔ ان ٹیلوں کی بلندی بادلوں سے بوس وکنار کرتی محسوس ہوتی۔ جھیلوں کے اطراف میں اونچی گھاس نظر آیا کرتی۔ اس گھاس میں ہجرت کرنے والے پرندے شمالی ٹنڈراؤں کی

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

طرف اڑتے ہوئے آتے اور بسیرا کر لیتے۔

گوبی کے شمالی حصہ میں رہائش پذیر انسانوں کو حالات نے تو سخت جان بنایا ہی تھا اس کے علاوہ ان کی موروثی روایات بھی کم کٹھن نہ تھیں۔ بچے زیادہ عرصہ تک ماں کے دودھ سے لطف اندوز نہیں ہو پاتے تھے۔ انہیں گھوڑی کا دودھ شروع کروا دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنی فکر خود کرنے کے جلد قابل ہو جائیں۔ تموچن نے یہ مرحلہ بھی بہت جلد کامیابی سے عبور کر لیا۔ اس کے بعد قوت مشاہدہ نے یہ دیکھا کہ یورت میں آگ کے قریب جوان جنگجو اور مہمان آ کر بیٹھا کرتے۔ عورتوں کو قدرے فاصلہ پر بائیں جانب بیٹھنے کی اجازت تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں بھی جہاں جگہ ملے بیٹھ جایا کرتے۔ نوعمر تموچن کے لیے دوسری حیران کن اور قدرے تاؤ دلانے والی شے غذا تھی۔ گوبی میں بہار کا موسم بہت خوشگوار رہتا۔ گھوڑیوں اور گایوں کے تھن دودھ سے بھر جاتے۔ شکار بھی وافر مقدار میں مل جاتا تھا۔ قبیلے کے شکاری لومڑیوں یا سمور دار دبلے پتلے جانوروں کی بجائے ہرن اور ریچھ کا شکار کرتے۔ شکار شدہ ہر چیز دیگ میں ڈال دی جاتی۔ کھانے کے اوقات میں خاصے انتشار کا سامنا بھی رہتا۔ جوان اور طاقتور مرد سب سے پہلے من پسند کھانا کھاتے۔ اس کے بعد بوڑھوں اور عورتوں کی باری آتی۔ بچے سب سے آخر میں ہڈیوں اور ریشوں کے لیے لڑ جھگڑ کر پیٹ بھر لیا کرتے۔ جانوروں کے حصہ میں تو کچھ بھی نہ آتا تھا۔

جاڑے اپنے ہمراہ بے پناہ مسائل لایا کرتے۔ جانور دبلے ہو جاتے اور بچوں کو کھانے کے بعد دودھ بھی نصیب نہ ہو پاتا۔ قبیلے کے بڑوں نے اس کے لیے ایک حل تلاش کر رکھا تھا۔ دودھ کے استعمال کا اکلوتا طریقہ یہ تھا کہ اسے 'کومیس' کی شکل دے دی جاتی۔ یہ مخصوص غذا دودھ کو چمڑے کے تھیلوں میں بھر کے خمیر دینے اور پھر خوب پھینٹنے کے بعد تیار ہوا کرتی۔ تین سے چار سالہ بچوں کے لیے یہ خوراک طاقت بخش ہونے کے ساتھ قدرے نشہ آور بھی ہوتی لیکن ان بچوں کو بھی یہ کسی لاڈ پیار کی طرح نہیں ملتی تھی۔ اس کم عمری میں بھی جسمانی طاقت اور نیند کا سرور حاصل کرنے کے لیے شرط یہی تھی کہ کومیس کسی بھی طرح مانگ کر یا چرا کر حاصل کی جائے۔ گوشت نہ ملنے پر ابلے ہوئے باجرے سے ان کی بھوک کا تھوڑا بہت علاج کر لیا جاتا۔ جاڑوں کے اختتامی دن تو مزید کٹھن ثابت ہوا کرتے تھے۔ گلوں کی تعداد میں کمی کے خدشہ سے مویشی ذبح کرنے سے گریز کیا جاتا۔ اس صورت حال میں قبیلے کے جنگجوؤں کے لیے دوسرے قبیلوں سے اشیائے خوردو نوش کی لوٹ مار اور مویشی ہنکانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ تموچن ان حالات کو بغور دیکھتا ہوا انہی روایتی طریقوں سے پروان چڑھ رہا تھا۔ وہاں بچپن سے ہی بچوں کو گروہی شکل میں شکار کھیلنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ تموچن بھی کلہاڑوں اور کند تیروں سے چوہے اور کتے مارنے کی کوشش کرتا۔ اس کے بعد وہ بھیڑوں پر سواری کی مشق بھی کرتا۔ سہارے کے لیے بھیڑوں کی پشم حتی الامکان مضبوطی سے تھام لی جاتی۔ وہ سردار کا بیٹا تھا اس لیے شکار میں کامل و منفرد ہونے کی توقعات بھی کہیں زیادہ تھیں۔ اس مشق سے گذر کر وہ گھر آ جاتا۔ سردار کی بیویوں کے لیے علیحدہ اور آراستہ یورت ہوتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ وہاں خوب ٹھاٹ سے رہتیں۔ ان کے ٹھاٹ بھی تو نرالے ہی تھے۔ لڑکیوں کی ذمے داری ہوتی تھی کہ یورت کا سب کام کاج مکمل کریں' اوپری روشن دانوں کے نیچے آگ جلانے کا اہتمام کیے رکھیں۔ یورت میں گھر بھر کی دولت سنبھال کر رکھی جاتی تھی۔ مختلف کاروانوں سے لوٹے گئے بخارا اور کابل کے قالین' کسی عرب سے مقامی شے کے معاوضہ میں خریدے گئے ریشمی سوتی کپڑے اور منقش چاندی کے زیور بھی نظر تو آتے لیکن ان کی اہمیت خیمہ کی دیواروں پر لٹکے ہتھیاروں کے سامنے کچھ بھی نہ تھی۔ ترکی نیچے ہاتھی دانت یا بانس کے بنے ترکش' متفرق لمبائی اور وزنوں کے تیر اور روغن لگی چمڑے کی مدور ڈھالوں کی وقعت انمول تھی۔

تموچن تھوڑا اور بڑا ہوا تو اس کی ذمے داریاں بھی مختلف ہو گئیں۔ وہ گرمیوں کی چراگاہوں سے جاڑوں کی چراگاہوں تک سفر کرتا۔ اسے راستے میں حائل ندی نالوں میں مچھلیاں پکڑنی ہوتی تھیں۔ اس کے ہمراہ خاندان کے دیگر بچے بھی ہوتے تھے۔ ان کے ذمے گھوڑوں کے گلے ہوا کرتے۔ کسی بھی جانور کی گمشدگی کی صورت میں انہی لڑکوں کو اس کی تلاش میں نکلنا پڑتا۔ جانوروں کے علاوہ نئی چراگاہوں کی تلاش بھی لازم تھی۔ ہر گذرتے لمحہ ان کا ذہنی ارتکاز قرب و جوار کی طرف بھی مبذول رہتا۔ قبائلی حملہ آوروں کے خطرات ہمہ وقت دل و دماغ پر سوار رہتے تھے۔ وہ لمحات ان کے لیے بہت کٹھن ہوتے۔ انہیں کئی راتیں آگ کے بغیر ہی برف میں گذارنی پڑتیں۔ کئی روز

www.pakistanipoint.com

تک زین پر ہی بسر کرتے۔ تین سے چار روز تک پکا ہوا کھانا نہ کھا پاتے۔ بعض اوقات تو کئی روز تک فاقے بھی کرنے پڑتے۔ بکری یا گھوڑوں کا گوشت وافر مقدار میں میسر آتے ہی وہ اس فاقہ کشی کی کسر پوری کر لیتے۔ ان کے معدوں کی استطاعت اور قوت ذخیرہ ناقابل یقین تھی۔ کسی اونٹ کی طرح یہ خوراک جسم میں ذخیرہ کر لینے کے علاوہ وہ میدانوں میں کئی کئی میل گھڑسواری اور کشتیاں لڑنے میں فرحت محسوس کرتے۔ اس دوران ہڈیاں ٹوٹ جانے کی بھی کوئی پروا نہ کی جاتی۔

اس داستان کا مرکزی کردار تموچن بھی ذہنی وجسمانی طور پر بے حد طاقتور تھا۔ اس کا ذہن دوررس تھا۔ کسی بھی معاملہ میں تجویز سازی اس کے لیے بہت آسان تھی۔ وہ کسی بھی قسم کے مشکل حالات میں خود کو کامیابی سے ڈھال لیتا۔ اس کی ان خوبیوں نے اسے بہت جلد کشتی لڑنے والوں کا سردار بنا دیا لیکن اس طاقت سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس کے تیور، جارحانہ پن اور خونخوار انداز مدمقابل کو خوامخواہ مرعوب کرنے لگتے۔ تموچن کے علاوہ اس کے کئی ہم عمر افراد اس سے بھی زیادہ تنومند تھے مگر اس کی جملہ خوبیاں سب سے سوا تھیں۔ تیر اندازی کے فن میں بھی وہ بہت جلد کامل ہو گیا تاہم اپنے بھائی ’قسار‘ کی قوت اور کمان کھینچنے کی مہارت تک نہ پہنچ سکا۔ قسار کو انہی خوبیوں کی بناء پر ’کمان دار‘ کے نام سے بھی پکارا جاتا۔ اس کے باوجود قسار تموچن سے خائف رہتا۔ تموچن اس قدر جارح مزاج تھا کہ اس کے سامنے ٹھہر پانا ممکن ہی نہ ہوتا۔ خلاف مزاج کوئی بھی بات اسے سخت برگشتہ کر دیتی اور نتیجہ نہایت ہلاکت انگیز برآمد ہوتا۔

قسار اور تموچن کی ایک سوتیلے بھائی سے خاصی چپقلش رہتی تھی۔ طاقت میں وہ بھی کسی سے کم نہ تھا۔ دونوں فریقین میں محاذ آرائی پیدا ہو گئی۔ تموچن اپنے کسی بھی دشمن کو مہلت دینے کا قائل ہی کہاں تھا۔ سوتیلے بھائی کے ستارے بھی گردش میں تھے۔ اس نے ایک روز تموچن کی شکار شدہ مچھلی چرالی۔ موقع کی تاک میں بیٹھے تموچن نے اسے بلا تامل قتل کر دیا۔ ’قتل وغارت‘ بہتا ہوا لہو اور دشمنوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی خواہش تو اس کی رگوں میں لہو کی طرح دوڑتی تھی۔ یہ قبیلے کی روایات بھی تھیں اور ذاتی تمنا بھی۔ ان نوعمر خانہ بدوشوں کی گھٹی میں رحم وتحمل کی بجائے انتقام کا درس تھا۔ اس قتل کے بعد تموچن کے جسم وجان میں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

برکھارت میں
سجے ستمبر 2020ء کے
شمارے کی جاودانیاں

اولین صفحات

برائی کا وجود ناقابلِ برداشت تھا اس کا خاتمہ ضروری تھا۔ قاتل کے پیچھے قاتل تھا۔ جرم اور طاقت کی سنسنی خیز داستان... **امجد رئیس** کے قلم کا شاہکار

انا گیر

سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل فگار داستان...... **امجد جاوید** کے زورآور قلم کا امتحان......

الاؤ

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل... زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جارہی تھی...... **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

ایک نوجوان لڑکی کا لرزا خیز قتل...... جرم، سنسنی، دہشت اور پُراسراریت سے بھرپور کہانی......

دوسرا رنگ

ہر جگہ طاقت کا قانون ہے...... اور انصاف، قانون کے سامنے بے بس ہے...... سرورق کی تیکھی کہانی

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے ... محبتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ایک عجیب سی سرشاری' دلیری اور حدت پنپنے لگی۔ نوعمری کے تقاضوں جیسی کوئی بات اس میں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی۔ وہ ذہنی طور پر بہت پختہ ہو چکا تھا۔ اسے اپنے ہم عمر بچوں کے چھوٹے موٹے جھگڑوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ذہنی افق وسیع ہونے اور بڑوں کے معاملات میں دلچسپی لینے سے اسے کئی اہم ترین معاملات سے بھی آگاہی ہونے لگی۔ انہی دنوں اسے علم ہوا کہ اس کی والدہ 'اولون' کا تعلق دوسرے قبیلہ سے تھا۔ یسوکائی اسے عین اس وقت قبیلہ سے اغوا کرلایا تھا جب وہ شادی کی تمام رسومات کی ادائیگی کے بعد اپنے دلہا کے خیمہ میں جارہی تھی۔ اولون خاصی ذہین اور معاملہ فہم تھی اس لیے زیادہ دیر رونے دھونے یا احتجاج کرنے کی بجائے یسوکائی کو برضا و رغبت شریکِ حیات تسلیم کرلیا۔ تموچن کی سماعت میں اپنے بڑوں کی یہ چہ مگوئیاں بھی پڑنے لگیں کہ انتقام کا یہ سلسلہ تھم نہیں سکتا۔ کسی نہ کسی روز اس کے قبیلہ سے بدلہ لینے والے ضرور آئیں گے۔ تموچن کو خبر نہ تھی کہ مستقبل قریب میں یہ وقت اس کی زندگی کو بھی براہِ راست اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔ وہ بے خبر تھا اسی لیے بے فکر تھا۔ اسی بے فکری میں وہ راتوں کو گوبر کی جلتی آگ کے پاس ان گویوں کے گیت سنتا جو یکتارا لیے خیمہ در خیمہ سواری کرتے اور بھنبھناتی ہوئی سی آواز میں اپنے آباؤ اجداد کی شجاعت کے گیت گایا کرتے تھے۔ بہادری کے وہ نغمات اسے مزید پُرجوش کیا کرتے۔ اس کے دل و دماغ میں یہ خیال اجاگر ہونے لگتا کہ وہ بھی بہت جلد اسی صف میں شامل ہوگا۔ ایسے گویے اس کی شان میں بھی زمین و آسمان کے قلابے ملایا کریں گے۔ وہ یسوکائی کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ یسوکائی یکایا بڑے مغلوں کے خان اور چالیس ہزار خیموں کا سردار تھا۔ ان گویوں کے گیتوں سے خوابوں کی دنیا سجانے کے علاوہ اسے یہ بھی علم ہوا کہ وہ ایک اعلیٰ نصب فرد ہے۔ اس کا شجرہ نسب 'بورجیجن' کی اولاد سے ملتا ہے۔ بھوری آنکھوں والے بورجیجن وسط ایشیا کے صحرائے گوبی کے شمال سے بحیرہ بیکال تک وسیع برف سے منجمد دشت میں رہائش پذیر افراد تھے۔ وہ ٹنڈرا کے برف زاروں کے کنارے مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد 'ہن' اور 'ستھین' تھے۔ اس کے ایک جد امجد 'قبل خان' نے 'ختا' کے شہنشاہ کی داڑھی تک نوچ ڈالی تھی جس کی پاداش میں اسے بعد ازاں زہر بھی دے دیا گیا۔

اس کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً کئی انکشافات علم میں آتے رہے۔ انہی دنوں اسے 'قرایت' قوم کے سردار 'طغرل خان' کے بارے میں بھی علم ہوا۔ طغرل گوبی کے خانہ بدوشوں میں طاقتور ترین تھا۔ نوعمر تموچن اپنے یا کامغل قبیلے کی چراگاہوں سے دھیرے دھیرے دیگر معاملات کے متعلق آگاہی حاصل کر رہا تھا۔ وہ ہم عمر لڑکوں کی بجائے بزرگوں' جنگجوؤں اور یسوکائی کے مشیروں کی سنگت میں بیٹھنا پسند کرتا۔ ایسی ہی ایک محفل میں کسی دانش مند مشیر نے اسے ٹٹولنے کی غرض سے پوچھا۔

''جنگ اور محاذ آرائیوں کے متعلق تم کیا سوچتے ہو تموچن؟''

''جنگ تو میرے لیے زندگی کا دوسرا نام ہے۔ میں اکثر کچھ مناظر دیکھتا ہوں کہ میں اپنے گھوڑے پر سوار چند دشمنوں کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔ وہ مجھ سے خوفزدہ ہیں۔ ان کے چہرے دہشت سے نچڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور میرے دل میں خواہش مچلنے لگتی ہے کہ میں ان کے وجود سے زندگی کا ہر ریشہ ادھیڑ دوں۔ ان کی کھوپڑیاں پاش پاش کر کے ان میں شراب بھر کر لطف کشید کروں۔ کبھی کبھی تو یہ بھی دل چاہتا ہے کہ میرے مقابلہ میں بے تحاشا دشمن ہوں۔ میں ہر ایک کی کھوپڑی قلم کر کے اس سے اپنے لیے شاندار یورت تعمیر کرواؤں۔ لوگ اس یورت کو دور سے ہی دیکھیں تو تھراتے ہوئے کہیں کہ دیکھو! یسوکائی کا بیٹا تموچن کس قدر بے رحم ہے۔ کاش کہ ہم بھی اس کے مقابل کوئی بہادر اور منتقم مزاج پیدا کرسکیں۔'' تموچن کی آنکھوں میں برفاب گوبی کے برعکس ایک عجیب سی حدت تھی۔ مشیر مسکرایا اور اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں چند آزمودہ باتیں اس کے گوش گذار نے لگا۔

''تم جانتے ہو کہ چین ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ شاندار اس قدر کہ ہم اس کے سویں حصہ کے برابر بھی نہیں۔''

''مجھے ان کی عظمت کے قصے نہ سناؤ۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ ہم ان کا بہت دلیری سے مقابلہ کرتے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔''

''ہاں! لیکن تمہیں یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ ہم یہ مقابلہ کامیابی سے کیونکر کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ ہماری خانہ بدوشی ہے۔ سامان رسد ہر وقت ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ اپنی طرز حرب میں یکتا ہیں۔ موقع ملنے پر انہیں لوٹ لیتے ہیں اور حالات سازگار نہ ہونے پر چھپ جاتے ہیں۔ اگر ہم

بھی ان کی طرح شہر بسا کر پختہ گھروں میں رہنے لگیں گے تو کبھی پروان نہیں چڑھ سکیں گے۔'' مشیر نے سمجھایا۔

''میں نے سنا ہے کہ شہروں میں خانقاہیں اور مندر بھی ہوتے ہیں۔'' تموچن نے پوچھا۔

''ہاں! اور اصل میں وہی ان کی بربادی کا سبب بھی ہوتے ہیں۔ یہ عمارتیں اور مذہب انسان کو نرم دل بنا دیتے ہیں اور نرم دلی سے حکومت نہیں ہوا کرتی۔ اصل حکمرانی وہی شخص کر سکتا ہے جو خونخواری اور جنگجوئی میں بے مثال ہو اور مجھے تم میں یہی خوبیاں نظر آ رہی ہیں تموچن! انہیں کبھی ماند نہ پڑنے دینا۔ تم جتنے بے رحم اور سنگدل بنو گے اتنے ہی کامیاب سردار ثابت ہو گے۔''

سفاکیت پسند تموچن نے مشیر کی یہ باتیں خوب اچھی طرح گرہ سے باندھ لیں۔ وقت کچھ مزید آگے سرکا تو وہ گلے کی نگہبانی کے فرائض سے سبکدوش قرار دے دیا گیا۔ اب اسے یسوکائی بہادر کے ہمراہ سواری کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ گذرتے وقت میں اس کی خوبروئی قبیلہ میں کافی ممتاز ہوئی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ خدوخال سے زیادہ اپنی جسمانی طاقت اور اٹھان کی وجہ سے زیادہ نمایاں محسوس ہوتا۔ قدرے دراز قامت' ہموار شانے' گندم گوں سفیدی مائل جلد اور ڈھلی ہوئی پیشانی۔ اس کی آنکھیں کافی منفرد تھیں۔ ایک دوسرے سے قدرے دوری پر ہونے کے باوجود ترچھی ہرگز نہیں کہلائی جا سکتی تھیں۔ آنکھوں کے تل نیلے یا سبز بھورے محسوس ہوتے۔ ان کا حاشیہ البتہ سیاہ تھا۔ سرخی مائل بال بھی کافی لمبے اور کسی قدر بھدے تھے۔ چوٹیوں میں گندھے یہ بال اس کی پیٹھ پر پڑے رہتے۔ وہ کم گو تھا۔ بات کرنے سے قبل اس پر اچھی طرح غور و فکر کر لیتا تاکہ جھٹلائے جانے کا اندیشہ ہی باقی نہ رہے۔

اس گذرتے وقت میں تموچن کے غصہ میں بھی اسی قدر اضافہ ہوا تھا۔ اس خونخوار غصیلے مزاج کے باوجود وہ جسے بھی چاہتا اپنا گہرا دوست بنا لیتا۔ قبیلے کے افراد بلا امتیاز اس سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے میں خوشی و فخر محسوس کرتے۔ تموچن کی جارح مزاجی انہیں مرعوب بھی رکھتی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ اس قدر شدت مزاجی کے باوجود وہ آناً فاناً صنف نازک کی محبت کا اسیر ہو گیا۔ اس معاملہ میں وہ یسوکائی ہی کی طرح طوفانی ثابت ہوا۔ اس جیسے شدت پسند شخص کے لیے محبت بھی عشق کی سرحدوں سے بالاتر ایک جذبہ تھی۔ ان دنوں وہ دونوں باپ بیٹا دورانِ سفر کسی اجنبی جنگجو کے خیمہ میں مہمان تھے۔ اس جنگجو کی ایک لڑکی پر نظر پڑتے ہی تیرہ سالہ تموچن کو اپنے دل میں تلاطم کی سی کیفیت محسوس ہوئی۔ لڑکی کی رنگت میں گھلی سرخی انگلیوں سے چھونے کی خواہش مچلنے لگی۔ بھوری آنکھوں پر پلکوں کی مخملیں چلمن بھی انگلیوں کی پوروں میں سنسنی پیدا کرنے لگی۔ خوبصورت ناک' اٹھان اور انداز و اطوار کا بھی کوئی جواب نہ تھا۔ تموچن ان کیفیات سے پہلے کبھی آشنا نہ ہوا تھا لیکن وہ اتنا نا سمجھ بھی نہ تھا کہ مرد و زن کے اس رشتہ کی حتمی نوعیت یا لطافت سے واقف نہ ہوتا۔ اس نے یسوکائی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس لڑکی کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔''

بیٹے کی اس فرمائش نے یسوکائی کو پہلے چونکایا اور پھر بے اختیار فخر و غرور میں مبتلا کر دیا۔ اس کا بیٹا آج ایک بھرپور مرد بن گیا تھا۔

''لڑکی تو اچھی ہے لیکن ابھی بہت چھوٹی ہے۔'' یسوکائی نے اپنے میزبان کی بیٹی کو نظروں ہی نظروں میں اچھی طرح جانچا۔ ''یاد رکھنا! ہمارے قبیلہ میں شادی کے لیے لڑکی کو جسمانی طور پر خاصا مضبوط ہونا چاہیے۔ نازک مزاج اور کمزور عورتیں اپنے ساتھ مرد کی زندگی کو بھی اجیرن بنائے رکھتی ہیں۔''

''میرا دل کہتا ہے کہ یہ بڑی ہو کر بہت شاندار نکلے گی اور میرے لیے بہت خوش قسمت بھی ثابت ہو گی۔'' تموچن اٹل رہا۔

یسوکائی مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ اسے بھی 'بورتائی' نامی وہ نو سالہ لڑکی خاصی پسند آئی تھی۔ میزبان سے ہی علم ہوا کہ اس کے نام کا ماخذ اپنے قبیلے کا روایتی جد امجد تھا۔ یسوکائی نے بلا تاخیر بیٹے کی خواہش اس کے گوش گذار دی۔ میزبان اس پذیرائی پر خوش ہوا لیکن صاف گوئی کا مظاہرہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''شادی کے لیے ابھی اس کی عمر مناسب نہیں۔ ایک دفعہ پھر اچھی طرح دیکھ بھال لو۔''

''میرے بیٹے کو پسند ہے۔ اس کے بعد بحث یا نظر ثانی کی کوئی گنجائش ہی نہیں بچتی۔ تمہارا تموچن کے متعلق کیا خیال ہے؟'' یسوکائی نے پوچھا۔

''میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ ایک غیر معمولی لڑکا ہے۔ اس کا صاف چہرہ' چمکدار آنکھیں اور انداز بتاتے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑا سردار ثابت ہو گا۔'' میزبان کے اس جواب

www.pakistanipoint.com

پر یسوکائی فخر سے مسکرانے لگا۔ اس وقت اس کے ذہن میں بڑا سردار ہونے کا مطلب خود سے دوگنا خیموں کی حکمرانی ہی تھا۔

رشتہ طے ہوگیا اور قبائلی روایات کے مطابق تموچن کو وہیں قیام کرنا پڑا تاکہ وہ اپنے خسر اور متوقع شریکِ حیات سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرلے۔ تموچن کے شب و روز بہت اچھے بیتنے لگے۔ کچھ ہی وقت گذرا تھا کہ بدقسمتی کسی آسیب کی طرح اس کے درپے ہوگئی۔ آغاز ایک ہولناک خبر سے ہوا۔ اس کے قبیلے سے ایک گھڑسوار عجلت و ہڑبونگ کے عالم میں اسے آگاہ کرنے آیا کہ یسوکائی بہادر کا آخری وقت قریب ہے اور وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔

''میرے دوست کو کیا ہوگیا بھئی؟ ابھی کچھ دن پہلے تو وہ یہاں سے بالکل ٹھیک اور توانا رخصت ہوا تھا۔'' تموچن کے مبینہ خسر نے حیرت کا اظہار کیا۔ خود تموچن بھی اسی قدر بے یقین تھا۔

''وہ بالکل ٹھیک اور توانا ہی تھے۔ یہاں سے واپسی پر انہوں نے کچھ تاتاری دشمنوں کے خیمہ میں رات بسر کی۔ انہیں جانے کیوں یقین تھا کہ دشمن وضع داری کا مظاہرہ کرکے مہمان کے لیے کم ظرفی کا مظاہرہ نہیں کرے گا لیکن انہوں نے زہریلا مشروب پلا دیا۔ سردار کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ تموچن سے ملنا چاہتے ہیں۔''

گھڑسوار کے اس انکشاف پر تموچن کو اپنے والد پر شدید غصہ آنے لگا۔ اس نے برق رفتاری سے واپسی کا سفر شروع کردیا۔ گھڑسواری میں اس کی مہارت و رفتار عمر سے کہیں زیادہ تھی۔ اردو (قبیلے کا خیموں والا گاؤں) پہنچنے تک اس کی حالت کافی خستہ ہوچکی تھی لیکن دکھ بہرحال اس بات کا تھا کہ یسوکائی اس سے ملاقات کیے بغیر ہی آخری سفر پر روانہ ہوچکا تھا۔ معاملہ صرف اسی حد تک رہتا تو قابلِ برداشت بھی ہوتا۔ اصل خرابی نے تو اس کی غیر حاضری میں ہی جڑ پکڑلی تھی۔ یسوکائی کی علالت اور وفات کے دوران قبیلہ کے سربرآوردہ لوگوں میں خاصا انتشار پھیل گیا تھا۔ دو تہائی اکثریت نے یسوکائی کا پرچم چھوڑ کر علیحدگی اختیار کرلی۔ انہیں اپنی ذات' گھرانوں اور گلوں کی حفاظت کے لیے تجربہ کار و طاقتور آقاؤں کی ضرورت تھی۔ تیرہ سالہ لڑکے سے پاسبانی کی توقع رکھنا ہی عبث تھا۔ قبیلہ کے چند دیگر معززین نے انہیں قائل کرنے کی کافی کوشش کی۔

''تموچن ایک غیر معمولی لڑکا ہے۔ اسے تھوڑا وقت تو دو۔ وہ ہمارے لیے بہترین سردار ثابت ہوگا۔''

''گہرا پانی تو بہہ گیا ہے۔ کڑیل پتھر بھی ٹوٹ کر پاش پاش ہوگیا ہے۔ ہمیں صرف یسوکائی سے سروکار تھا۔ ہم اس کی پاسبانی میں محفوظ تھے۔ ایک عورت اور اس کے یہ کم عمر بچے اپنی حفاظت نہیں کرسکتے۔ ہماری دیکھ بھال کیا خاک کریں گے؟ ہم ان کے زیرِ سایہ آکر خودکشی نہیں کرنا چاہتے۔''

اولون ان تمام چہ مگوئیوں سے آگاہ تھی۔ وہ زیرک اور بہادر بھی تھی۔ اس نے اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت کا مظاہرہ کرنا شروع کردیا۔ قبیلہ کا شیرازہ بکھرنے سے بچانے کے لیے یاک کی نو دموں والا پرچم اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور علیحدگی پسندوں کا تعاقب کرکے التجاؤں و دلائل سے کسی حد تک قائل کرکے ہی دم لیا۔ نتیجتاً چند خاندان اپنی گاڑیوں اور گلوں سمیت ان کے ساتھ الحاق برقرار رکھنے کے لیے تیار ہوگئے۔ تموچن سفید گھوڑے یا کا پر مغلوں کے خان کی حیثیت سے براجمان ہوگیا۔ ایک بات تو طے تھی کہ یہ سرداری بستر گل ہرگز ثابت نہ ہوئی۔ اس کے زیرِ نگین قبیلہ کا ایک بچا کھچا ٹکڑا تھا اور یہ خدشہ بھی اپنی جگہ برقرار تھا کہ یسوکائی اور منگولوں کے تمام تر پرانے دشمن سابقہ حسابات چکتا کرنے لازماً چلے آتے۔

☆☆☆

سرداری معاملات سنبھالتے ہی تموچن کے لیے بقاء کی لامتناہی جنگ کا آغاز ہوگیا اور وجہ تنازعہ 'چراگاہیں' ثابت ہوئیں۔ یہ معاملہ درحقیقت کچھ یوں تھا کہ قبل خان اور یسوکائی کے زمانے میں یکا مغل شمالی گوبی کے سردار تسلیم ہوتے تھے۔ مغل ہونے کی حیثیت سے انہوں نے جھیل بیکال سے لے کر مشرق میں منچوریا کی سرحد پر پہاڑی سلسلہ میں تمام تر اچھی چراگاہوں پر قبضہ کررکھا تھا۔ ان چراگاہوں کی اہمیت مسلمہ تھی۔ یہ دو چھوٹی ندیوں مکوران اور اونان کی زرخیز وادیوں میں واقع برچ اور صنوبر کے درختوں سے لدی' بکثرت شکار اور پانی کے وسیع ذخائر سے مالا مال تھیں۔ یہاں برف بھی دیر سے ہی پگھلتی۔ سرما کی شدت زیادہ ناگوار نہ تھی۔ مویشیوں کے گلے سے ہر طرح کی ضرورتِ زندگی پوری ہوجاتی۔ ان کے بالوں سے نمدا اور خیمہ باندھنے والی رسیاں بٹ لی جاتیں' ہڈیوں سے تیروں کی نوکیں بنالی جاتیں' چمڑے سے گھوڑے کی زین' کومیس

waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کے تھیلے اور گھوڑوں کا ہی دیگر ساز و سامان تیار ہو جاتا۔ ایسی جنت نظیر صورت حال سے فائدہ کیونکر نہ اٹھایا جاتا۔ مخالفین تو رہے ایک طرف' تموچن کے زیر سایہ افراد کو بھی یقین تھا کہ وہ تیرہ سالہ لڑکا مصائب در مصائب کا شکار ہونے والا ہے۔ ان کے یہ خدشات بہت جلد 'ترغا تائی' نامی جنگجو کے روپ میں مجسم سامنے آ گئے۔

ترغا تائی بورچیچن تھا۔ اس نے بھی شمالی گوبی کی سرداری کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ وہ 'تایجوت قبیلہ' کا سردار تھا اور ان منگولوں کا نسلی دشمن تھا۔ ترغا تائی اس کم عمر سردار کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی کیفیت بالکل اس بھیڑیے کی طرح تھی جسے کسی کم سن بھیڑیے سے اس بات کا خدشہ ہو کہ وہ مستقبل قریب میں اس کی جگہ ہتھیانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ترغا تائی نے کسی بھی اطلاع کے بغیر کثیر گروہ ساتھ لے کر تموچن پر دھاوا بول دیا۔ قسار اور تموچن نے اہل خانہ کے ساتھ فرار میں ہی عافیت سمجھی۔ قسار نے گھوڑے پر ہی بیٹھے اپنی تیر اندازی کے جوہر بھی دکھائے لیکن دشمن کے ارادے غیر متزلزل رہے۔ تایجوت کے ان جنگجوؤں کو اپنی تعداد' ہتھیاروں اور حکمت عملی پر پورا بھروسا تھا۔ وہ بڑے اہتمام سے ان کا تعاقب کرتے رہے۔ تموچن اور قسار گھاٹیوں سے ہوتے' تناور درختوں کی آڑ میں چھپتے آگے بڑھتے رہے۔ اس فرار میں جبلت ہی ان کی سب سے بڑی رہنما تھی۔ اسی طاقتور احساس کی مدد سے وہ راستے میں آنے والے چند درخت کاٹ کر تنے مخصوص طریقہ سے گرا دیتے تا کہ تعاقب کرنے والوں کی رفتار میں کمی لائی جا سکے۔ اب شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا غالب آتے ہی ان کے حواس منتشر ہونے لگے۔ یسوکائی کی بیٹیاں اور دیگر چھوٹے بیٹے ایک غار میں روپوش ہو گئے۔ قسار کسی اور جانب پلٹ گیا اور تموچن گھوڑا دوڑاتے ہوئے ایک پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اگلے کئی روز تک وہ ایک خفیہ مقام پر روپوش رہا لیکن بھوک سے مجبور ہو کر باہر آنا ہی پڑا۔ بھوک پیاس سے نڈھال اس تیرہ سالہ لڑکے نے گھات میں بیٹھے دشمنوں کو غچہ دینے کی بھرپور کوشش کی لیکن تایجوت کے تازہ دم جنگ جو اسے قید کر کے ترغا تائی کے سامنے لے آئے۔ ترغا تائی نے بلا تامل اسے 'کنگ' میں جکڑنے کا حکم دے دیا۔ کنگ ایک مخصوص چوبی ہتھکڑی تھی جس سے قیدی کے شانے اور کلائیاں جکڑ دی جاتی تھیں۔ ترغائی کے جنگجو فتح کے گیت گاتے' پکڑے ہوئے مویشی ہنکاتے ہوئے قیدی تموچن کو اپنے قبیلے تک لے آئے۔ تموچن زندگی میں پہلی بار ایسی لاچاری اور بے بسی کا شکار ہوا تھا۔ تذلیل و توہین کا ہر ایک لمحہ اس کے اندر انتقام اور طاقت ور بننے کی آگ مزید دہکاتا۔ وہ ذہنی طور پر فرار کے لیے بالکل تیار تھا اور یہ موقع بھی بہت جلد مل گیا۔

تریجوت قبیلے کے جنگ جو کسی دعوت میں گئے تھے۔ اس کی حفاظت پر صرف ایک پہریدار متعین تھا۔ اندھیرا چھاتے ہی تموچن نے اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے پوری قوت سے کنگ کے سرے محافظ کے سر پر مار کر اسے بے ہوش کیا اور خیمہ سے باہر دوڑ لگا دی۔ آسمان پر ماہِ کامل کی روشنی جنگل کو تا حد نظر منور کیے ہوئے تھی۔ جھاڑیوں میں گھس کر وہ ندی کی سمت میں چلنے لگا۔ اس دوران تعاقب کرنے والوں کی آہٹیں واضح محسوس ہونے لگیں۔ چار و ناچار تموچن نے ندی میں چھلانگ لگا دی اور اس کی بو سونگھتے پھر رہے ایک جنگجو نے اسے دیکھ لیا لیکن کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ تموچن نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ اس مہربان کو پہچان گیا تھا۔ وہ قبیلے میں اجنبی اور مہمان تھا۔ تموچن نے سواروں کے جاتے ہی کچھ وقت مزید گذارا اور اس کے خیمہ میں پہنچ گیا۔ اجنبی اس شرابور اور کنگ میں جکڑے لڑکے کو دیکھ کر بیک وقت خوف اور ترحم کے جذبات میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے انسانی ہمدردی کے تحت کنگ کو ٹکڑوں میں کاٹا اور نذر آتش کر کے اپنے خلاف سب ثبوت مٹا دیئے۔ تموچن کو اس نے اون سے لدی ہوئی ایک گاڑی میں چھپا دیا۔ گاڑی سخت بے آرام اور گرم تھی۔ اس اجنبی شکاری کو بھی علم تھا کہ تموچن کو فرار کروانے کی یہ کوشش ایک بہت بڑا خطرہ تھی۔ تایجوت جنگجو اپنے قیدی کو دیوانوں کی طرح تلاش کر رہے تھے۔ قبیلہ سے باہر جانے والی اس گاڑی پر رکھی اون میں اچھی طرح نیزے مار کر ہی اسے جانے کی اجازت دی گئی۔ نیزے کی ایک انی نے تموچن کی ٹانگ بھی زخمی کی لیکن وہ بلا حرکت وہیں دبکا رہا۔ خطرہ کی حدود سے باہر آتے ہی شکاری نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ اس نے تموچن کی کم سنی پر ترس کھاتے ہوئے اسے کھانا' دودھ' ایک کمان اور دو تیر دے کر ماں اور بھائیوں کے پاس جانے کی تاکید کر دی۔ تموچن اسی کے دیئے گئے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی جاگیر میں پہنچا تو وہاں راکھ' سناٹے اور تباہی کے آثار کے سوا کچھ بھی باقی نہ تھا۔ دشمن اس کے مویشی بھی ہنکا کر لے جا چکے

www.pakistanipoint.com

تھے۔ تموچن نے ہمت ہارے بغیر ان کا سراغ لگالیا۔ اولون' قسار اور سوتیلا بھائی ملکوتی بقید حیات تھے۔ وہ بھی تموچن کو زندہ دیکھ کر ایک نئے سرے سے جی اٹھے۔ انہوں نے اپنے ایک ہمدرد کے پاس جانے کا فیصلہ کرلیا۔

یہ سفر بھی ہرگز آسان نہ تھا۔ اہل خانہ کو مکمل حفاظت اور ذمے داری سے کسی پناہ گاہ میں پہنچانا ہی اس کی صلاحیتوں کا اصل امتحان تھا۔ اس سفر کا ہر ایک لمحہ تموچن کے لیے بقاء کا ایک نیا سبق ثابت ہوا۔ وہ گلہریاں پکڑ کر بھوک مٹاتے۔ اگر کہیں مچھلیاں میسر آجاتیں تو ان سے استفادہ کرلیا جاتا۔ بکریاں البتہ صرف دودھ کے لیے استعمال ہوتی رہیں۔ تیرہ سالہ تموچن کے سامنے امان اور سکون حاصل کرنے کے لیے تین راستے تھے۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کی زمینیں دشمن کے حوالے کرسکتا تھا' اپنی منگیتر بورتائی کے طاقتور قبیلہ کے سردار باپ سے مدد طلب کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ 'قرایت' قوم کے سردار طغرل سے بھی مدد مل جاتی۔ طغرل اخلاقی اور روایتی طور پر تموچن کی دلگیری کا مقروض بھی تھا کیونکہ اس نے یسوکائی کے ساتھ رفاقت قائم رکھنے کی قسم اٹھائی تھی۔ اس قسم کے تحت دونوں فریقین اپنی اپنی ہتھیلیوں پر زخم لگا کر وہ ہاتھ مضبوطی سے ملاتے اور ملاپ شدہ لہو ایک جام میں انڈیل کر 'رفاقت کا جام' پی لیا جاتا۔ تموچن کی انا کو یہ بات بھی گوارا نہ تھی۔ اس نے اولون کے اصرار کا صرف اتنا ہی جواب دیا۔

''میں نہتا اور بے بس ہوکر کسی سے مدد طلب نہیں کروں گا۔ مجھے علم ہے اس طرح مدد نہیں حقارت ملا کرتی ہے۔''

''میرے بچے! ہماری روایات میں رفاقت کا حلف کسی بادشاہ کے وعدہ سے بھی زیادہ اہم ہوتا ہے۔ طغرل خان ہمیں سہارا دینے کا پابند ہے، وہ ہم پر کوئی احسان نہیں کرے گا۔'' اولون نے اسے سمجھانا چاہا۔

''نہیں! میں اس کے سامنے کسی مفرور پناہ گزین کی حیثیت سے نہیں جاؤں گا۔ اس سے بہتر ہے کہ میں اپنے قبیلے کی بکھری ہوئی وادیوں میں جاکر خراج طلب کروں اور میں ایسا کرکے بھی دکھاؤں گا۔'' تموچن کا ارادہ اٹل تھا جسے عملی جامہ پہنانے میں وہ کامیاب بھی رہا۔ اسے خراج میں ایک اونٹ' بیل' گھوڑا اور بھیڑ تو مل گئے لیکن اس کے دامن سے لپٹی تنگیاں ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہ تھیں۔ اہلخانہ کی سہولت کے لیے یہ چار جانور میسر ہوئے تو آٹھوں گھوڑے تایجوت قبیلہ کے ہتھے لگ گئے۔ اب ان کے پاس صرف ایک سرخ گھوڑی ہی بچی تھی جو شاید اس لیے سلامت رہ گئی تھی کہ ملکوتی اس پر سوار ہوکر گلہریوں کے شکار کے لیے گیا تھا۔ تموچن' قسار اور ملکوتی تینوں ہی اس نئی صورتِ حال سے خود نمٹنا چاہتے تھے۔ دشمن سے مال مسروقہ برآمد کرنے کے لیے ان کی رگیں چیخ رہی تھیں۔ گمشدہ جانوروں کی جلد از جلد برآمدگی اس لیے بھی ضروری تھی کہ پیادہ ہونے کی صورت میں دشمن کے قبضے میں جانے کے مواقع کہیں زیادہ بڑھ جاتے۔ تموچن سواروں اور آٹھوں گھوڑوں کے پاؤں کے نشانات کو جتا تین روز تک لگاتار تعاقب کرتا رہا۔ زادراہ کے طور پر صرف کچھ سوکھا ہوا گوشت ہمراہ تھا جو نرم اور گرم رکھنے کے لیے زین اور گھوڑے کی پیٹھ کے درمیان رکھا تھا۔ مشکلات کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جارہی تھیں۔ گوشت ختم ہوگیا اور گھوڑی کی تھکاوٹ بھی بڑھنے لگی۔ وہ مزید سفر کے قابل نہ رہی تھی۔

تین روز کے بعد جب سفر ناممکن تصور ہونے لگا تو اگلے ہی دن اسے پگڈنڈی کے کنارے گھوڑی کا دودھ دوہتے ہوئے ہم عمر لڑکا ملا۔

''تھکے ہوئے معلوم ہورہے ہو۔ لگتا ہے کئی روز سے سفر میں ہو۔'' اجنبی نے اسے پوچھا۔

''ہاں! میرے گھوڑے چوری کرلیے گئے ہیں۔ انہی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔''

''اوہ اچھا! تو وہ گھوڑے تمہارے تھے جو میں نے پچھلے پہر یہاں سے جاتے دیکھے تھے۔'' اجنبی چونکا۔

''کیا تم مجھے وہ راستہ دکھا سکتے ہو؟'' تموچن ایک ہی لمحہ میں ساری تھکاوٹ بھول گیا۔ اجنبی نے اپنا چمڑے کا کیسہ باندھ کر لمبی گھاس میں چھپایا اور ایک عزم سے بولا۔

''میرا نام بغورچی ہے۔ تم اپنی یہ گھوڑی یہیں چرنے کے لیے چھوڑ دو۔ ہم دونوں تازہ دم گھوڑوں پر آگے چلتے ہیں۔'' بغورچی نے ایک سفید گھوڑے پر زین کس کر تموچن کے حوالے کردیا۔ تین روزہ مزید سفر کے بعد تایجوت کی خیمہ گاہ اور مسروقہ جانور نظر آگئے۔ تموچن بے انتہا پُرجوش تھا۔ دونوں نوجوان ان گھوڑوں کو کامیابی سے ہنکالائے۔ تایجوت جنگجوؤں نے ان کا تعاقب بھی کیا لیکن تموچن نے اپنے گھوڑے پر بیٹھے ہی زرہ پر تیر چڑھائے اور قریب ترین گھڑسواروں کو زخمی کرکے بقیہ ماندہ کو اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لینے پر مجبور کردیا۔ رات

Waqar Zeem
www.pakistanipoint.com

بھرسفر کے بعد اگلے روز وہ بغورچی کے خیمہ پہنچ گئے جہاں اس کے والد نے دونوں کا استقبال کیا۔ وہ تموچن سے کافی متاثر ہوا۔ اس نوجوان سردار کو کھانا اور دودھ سے بھرا تھیلا دینے کے بعد رخصت کرنے کا وقت آیا تو وہ بغورچی اور تموچن کو بھی دوستی کے گہرے اور دائمی رشتہ میں بندھنے کی بارہا تاکید کرتا رہا۔ بغورچی بھی اس نئے دوست کا اسیر ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ تموچن کے پاس ہی منتقل ہو گیا۔

☆☆☆

گذرتے وقت کے ساتھ تموچن ذہنی طور پر کافی پختہ ہونے لگا۔ خانہ بدوش نسل کی تمام خوبیاں اور خامیاں اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اسے قبیلہ میں کمزور افراد گوارا ہی نہ تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے قبیلے کے کسی بھی فرد پر یقین نہ کرتا۔ اسے چالاکی کے ذریعہ دشمنوں کی دغابازی کو مات دینے کا ہنر بھی آ گیا تھا۔ وعدہ کی پابندی ضرب المثل بن کر قبیلہ میں مشہور ہونے لگی۔ سترہ سال کی عمر تک پہنچتے ہوئے اس کے قبیلے کی افرادی قوت کافی بڑھ گئی تھی۔ گوبی میں سرداری کا انحصار صرف اس بات پر تھا کہ دشمنوں سے بچاؤ اور چراگاہوں کو اپنے قبضہ میں رکھا جائے۔ اگر کوئی سردار لڑائیوں میں اپنے قبیلہ کی حفاظت نہ کر سکے تو اسے اس منصب پر فائز رہنے کا بھی کوئی حق نہ رہتا۔ تموچن کی چالاکی، فراست، جسمانی قوت اور دلیری نے اسے ہر مخالف پر غالب ہی رکھا۔ قبیلہ کے معاملات متوازن ہوتے ہی اس نے گذشتہ چار برس سے مؤخر شدہ ایک ادھورے وعدہ کی تکمیل کا ارادہ کر لیا۔ بورتائی سے شادی کرنے کا اس سے بہترین وقت کوئی نہ تھا۔

تموچن کے شادی کے فیصلہ نے قبیلہ میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ وہ ایسے کسی بھی موقع کے ہمیشہ منتظر رہتے تھے کیونکہ وہاں 'اخودور' (تقریبات) بہت کم منعقد ہوتی تھیں۔ بورتائی کے والد نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ وہ اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس قدر سخت دشمنی کے حالات سننے کے بعد وہ تموچن کی سلامتی اور بقاء سے کافی مایوس ہو چکا تھا۔ شادی کی اس اخودور کا منظر دیدنی تھا۔ شمالی گوبی میں رہائش پذیر تیر کمان والے لمبے دنوں اور اونچے سفید پہاڑوں والے لوگوں کے نام سے مشہور یہ افراد ایسی ہر اخودور سے اپنے مخصوص سفّاک انداز میں ہی لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ تموچن کی شادی میں بھی قہقہوں کا بازار گرم تھا۔ ملازمین بھیڑوں اور موٹے تازے دنبوں کو کاٹ کر گوشت کے تکے بنانے اور پکانے میں مصروف تھے۔ یورت میں بیٹھنے سے پہلے مہمان اپنا اسلحہ دروازے کے پاس ہی چھوڑ آتے اور بزرگوں کے دائیں جانب بیٹھ کر مے نوشی میں مشغول ہوتے ہی مخصوص انداز میں تالیاں بجانے لگتے۔ نوکر چاروں اطراف میں مہمانوں کے جام بھرنے کے لیے مکمل چوکس تھے۔ یکتاروں کے ساز میں چاولوں کی شراب پی کر جھومتے وہ قبائلی بے ڈھنگے انداز میں ہرنوں کے چمڑے سے بنے جوتے پہن کر مزید بے ڈھنگے پن سے ناچنے لگتے۔

تیسرے روز بورتائی کو سردار کے خیمہ میں لایا گیا۔ وہ سفید سمور کا طویل لباس پہنے اس کے بائیں جانب خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس کی چوٹیوں میں چاندی کے سکے اور ننھی مورتیاں بھی گوندی گئی تھیں۔ سر پر صنوبر کی چھال اور بیش قیمت ریشم سے منڈھی مخروطی کلاہ تھی۔ اس کلاہ کو وہ دونوں کانوں پر گندھی چوٹیوں کے سہارے ہی اوڑھا ہوا تھا۔ علاقائی رسومات کے مطابق اسے رخصتی کے وقت تک یونہی خاموش بیٹھے رہنا تھا۔ اس کے بعد وہ خیمہ خیمہ چھپتی تاکہ تموچن اس کی بہنوں اور خادماؤں سے لڑتے ہوئے اسے تلاش کرے اور گھوڑے پر بٹھا کر اپنے قبیلہ میں لے جائے۔ تیرہ سالہ بورتائی کو اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھا کر تموچن اپنی ذات میں عجیب کاملیت محسوس کر رہا تھا۔ بورتائی کے سینے اور کمر پر نیلے پٹکے بندھے ہوئے تھے۔ عقب میں نوکر ایک سموری لبادہ لیے ہمراہ تھے جو اولون کو بطور تحفہ پیش کیا جاتا۔ بورتائی کے دل و دماغ میں بھی تلاطم برپا تھا۔ وہ ایک نئی زندگی کے آغاز کے لیے تیار تھی۔ اسے علم تھا کہ خان کی بیوی ہونے کی حیثیت سے یورت کی نگرانی اس کا سب سے بڑا منصب تھا۔ اسے ضرورت پڑنے پر جانوروں کا دودھ بھی دوہنا تھا۔ مردوں کے میدانِ جنگ میں ہونے کی صورت میں ریوڑوں کی چوپائی، خیموں کے لیے غذا تیار کرنے، ریشوں کی تانت سے کپڑے بننے اور ان کے لیے چپلیں موزے تیار کرنا بھی اسی کی ذمے داری تھی۔ بورتائی نے اپنے فرائض بہت شاندار انداز میں نبھائے۔ اپنے حسن کے بعد اس نے اطاعت، وفاداری اور خدمت گذاری سے بھی تموچن کا دل جیت لیا تھا۔

خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتا یہ وقت دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ گوبی میں جنگ کے شعلے ایک بار پھر بھڑک اٹھے تھے۔ شمالی میدانوں میں رہائش پذیر 'مکریت افراد' (بعض

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

مقامات پر مرکیت بھی درج ہے) نے تموچن کے قبیلہ پر دھاوا بول دیا۔ یہ کھرے وحشی اور ٹنڈرا کے علاقوں کے قدیم باشندے درحقیقت اس جنگجو کے لواحقین تھے جس سے اولون کو اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ وہ اٹھارہ سال بعد بھی انتقام کی آگ سینوں میں دہکائے ہوئے تھے۔ رات کو تموچن کے اردو میں بھڑکتی ہوئی مشعلیں پھینکنے کے بعد وہ بورتائی کو اٹھا کر واپس لوٹ گئے۔ تموچن نے ان جنگجوؤں کا ڈٹ کر مقابلہ تو کیا لیکن اپنی محبوب اہلیہ کو ان کے تصرف میں جانے سے نہ بچا سکا۔ وحشت' غضب اور انتقام نے اسے دیوانگی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس معاملہ میں واحد مثبت پہلو یہ تھا کہ وہ شادی کے بعد اپنی آزاد اور باوقار حیثیت میں طغرل خان سے مل کر آیا تھا۔ اولون کے لیے بھیجا گیا سمور اس نے طغرل کو تحفہ میں پیش کر دیا تھا اس لیے اب وہ مدد طلب کر سکتا تھا۔ اس کی انا پر یہ بار ہرگز نہ تھا کہ طغرل سے اس کا سامنا محض مجبوری اور ضرورت کے تحت ہوا ہے۔ طغرل نے اس کی مدد کی درخواست بلا تامل قبول کر لی۔ مکمل منصوبہ بندی اور حکمت عملی کے تحت ایک چاندنی رات میں مغل اور قرایت قبیلے نے مکریتوں پر ایسا دھاوا بولا کہ بورتائی کی بازیابی میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ بورتائی کا سامنا بیک وقت خوش گوار اور حیران کن لمحہ تھا۔ اس کے شکم کا ابھار ایک نئی زندگی کی تخلیق کی نوید دے رہا تھا۔ تموچن نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیا اور شکم پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھ کر بولا۔

''میرا بیٹا..... میرا اصل جانشین یہی ثابت ہوگا۔ وہ دشمنوں کے لیے قہر ثابت ہوگا۔''

تموچن کے اس اعلان کے بعد کوئی بھی ساتھی متنازعہ بات کرنے کی جسارت نہ کر سکا۔ تموچن نہایت شان سے بورتائی کو واپس لے آیا۔ اس کی زندگی کے ہنگامے جوں کے توں جاری تھے۔ ان صحرائی قبیلوں کی باہمی لڑائیوں میں شاذ ہی امن کی نوبت آتی۔ اس کے ساتھی جانثاری میں بے مثال تھے۔ ایک لڑائی میں اس کے حلق میں تیر پیوست ہو گیا۔ دشمن نے تو اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا لیکن چند ساتھیوں کو اس کے وجود میں زندگی کی رمق محسوس ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس کے زخم سے خون چوسا اور ایک پیالے میں برف پگھلا کر زخموں سے لہو صاف کرتے رہے... اور اسے نئی زندگی مل گئی۔ وہ پھر سے کارزار زندگی میں کود پڑا۔ اپنے گرد جانثاروں کی تعداد بڑھانے لگا۔ دھیرے دھیرے تموچن کے ان جانثاروں کی تعداد تیرہ ہزار سے زائد ہو گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب گرما کی چراگاہوں سے سرمائی چراگاہوں کی جانب سفر کرتے ہوئے انہیں تیس ہزار تایجوت جنگجوؤں کی یورش کا سامنا کرنا پڑا۔ تایجوت کی کمان برغاتائی کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس طویل وادی میں پھیلے منگول قبیلے کو نابود کر دینا چاہتا تھا۔ تموچن کے 'بت کے' (چھکڑوں) پر خیمے نصب تھے۔ وہ آہستہ رو ریوڑوں کے درمیان قدرے دھیمی رفتار سے چلے آ رہے تھے کہ برغاتائی کے ارادوں نے ہرسو سنسنی دوڑا دی۔ فرار کی بھی کوئی صورت نہ تھی کیونکہ ان کی روایات کے مطابق فرار کا مطلب عورتوں' مویشیوں اور قبیلے کی ملکیت سے مکمل محرومی تھا۔ دوسری جانب تیس ہزار جنگجوؤں کا سامنا کرنے کا مطلب یقینی موت تھا۔

وہ ایک تاریخی لمحہ تھا۔ تموچن کی ذات اور قبیلہ بقاء وفنا کی کشمکش میں گھرے تھے۔ اس وقت ہونے والی کوئی بھی غلطی اسے ہمیشہ کے لیے گمنام اور نابود کر دیتی۔ تموچن کی حسیات مکمل طور پر چوکنا اور ذہن تیزی سے چل رہا تھا۔ اس کے دوررس دماغ نے بالآخر اس مشکل سے نمٹنے کا جامع حل تلاش کر لیا۔ اس نے اپنے دستوں کی ایک صف بنائی۔ اس صف کی ایک سمت جنگل کے باعث محفوظ تھا۔ دوسری جانب بت کوں (چھکڑوں) کا طویل و عریض چوکور حلقہ بنا دیا گیا جو اندر سے خالی تھا۔ تمام مویشیوں کو ہنکا کر ان چھکڑوں میں عورتوں اور تیر کمان سے مسلح لڑاکوں کو اکٹھا کر دیا گیا۔ اس کے بعد دستوں کو اچھی طرح مسلح کرنے کے بعد انہیں بہترین مقامات پر تعینات کیا۔ اس روز گوبی کے نظارے حیران کن تھے۔ دو طرفہ تیروں کی بارش' چمکتی تلواریں چلاتے' کمندوں اور تیروں کے کانٹوں سے دشمنوں کو زین سے کھینچتے ہر جانب گھمسان کا رن تھا۔ وادی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک شام تک جنگ برپا رہی۔ اندھیرا غالب آنے تک تموچن فتح یاب ہو چکا تھا۔ تقریباً چھ ہزار دشمن صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ اس کے بعد 'ستر' سواروں کو تموچن کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان کے ترکش اور تلواریں گردنوں سے لٹک رہی تھیں۔ تموچن نے ان سرداروں کو اسی لمحہ اور اسی مقام پر کڑاہیوں میں زندہ ابلوا دینے کا حکم جاری کر دیا۔ دشمن کی چیخ و پکار اور کراہیں اس کے لیے گوبی کی دلکش ترین موسیقی سے بھی زیادہ سرور بخش تھیں۔

☆☆☆

www.Paksociety.com

سرخ بالوں والے تموچن کی کامیابی کا ڈنکا ہر سو بجنے لگا۔ وہ بجا طور پر اپنی اس فتح پر فاخر تھا اور مکمل استحقاق سے ہاتھی دانت اور سینگ سے مرصع جریب اپنے ہاتھ میں تھامے رہتا۔ ایک چھوٹے سے عصا کی صورت کا یہ جریب سپہ سالاری اور سرداری کا مخصوص نشان تھا۔ ان دنوں اس کی اولین کوشش سیاسی طاقت کی بجائے افرادی قوت میں اضافہ تھا۔ وہ اپنے لشکر میں ایسے بہادر جمع کرنا چاہتا تھا جو سخت پتھروں کو کچل کر ریت بنانے کی استطاعت رکھتے ہوں، چٹانوں کو الٹ سکیں اور گہرے پانیوں کا تموج ٹھہرا دینے کے قابل ہوں۔ وفاداری اور اطاعت اس کی پسندیدہ ترین خوبیاں تھیں۔ ان دنوں اس کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ وہ کھرے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتا۔ یہ پہاڑ ’تنگری‘ کا مسکن سمجھا جاتا تھا۔

تنگری درحقیقت ان قبائلیوں کا ایک عقیدہ تھا۔ انہیں بلندی کی ہواؤں کی روحیں سمجھا جاتا تھا جو طوفان، رعد کے علاوہ لامتناہی آسمان میں پیدا ہونے والے دیگر ہولناک عوامل کا سبب بھی تھیں۔ تموچن اپنی پیٹی کاندھے پر ڈالے چہار سمت ہواؤں سے دعا گو ہو جاتا۔

”اے لامتناہی آسمان! میں تیرے کرم کا طالب ہوں۔ میری مدد کر۔ بلندی کی طاقتور ہواؤں کو میرا دوست اور مطیع بنا دے۔ زمین پر ایسے آدمیوں کو میرے پاس بھیج جو وفادار ہوں۔ مجھے غداروں سے دور رکھنا۔ غدار بڑی بڑی بستیوں کو تباہ کر سکتے ہیں۔ مجھے ایسے آدمیوں سے محفوظ رکھنا جو صبح کو وعدہ کر کے رات تک اسے توڑ دے۔“

تموچن کی دعائیں اور کوششیں رنگ لانے لگیں۔ اس کے نویاکوں کی دموں والے پرچم تلے سینکڑوں افراد جمع ہوتے رہے۔ تموچن اپنے ماتحتوں کا خیال بھی بہت رکھتا تھا۔ شکار کے بعد وہ شکاری کو اپنا مطلوبہ حصہ الگ کر لینے کی اجازت دے دیا کرتا۔ جنگ کے بعد ہر آدمی لوٹ مار کا حصہ رکھنے کا مجاز بھی ہوتا۔ بہت زیادہ خوش ہوتا تو اپنے کندھے پر پڑا ملبوس تحفہ میں دے دیتا۔ وہ اپنی فطرت میں بہت انوکھا شخص تھا۔ آوارہ گردوں کو اپنے لشکر میں اسی شوق و محبت سے بھرتی کرتا جیسے موجودہ وقت میں صاحب ثروت لوگ نوادرات، مصوری اور سنگتراشی کے شاہکار جمع کرتے ہیں۔

ان ساتھیوں کے علاوہ اس کے قریبی احباب بھی کم جانثار نہ تھے۔ بغورچی اور قسار نے تو مشکل حالات میں بھی اس کا ہر ممکن ساتھ دیا تھا۔ ان کے علاوہ ارغون، جبی نویان، مقولی اور سوبدائی بھی عجوبہ روزگار افراد ہی تھے۔ جبی نویان اور مقولی خاصے زیرک اور میدانِ جنگ میں سینکڑوں زخم سہنے کے بعد منجھے ہوئے سپہ سالار بن چکے تھے۔ سوبدائی بھی بے مثال تیرانداز تھا۔ ارغون کافی منفرد شخص تھا۔ خوش مزاج اور کسی حد تک مغنی۔ تموچن کے یہ ساتھی گوبی کے علاقہ میں ’قیات‘ (امڈتے ہوئے دھارے) کہلاتے تھے۔ جبی نویان اور سوبدائی تو خاصے کم عمر تھے۔ اس کے باوجود میدانِ جنگ میں تباہی برپا کرنے میں لاثانی تھے۔ تموچن بھی ان سبھی کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ قرولتائی (سرداروں کی مجلس مشاورت) میں بغورچی اس کی قریب ترین نشست پر بیٹھا کرتا۔ وہ تموچن کے تیر اور کمان سنبھالے رکھنے کا مجاز بھی تھا۔ قسار کو تیغ برداری کا منصب ملا۔ سرداری کے فرائض سنبھالتے ہی وہ گوبی میں دھیرے دھیرے اپنا اثر قائم کر رہا تھا۔ ابتدائی مشکلات کے بعد اب اس نے زندگی کے دھارے کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرنا سیکھ لیا تھا۔ تیس سال کی عمر تک پہنچتے وہ کامیابی، خوشحالی اور بے مثال زندگی کی راہ پر گامزن تھا۔

گوبی میں بڑے قبیلے بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے لڑتے، تعاقب اور انسانی شکار کھیلتے۔ تموچن کا قبیلہ بھی ایک لاکھ خیموں کی وسعت اختیار کر چکا تھا۔ ریوڑوں میں جانور بھی بے شمار تھے۔ بیٹے اس کے ساتھ گھڑ

کرنل صاحب جوان جیونت کی بہادری کا امتحان لینا چاہتے تھے جو ہر وقت ڈینگیں مارتا رہتا تھا کہ اس جیسا بہادر اور نڈر آدمی اس دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔ اسے حکم دیا گیا کہ ایک جگہ بالکل ساکت کھڑے ہو جاؤ اور صرف اپنا داہنا ہاتھ باہر کی طرف نکال لو۔ ایک گولی چلائی جائے گی جو صرف تمہاری آستین کو چھوتی ہوئی گزر جائے گی۔ جیونت نے حکم کی تعمیل کی اور گولی اس کی آستین کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

کرنل اس کی جواں مردی پر بے حد خوش ہوا۔ اس نے حولدار کو حکم دیا کہ جیونت کو نیا کوٹ عنایت کر دیا جائے۔

”حضور اعلیٰ!“ جیونت گڑگڑایا۔ ”مجھے ایک نئی پتلون کی بھی ضرورت ہے۔“

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

تھے۔ 1210 عیسوی (بھیڑ کا سال) آنے تک حالات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ 'فن یا کن یا چن' (خاندان زریں) شہنشاہی تخت پر براجمان تھا۔ پایہ تخت 'ین کنگ' تھا (ین کنگ موجودہ پیکن سے کافی قریب ہے) ہزاروں سال پرانی اس تہذیب کی حالت کسی معمر خاتون کی سی ہو چکی تھی جو اپنی شان و شوکت اور شاندار ماضی کے زیر اثر لباس، انداز و اطوار میں تو پرتمکنت ہو لیکن درون پردہ یہ عالم ہو کہ اردگرد جمع 'بچوں' پر بالکل کوئی ضابطہ یا قانون نظر نہ آئے۔ غلام سوتی کپڑے پہن کر برہنہ پا اِدھر اُدھر دوڑتے۔ اعلیٰ افسران کی شان نرالی تھی۔ ان کے خدام چھتریوں کا سایہ کیے رکھتے۔ رسومات کی پابندی بے مثال تھی۔ عوام کی توجہ زیادہ تر عادات و اطوار شائستہ بنائے رکھنے پر ہی مرکوز رہتی۔ شہروں میں تفریح کے لیے جھیلیں موجود تھیں۔ کشتیوں میں سوار لوگ چاول کی شراب سے لطف اندوز ہوتے۔ عورتیں اپنے ہاتھوں میں چاندی کی گھنٹیاں پکڑے انہیں رسیلے نغمات سناتیں۔ شاعر اور مصور کسی زمانے میں اعلیٰ پایہ کی تخلیقات تراشتے تھے لیکن اب اکثریت محنت سے جی چرانے لگی تھی۔ جنگی ہتھیاروں میں بھی جدت ختم الفریب تھی۔ جنگی مشینوں کے نام پر پرانے رتھ تھے جنہیں کم از کم بیس گھوڑے کھینچ پاتے۔ کڑی کمانوں اور منجنیقوں کا بھی یہی حال تھا۔ کمانیں دس افراد مشکل سے کھینچ پاتے اور منجنیقوں کی جسامت اس قدر بڑی کہ دو سو آدمی ان بڑی رسیوں کو کھینچا کرتے۔ ختا کی ان کمزوریوں کے متعلق تقریباً سترہ سو سال قبل ہی ایک سپہ سالار نے تنبیہ کر دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ فوج پر حکمرانی کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ اس ادارہ کو سلطنت کی طرح چلانے سے تباہی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ فوج کے اندرونی حالات اور میدانِ جنگ میں ان کی ضروریات و نفسیات سے آگاہی حاصل نہ کی جائے تو یہ عظیم اجتماع معذوری کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ سپاہیوں میں بے چینی اور انتشار پھیل جاتا ہے۔ ختا کی حقیقی کمزوری اس کا شہنشاہ ہی تھا جو خود تو 'ین کنگ' میں ٹھاٹ سے رہتا اور سپاہی سپہ سالاروں کے رحم و کرم پر ہوتے۔ اب ان کا مقابلہ کرنے کو بی سے چنگیز خان آ رہا تھا جس کی جنگی جبلت اس کی سب سے بڑی رہنما تھی۔ اس کی فراست و ہوشیاری کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی مہم سر کرنے سے پہلے وہ اپنے ذہن میں مبینہ علاقہ کا پورا نقشہ بنا کے ہی کوئی قدم آگے بڑھاتا۔ اس نے دیوارِ چین کو کئی مقامات سے دیکھ رکھا تھا۔ اسے مٹی اور فصیل کی ساخت کا بھی اچھی طرح علم تھا۔ دروازوں کے برج، دیوار کی چوڑائی کا اندازہ چھ گھوڑوں کے سینہ بہ سینہ چلنے سے اس نے خود ہی اخذ کیا تھا۔

ختا کے کروڑوں باشندوں کے سامنے اپنے اڑھائی لاکھ جنگجو لے جانے کا خیال بظاہر حماقت محسوس ہوتا تھا لیکن چنگیز خان کچی گولیاں کھیلنے نہیں جا رہا تھا۔ کچھ عرصہ قبل تاجدار زریں کو جنوب میں واقع 'دریائے جنگ سی' کے پار ایک پرانے دشمن خانوادے 'سانگ' سے حتمی لڑائی درپیش تھی۔ شان و شوکت کا تو محض بھرم ہی قائم تھا۔ ماضی قریب میں دیوارِ چین کے پار خانہ بدوشوں سے خراج وصول کرنے والا یہ خاندان درون خانہ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اب خانہ بدوشوں کے حملے ٹالنے کے لیے چاندی، منقش چمڑے، غلے، شراب، کچے ریشم اور ترشے ہوئے جیڈ قافلوں کی صورت میں بطور تحفہ بھیجے جاتے۔ اس صورتِ حال کا غیر جانبداری سے تجزیہ کیا جائے تو شاہی خاندان تحائف کے روپ میں خراج ہی ادا کر رہا تھا۔ چنگیز خان اس ساری کشمکش سے آگاہ تھا اسی لیے اس نے تاجدار زریں کی دریائے جنگ سی کے پار لڑائی میں اسی کے مطالبہ پر شہسوار بھیج دیئے۔ اس کے ارسال کردہ یہ تو مان درحقیقت ختا کے اندرونی معاملات کی جاسوسی کرتے رہے تھے۔ ان میں خانہ بدوشوں کی ایک اور صفت بھی بدرجہ اتم موجود تھی کہ وہ کسی بھی سرزمین کا نقشہ کبھی فراموش نہ کر پاتے۔ ختا کا مکمل جغرافیہ ان کے ذہنوں میں نقش ہو چکا تھا۔

چنگیز خان کے ذہن میں بھی گویا شطرنج کی بساط بچھ چکی تھی۔ ارخانوں کی واپسی اور مکمل معلومات حاصل کر لینے کے بعد اس نے پہلے 'ہیا' کے علاقہ میں پیش قدمی کی۔ ہیا کے سردار اس عفریت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انہوں نے 'لہو کے رشتے' سے صلح کی توثیق کرنے کی حامی بھر لی اور اس مقصد کے لیے شاہی خاندان کی ایک عورت کو چنگیز خان سے شادی کے لیے روانہ کر دیا۔ ہیا سے نئے حلیف ملتے ہی اس نے اپنے لشکروں میں نئے اہلکار بھرتی کر لیے۔ اس کی قسمت بھی بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اسی دوران ختا کا شہنشاہ زندگی کی بازی ہار گیا۔ اس بار تخت نشینی دراز قامت، گھنی داڑھی کے مالک، مصوری اور شکار کے شوقین بیٹے کا نصیب بنی۔ اس نے اپنے لیے 'وائی وَنگ' کا خطاب اختیار کیا اور اقتدار سنبھالتے ہی اپنی سابقہ روایات زندہ کرتے ہوئے ایشیائے بلند کے علاقوں سے خراج وصول

کرنے کے لیے افسران بھیج دیئے۔ چنگیز خان کے پاس جب شاہی نمائندہ پہنچا تو اس نے کسی بھی ادب کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر شاہی فرمان پکڑ لیا۔ روایات کے مطابق اسے فرمان تھامتے ہی جنوبی سمت میں سر تسلیم خم کرنا تھا لیکن چنگیز نے تھوکتے ہوئے دائی ڈنگ کو احمق، غبی اور نااہل قرار دے کر اس نئے تاجدار زریں کو ایک عظیم لشکر کے استقبال کا عندیہ پہنچا دیا۔ شاہی نمائندہ واپس چلا گیا۔

جاڑے دبے قدموں رخصت ہوتے رہے۔ چنگیز خان کے لشکری تیروں کی تیاری کے ساتھ گھوڑے بھی جمع کرتے رہے۔ خود چنگیز نے ختا کے شمالی علاقہ میں 'لیاؤ تنگ' کے باشندوں سے روابط بڑھا کر ان کی دیرینہ دشمنی کو ہوا دی۔ اس نے ختا پر قبضہ کے بعد لیاؤ تنگ کو شاہی منصب فراہم کرنے کے لیے خون سے معاہدہ کیا۔

چنگیز خان کا یہ اتحادی لشکر 1211 میں پوری قوت سے ختا پر ٹوٹ پڑا۔ اس موقع پر جبی نویان اور دیگر ارخانوں نے اپنی غیر معمولی یادداشت کے سہارے اس یورش کو بھرپور کامیاب بنایا۔ انہیں یہ علاقہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں جیسا ہی ازبر تھا۔ چنگیز خان کے لیے بڑے پیمانے پر پہلی جنگ تھی جس میں دوطرفہ توازن یکساں تھا۔ پہلی یورش میں منگولوں کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ مغربی دربار والے شہر کے محاصرہ میں چنگیز بھی زخمی ہوا۔ اس نے لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا۔

موسم خزاں کی آمد ہو چکی تھی۔ تازہ گھوڑوں، خوراک اور دیگر ضروریات اشیاء کے لیے بھی واپسی ضروری تھی۔ اگلا حملہ پہلے سے بھی بھرپور قوت سے کیا گیا۔ تین مختلف مقامات سے ختا پر دھاوا بولا گیا۔ جنوبی سمت سے چنگیز کے تین بیٹوں نے صوبہ شانسی کے آر پار ایک چوڑی پٹی کاٹی۔ شمالی جانب سے جوجی 'خنگان' کا سلسلہ عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا اور قلب میں چنگیز خان ین کنگ کے عقب میں بڑے سمندر کے کنارے تک پہنچ گیا۔ ان تینوں لشکروں کی پیش قدمی بالکل انوکھی تھی۔ یہ لشکر ایک دوسرے سے الگ تھے۔ انہوں نے مکمل حکمت عملی سے طاقتور ترین شہروں کا محاصرہ کیا۔ قلعوں پر حملہ کرنے سے قبل قریبی دیہاتوں سے مقامی افراد کو گرفتار کیا گیا۔ ان کی آڑ میں ہونے والا حملہ کامیاب رہا۔ فصیل کے اندر موجود ختائی باشندے اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر دروازے کھول دینے پر مجبور ہو جاتے۔ اس کے بعد انہیں علم ہوتا کہ اصل تباہی تو مقامی افراد کو یہاں لانے سے قبل ہی برپا ہو چکی ہوتی۔ فصلوں کو کچلنے اور جلانے کے بعد ریوڑ ہنکا دیئے گئے ہوتے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کے ٹکڑے کر کے ادھر ادھر پھینکے جا چکے ہوتے۔ اس ہولناکی کے بعد کئی ختائی سپہ سالار اپنی افواج کے ساتھ منگول لشکر کا حصہ بن گئے۔ اس ہیبت ناک جنگ میں گوبی نے ان وحشی قبائلیوں سے بھی اپنا خراج وصول کیا تھا۔ طویل جدوجہد سے گھوڑے لاغر ہونے لگے۔ سپاہیوں میں بھی امراض پھیلنے لگے۔ ین کنگ کی فصیلوں کے قریب خیمہ میں موجود چنگیز خان لحہ بہ لحہ صورت حال سے آگاہ ہو رہا تھا۔ اس نے تاجدار زریں کو نیا پیغام بھجوا دیا۔

''اس لڑائی سے تمہارے ہوش تو ٹھکانے آگئے ہوں گے۔ دریائے ہوانگ ہو کے سبھی شمالی صوبے اب میرے قبضہ میں ہیں۔ میں نے فی الوقت اپنے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا تم میرے افسران کو نذرانوں سے خوش کیے بغیر ہی واپس جانے دو گے؟''

چنگیز خان کے ان الفاظ کے عقب میں دہری چال پوشیدہ تھی۔ وہ دائی ڈنگ کی بے بسی سے محظوظ ہو کر اپنے سپہ سالاروں کی انا کو بھی تسکین دینا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے لشکر کی کوئی بھی کمزوری دشمن پر عیاں نہیں کر سکتا تھا۔ بعض چینی مشیر چنگیز خان کے اردو کی کمزوری سے کسی حد تک باخبر ہو چکے تھے۔ وہ اپنے شہنشاہ کو ین کنگ سے باہر نکل کر لڑائی پر اکسانے لگے لیکن تاجدار زریں اب ذہنی طور پر مغلوب ہو چکا تھا۔ اس کی قوت مزاحمت نابود ہونے لگی تھی۔ اس نے چنگیز خان کو پانچ سو جوان، پانچ سو کنیزیں، نفیس اور اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کا ایک ریوڑ، سونے اور ریشم کے تودے بطور نذرانہ بھجوا کر یہ عہد بھی کیا کہ اس کے حلیف 'لیاؤ شہزادوں' کو لیاؤ تنگ میں بالکل نہیں چھیڑیں گے۔ چنگیز خان کی انا محض ان نذرانوں سے تسکین نہ پا سکی۔ وہ انہیں مزید زک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس نے صلح کے عوض شاہی خاندان کی ایک عورت سے شادی کا مطالبہ کر دیا جسے پورا کرنے میں ہی مقابل نے عافیت سمجھی۔

اسی برس خزاں میں واپسی سے پہلے صحرا کے کنارے قیدیوں کا ایک کثیر لشکر قتل کر دیا گیا۔ چنگیز خان کاریگروں، علماء اور فضلاء کے علاوہ کسی بھی قیدی کو زندہ رکھنے کے حق میں ہی نہ تھا۔ اس زمانہ میں بھی قیدیوں کو غلام بنا کر رکھنے کا رواج ... نہ تھا۔ اس کے علاوہ فاقہ کشی کے ستائے وہ قیدی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

برہنہ پا گوبی کی وسعتیں عبور کرنے کے بھی قابل نہ تھے لہٰذا انہیں آزاد کرنے کی بجائے پھٹے پرانے کپڑوں کی طرح اتار کر پھینک دینا ہی بہتر سمجھا جاتا۔ انسانی زندگی ان کے نزدیک بالکل بے وقعت تھی۔ ان کی اوّلین خواہش صرف زرخیز زمینوں کی ویرانی اور اپنے ریوڑوں کی چراگاہوں میں تبدیلی تھی۔ ختا کے بہت سے شہر زمین کے بالکل متوازی مسمار کر دیئے گئے تھے تا کہ کسی گھوڑے کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک جاتے ہلکی سی ٹھوکر بھی نہ لگ سکے۔

دائی دنگ سے ہونے والے اس نئے معاہدہ کے بعد بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حالات پرامن ہو جائیں گے اور دوطرفہ عہد نبھائے جائیں گے لیکن تاجدار زریں حماقت کی حد تک ہراساں ہو چکا تھا۔ وہ اپنے سب سے بڑے بیٹے کو ین کنگ میں چھوڑ کر جنوبی علاقوں میں فرار ہو گیا۔ تاجدار زریں کی اس حرکت نے عوام اور امراء کو بیک وقت مشتعل کر دیا۔ انہیں اپنے قومی وقار کی بحالی درکار تھی۔ قومی سطح پر مزاحمت اور جنون کی ایک بلند و بالا لہر اٹھی۔ ملک کا درمیانی طبقہ بھی فوج میں شامل ہو کر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ نتیجتاً منگول قوم کے محافظ دستوں اور چوکیوں پر حملے کیے جانے لگے۔ لیاؤتنگ کا صوبہ بازیاب کروانے کے لیے بھی نفری بھیجی گئی۔ حیران کن طور پر چینی فوج ناقابلِ یقین کامیابیاں سمیٹ رہی تھی۔ چنگیز خان کو اپنے جاسوسوں سے اس بغاوت کا علم ہوا تو اس نے مزید سفر کا ارادہ ترک کر کے واپسی کا فیصلہ صادر کر دیا۔ اس 'دھوکا دہی' نے چنگیز کی انا پر شدید ضرب لگائی تھی اور اب تاجدار زریں کے خاندان کی تباہی یقینی تھی۔ طویل محاصرہ اور پھر دوبدو لڑائی کے بعد ین کنگ کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ 'مقولی' نے فوری طور پر شہر بھر کا خزانہ اور جنگی ساز و سامان چنگیز خان کے پاس بھیج دیا۔ قیدیوں میں ایک دراز قامت لیاؤتنگ کا شہزادہ بھی تھا۔ اس کی ناف تک پہنچتی داڑھی اور صاف آواز کی وجہ سے چنگیز خان اس کی جانب متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''کیا نام ہے تیرا؟'' اس نے کروفر سے پوچھا۔

''ولیئی لیوچیت سائی۔'' وہ خوفزدہ ہوئے بغیر بولا۔

''کیا تو احمق ہے کہ اس شاہی خاندان کے لیے لڑتا رہا جو تیرے خاندان کا پرانا دشمن تھا؟''

''احمق نہیں...... وفادار ہوں۔ میرا باپ اور خاندان کے کئی افراد اس خاندان کے وفادار تھے تو میں ان سے غداری کیسے کرتا؟'' قیدی کے اس بے نیاز جواب پر چنگیز کی آنکھوں میں گہری چمک پیدا ہوگئی۔

''بہت فائدہ مند شخص ثابت ہوگا تو! وفاداری ہی مرد کی اصل شان ہوا کرتی ہے۔ آج سے تو میرے آدمیوں میں شامل ہوگا۔'' چنگیز نے اسے نوید سنائی اور چن خاندان سے غداری کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دے دیا۔

ختا کے خزانے سمیٹے وہ قراقورم روانہ ہوا تو بہت سے علماء بھی اس کے قافلہ میں شامل تھے۔ نئے صوبوں کی فوجی حکومت اور مزید کسی بغاوت سے نمٹنے کا ذمہ اب باضابطہ طور پر مقولی بہادر کے سپرد تھا۔ اس کی بہادری اور مہارت کی تعریف میں چنگیز خان نے اسے نو سفید یاکوں کی دموں والا مخصوص نشان بھی عطا کر دیا۔

☆☆☆

چن خاندان کے خاتمہ اور ختا پر اپنا پرچم لہرانے کے بعد چنگیز خان ایک بار پھر اپنی موروثی سرزمین اور بنجر بلندیوں کی طرف لوٹ آیا۔ اس نے اپنے اردو کے لیے صحرائی شہروں میں سے قراقورم (لفظی معنی کالی ریت) کا انتخاب کیا۔ قراقورم بنجر سرزمینوں کا دارالحکومت اور بے حد عجیب شہر تھا۔ ہواؤں کے جھکڑ شدید ہوا کرتے۔ گارے اور پھوس کی جھونپڑیوں میں کسی بھی سڑک کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ خوشحالی کا دور تھا۔ اصطبلوں میں گھوڑوں کے ریوڑ موجود رہتے۔ بڑے بڑے کھلیانوں میں قحط سالی سے نمٹنے کی غرض سے انسانوں کے لیے باجرہ و چاول اور گھوڑوں کے لیے چارے و گھاس کی صورت میں خوراک کا بھی وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ شمالی ایشیائی ملکوں کے سفیروں اور مسافروں کے لیے سرائے کثیر تعداد میں بن چکی تھیں۔ اس زمانہ میں جنوب سے عربوں اور ترکوں کی آمد ہونے لگی۔ ان سے معاملات طے کرنے کے لیے چنگیز خان نے ایک انوکھی راہ نکالی۔ اگر تاجر قیمتوں کے معاملہ میں بحث و مباحثہ کرتے تو وہ ان کا مال اسباب ہی ضبط کر لیتا اور اگر کوئی زیرک تاجر اپنا اسباب خود ہی ان کے حوالے کر دیتا تو وہ انہیں سامان تجارت سے بھی زیادہ قیمت کے انعام و کرام سے نواز دیا کرتا۔

مسافروں اور سیاحوں کے لیے الگ ہی اصول و ضوابط تھے۔ وہ اپنے ساتھ تحائف لانے کے پابند تھے۔ چنگیز خان سے ملاقات کے لیے بہت سے مراحل طے کرنے

پڑتے۔ تحائف جمع کروانے کے بعد اس روز کا محافظ دستے کا سردار انہیں دربار میں لاتا۔ ان کی اچھی طرح تلاشی لے کر مکمل نہتا کر دیا جاتا۔ خیمہ کی دہلیز اور رسیوں کو چھونے کی سختی سے ممانعت تھی۔ دوزانو بیٹھ کر ہی بات چیت ممکن ہوا کرتی۔ چنگیز کی مرضی کے بغیر ارد و سے واپسی ممکن ہی نہ تھی۔ نو وارد سیاح' تاجر اور مسافر اس عجیب وغریب دنیا میں چکرا کر رہ جاتے۔ یاسا کے قوانین پر چلنے والی یہ دنیا بلاچوں چرا چنگیز کا ہر حکم قبول کیا کرتی تھی۔ نظم وضبط کی پابندی حیران کن حد تک منظم تھی۔ چنگیز خان خود بھی کثیر العیال تھا۔ بورتائی کے علاوہ بھی اس نے ان گنت شادیاں کی تھیں۔ اولاد کے معاملہ میں بھی اس کے نظریات بالکل واضح تھے۔ وہ صرف بورتائی کے چاروں بیٹوں کو ہی اپنا وارث تسلیم کرتا تھا۔ ان کی تعلیم اور جنگی تربیت کے لیے وہ ذاتی دلچسپی لیتا۔ کہنہ مشق اساتذہ کی نگرانی میں انہیں کندن بنانے کے بعد چاروں کو 'ارلوق' (شاہین) کا خطاب دیا گیا۔ سب سے بڑا بیٹا جوجی 'میر شکار' تھا۔ چغتائی میر قانون وسزا' اوغدائی میر مشاورت اور تولی فوج کا سپہ سالار اعظم متعین تھا۔ زندگی دشمنوں پر جھپٹنے اور ریاستی معاملات درست کرنے میں بالکل من پسند ڈگر پر رواں تھی۔

قراقورم واپس آکر چنگیز نے تبت سے سمرقند تک کے وسیع کہستانی سلسلوں میں پھیلی کوشلوک سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد شمالی ایشیاء میں امن قائم ہو گیا۔ بغاوت ختم ہو چکی تھی۔ حالات کا یہ عالم تھا کہ خانہ بدوشوں کی اس سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی دلکش حسینہ اپنے ساتھ ڈھیروں سونا لیے تنہا بھی سفر کرتی تو اسے کسی قسم کا خطرہ یا مزاحمت درپیش نہ ہوتا۔ اس انتظامی بہتری سے چنگیز خان کی طبیعت اوبنے لگی۔ اسے سرمائی شکار میں بھی لطف نہ آتا۔ دل میں برسوں پرانی تمنا ایک بار پھر شدت سے کچلنے لگی۔ وہ اپنے دشمنوں کو کچل کر قدموں میں گرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ ان کا جنگی سامان اپنے قبضہ میں کر کے عورتوں کی آہ وفریاد سننے کی طلب موسیقی سے بھی دلکش تھی لیکن ان پرامن حالات میں دشمن تو نابود ہو چکے تھے۔ نئے دشمنوں کی کھیپ کہاں سے لائی جاتی؟ کسیلے دن اور بے کیف راتیں بسر کرتے چنگیز خان کو بالآخر نئی دشمنی کے اسباب میسر آ گئے۔ یہ دشمنی اور جنگ اسے ظلم' بربریت اور سفاکیت کا ایک کامل استعارہ بنانے والی تھی۔

☆☆☆

قراقورم میں مسلمان تاجروں کی آمد ورفت سے چنگیز خان مغربی سرحدوں کے سلسلہ کوہ سے پرے وادیوں سے شناسا ہوا۔ وہ اپنی نوعیت کے منفرد علاقے تھے۔ وہاں برفباری نہیں ہوتی تھی۔ دریا بھی ایسے جو منجمد نہ ہوتے۔ ان کی تہذیب وتمدن ختا کے شہروں سے بھی زیادہ قدیم تھے۔ تجارتی قافلوں کے ساتھ آنے والی آب دار تلواریں' زنجیر دار زرہیں' سفید کپڑے' سرخ چمڑے' عنبر' ہاتھی دانت' فیروزے اور لعل اس کی نظریں خیرہ کرنے لگتے۔ تجارت میں گہری دلچسپی رکھنے والے چنگیز خان کے لیے یہ مصنوعات اور ہتھیار دل للچانے کا سبب تھے۔ اس نے مغربی علاقوں میں تجارتی قافلے روانہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کا قریب ترین ہمسایہ خوارزم شاہ تھا۔ چنگیز خان نے اپنے قاصدوں کو پیغام دے کر روانہ کر دیا۔ یہی پیغام وجہ تنازعہ اور تاریخی قتل وغارت کا ابتدائیہ ثابت ہونا تھا۔

''میری جانب سے تہنیتی پیغام!

مجھے تیری قوت اور سلطنت کی شان وشوکت کا علم ہوا۔ میرے لیے تو ایک عزیز فرزند جیسا ہی ہے۔ تجھے بھی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے چین اور کئی ترک قوموں پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ میرا ملک سپاہیوں کے معاملہ میں نہایت زرخیز ہے۔ تو اسے چاندی کی کان سمجھ لے۔ نئے علاقوں کی مجھے فی الحال کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنی اور تیری رعایا کے درمیان تجارتی تعلقات بڑھانا چاہتا ہوں۔''

خوارزم شاہ کو اس پیغام میں اپنے لیے بہت توہین محسوس ہوئی۔ ایشیاء میں کسی کو اپنا فرزند کہنا باجگزاری کی علامت ہوا کرتی تھی۔ ترک ہونے کے باعث مفتوح ترک قبیلوں کا ذکر بھی بہت تکلیف دہ تھا۔ خوارزم شاہ کے سامنے قاصد نے چاندی کی سیخیں' قیمتی جیڈ' سفید اونٹوں کی اون کے لبادوں پر مشتمل تحائف رکھ دیئے لیکن وہ خط کے الفاظ سے ہی سنبھل نہیں پا رہا تھا۔

''کیا تم لوگ مسلمان ہو؟'' اس نے قاصدین سے پوچھا۔

''الحمدللہ!'' جواب ملا۔

''کون ہے یہ چنگیز خان؟ کیا واقعی اس نے چین جیسی قدیم تہذیب پر قبضہ کر لیا ہے؟''

''جی ہاں! اب وہی ان کے آقا ہیں۔'' قاصد نے سنبھل کر جواب دیا۔

www.pakistanipoint.com

''اس کی افواج کیسی ہیں؟ کیا وہ میری کثیر فوج کے ہم پلہ ہیں؟'' خوارزم شاہ کے اس سوال نے انہیں الجھن میں مبتلا کر دیا۔ وہ وقت بے حد نازک تھا۔ قاصدین کو اپنی جان بھی بچانی تھی۔ انہوں نے لمحاتی سوچ بچار کے بعد جواب دیا۔

''اس کے لشکر کا آپ سے کوئی مقابلہ نہیں۔''

خوارزم شاہ نے اس جواب سے مطمئن ہو کر باہمی تجارت کا معاہدہ کر لیا۔ کچھ عرصہ تک معاملات متوازن رہے اور پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مسلم سلطنت پر قہر در قہر ڈھانے کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ ان منگولوں کا ایک تجارتی قافلہ خوارزم شاہ کے مغربی سرحدی قلعہ 'اترار' تک پہنچا۔ قلعہ دار 'اینال' خوارزم شاہ کا رشتے میں ماموں تھا۔ بیش قیمت سامان دیکھ کر اس کی نیت میں کھوٹ آ گیا۔ اس نے فوری طور پر ایک منصوبہ تراش کر ان چار سو تاجروں کو گرفتار کر لیا اور خوارزم شاہ کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ منگولوں کے تجارتی قافلہ سے خطرناک جاسوس گرفتار ہوئے ہیں۔ محمد خوارزم نے اس معاملہ سے نمٹنے کی ذمے داری اینال کو ہی سونپ دی جس نے بلا تامل چار سو تاجروں کو موت کی نیند سلا دیا۔ چنگیز خان تک یہ خبر پہنچی تو اس کا طیش عود آیا۔ اس نے احتجاجی طور پر خوارزم شاہ کے پاس اپنے قاصد بھیج کر اترار کے قلعدار اینال کا مطالبہ کر دیا۔ وہ اسے قرار واقعی سزا دینا چاہتا تھا۔ خوارزم شاہ کو اس پیغام میں بھی اپنے لیے سبکی محسوس ہوئی۔ اس نے بلا سوچے سمجھے ان قاصدوں کا امیر قتل کرنے اور بقیہ افراد کی داڑھیاں نذر آتش کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

سوختہ چہرے لیے یہ قاصد جب واپس گوبی پہنچے تو چنگیز خان نے فوری طور پر اعلان جنگ کر دیا۔ اس نے خوارزم شاہ کو پیغام بھجوایا۔

''آسمان پر دو سورج اور زمین پر دو خاقان نہیں رہ سکتے۔ تو نے جنگ کا انتخاب کر لیا ہے۔ جنگ تو میری لونڈی ہے۔ مجھے اس کے بدن سے لطف اندوز ہونے میں بڑا سرور ملتا ہے۔''

جنگ کی تیاری دونوں اطراف میں شروع ہو گئی۔ چنگیز خان کو فی الفور دو مسائل درپیش تھے۔ ختا پر لشکر کشی کے وقت تو وہ اپنے سبھی صحرائی حلیف ساتھ لے گیا تھا لیکن اس بار ایسا ممکن نہیں تھا۔ کئی برس کے لیے فتح شدہ سلطنت چھوڑ کے جانا خطرات سے خالی نہ تھا۔ اس کا حل چنگیز خان نے یہ نکالا کہ ان افراد کی فہرست بنائی جو اس کی عدم موجودگی میں کوئی بھی شورش برپا کر سکتے تھے۔ ایک قاصد چاندی کی تختی پر درج شدہ حاضری کا حکم نامہ لیے ان کے پاس گیا۔ ان معززین کو اپنے ہمراہ لے جانے کی حتمی ہدایات دے کر اس نے اپنے ایک بھائی کو قراقورم کا گورنر بنا کر انتظامی معاملات سونپ دیئے۔ اس کے بعد مغربی علاقوں کی طرف کوچ بھی بہت سنگین مسئلہ تھا۔ اڑھائی لاکھ سپاہیوں کا اردو 'جھیل بیکال' سے وسط ایشیاء کے بلند و بالا کہساروں کے پار کس طرح سفر کرتے؟ اس مسافت کا اب بھی فضائی فاصلہ دو ہزار میل کے لگ بھگ ہے۔ منگول سپاہیوں کی جفاکشی' تنومندی اور اہلیت پر اعتماد کے باوجود خدشات تو اپنی جگہ برقرار تھے۔

انہی تیاریوں' خدشات اور تجاویز میں 1219ء کا موسم بہار طلوع ہو گیا۔ چنگیز خان کے حکم پر اردو جنوب مغرب میں واقع ندی کے کناروں کی چراگاہوں میں جمع ہو گیا۔ مختلف تومان اپنے سپہ سالاروں کی قیادت میں بالکل منظم نظر آ رہے تھے۔ ہر ایک سوار کے جلو میں پانچ گھوڑوں کا منظر بھی دیدنی تھا۔ مویشیوں کے بڑے گلے چراگاہوں میں ہانک دیئے گئے تاکہ وہ گرما کی ہری بھری گھاس کھا کر تازہ دم ہوتے رہیں۔ اس کے بعد سپہ سالار اعظم تولی کی آمد ہوئی اور خواں کے آغاز میں قراقورم سے چنگیز خان بھی آ گیا۔ اس نے اپنی آمد کے بعد سلطنت کی عورتوں کو اکٹھا ہونے کا فرمان جاری کر دیا۔ خواتین بھی اپنے 'بوگدو' کا خطاب سننے کے لیے بے تاب تھیں۔

''ہتھیار سنبھالنا تمہارا کام نہیں ہے لیکن تمہارے ذمے فرائض کی اہمیت بھی جھٹلائی نہیں جا سکتی۔ تمہیں پورتوں میں بہترین انداز میں خانہ داری کرنی ہوگی۔ لڑائی سے واپس آنے والے سپاہیوں' قاصدوں اور مسافر سرداروں کو شب بسری کے لیے آرام دہ' صاف ستھری جگہ اور بہترین کھانا میسر ہونا چاہیے۔ ایک بیوی اپنے سپاہی شوہر کی اسی طرح عزت کر سکتی ہے۔''

چنگیز خان کی لشکر میں آمد کے بعد لشکریوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ مختلف اطراف میں گھومتا پھرتا ہر ایک معاملہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ درختوں کے ایک گھنے جنگل سے گذرتے ہوئے اسے صنوبر کا جھنڈ نظر آیا۔ وہ بلا ارادہ وہیں رک کر چند لمحوں کے لیے درختوں اور زمین کا جائزہ لیتا رہا اور یکدم کہنے لگا۔ ''یہ جگہ ہرنوں کے شکار کے لیے

www.paksociety.com

بہت اچھی ہے اور بوڑھے کے آرام کے لیے تو انتہائی مناسب ہے۔''

چنگیز کی اس بات پر ہمراہی چونکے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے گہری نظروں سے اس چھپن سالہ شخص کا جائزہ لیا جس کے چوڑے چہرے پر اب جھریاں مکین بن چکی تھیں۔ اس کی سخت جلد، لمبی آستینوں والا چرمی لبادہ، طلائی پٹیوں سے بنا کمر بند، اوپر کی طرف اٹھی ہوئی باز کے پروں پر مشتمل سفید سموری ٹوپی، دونوں کانوں پر لہراتی سرخ کپڑے کی جھنڈیاں دیکھ کر 'بوگدو' سے کم لفظ ذہن میں آتا ہی نہیں تھا۔ اس ناقابل شکست اور آہنی اعصاب کے حامل شخص کی زبان سے ایسے الفاظ سننا یقیناً ایک حیران کن بات ہی تھی۔ ان ساتھیوں کے ذہن میں پنپتا ہر خدشہ اگلے ہی لمحہ رفع ہو گیا۔ چنگیز خان اردو کے مختلف دستوں کا معائنہ کرنے چل دیا تھا۔ اردو کے افسران اب اس کی مکمل توجہ کا مرکز تھے۔

''تم سب میرے ساتھ اپنی زور آزمائی سے اس شخص کو نیچا دکھانے جا رہے ہو جس نے ہماری توہین کی ہے۔ اس کا گھمنڈ توڑنے کی فتح میں تم سب میرے ساتھ شریک ہو گے۔ فتح ہمیشہ نظم و ضبط اور اطاعت سے ملتی ہے۔ سردار خواہ دس سپاہیوں کا ہو یا دس ہزار کا۔ اس کی اطاعت سے غفلت کرنے والا اسی وقت موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اس کی عورتیں اور بچے بھی سسک سسک کر مریں گے۔''

اس کا سرد لہجہ، سفاک انداز ہر ایک کے لیے واضح تنبیہہ تھی۔ سپاہی اپنے گھوڑوں، چمڑوں کی زرہوں، کمانوں، ڈھالوں اور تیروں کے ساتھ بالکل پُرعزم اور توانا تھے۔ سفر کے آغاز میں مشکلات بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ آبی راستوں کو گزرگاہیں بنا کر محفوظ رستے تلاش کیے جاتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد سرما کی شدت سے دریا منجمد ہو گئے تو برف کے اوپر سے ہی انہیں عبور کیا جانے لگا۔ جوجی کے زیر کمان دستے جنوبی سمت مڑ گئے۔ انہیں سات ہزار فٹ بلند دروں سے گذر کر نشیب میں اس شمالی شاہراہ 'پی لو' تک جانا تھا جو 'طیان شان' کے آگے ہے۔ چنگیز خان کے اردو کا مرکزی حصہ مغربی سمت رواں دواں تھا۔ اسے دروں اور گھاٹیوں سے اترنے کے بعد منجمد جھیلوں کو طے کر کے 'درہ زنگاریہ' تک پہنچنا تھا۔ سردی کی شدت ان کے لیے بہت بڑا امتحان ثابت ہو رہی تھی۔ موسم کی ہولناکی کا یہ عالم تھا کہ درے میں پھنسنے والا کوئی بھی ریوڑ وہیں منجمد ہو کر یخ ہو جاتا۔ زیادہ تر مویشی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ انہیں بطور غذا استعمال کیا جاتا رہا۔ چارے کا ذخیرہ ختم القریب تھا۔ چھکڑے پیچھے چھوڑنے پڑے۔ صرف چند سخت جان اونٹ ہی ہمراہ رہ گئے تھے۔ اس طوفانی درے کو عبور کرنے میں دو لاکھ سپاہیوں نے بہت ہمت کا مظاہرہ کیا۔ وہ برفباری میں بھیڑوں کی کھالیں یا چمڑے اوڑھ کر سو جاتے۔ غذا نہ ملتی تو گھوڑے کی فصد کھول کر تھوڑا سا خون پیتے اور پھر رگ کو دوبارہ ٹانکے لگا دیئے جاتے۔ برف پگھلنے کے زمانہ تک وہ بارہ سو میل کا سفر طے کر چکے تھے۔ منزل قریب تر تھی۔ جنگلوں کے پار دنیائے اسلام کی سرحد تھی جسے روندنے کا خیال چنگیز خان کو ہواؤں میں اڑا رہا تھا۔ اس دنیا کے متعلق اسے اپنے مخصوص ذرائع سے بنیادی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ یہاں کے بہت سے معاملات متضاد تھے۔ اس دنیا میں صاحب سیف افراد رہتے تھے لیکن موسیقیت کے شیدائی بھی تھے۔ اندرونی کشمکش اور مصائب بے شمار تھے۔ صاحب ثروت لوگ تھے اور غلامی کا رواج تھا۔ سازشیں عروج پر تھیں۔ حکومتی عہدیداروں میں رشوت خوری اور خیانت کے جراثیم تھے۔ محصول جبری طور پر وصول کیا جاتا۔ عورتوں کا تحفظ خواجہ سراؤں کے سپرد ہوا کرتا۔ عسرت زدگان کو زکوٰۃ دی جاتی، صفائی و پاکیزگی کا خصوصی اہتمام کیا جاتا۔ روشن صحنوں میں مجالس منعقد کروائی جاتیں۔ اس دور میں مسلم دنیا کی عسکری قوت اپنے جوبن پر تھی۔ عربوں اور ترکوں نے باہمی اتحاد سے نصرانی زرہ پوش لشکر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ نصرانی مغربی دنیا سے یروشلم حاصل کرنے کے لیے کئی بار حملے کر چکے تھے لیکن اب ان کی طاقت ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ارض مقدس کے ساحلوں تک واپس دھکیل دیئے گئے تھے۔ ایشیائے کوچک کا بڑا حصہ بھی اب مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ بغداد میں عباسی خلفاء امیر المومنین کہلاتے اور شان و شوکت سے زندگی بسر کرتے۔ شاعری و موسیقی کا دور دورہ تھا۔ زمین زرخیز تھی۔ پہاڑ سرسبز درختوں سے ڈھکے تھے۔ ان پہاڑوں سے نکلنے والی ندیاں صحرائی رہت اور مٹی کو سیراب کر کے افراط سے غلے اور میوے اگاتیں۔ اسلحہ سازی بے مثال تھی۔ ان کی تلواریں لچکدار ہوتی تھیں۔ ڈھالوں پر نقرئی کام ہوتا۔ زرہیں زنجیردار اور ہلکے خود فولاد سے بنتے۔ ان کی سواریاں تیز رفتار اعلیٰ نسل کے گھوڑے ہوتے لیکن وہ جلد ہی تھک بھی جاتے۔ ان کی تفریحی سرگرمیوں میں شاعری، نغمات، موسیقی، لذیذ شراب، چوسر، شطرنج، شکارگاہ، شہباز، تیز چیتے، چوگان، دربار، میدانِ جنگ،

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ضیافتیں، گھوڑے اور ہتھیار تھے۔ اس کے علاوہ اپنے پروردگار کی حمد وثناء اور عبادت بھی خشوع وخضوع سے کرتے۔ چنگیز خان کو ان کے تصورِ عبدیت سے ہی خصوصی دلچسپی تھی۔ یہ تصور درحقیقت اس کے لیے بہت انوکھا تھا۔ اس مسلم دنیا کے قلب میں علاؤالدین محمد خوارزم شاہ امیر جنگ تھا جس کی سلطنت ہندوستان سے بغداد اور بحیرہ خوارزم سے خلیج فارس تک وسیع تھی۔ خوارزم شاہ ایک تورانی سپاہی تھا جس کی جبلت ہی عسکریت تھی۔ اس کے پاس چار لاکھ خوارزمی ترکوں پر مشتمل فوج قلب میں تھی۔ ایران سے بھی فوج بوقت ضرورت طلب کرلی جاتی۔ اس کے شہروں کا تمدن خیرہ کن تھا۔ چنگیز خان اسی شان وشوکت کو دیکھنے اور اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے بے تاب تھا۔

☆☆☆

خوارزم شاہ منگولوں سے پہلے ہی میدانِ جنگ میں پہنچ گیا۔ ہندوستانی فتوحات کے بعد اب وہ قدرے تازہ دم تھا۔ اس کا پہلا ٹکراؤ جبی نویان کے کچھ ہراول دستوں سے ہوا۔ یہ سمور پوش خانہ بدوش اوران کا ساز وسامان اس کے لیے کافی انوکھا تھا۔ باقاعدہ جنگ شروع ہوئی تو وہ ان کی بہادری دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اسے ابھی تک ایسے دشمن اور مہارت سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ منگولوں کا ہراول دستہ قتل وغارت کرتا ترکوں کے قلب تک پہنچ گیا۔ اس روز موت خوارزم شاہ سے محض ایک تیر کے فاصلے پر تھی۔ محافظ دستے نے سرتوڑ کوشش سے اس کی جان بچالی۔

دوسری جانب ایسی ہی صورتِ حال جوجی کو بھی درپیش آئی۔ اس کی زندگی بچانے کا سبب ایک ختائی شہزادہ بنا۔ منگولوں نے قلب کے بعد میمنہ اور میسرہ میں بھی خاصی تباہی برپا کی لیکن ان کی بدقسمتی یہ رہی کہ خوارزم شاہ کے ولی عہد اور خوارزمیوں کے محبوب شہزادہ جلال الدین کے جوابی حملہ نے انہیں پسپائی پر مجبور کردیا۔ شام ہونے تک حریف سوار الگ ہوگئے تھے۔ رات کو منگولوں نے اپنی روایتی چالبازی کا مظاہرہ کرکے اس وادی کی گھاس کو نذرِ آتش اور خیموں میں الاؤ بھڑکا کے مسلم فوج کو اپنی موجودگی کا بھرپور تاثر دیا لیکن خود تازہ دم گھوڑوں پر سوار ہوکر اس قدر برق رفتاری سے واپس گئے کہ دوروزہ مسافت اسی ایک رات میں طے کرلی گئی۔

اس پہلی جنگ میں مسلم فوج کا نقصان خاصا دلبرداشتگی کا سبب تھا۔ خوارزم شاہ بھی ان کی بہادری اور مہارت سے کافی متاثر ہوا۔ چنگیز خان اپنے قاصدین کی زبانی ہر ایک معرکہ سے آگاہ ہورہا تھا۔ اس نے خوارزم شاہ کا تعاقب ہر قیمت پر جاری رکھنے کا حکم جاری کردیا۔ جوجی کے لیے مزید پانچ ہزار منگول بھیجے گئے۔ خوارزم شاہ بلند و بالا کہساروں سے اتر کر شمالی دریائے سیحون کی جانب مڑ چکا تھا، وہ سیحون کے عقب میں پڑاؤ ڈال کر منگولوں کا انتظار کرنے لگا لیکن اس کی توقع کے برعکس جوجی کی بجائے جبی نویان پہاڑ عبور کرکے خاموشی سے اس کے سر پر چلا آیا۔ شمال میں چنگیز کے دو بیٹے سیحون کے کنارے اترار کے شہر تک پہنچ گئے۔ قلعہ ارکوان وحشی قبائلیوں سے رحم کی کوئی توقع نہ تھی۔ اس نے اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ بندی کو ترجیح دی۔ اگلے پانچ ماہ تک وہ محصور ہوکر ہی لڑتا رہا۔ منگولوں کی جانب سے اس کا آخری سپاہی بھی قتل کردیا گیا تو وہ ایک برج میں روپوش ہوکر تیراندازی کرتا رہا۔ تیر ختم ہوئے تو اس نے سنگباری کا سہارا لے لیا۔ سخت مزاحمت کے بعد اسے زندہ گرفتار کرکے چنگیز خان کے سامنے لے جایا گیا۔

''اس شخص کی گردن پر میرے چار سو آدمیوں کا خون ہے۔ اس کے کانوں اور آنکھوں میں پگھلی ہوئی چاندی ڈال کر جان سے مار دو اسے۔ اس قلعہ کی فصیلیں گرا کر زمین کے برابر کردو۔ آبادی کو گرفتار کرلو۔ ان کا فیصلہ بعد میں کروں گا۔'' اس لمحہ چنگیز خان کا سفاک انداز اس قلعہ دار کو جبر کی انتہا معلوم ہوا تھا لیکن اصل سفاکیت تو ابھی پردہ غیب سے ظہور میں آنی تھی جسے دیکھنے کے لیے اسے زندہ ہی نہ رہنا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ منگولوں اور خوارزم شاہ کا ٹکراؤ مختلف مقامات پر جاری رہا۔ اسی دوران چنگیز خان کو خوارزم شاہ کے 'بخارا' میں ہونے کی اطلاع ملی۔ وہ ناقابل یقین رفتار سے تعاقب میں لپکا لیکن وہاں پہنچ کر علم ہوا کہ خوارزم شاہ فرار ہوچکا ہے۔ دشمن سے توجہ لمحہ بھر کے لیے ہٹی تو چنگیز خان کو اپنے سامنے عظیم الشان تمدن کا حامل شہر نظر آیا۔ بخارا مدارس کا مرکز تھا۔ اس کے اطراف میں فصیل کا طول ہی بارہ فرسخ تھا۔ اس کے درمیان بہنے والی خوشنما نہر کی خوبصورتی، کناروں پر واقع باغ اور قصر دنگ کردیتے تھے۔ یہ شہر۔ بے شمار اماموں، سیدوں، فقہاء، علماء اور مفسرین کا مسکن تھا۔ بیس ہزار ترک اور ہزارہا کا ایک دستہ حفاظت کے لیے مامور تھا لیکن فی الوقت وہ خوارزم شاہ سے ملنے کے

www.pakistanipoint.com

لیے آمودریا کی طرف کوچ کر گئے تھے۔ منگولوں نے بھی ان کی روانگی میں خلل نہ ڈالا۔ شہر کے بزرگوں' قاضیوں اور اماموں نے باہمی مشورہ سے چنگیز خان سے مل کر شہر کی کنجیاں اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا تاہم ان کا کوئی بھی قدم وہ یادگار تباہی برپا ہونے سے نہ روک سکی۔

منگول سوار کسی سیلابی ریلے کی طرح شہر کی سڑکوں پر امنڈ آئے تھے۔ غلے کے گودام اور ذخیرے لوٹ لیے گئے۔ کتب خانے گھوڑوں کے اصطبل بنا لیے گئے۔ قرآن پاک کے صفحات گھوڑوں کے سموں تلے روندتے دیکھ کر مسلمان بے بسی محسوس کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکے۔ چنگیز خان نے اپنا گھوڑا جامع مسجد کے سامنے روک لیا۔

''کیا یہی تمہارے شہنشاہ کا گھر ہے؟'' اس نے ہجوم سے دریافت کیا۔

''ہاں! یہ خانہ خدا ہے۔ یہاں دونوں جہانوں کے شہنشاہ کی عبادت کی جاتی ہے۔'' ایک عالم نے جواب دیا۔

چنگیز خان اس جواب پر زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے گھوڑا زینوں پر دوڑاتے مسجد کے اندر پہنچ گیا۔ منبر پر قرآن پاک کا ایک بہت بڑا نسخہ موجود تھا۔ چنگیز اپنے گھوڑے سے اتر کر منبر پر چڑھ گیا۔ سیاہ منقش چمڑے کی زرہ اور خود پہنے اس شخص کو دیکھ کر مسلمان حیرت سے بے حال تھے۔ ان کے دل و دماغ میں ایک ہی سوچ تھی کہ اس شخص پر آسمان سے آگ کیوں نہیں برس رہی؟ زمین شق ہو کر اسے نگل کیوں نہیں رہی؟

ان کی کیفیات کو نظر انداز کرتے ہوئے چنگیز خان نے اپنی فوج کے لیے غلے اور چارے کا انتظام کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔ اس کے بعد وہ مسجد سے شہر کے اس چوک میں پہنچا جہاں خطیب عوام کو فلسفہ اور فقہ کا درس دیا کرتے تھے۔ اس کی دید اور انداز و اطوار عوام کو ہولا رہے تھے۔ وہ اس عجیب الہیت شخص کو اپنے لیے خدا کا عذاب سمجھ رہے تھے۔ اس شخص کے نظریات اس کی ہیئت سے بھی زیادہ ہولناک تھے۔ وہ ان کے سامنے منبر پر کھڑا ہو کر حج بیت اللہ کو باطل قرار دے رہا تھا کیونکہ اس کے خیال میں نیکیوں جاودانی طاقت ایک جگہ نہیں بلکہ ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ وہ نہایت گھمنڈی انداز میں خود کو جاودانی آسمان کا قہر' آسمانی ضرب اور دنیا کے ہر مذہب کے ہر ایک شہنشاہ کو نابود کر دینے کے عزائم کا اظہار کر رہا تھا۔ چنگیز خان خود تو اس شہر میں دو گھنٹے تک ہی مقیم رہا لیکن بعد ازاں اس کی فوج نے یہاں تباہی کی عبرتناک داستانیں رقم کیں۔ قلعہ سر کر لینے کے بعد زر و جواہر کی تلاش میں شہر بری طرح ادھیڑ کر رکھ دیا گیا۔ شہری آبادی گھسیٹ کر میدان میں جمع کر لی گئی۔ ہر جانب مردوں' عورتوں اور بچوں کی آہ و زاری تھی۔ عورتوں کی سر عام سب رشتہ داروں کے سامنے آبروریزی کی گئی۔ مزاحمت کار مردوں کو بھیانک موت کا تحفہ دیا جاتا رہا۔ شہر کے مختلف حصے نذر آتش کر دیئے گئے۔ ہر جانب شعلوں کا رقص تھا، دھوئیں کے بادل اس قدر کثیف تھے کہ سورج روپوش ہو گیا۔ قیدیوں کو سمرقند کی جانب ہنکا دیا گیا۔ بخارا کے بعد سمرقند کی شان و شوکت تاراج ہوئی تھی۔ یہ شہر خوارزم شاہ کے مستحکم علاقوں میں سے ایک تھا۔ یہاں بھی منگولوں کی وحشت کا مقابلہ نہ کیا جا سکا جھڑپوں میں ہونے والا نقصان محصور فوج کو لحہ بہ لحہ بری طرح دل شکستہ کر رہا تھا۔ بالآخر چنگیز خان ایک روز فصیل ڈھانے میں کامیاب ہو گیا۔ شہر کے قاضی اور امام نے شکست تسلیم کر کے کنجیاں ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تیس ہزار مقامی افراد اپنی مرضی اور خوشی سے منگول لشکر میں شامل ہونے کے لیے پیش ہو گئے۔ چنگیز خان نے اولاً ان کا بہت خوشدلی سے استقبال کیا۔ انہیں منگول وردیاں بھی عطا کی گئیں اور اگلے ہی روز انہیں نہایت اہتمام سے قتل کر دیا گیا۔ سابقہ مالکان سے وفاداری نبھانے میں ناکام افراد اس کے لیے کچرے کے ڈھیر سے زیادہ اہم نہ تھے۔ بیسیوں میل تک باغوں' نہروں' بہتے چشموں' تالابوں سے گھرا وہ دلکش مقام آگ و خون سے آلودہ کر دیا گیا۔ اس کے رہائشیوں نے بھی اپنی زندگی کے عبرتناک شب و روز میں ناقابل بیان اذیت جھیلی۔ ان کے لیے بھی چنگیز خان کے دیئے گئے ان زخموں کا کہیں کوئی درماں نہ تھا۔

☆☆☆

1220 (منگول جنتری کے مطابق سال مار) کا آغاز ہو چکا تھا۔ چنگیز خان کی خوارزم شاہ سے متعلق کوئی بھی خواہش مکمل نہیں ہو پا رہی تھی۔ ابھی تک اس کا براہِ راست مقابلہ ہوا تھا' نہ ہی گرفتاری ممکن ہو سکی تھی۔ محمد خوارزم شاہ سمرقند سے بلخ اور پھر ویران سرزمینوں سے ہوتا ہوا شمالی ایران کے پہاڑی سلسلے عبور کر کے نیشاپور پہنچ گیا۔ چنگیز خان کے بھیجے گئے سپہ سالار اس کے تعاقب میں تھے۔ اس کے لیے کہیں بھی کوئی عافیت نہ تھی۔ وہ شدت سے کسی ایسے مقام کی تلاش میں تھا جہاں ان وحشی سپاہیوں

Masood Azeem
www.pakistanipoint.com

سے روپوش ہوکر اپنی ہمت اور لشکر مجتمع کرسکے لیکن بے سود۔ وہ درماندگی اور بے چارگی کی انتہا پر تھا۔ بھیس بدل کر پہاڑوں کے دروں اور گھاٹیوں سے ہوتا 'بحیرہ خزر' کی مغربی ساحلی آبادی میں پہنچ گیا۔ جامع مسجد میں نماز کی ادائیگی کے دوران اسے پہچان لیا گیا۔ مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ ایک مقامی مسلمان نے ماضی میں ہونے والے نقصان اور چپقلش کے باعث اس کی مخبری کردی۔ منگولوں نے تعاقب کرتے ہوئے اس کی کشتی پر تیراندازی کی لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ چنگیز خان کسی آسیب کی طرح اس کی زندگی نگلنے کے در پے تھا۔ اسے خوارزم شاہ کسی بھی قیمت پر زندہ یا مردہ درکار تھا۔ اس عفریت سے لڑتے بیماری اور مصائب سے چور ہوکر وہ ایسے عالم میں موت کی پُرسکون وادی میں داخل ہوا کہ کفن دفن کا بھی کوئی مناسب انتظام نہ تھا۔

اس دوران منگولوں کے لیے متواتر لشکرکشی ہرگز سہل ثابت نہیں ہوئی تھی۔ موسم گرما کی شدت نے ان کا حوصلہ خوب آزما رکھا تھا۔ چنگیز خان نے نشیبی میدانوں سے لشکر ہٹالیا۔ گوبی کے بلند میدانوں کی آب و ہوا کے پروردہ منگولوں کو ایسی جھلسا دینے والی سخت گرمی برداشت کرنے کی عادت ہی نہ تھی۔ چنگیز انہیں خشک پہاڑوں میں لے گیا۔ فوج کو مصروف رکھنے اور ان کی تنظیم برقرار رکھنے کے لیے شکار کھیلنا شروع کردیا گیا، یہ شکار بھی اپنی نوعیت میں بہت منفرد اور وحشیانہ تھا۔ زمین میں گھسنے یا چٹانوں کے درمیان کسی سوراخ میں چھپنے والے جانور کا تعاقب کرنے والے سپاہی پر لازم تھا کہ اسے کسی بھی نقصان کے بغیر باہر نکالا جائے۔ چنگیز خان اس سارے مرحلہ کی کسی نہ کسی طور خود نگرانی کررہا تھا۔ اس برس چار ماہ تک یہ مرحلہ جاری رہا۔ شکار میں فرحت انگیز لمحات بسر کرنے کے بعد چنگیز خان کو اپنے دشمن کی موت کی اطلاع ملی۔

خوارزم شاہ کی موت کو کڑوے گھونٹ کی طرح برداشت کرنے والے چنگیز کو اب اس کے غیر معمولی دلیر بیٹے جلال الدین کا سامنا تھا جو اپنے محدود وسائل کا بہترین استعمال کررہا تھا۔ خوارزم کے دارالحکومت ارگنج کی فتح کے بعد جلال الدین ان کے چنگل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس کی بھرپور کوشش تھی کہ عالم اسلام کو کسی بھی طرح اس ٹڈی دل لشکر کے خلاف متحد کرکے کاری ضرب لگا سکے۔ جلال الدین کی اس خواہش سے آگاہی کے بعد چنگیز خان نے بھی اپنے اردو کو پیش قدمی کرنے کا حکم دیا۔ اس مرتبہ وہ نقل وحرکت یا محض لوٹ کھسوٹ کی بجائے اطراف میں موجود بھی مسلم علاقوں میں مردوں کا قتل عام کرنا چاہتا تھا تاکہ جلال الدین کو زائد نفری اور مدد میسر نہ آسکے۔

چنگیز خان کے یہ وحشی ساتھی خراسان تک پہنچ گئے۔ ہر جانب ہراس اور ویرانی کا راج تھا۔ خراسان کی زرخیزی کو ملیامیٹ کرنے کے لیے اس نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے تولی کو سپہ سالار متعین کیا۔ اسے کسی بھی قیمت پر جلال الدین خوارزم کی تلاش تھی۔ اسی کشمکش اور جدوجہد میں تولی نے 'مرو' شہر میں قہر ڈھادیا۔ وہ بڑی تمکنت سے سنہرے تخت پر بیٹھ کر اپنے لشکریوں کے ہاتھوں ایرانی افسران کا قتل عام ہوتے دیکھتا رہا۔ ان افسران کے سر رعایا کے سامنے قلم کیے گئے۔ اس کے بعد عوام کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ مردوں کے ہاتھ پشت پر باندھ کر زمین پر لٹادیا گیا۔ ان تینوں گروہوں کو منگول لشکریوں کے حوالے کردیا گیا جو انہیں اپنی خواہش اور مزاج کے مطابق گلا گھونٹ کر یا ٹکڑوں میں تبدیل کرکے جان سے مارتے رہے۔ شہر بھر کے امراء کو بھیانک عذاب سے گذار کر ان کا مال و دولت ہتھیائے اور انہیں بھی عدم آباد روانہ کردیا۔ مرو شہر کی آبادی میں صرف چار سو افراد کی جان بخشی کی گئی تھی۔ یہ افراد وہ ہنرمند اور کاریگر تھے جن کی چنگیز خان کے اردو کو کافی ضرورت تھی۔ کچھ بچوں کو البتہ غلام بنا کے رکھنے کے لیے زندہ چھوڑ دیا گیا۔ خالی مکانات میں بھرپور لوٹ مار ہوئی۔ دیواریں زمین کے متوازی کردی گئیں۔ روانگی سے قبل انہیں علم ہوا کہ شہر میں ابھی پانچ ہزار مسلمان زندہ ہیں جو تہہ خانوں اور نالیوں میں روپوش ہیں۔ منگول سپاہیوں نے اپنے شکار کا تجربہ آزمایا اور ان پوشیدہ افراد کا کھوج لگا کر ایک بار پھر خون کی ندیاں بہادیں۔

مرو کے بعد اگلے شہروں میں بھی یہی قتل عام کیا گیا۔ کچھ افراد بظاہر مردہ بن کر لاشوں میں لیٹ کر جان بچانے لگے۔ اس کے بعد منگولوں نے قتل عام کے لیے سر قلم کرنے کا آغاز کردیا۔ ان کی ایذارسانی کے طریقوں کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ ایک مسخر اور مسمار شہر میں کچھ لوگوں کے زندہ بچ جانے کا شک ہوا تو کسی قیدی مؤذن کو مسجد کے مینار سے اذان دینے کا حکم دیا گیا۔ روپوش مسلمان یہ سوچ کر خوش ہوگئے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ وہ بے خوف ہوکر اپنی کمین گاہوں سے باہر نکلے اور بھیانک انجام سے بغلگیر ہوگئے۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

چنگیز خان کے حکم پر کسی بھی شہر کو مسمار کر دینے کے بعد نواح میں اناج کی فصلیں نذر آتش کر دی جاتیں تاکہ کوئی بھی روپوش فرد فاقوں سے مرنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر کسی شہر میں محاصرہ طویل ہو جاتا تو شہر کے پیچھے دریا پر بند باندھ کر اس کا راستہ ایسے انداز میں بدلتے کہ مکان اور دیواروں کے ملبے تک سیلاب کی زد میں آجاتے۔ چنگیز خان کی برپا شدہ یہ جنگ ہر اخلاقی حد سے متجاوز تھی۔ اس جنگ کا مقصد محض انسانوں کا فنا تھا۔ قتل عام سے عالم اسلام کا قلب کسی چٹیل میدان کا روپ اختیار کر چکا تھا۔ سلامت رہ جانے والے افراد زندہ لاشیں تھیں۔ اس قدر ظلم وتشدد اور جبر دیکھنے کے بعد ان کے حواس پتھرا چکے تھے۔ چنگیز خان ظلم وسفاکیت کا استعارہ بن گیا تھا۔ جلال الدین خوارزم شاہ کی تلاش اسے قریہ قریہ تعاقب پر مجبور کر رہی تھی۔

دوسری جانب نوجوان سلطان اپنی استطاعت سے بھی زیادہ جدوجہد میں مصروف تھا۔ اسے اس بات سے آگاہی تھی کہ وہ عالم اسلام کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو منگولوں سے نجات زیادہ کٹھن ثابت نہ ہوگی لیکن یہ یکجائی ہی تو سب سے مشکل مرحلہ تھی۔ باہمی سازشیں، نفرت اور جاہ طلبی مسلم ریاستوں کو متحد ہونے ہی نہ دیتیں۔ چنگیز خان نے بھی اپنے دستوں کو ایسی ہدایات دے رکھی تھیں کہ ہراول دستے جلال الدین کو سرحدی علاقوں میں ہی الجھائے رکھتے۔ چنگیز خان اپنے اس دشمن کو لشکر جمع کرنے کا کوئی موقع یا وقت نہیں دینا چاہتا تھا۔ 'ہرات' شہر میں بھی بربریت کی مثالیں رقم کرنے کے بعد گرما میں وہ اپنے اردو کا بڑا حصہ کوہ ہندوکش کی درختوں سے گھری بلندیوں میں لے گیا۔ لشکریوں کے لیے میدانی علاقوں کی گرمی برداشت کرنا بہت کٹھن تھا۔ وہ کئی امراض کا شکار ہو چکے تھے۔ یہاں پہنچ کر قیدیوں کو گندم کی کاشت پر مامور کر دیا گیا۔ اپنے وقت کے مستند قاضی، امراء، فقیر اور غلام سب ایک ہی صف میں شامل گوبی کے اس سفاک سردار کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔ وہ آبدیدہ نظروں سے اپنے ہی پامال شدہ درباروں کے ریشمی شامیانوں میں محو آرام منگولوں کو دیکھتے۔ ترک، اتابک اور ایرانی امراء کے فرزندان کی ساقی گری کرتے۔ دنیائے اسلام کی وہ خواتین جن کے سر کا ایک بال بھی کسی غیر مرد نے کبھی نہ دیکھا تھا اب اس پڑاؤ میں بے نقاب پھرتیں اور منگولوں کی ہر سفلی خواہش کی تکمیل کرنے پر مجبور ہوتیں۔ کاشتکاری پر مامور افراد کے پاس اپنی ستر پوشی کے لیے چند چیتھڑے بھی باقی نہ رہے تھے۔ دن بھر محنت مشقت کے بعد خوراک کے چند نوالے حاصل کرنے کے لیے انہیں منگول سپاہیوں کے پالتو جانوروں کے ساتھ چھینا جھپٹی کرنی پڑتی۔

ظلم وجبر اور انسانیت سوزی کے نئے باب رقم کرنے والے چنگیز خان کے ذہن میں اب ایک نیا خیال ادھم مچا رہا تھا۔ دو محاذوں پر جنگی کارروائی میں مصروف رہنے کے ساتھ گوبی میں قبائلی انتظامیہ کی مجلس مشاورت سے رابطہ قائم رکھنا بے حد ضروری تھا۔ اس کے حکم پر ختا کے مشیر ہندوکش میں حاضر ہونے کے پابند تھے۔ مشرق اور مغرب کی ان انتہاؤں میں روابط اور سفر ہموار کرنے کے لیے نئی شاہراہوں کا قیام اب ناگزیر ہو چلا تھا۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے اس کے زرخیز دماغ نے 'یام' کی اصلاح کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ابتدائی طور پر گوبی میں یہ طریقہ اس طرح رائج تھا کہ کوئی سوار جنگ سے متعلقہ یا کوئی بھی اہم خبر ایک پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ تک پہنچاتا اور اردو سے کوئی دوسرا گھڑسوار وہ خبر دور دراز کے دستوں تک پہنچا آتا۔ ان قاصدین کے لیے دن بھر میں پچاسیوں میل مسافت طے کرنا ایک معمولی امر تھا۔ آغاز میں 'یام' کی صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ لشکر کے راستے میں قدرے فاصلے پر باقاعدہ کیمپ قائم کر دیئے جاتے تھے۔ ہر کیمپ میں نوجوان سائیس گھوڑوں کی قطار پر مامور ہوتے۔ چوراچکوں سے نمٹنے کے لیے چند سپاہی بھی وہیں موجود ہوا کرتے۔ لشکر کے گذرتے ہی کسی طاقتور دستے کو پیچھے چھوڑ دینے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ یہ کیمپ عام طور پر چند یورتوں، گھوڑوں کے لیے گھاس، چارے کے کھلیان اور سرما کی غذا کے لیے جو کے تھیلوں پر سو میل کی مسافت پر لازماً مشتمل ہوتا۔ اسی راستے سے لوٹ مار کا سامان، ہیرے جواہرات، جیڈ کے اور میناکاری سے مزین ظروف قراقرم بھیجے جاتے تھے۔ یام بیک وقت تار، ریل اور ڈاک کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے بعد چنگیز خان نے سرائے کا نظام جدید خطوط پر استوار کرنا شروع کیا۔ ہر پچیس میل کے فاصلے پر ایک سرائے کا قیام لازم تھا۔ اسے گھوڑوں کی ڈاک کی سرائے بھی کہا جانے لگا۔ یہ عمارت قدرے وسیع اور خوبصورت بھی ہوتی۔ تمام کمرے آراستہ بستروں اور بیش قیمت ریشمی پردوں سے مزین ہوتے تھے۔ حسن انتظام کا یہ عالم تھا کہ دس ہزار سے زائد ان سراؤں میں تین لاکھ گھوڑوں کی نگہبانی

بھی بہت اہتمام سے کی جاتی۔ دس دن کی مسافت پر واقع مقامات سے بھی ایک ہی روز میں اہم اطلاعات چنگیز خان تک پہنچا کرتیں۔ قاصدین کے لیے محصول بالکل معاف تھے۔ انہیں خصوصی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ ان سراؤں میں ایسے افراد بھی تعینات تھے جو کسی ہنگامی حالت میں دن کے بعد رات میں بھی اڑھائی سو میل کی مسافت طے کرلیا کرتے۔ ان قاصدین کا لباس بھی مخصوص تھا۔ ہر ایک قاصد گھنٹیوں سے مزین چوڑی پٹی پہنتا۔ ان گھنٹیوں کے بجنے کی آواز قدرے فاصلے سے بھی سنائی دیا کرتی۔ اگلی سرائے تک پہنچتے ہی اسے اپنا دوسرا اہم منصب بالکل تیار حالت میں ملتا۔ اسے پیغام تھما کر اگلی منزل تک روانہ کرتے ہی سرائے کے منشی کے پاس آمد اور روانگی کے وقت کا اندراج بھی لازمی امر تھا۔ عوام میں ان قاصدین کا مقام بہت بلند تھا۔ ان کے پاس شہباز کی شبیہہ بردار مہر ہوا کرتی تھی تاکہ راستے میں کسی ہنگامی صورتِ حال یا گھوڑے کی تھکاوٹ کی صورت میں سڑک پر نظر آنے والا کوئی بھی مسافر اپنا گھوڑا اس کے سپرد کردے۔ عوام میں کسی کو بھی اپنی سواری ان قاصدین کو فراہم کرنے سے انکار کی تاب ہی نہ تھی۔

ڈاک کی یہ سڑکیں چنگیز خان کے نظام حکومت میں ریڑھ کی ہڈی سی حیثیت اختیار کرچکی تھیں۔ ہر ایک مفتوحہ علاقہ سے خراج وصول کرنے کے لیے منگول داروغہ مقرر کیے گئے۔ اس تسخیر شدہ مملکت میں 'یاسا' نے ہر مقامی قانون کی جگہ لے لی تھی۔ دشمن سے چھینے گئے گھوڑوں پر چنگیز خان کا خصوصی نشان داغ دیا جاتا۔ مردم شماری کے لیے بھی خصوصی کتابچے بنائے گئے۔ چنگیز کی اوّلین ترجیح فوج کی تنظیم اور نئی سڑکوں کی تعمیر ہی رہی۔ اس کے اردو کے افسران اب نفیس زنجیریں اور ترکی کی زرہیں پہنتے۔ دمشق کی تاجدار تلواریں استعمال کرتے۔ خود چنگیز خان کا یہ عالم تھا کہ وہ نئے ہتھیاروں کے متعلق پرتجسس تو رہتا لیکن دیگر سامان و آسائشات سے بے نیازی ہی اختیار کیے رکھتا۔ اس کا لباس ہنوز گوبی کا روایتی لبادہ ہی تھا۔ اس نے اپنی عادات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہونے دی تھی۔ ان پرسکون اور ہموار معاملات میں واحد خلش صرف یہ لاحق تھی کہ اردو کے کئی شہزادے جوجی کے متعلق بہت منفی سوچ کے حامل تھے۔ وہ اس کی پیدائش اور نطفہ کے متعلق روز پیدائش سے ہی مشکوک تھے۔ اکثر اسے 'تاتار' کہہ کر پکارا جاتا۔ چنگیز خان کو فطری طور پر یہ فکر لاحق تھی کہ ولی عہد نامزد ہونے کی صورت میں یہ شہزادے اسے کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے۔ صورتِ حال بغاوت اور انتشار میں بھی تبدیل ہوسکتی تھی۔ مفتوحہ علاقوں کے معاملات کو اپنی فراست سے حل کرنے اور یاسا کے ہنٹر سے سب کو تیر کی طرح سیدھا رکھنے والا چنگیز خان اس معاملہ میں بے بسی محسوس کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر پا رہا تھا۔

☆☆☆

جنگ و جدل میں مصروف چنگیز خان اب بڑھاپے کی جانب گامزن تھا۔ مفتوحہ علاقوں کی یہ سرزمین اس کے لیے کافی فرحت بخش ثابت ہوتی آئی تھی۔ دشمنوں اور مزاحمت کاروں سے نمٹنے کے لیے خون میں ہمہ وقت حدت مچلتی رہتی۔ بلاشبہ اس نے ہر مزاحمت کار اور باغی سے بھرپور انتقام بھی لیا تھا لیکن جلال الدین خوارزم ہنوز ناقابل تسخیر تھا۔ اسی دوران اطلاع ملی کہ جلال الدین مشرق میں فوج جمع کررہا ہے۔ اس کی تلاش اور سرکوبی کے لیے چنگیز خان نے خود ساٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ میدان کا رخ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے راستے میں کوہِ بابا میں واقع بامیان کا شہر پڑتا تھا۔ چنگیز خان نے اس کا محاصرہ کرلیا اور فوج کا کثیر لشکر ارخون کی سرکردگی میں جلال الدین کے پیچھے روانہ کردیا۔ شومئی قسمت اسے ایک افغان لشکر کی کمک بھی مل گئی تھی۔ کچھ ہی عرصہ میں ترکوں اور افغانوں نے منگول فوج کو پسپا کرکے پہاڑوں میں دھکیل دیا۔ اس خبر نے چنگیز خان کا طیش سوا کردیا۔ اس کے غضب کا لاوا بامیان پر منتقل ہوگیا۔ اس نے اپنی فوج کو آخری اور زوردار ہلے کا حکم دیا اور اپنا خود اتار کر وہ سپاہیوں کی صف میں گھس گیا۔ یہ دستہ فصیل کے شگاف سے اندر داخل ہونے کی تاک میں تھا۔ محصورین اس وحشت کا مزید مقابلہ نہ کرسکے۔ بامیان منگولوں کے ہتھے چڑھتے ہی تباہی کی زد میں آگیا۔ ہر ذی نفس کو تلوار کی زد میں رکھ کر موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا۔ مساجد اور محل اس حد تک تباہ کردیئے گئے تھے کہ منگول سپاہ بھی بامیان کو 'موبلیغ' (بلدہ غم) کہنے لگے۔ یہ تباہی برپا کرنے کا حکم دینے والا چنگیز خان اپنے منتشر دستوں کو اکٹھا کرکے جلال الدین کے پیچھے لپکنے کے درپے تھا۔ اس نے فوج کو دوروں پر تعینات کردیا تاکہ جلال الدین کو کہیں سے بھی کمک نہ مل سکے۔

جلال الدین اپنی تیس ہزار سپاہ کے ساتھ پہاڑیوں سے نیچے اتر کر دریائے سندھ کی وادی میں پہنچ چکا تھا۔ اسے

Naqar Azeem www.pakistanipoint.com

قوی اُمید تھی کہ دریا عبور کر کے دہلی کے سلطان کی مدد لینے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن منگول ناقابل یقین رفتار سے اس کے تعاقب میں تھے۔ جلال الدین نے اپنی قوم اور امت کی بہادری کا پاس رکھتے ہوئے شیر دلی سے مقابلہ کیا۔ اس اعصاب شکن اور سنسنی خیز جنگ میں فتح کا پلڑا مسلمانوں کے حق میں بھی پلٹا لیکن انجام کار چنگیز خان کے تجربہ اور چالبازی نے جلال الدین کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے پاس محض سات سو سپاہی بچے تھے۔ منگول لشکر کے روپ میں موت سر پر منڈلاتی دیکھ کر جلال الدین نے اپنی زرہ اتار پھینکی۔ تلوار، کمان اور ترکش بھرے تیر لے کر وہ تازہ دم گھوڑے پر سوار ہوا اور بیس فٹ اونچی چٹان سے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ چنگیز خان یہ حیرت انگیز منظر دیکھ کر اپنی بصارت پر یقین ہی نہیں کر پا رہا تھا۔

''خوارزم شاہ بہت خوش قسمت تھا کہ اس کا بیٹا اس قدر بہادر ہے۔'' وہ برملا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

بہادری کے اس اعتراف کے باوجود وہ جلال الدین کو زندہ چھوڑنے کا قائل نہ تھا۔ اس نے بلانویان نامی سردار کو اس کے تعاقب میں روانہ کر دیا۔ بلانویان نے ملتان اور لاہور پر منگول وحشت کے نقوش ثبت کرتے ہوئے اپنا تعاقب جاری رکھا۔ خوارزمی شہزادہ کی تلاش دہلی روانہ ہونے والے قافلوں میں بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ بلانویان اور اس کے لشکری اس بے سود جدوجہد سے اکتانے لگے تھے۔ اس پہ مستزاد ان میدانی علاقوں کی گرمی سپاہیوں کی موت کا سبب بن رہی تھی۔ گوبی کے شفاف چشموں کا پانی پینے والے یہ سپاہی ان شہروں کے آبی ذخائر سے بھی مختلف امراض میں مبتلا ہو رہے تھے۔ بلانویان اپنے سردار اعظم کے پاس لوٹنے پر مجبور ہو گیا۔

چنگیز خان کے مزاج میں بھی اب تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ وہ ایشیائے بعید لوٹنا چاہتا تھا جہاں اہل ختا پر مامور مقولی بہادر اب زندہ نہ تھا۔ گوبی کے خان حجت اور تکرار میں پھنس چکے تھے۔ ہیا کی سلطنت میں بھی بغاوت کی چنگاریاں شعلوں کا روپ دھارتی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے پشور کو تاراج کرتے ہوئے سمرقند کا رخ کر لیا۔ واپسی کے اس سفر میں جنگی قیدیوں کا قتل عام کر دیا گیا۔ مسلم بادشاہوں کی حرم سراؤں سے منگوی خواتین اور بیگمات بھی منگولوں کے قبضہ میں تھیں۔ ان پر محض اتنا رحم کھایا گیا تھا کہ سڑک کے کنارے اپنے وطن کو آخری بار دیکھ کر رونے

سکندر لکھنوی

(1918ء...1993ء)

بزرگ شاعر مرزا سکندر بیگ کی ولادت 1918ء میں ہوئی۔ قیامِ پاکستان کے وقت یہ 29 برس کے جوان تھے۔ ان کے آبائی شہر میں اکثر و بیشتر نعت خوانی کی محافل منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ جس نے ان کے اندر نعت خوانی اور بعد ازاں نعت گوئی کا شوق پیدا کر دیا۔ تین بار عمرے اور سات بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے والے مرزا سکندر بیگ کو شعر و ادب کی دنیا میں ''سکندر لکھنوی'' کے نام سے پکارا جاتا رہا ہے۔ ان کی نعتیں سہل اور رواں ہوتی ہیں۔ بھاری بھرکم اور غیر معروف الفاظ کا استعمال ان کے ہاں نہیں ملتا۔ کراچی کے کئی نعت خواں ان کی نعتیں بڑے ذوق و شوق سے سناتے ہیں جس سے محفل نعت میں سماں بندھ جاتا ہے۔ ''تسکین روح''، ''حرم''، ''سفینۂ دل''، ''نعت حبیب اکرم'' (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے اور کئی مجموعوں میں سے چار مجموعوں کے نام ہیں۔ سکندر لکھنوی کی وفات 1993ء کو کراچی میں ہوئی اور کراچی میں ہی تدفین ہوئی۔

☆☆☆

''واہ رے لکھنؤ! تیری سرزمین سے بھی فکر و فن کی کیسی کیسی بے مثال و باکمال ہستیاں طلوع ہوتی رہیں۔ زمانہ لاکھ چاہے ان کا مثل و ہمسر نہ مل پائے گا۔ گاؤں گاؤں جائیے مایوس لوٹ آئے گا۔ یہاں جو شے تھی لاجواب تھی۔ ہزاروں میں انتخاب تھی۔ جس وضع قطع کا جس طور طریق کا جس نے التزام کیا مرتے دم تک اس کا احترام کیا۔ خوش اخلاقی خوش مزاجی، وضع داری دلدہی اور دوست نوازی تو جیسے یہاں کے شرفاء کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مروّت و بردباری، دلداری و وفاداری اور طرح داری عام تھی یہاں کا باسی جہاں جاتا لوگوں کی نظروں سے چھپا نہ رہتا۔ الغرض دانشورانِ ہندوستان و پاکستان ہی نہیں کل جہاں کا یہ تاثر اور بیان ہے کہ ''جس نے لکھنؤ کو ایک بار دیکھا وہ سدا اس کا رطب للساں رہا اور جس نے نہ دیکھا یا نہ دیکھ سکا وہ اپنی اس محرومی و کوتاہی پر بدقسمتی پر نوحہ خواں رہا۔''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

جے ایم کوئٹزی

2003ء کے نوبیل انعام سے جنوبی افریقا کے معروف ناول نگار، افسانہ نویس، مضمون نگار، نقاد، ماہر لسانیات اور مترجم جے ایم کوئٹزی کو نوازا گیا۔ وہ آسٹریلیا کے شہری ہیں اور جنوبی آسٹریلیا کے شہر ایڈیلیڈ میں مقیم ہیں۔ نوبیل انعام پانے سے قبل کوئٹزی دو بار بکر پرائز جیت چکے تھے۔ جے ایم کوئٹزی 9 فروری 1940ء کو کیپ ٹاؤن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، زاچاریاس کوئٹزی، ایک جز وقتی وکیل اور سرکاری ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ بھیڑوں کا باڑا چلاتے تھے۔ ان کے گھر میں انگریزی بولی جاتی تھی لیکن عزیز و اقارب کے ہمراہ افریقی زبان میں بات چیت ہوتی تھی۔ جے ایم کوئٹزی ستر ہویں صدی کے جرمن مہاجرین کی اولاد اور ننھیال کی طرف سے پولش خاندان سے ہیں۔ بالٹازار ڈوبیل ان کا نانا تھا۔ جے ایم کوئٹزی کی ابتدائی زندگی کا زیادہ عرصہ کیپ ٹاؤن اور ایک نزدیکی قصبے وورسیسٹر میں گزرا کیونکہ ان کے والد کی ملازمت ختم ہونے کے بعد ان کا خاندان وورسیسٹر ہو گیا تھا۔ کوئٹزی نے کیپ ٹاؤن کے سینٹ جوزف کالج نامی کیتھولک فرقے کے اسکول اور جامعہ کیپ ٹاؤن سے تعلیم حاصل کی۔ جے ایم کوئٹزی نے برطانیہ میں کمپیوٹر پروگرامر کی حیثیت سے کام کرنے کے دوران 1963ء میں جامعہ کیپ ٹاؤن سے فورڈ میڈوکس کے ناولوں پر مقالہ لکھ کر ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ وہ 1965ء میں آسٹن کی جامعہ ٹیکساس، امریکا میں فل برائٹ پروگرام کے تحت چلے گئے جہاں سے انہوں نے 1969ء میں لسانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پھر بفالو کی جامعہ نیویارک میں ادب پڑھانے لگے۔ وہ وہاں

دھونے کی اجازت دے دی گئی۔ ان سفاکانہ اقدامات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے چنگیز خان اپنے زخموں میں ایک عجیب نوعیت کی خراشیں محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کا وجدان وہ نادیدہ آہٹیں بھی بھانپ رہا تھا جن کی آمد تواٹل ہوتی ہے لیکن کوئی بھی ذی نفس ان واہمات وخدشات کو واضح طور پر بیان کر دینے کے قابل اور مجاز بھی نہیں ہوتا۔ چنگیز خان بھی سمجھ گیا تھا کہ اب تموچن کے چل چلاؤ کا وقت قریب ہے۔ وہ انتظامی امور کی تکمیل کے بعد ممکنہ بغاوتوں کا سدباب کرنا چاہتا تھا۔ یاسا کا قانون نافذ کرنے کے بعد اس کے بیٹے امور سلطنت سنبھال لیتے۔ چنگیز خان نے تمام سرداروں کے پاس ہرکارے بھجوا کر انہیں دریائے سیحوں کے کنارے اس مقام پر جمع ہونے کا حکم دیا جہاں اس نے خوارزم شاہ کی سرحد میں پہلی بار قدم رکھا تھا۔

قرولتائی کا اہتمام شان وشوکت سے ہوا۔ چنگیز خان محمد خوارزم شاہ کے سمرقند سے لائے گئے تخت پر براجمان تھا۔ اس کا عصا اور تاج بھی تخت کے پاس ہی موجود تھے البتہ اس کے نیچے گوبی میں مستند سرداری اور جانوروں کے بالوں سے بنا خاکی سمور کا ٹکڑا بھی پڑتا تھا۔ قرولتائی کے آغاز میں خوارزم شاہ کی والدہ 'ترکان بیگم' کو تھکڑیوں میں جکڑ کر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس روز چنگیز خان کا مزاج ایک انوکھی ترنگ میں تھا۔ اس نے سرداروں کو یاسا کے قوانین کی بہرصورت پابندی کا حکم دیا۔ بیٹوں کو باہمی جنگ وجدل سے گریز کا مشورہ تھا۔ جانشینی کا کٹھن مرحلہ بھی بالآخر طے کر لیا گیا۔ اس نے جوجی کے متبادل جنگجو مزاج تولی یا تند مزاج چغتائی کی بجائے قدرے سادہ طبیعت اور فیاض فطرت کے حامل اوغدائی کو ولی عہد مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے علم تھا کہ چغتائی کسی بھی صورت اپنے سب سے چھوٹے بھائی تولی کی اطاعت نہ کر پاتا۔ دوسری جانب امیر جنگ تولی بھی زیادہ عرصہ تک سخت گیر چغتائی کی خدمت سے قاصر ہی رہتا۔ اس صورت حال میں اوغدائی ہی بہترین انتخاب تھا۔ ضرورت محض اس بات کی تھی کہ ان بھائیوں کو یاسا کے بنیادی قوانین 'اطاعت۔ اپنے بھائیوں سے وفاداری اور خانہ جنگی سے گریز' کی تلقین کی جاتی رہے۔

قرولتائی میں ایک ماہ تک جشن برپا رہا۔ اس سرور وطرب میں بھی چنگیز خان کو کلی طور پر سکون نہیں تھا۔ اس کے دل میں اب بھی خلش باقی تھی۔ تبت کے قریب

1971ء تک رہے۔ 1971ء ہی میں کوئٹزی نے امریکی شہریت کے لیے درخواست دی جسے اس بناء پر مسترد کر دیا گیا کہ وہ ویت نام جنگ کے خلاف احتجاج کرنے والوں میں شامل تھے۔ وہ واپس لوٹ آئے اور جامعہ کیپ ٹاؤن میں انگریزی ادب پڑھانے لگے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایڈیلیڈ آسٹریلیا چلے آئے اور جامعہ ایڈیلیڈ کے شعبہ انگریزی میں ریسرچ فیلو کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ 6 مارچ 2006ء کو جے ایم کوئٹزی نے آسٹریلیا کی شہریت اختیار کر لی۔ انہوں نے جامعہ شکاگو میں بھی معلم کی حیثیت سے کام کیا۔ کوئٹزی نے 1963ء میں فلپا جوبر سے شادی کی جو طلاق پر منتج ہوئی جس سے ان کا ایک بیٹا نکولس اور ایک بیٹی جسیلا پیدا ہوئے۔ نکولس 23 برس کی عمر میں ایک حادثے میں چل بسا۔ 1969ء میں اسانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے دوران انہوں نے لکھنے کا آغاز کیا۔ اسی دوران انہوں نے اپنا ناول Dusk Lands شروع کیا جو 1974ء میں جنوبی افریقا سے منصہ شہود پر آیا اور سب سے اہم جنوبی افریقن ادبی ایوارڈ، سی این اے ایوارڈ جیتا۔ یہ ناول بعد میں برطانیہ اور امریکا سے بھی شائع ہوا۔ کوئٹزی کے اگلے ناول Waiting for Barbarins کو جو 1980ء میں چھپا، عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی اور 1983ء میں چھپنے والے ناول Life and Times of Michael K نے کوئٹزی کی شہرت پر مہر ثبت کر دی۔ اس ناول کو برطانوی ادبی اعزاز ''بکر پرائز'' سے نوازا گیا جس کا اس وقت آغاز ہوا ہی تھا۔ یوں کوئٹزی بکر پرائز حاصل کرنے والے دنیا کے پہلے ادیب ہیں۔

از: ڈاکٹر نظر کامرانی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ہیا سلطنت کی بغاوت اور جنوبی چین میں سنگ خاندان کی قدیم حکومت ہنوز مکمل طور پر تسخیر نہیں ہو پا رہی تھیں۔ قراقورم میں بورتائی کے ساتھ کچھ وقت گزاری کے بعد ایک بار پھر مضطرب مزاج سے مجبور ہو کر میدان جنگ میں کود پڑا۔ سوبدائی بہادر کو سنگ کی سرزمینیں فتح کرنے کے لیے روانہ کیا اور خود ہیا کے صحرائی قبائل کی سرکوبی کرنے نکل کھڑا ہوا۔ جاڑے میں منجمد دلدلیں عبور کر کے اس نے بچے کھچے ختائی، چین، ترک اور ہیا کی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ اس دوطرفہ لڑائی میں تین لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ ہیا کا بادشاہ فرار ہو کر ایک پہاڑی قلعہ میں روپوش ہو گیا۔ اس کے لیے کہیں کوئی جائے اماں نہ تھی۔ مجبوراً اسے چنگیز خان کو اطاعت کا پیغام بھیجنا پڑا۔ اس محاذ پر سرخروئی کے بعد اس نے درمیانی جاڑوں میں قدیم چین کی طرف کوچ کا ارادہ کر لیا۔ اس موقع پر مشیر خاص لیوچتسائی نے اسے ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی اور دلائل سے سمجھانے لگا کہ اگر بھی آدمیوں کا قتل عام کیا جاتا رہا تو اس کے جانشینوں کے لیے دولت پیدا کرنے والا کوئی بھی نہ بچے گا۔ چنگیز خان کو یہ مشورہ پسند آیا۔ ماضی میں بھی وہ چین کے دانشور مشیروں کی مدد سے ہی انتظامی نظم ونسق برقرار رکھ پایا تھا۔ اس نے لیوچتسائی سے اسی وقت اپنے بیٹوں کی خدمت ووفاداری کا عہد لیا لیکن اس کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آیا۔ وہ اپنے خواب کی تکمیل بہرصورت کرنا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کے لیے وہ اپنی فوج زرد دریا کے پار لے گیا۔ یہیں اسے یورپی چراگاہوں میں سرگرداں جوجی کی موت کی خبر ملی۔ لاکھوں افراد کا قتل عام کروانے، دشمن کی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کروانے اور ان کھوپڑیوں میں شراب سے لطف اندوز ہونے والا وہ سردار بیٹے کی موت پر شدید صدمہ میں مبتلا تھا۔ وہ کسی کے سامنے اپنے رنج والم کے اظہار کی بجائے خیمہ میں گوشہ نشین ہو کر خاموشی سے ماتم کرتا رہا۔ جوجی کی موت کا صدمہ ایک ناقابل مندمل زخم سہی لیکن معمولات زندگی نبھاتے رہنا بھی ضروری تھا۔ چنگیز خان ایک بار پھر میدان عمل میں کود پڑا تاہم اب سابقہ ہمت اور آہنی عزائم لرزیدہ ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ کچھ عرصہ سے لاحق مختلف امراض کے اثرات اب مزید مسائل پیدا کرنے لگے۔ اسی دوران وہ حادثاتی طور پر گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گیا۔ طویل عرصہ سے دشمنوں سے برسرپیکار چنگیز خان نے بستر مرض پر بھی اس بات کا مکمل بندوبست

کر دیا تھا کہ بچے کھچے دشمنوں کو نیست و نابود کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ اس کا واضح حکم تھا کہ ہیا کے بادشاہ کی مکمل تباہی سے پہلے اس کی موت ہر قیمت پر پوشیدہ رکھی جائے۔

دشمنوں کے لیے قہر ثابت ہوتے اور لاشوں کی ڈھیر لگاتے ہوئے بالآخر اگست 1227 کا وہ دن بھی چلا آیا جب گوبی کی دہشت نے اپنے آخری سانس لیے۔ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس کی موت کے بعد ایک نیزہ یورت کے باہر گاڑ دیا گیا۔ یہ یورت خیمہ گاہ سے قدرے فاصلہ پر موجود تھا۔ رواج کے مطابق نیزہ کی انی زمین میں دھنسی ہوئی تھی جو اس بات کا اعلان تھی کہ سردار سخت علیل ہے۔ نجومی، دانشوروں اور مشیروں میں سے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ انہوں نے نہایت کامیابی سے چنگیز خان کی موت پوشیدہ رکھی ہوئی تھی۔

چنگیز کی خواہش کے مطابق ہیا کے بادشاہ اور اس کی فوج کو مغل اردو میں ضیافت میں مدعو کر کے اعزازی خلعت پہنائے گئے۔ اسے اردو کے سرداروں کے درمیان بٹھا کر عزت بخشی گئی اور پھر ان سب کا قتل عام کر دیا گیا۔ یہی سلوک جنازے سے واپسی پر عوام کے ساتھ کیا گیا۔ جنازے کا رتھ لے جاتے ہوئے راہ میں نظر آنے والا ہر شخص موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تاکہ دشمنوں تک چنگیز خان کی موت کی خبر نہ پہنچ سکے۔ ریگستان پہنچ کر اردو کے پرانے سپاہی جنازے کے ساتھ بہ آواز بلند ماتم کرنے لگے۔

”اے ہمارے بگدو آقا! تو ہمیں اس طرح چھوڑ کے کیوں چلا گیا؟

تیرا پیدائشی ملک اور اس کی رواں ندیاں آج بھی تیری منتظر ہیں۔

تیرے خوش نصیب آبائی وطن میں سنہرا مکان بہادر سورماؤں کے نرغہ میں ہے۔

وہ سورما آج بھی تیرے منتظر ہیں۔

تو ہمیں اس گرم سرزمین میں کیوں چھوڑ گیا ہے جہاں دشمنوں کی لاشیں ڈھیر کی صورت میں پڑی ہیں۔“

ریگستان کی سطح عبور کرتے اردوؤں نے بھی ماتم جاری رکھا۔ ان کی زبانوں سے ادا ہونے والا ہر ایک لفظ دلی عقیدت اور دائمی جدائی کے گہرے زخم سے چور تھا۔

”وقت کی چالیں کون سمجھ سکتا ہے بھلا؟

یہ انسان کو زندگی میں متضاد موسم دکھاتا ہے۔

کبھی تو شہباز کی مانند جھپٹا کرتا تھا لیکن اب ایک لڑکھڑاتی ہوئی گاڑی تیرا بے جان وجود لیے رواں دواں ہے۔

اے ہمارے عظیم خان!

ہم کیسے یقین کر لیں کہ تو اپنے اہل و عیال، قوم اور قرولتائی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

اے ہمارے خان!

تو ہمارا سردار تھا۔ ہم تیری سرپرستی میں ایک عظیم قوت بن کر پنپ رہے تھے۔

تو فخر و غرور سے عقاب کی مانند چکر لگایا کرتا تھا لیکن اب موت نے تجھے اپنے قبضہ میں کر کے نقل و حرکت سے بھی عاجز کر دیا ہے۔

اے ہمارے خان!

یہ ہم پر کیسا ستم ٹوٹ پڑا ہے...... یہ تجھ پر کیسا وقت آن پڑا ہے؟“

☆☆☆

چنگیز خان کی لاش قراقورم کی بجائے ان وادیوں میں لے جائی گئی جہاں اس کا جدوجہد اور مشکلات سے لبریز لڑکپن بسر ہوا تھا۔ اردو کے ہرکارے مختلف ارخانوں، شہزادوں اور دور دراز سپہ سالاروں تک خبر پہنچانے کے لیے لاش کو اس آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا جس کا انتخاب وہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ تدفین سے قبل چنگیز خان کے اس گھوڑے کو بھی مار دیا گیا جس پر وہ اپنے آخری ایام میں سواری کرتا رہا تھا۔ اس گھوڑے کی ہڈیاں علیحدہ کر کے انہیں جلا کر خشک اور صاف کر لیا گیا۔ قبر کے اندر چھوٹا خیمہ نصب کر کے پکا ہوا گوشت، اناج، ایک کمان، تلوار اور گھوڑے کی ہڈیاں رکھ کر چنگیز خان کو دائمی رہائش گاہ تک پہنچا دیا۔ چالیس عورتیں، چالیس خوبصورت مشکی گھوڑے ذبح کر کے قبر پر چڑھائے گئے۔ تدفین کے بعد ایک قبیلے کو فوجی خدمت معاف کر کے اس مقام کی نگرانی سونپ دی گئی۔ قبر پر تقریباً ایک ہزار گھوڑے دوڑائے گئے تاکہ زمین ہموار ہو جائے اور قبر کا نشان باقی نہ رہ پائے ...... درختوں کے جھنڈ میں خوشبو جلانے کا اہتمام کیا جاتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد قرب و جوار کا جنگل اس قدر گھنا ہو گیا کہ چنگیز خان کی قبر والے صنوبر کے درخت کا نشان حقیقتاً کھو گیا۔

ماخذات:

چنگیز خان...... از: ہیرلڈ لیم

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

وہ بڑی دلیر خاتون تھی کوئی اس کے سامنے آنکھ اٹھا کر نہیں بول سکتا تھا۔ گل بی بی نے انگریزی سرکار کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے اس کے مقابل جنرل ڈائر تھا، اس نے بلوچستان کے تمام پھنے خانوں کو گل بی بی کے زندہ یا مردہ پکڑنے کے لیے اس وقت کے حساب سے ایک بڑی رقم مبلغ پچاس روپے انعام کا اعلان کیا تھا مگر اس خاتون کی بہادری نے کسی کو بھی اپنے قریب آنے نہیں دیا۔ جنرل ڈائر نے بڑے بڑے سورماؤں کو چت کیا تھا مگر اس خاتون نے جنرل

جنگجو دوشیزہ

بیبرک کارمل جمالی

حکومتِ انگلیشیہ کے جنرل عیار و مکار تھے۔ پورے برصغیر پر دھوکے سے قبضہ کیے بیٹھے تھے مگر جب بلوچستان کی وادیوں کی جانب بڑھے تو ایک محبِ وطن دوشیزہ نے انہیں تگنی کا ناچ نچادیا۔

تاریخ کے صفحات میں گم ایک داستانِ عشق

Waqar Azeem
www.paksociety.com

ڈائر کی ہواؤں کو بھی اپنے اور اپنے علاقے کے لوگوں کے قریب آنے نہیں دیا۔ وہ جنگ جو نسل سے تھی اس کے باپ دادا بھی جنگجو تھے اور میدانِ جنگ میں جان گنوا چکے تھے۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ گل بی بی کو شکست دے سکے ہاں گل بی بی نے ایک شخص کے آگے ہار تسلیم کی تھی۔ وہ تھا شہسوار۔ وہی شہسوار جس نے پیار کے تیر سے اسے گھائل کیا تھا اور وہ محبت کی ٹیس سے مجبور ہو کر اس کے آگے جھک گئی تھی پھر ان وادیوں نے وہ سماں بھی دیکھا جب وہ علاقے کے بڑوں کی دعاؤں کے سایہ میں، سرخ جوڑے میں ملبوس ہو کر شہسوار کی جھگی میں آئی تھی۔ وہ دن شہسوار کے لیے بھی عید سے کم نہ تھا کیونکہ اس نے گل بی بی پر اپنا قلعہ صدقہ کر دیا تھا اور اب جھگی میں رہ رہا تھا۔ اس وقت وہ گل بی بی کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ دونوں جنگجو ایک دوسرے کے سامنے سرخم کر چکے تھے۔

یہ 1916 کا سال تھا۔ انگریزوں کا توتی ہر جگہ بول رہا تھا مگر بلوچستان میں ان کے ہاتھوں کے توتے اڑ رہے تھے۔ گل بی بی بلوچستان کی بہادر جنگجو کمانڈر تھی۔ وہ مغربی بلوچستان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا تعلق خاش شہر سے تھا۔ خاش شہر انگریزی سرکار کے لیے غیر ممنوعہ علاقہ تھا۔ خاش کو آج کل ایرانی بلوچستان کہا جاتا ہے۔ خاش شہر میں دو قبائل آباد تھے۔ یار احمد زئی اور گمشادزئی۔ دونوں جنگجو قبائل تھے۔ ان قبائل نے انگریزی سرکار کے خلاف قدم سے قدم ملا کر جنگ کی تھی۔ ان قبائل کے کچھ لوگوں نے قسم اٹھائی تھی کہ جس دن انگریزی سرکار کے سامنے ہتھیار رکھیں گے اس دن اپنا سر خود ہی زہریلے تلوار سے قلم کر لیں گے۔ جبکہ دوسری جانب انگریزی سرکار کی کوشش تھی کہ کسی طرح خاش پر قبضہ کر لیں۔ قبضہ کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ چار سردار تھے۔ گل بی بی، جنید خان، شہسوار اور خلیل خان۔ ان چاروں کی بہادری کے چرچے برطانیہ کی لائبریریوں میں آج بھی موجود ہیں۔ یہ وہ جنگجو تھے جو مرتے دم تک نہ بکے نہ جھکے تھے۔

برطانوی سامراج نے خاش شہر میں بلوچ مزاحمت کاروں کے سر قلم کرنے کے لیے بڑے بڑے سفاک جرنیلوں کو بلوچستان بھیجا تھا۔ ان میں جنرل ڈائر بھی تھا۔ وہی ڈائر جو جلیانوالہ باغ کے قتل عام کا مرکزی کردار تھا۔ جنرل ڈائر کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو دھوکے بازی اور لالچ میں لوگوں کو پھنسا کر اپنی گرفت میں لیا کرتے تھے۔ جنرل ڈائر نے بلوچستان سے بلوچ مزاحمت کاروں کو مکمل ختم کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ وہ بلوچستان سے آزادی کی تحریک کا مکمل خاتمہ چاہتا تھا۔ جنرل ڈائر اتنا چالاک تھا کہ جہاں بھی جاتا وہاں آٹھ ماہ صرف پلاننگ کرنے میں گزارتا تھا۔ ہر دو چار دن میں ماتحتوں اور ایجنٹوں سے میٹنگ کرتا تاکہ دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکے۔ اب جب اسے سرحدی علاقہ جات و بلوچستان پر انگریزوں کی پکڑ مضبوط کرنے کا ٹاسک دے کر بھیجا گیا تو یہاں بھی اس نے ایجنٹوں کے ساتھ میٹنگ شروع کر دی۔

ہر دور میں ہر علاقے میں محبِ وطن ہوتے ہیں تو غدار وطن بھی بے شمار ہوتے ہیں۔ جنرل ڈائر ایسے ہی غداروں کو خرید رہا تھا تاکہ بلوچستان کو مکمل طور پر فتح کر لے۔ مگر اس کے سامنے مضبوط فصیل کی طرح گل بی بی کھڑی تھی۔ اس نے انگریزوں کو ننگی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ اس کی دہشت ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے چرچے ہر جا ہوتے تھے۔ گل بی بی وہ خاتون تھی جس کا دماغ جنرل ڈائر سے بھی تیز چلتا تھا۔ گل بی بی جنگ میں انگریزوں کے خلاف قلعہ بنی ہوئی۔ اس کے نشانے سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا تھا۔ وہ جب بندوق اٹھا کر میدان جنگ میں کودتی تو بڑے بڑے سورماؤں کو چت کر دیتی تھی۔ وہ اپنے تمام ساتھیوں کو ہتھیار چلانے کا گر بھی بتاتی تھی۔ وہ ہر جنگ میں اپنے فوجیوں کے لیے ایک ٹرینر کا بھی کردار ادا کرتی تھی۔

☆☆☆

گل بی بی جب پیدا ہوئی تو اس کی خوبصورتی دیکھ کر ماں باپ نے اس کا نام گل بی بی رکھا۔ بلوچی زبان میں گل پھول کو کہتے ہیں۔ یعنی گل بی بی پھول کی طرح خوبصورت تھی۔ اس کے حسن کے چرچے پیدائش سے ہی شروع ہو گئے تھے۔ جوان ہوئی تو قیامت بن گئی گول چہرے پر بے پناہ کشش، بڑی بڑی نیلی آنکھیں، ان آنکھوں میں جب سرمہ ڈالتی تو چہرے کی خوبصورتی اور بڑھ جاتی وہ سینہ تان کر چلتی تھی جیسے سفید شیرنی چل رہی ہو۔ خوبصورتی اتنی کہ کبھی کبھار جنگ میں دشمن کے ہتھیار بھی گر جاتے تھے۔ اس کے ہونٹ بادامی تھے ان پر مسکراہٹ سجتی تو جان نکال دیتی تھی۔ اس کے نرم نازک ہاتھوں میں اسلحہ چلانے کی ایسی پھرتی موجود تھی کہ دشمنوں کو سیکنڈوں میں ڈھیر کر دیتی تھی۔ کئی کئی مرتبہ تو دشمن گل بی بی کا چہرہ دیکھ کر میدانِ جنگ سے بھاگ جاتے تھے۔ کئی لوگ گل بی بی کے عشق میں مبتلا بھی تھے۔ وہ ایک شیرنی کی طرح میدانِ جنگ میں اترتی اور جنگ جیتے بغیر واپس نہیں

www.paksociety.com

ہوتی تھی۔ اس کے بارے میں انگریزی دور میں لکھی گئی تاریخی کتابیں آج بھی ہمیں بہت کچھ بتاتی ہیں۔

اس کا حسن و جمال دیکھ کر شاہسوار اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ گل بی بی کی بچپن میں ہی منگنی محمد حسن نامی شخص سے ہوئی تھی۔ محمد حسن بڑی بڑی عمارتوں میں رہنے کا شوقین تھا۔ اس وقت خاش میں سب سے بڑا قلعہ شہسوار کے آباؤ اجداد کی ملکیت تھی۔ شہسوار اور گل بی بی نے کئی مرتبہ انگریزی سرکار کے خلاف اکٹھے جنگ لڑی تھی۔ ہر جنگ میں وہ ایک دوسرے پر حاوی ہونے کے لیے سخت محنت کرتے تھے۔ خاش شہر کی سب سے خوبصورت عورت گل بی بی تھی تو اس شہر کا سب سے خوبصورت مرد شہسوار تھا۔ خاش شہر کے کچھ امیر زادوں میں محمد حسن کا بھی شمار ہوتا تھا۔ جبکہ شہسوار نے کبھی خود کو امیر زادہ نہیں سمجھا تھا۔ وہ سب کو ایک نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ایک دن اس نے گل بی بی سے اپنی محبت کا اظہار کیا تو گل بی بی نے کہا کہ اے خاش شہر کے وارث میں کسی اور کو وراثت میں دے دی گئی ہوں، ہاں اگر وہ مجھے اس وراثت سے الگ کردے تو پھر کچھ کہہ سکتی ہوں۔

اسی دوران شہسوار نے محمد حسن سے گل بی بی کے رشتے کا مطالبہ کیا تو محمد حسن نے خاش شہر کی ملکیت کا حصہ طلب کرلیا۔ شہسوار کا مطالبہ سن کر محمد حسن سے بولا۔ ”اس شہر میں جو چاہے لے لو۔ مگر گل بی بی کو منگنی کے بندھن سے آزاد کردو۔

محمد حسن نے گل بی بی کو چھوڑ دینے کی قیمت خاش شہر کا قلعہ بتائی۔ اس روز جب یہ خبر گل بی بی تک پہنچی تو اس کے دماغ میں محمد حسن کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی اور اس کا جھکاؤ شہسوار کی طرف ہوگیا۔ وہ محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔

محمد حسن نے خاش کا قلعہ شہسوار سے مانگا تھا۔ شہسوار نے اپنے تمام خاندان والوں کو گھر بلا کر فیصلہ سنایا کہ اگر آپ سب چاہتے ہو کہ شہسوار زندہ رہے تو یہ قلعہ محمد حسن کو دے دیا جائے۔ میں اپنی محبوبہ پر یہ قلعہ قربان کرنا چاہتا ہوں۔

اس وقت قلعہ میں کئی بڑے بڑے لوگ موجود تھے یہ سن کر سب حیرت زدہ رہ گئے تھے کہ باپ دادا کی بنائی ہوئی ملکیت شہسوار ایک خاتون کی محبت میں چھوڑ رہا ہے۔ ان سورماؤں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”اے شہسوار یہ ملکیت آپ کے باپ دادا نے بڑی جدوجہد سے بنائی تھی۔ ہم سب سوبار ایسی ملکیت آپ پر قربان کریں گے۔ اگر آپ کی جان رہے گی تو ایسے کئی قلعے بن سکتے ہیں۔“

اسی وقت یہ فیصلہ ہوگیا کہ یہ قلعہ محمد حسن کو دے دیا

ملک ملک کے دلچسپ قوانین

☆ جدہ (سعودی عربیہ) 1979ء میں ہی قانون نافذ ہوگیا تھا کہ کوئی بھی خاتون ہوٹل کے سوئمنگ پول میں نہیں نہا سکتی۔

☆ سموا میں بیوی کی سالگرہ کی تاریخ بھول جانا بہت بڑا جرم ہے۔ اس جرم پر سزا بھی ہوسکتی ہے۔

☆ انگلینڈ میں پارلیمنٹ کے اندر مرنا جرم سمجھا جاتا ہے (اب یہ نہیں معلوم کہ بے چارے اچانک فوت ہوجانے والے کو کیا سزا دی جاتی ہے)

☆ انگلینڈ کی ڈاک کے ٹکٹ پر ملکہ کی تصویر بنی ہوتی ہے اگر آپ نے غلطی سے ٹکٹ چپکاتے ہوئے الٹا چپکا دیا۔ یعنی سر نیچے کردیا تو یہ جرم ہے۔

☆ انڈیانا میں باربی جیسی ڈریسنگ کرنا قانون کے خلاف ہے۔ چاہے آپ عورت ہوں یا مرد۔

☆ ٹیکساس میں کسی کو خالی پستول سے دھمکانا بہت بڑا جرم ہے۔

☆ آسٹریلیا میں اس جانور کا نام لینا جرم ہے جس کو آپ نے کھانے کا پروگرام بنایا ہے۔ (سمجھ سے باہر ہے کہ یہ کیسا قانون ہے اگر مجھے رات کے کھانے میں بیف کڑاہی کھانی ہو تو مجھے کہنا پڑے گا کہ رات کو چقندر کڑاہی بنا لینا یا اسی قسم کی کوئی اور چیز)

☆ کینز (فرانس کا ایک مشہور شہر) وہاں جیری لوئیس کا ماسک پہننا منع ہے (جیری لوئیس ایک بہت بڑا اداکار تھا)۔

☆ نیوجرسی میں اگر کوئی ٹریفک پولیس والا روک کر پوچھے کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کو کیوں روکا ہے اور آپ یہ جواب دیں کہ نہیں میں نہیں جانتا تو تین سو ڈالر سیدھا جرمانہ ہوگا۔ (کیوں کہ آپ کو اپنی غلطی کا احساس خود ہونا چاہیے)

☆ پارک میں آپ کسی اسکاٹش کو مار سکتے ہیں بشرطیکہ اس نے قدیم علاقے کی حدود میں تیر اور کمان اٹھا رکھا ہو۔

☆ لندن میں اگر ٹیکسی چلانے والا بیمار ہو تو وہ اپنی ٹیکسی کا میٹر ڈاؤن کر کے ٹیکسی نہیں چلا سکتا۔ (سوال یہ ہے کہ وہ اگر بیمار ہی ہے تو ٹیکسی کیوں چلائے گا)

☆ کین ٹکی میں آپ اپنے لان کی دیواروں کو سرخ رنگ نہیں دے سکتے۔

☆ پرتگال میں سمندر میں پیشاب کرنا جرم ہے۔

☆ ساؤتھ کیرولینا میں غیر شادی شدہ خواتین پینٹیز نہیں خرید سکتیں۔

☆ مونٹانا میں ٹیلی فون ڈائریکٹری کو آدھا پھاڑ دینا جرم ہے۔

☆ مشی گن میں کسی مگرمچھ کو زنجیروں سے باندھ کر آتش دان کے پاس رکھنا جرم ہے۔

مرسلہ: نازیہ نازی۔ حاصل پور

www.paksociety.com

جائے۔ جب یہ خبر گل بی بی کو پہنچی تو وہ خوشی سے آبدیدہ ہو گئی۔ وہ زندگی میں پہلی بار خوشی سے روئی تھی۔

شہسوار اس وقت انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھانے والوں میں سب سے اوپر تھا۔ بلوچستان کے مشہور چھاپہ ماروں میں ایک چھاپہ مار تھا۔ وہ قلعہ میں چندروز بہ مشکل رہتا تھا۔ شہسوار نے انگریزی سرکار کو زچ کرر کھا تھا ان کے اسلحے چھین کر انہی اسلحوں سے انہیں نقصان پہنچایا کرتا تھا۔ اس کے چھاپے انگریزی حکومت کے سینے پر ضرب تھے۔ شہسوار کے باپ دادا نے خاش شہر پر کئی دہائی تک حکمرانی کی تھی۔ خاش شہر کے بانیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ خاش شہر پہاڑوں کے بیچوں بیچ بسایا گیا تھا۔ جہاں پہ ہر شخص کا پہنچنا ممکن نہ تھا۔ خاش شہر کی خاص بات یہ تھی کہ ہر شخص دوسرے شخص کی بہت عزت کرتا تھا۔ اس شہر میں بسنے والے لوگ ایک دوسرے پر مر مٹنے کو تیار رہتے تھے ان لوگوں کے آپس میں کبھی اختلافات نہیں ہوتے تھے۔ اگر کسی کا اختلاف ہوتا تو جلد از جلد شہر کے بڑے لوگ تصفیہ کرا دیتے تھے۔

اس روز جنرل ڈائر کو ایک بڑا دھچکا لگا تھا جب شہسوار اور گل بی بی کی شادی کی خبر اس تک پہنچی تھی۔ اس کے ہاتھ سے گلاس گر گیا تھا۔ چاندی کا وزنی گلاس اس کے پاؤں کو زخمی کر گیا تھا۔ جنرل ڈائر کو اس وقت کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ خاموش ہو کر میز پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔۔ کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دو بڑے دشمن ایک ہوئے ہیں تو برٹش حکومت کو نقصان ہی پہنچے گا۔

شہسوار اور گل بی بی کی شادی ہو گئی۔ شہسوار نے رخصتی کے وقت قلعہ کی جانب دیکھا پھر چہرہ نیچے کیا اور گل بی بی کے جانب دیکھ کر ہنسنے لگا۔ گل بی بی نے شہسوار سے کہا ہم اور آپ ایسے سیکڑوں قلعہ بنا لیں گے۔ ویسے بھی ہمیں کسی قلعہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لیے ایک جھگی ہو جس کی چھت بارش میں نہ ٹپکے۔ جس کے چاروں کونوں میں تکیے سجے ہوں۔ جس کے باہر میدان جنگ ہو۔ جہاں پر میں اور آپ اپنے جنگجو کو تربیت دے سکیں، مجھے تو ایسا قلعہ چاہیے۔

شہسوار تھوڑا سا آبدیدہ ہوا اور گل بی بی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اے گل بی بی گل (پھولوں) کی طرح یوں ہی مسکراتی رہو۔“

گل بی بی اور شہسوار جھگی میں داخل ہوئے۔ فرش پر ایرانی قالین سجا ہوا تھا۔ جس کے چاروں کونوں میں تکیے رکھے تھے۔ گل بی بی اور شہسوار نے اس جھگی سے نئی زندگی کی ابتداء کی۔

شہسوار اور گل بی بی ایک دوسرے سے بیحد محبت کرنے لگے تھے۔ شہسوار نہ صرف گل بی بی سے محبت کرتا تھا بلکہ اس کے ہر فیصلے کی قدر کرتا تھا۔ اسی وجہ سے ان کی محبت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ گل بی بی شہسوار کی محبت میں ہمیشہ کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ شہسوار باہر جاتا تو گل بی بی تب تک کھانا نہ کھاتی جب تک شہسوار واپس نہ آ جاتا۔

گل بی بی بلوچستان کی پہلی جنگجو خاتون تھی جس نے انگریزی سرکار کے خلاف جنگوں کی قیادت کی تھی۔ گل بی بی ہر جمعرات کو اپنے قبیلے کے جنگجوؤں کو جمع کر کے ہتھیار چلانے اور جنگی طور طریقے بتاتی تھی۔ جبکہ شہسوار چھاپہ مارنے کے طریقے بتاتا تھا۔ شہسوار اور گل بی بی نے ایسی فوج تیار کی تھی جس نے انگریزی سرکار کو خاش آنے والے ہر راستے سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جنرل ڈائر بہت مایوس ہو چکا تھا مگر اپنی مایوسی کا ذکر کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سیکڑوں فوجی گل بی بی اور شہسوار کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے تھے۔ جن کو وہ کم تعداد بتا کر اپنے حکام بالا سے شیئر کر رہا تھا۔ جنرل ڈائر کے کئی مخبر بھی گل بی بی اور شہسوار سے نہ بچ سکے تھے۔

شہسوار اور گل بی بی انگریزی سرکار کے کمانڈر سے بھی زیادہ طاقتور بن گئے تھے۔ گل بی بی، شہسوار سے کہتی تھی۔ دیکھ شہسوار یہ وہی انگریزی سرکار ہے جس نے پورے برصغیر پر قبضہ جمالیا ہے مگر خاش شہر کی طرف ایک قدم بڑھانے کی بھی طاقت نہیں رکھتی ہے۔ ہم چند ہزار لوگ ان پر حاوی ہیں۔

شہسوار مسکراتے ہوئے کہتا۔ ”گل بی بی میری جان یہ آپ کی محبت ہے اور ہم دونوں کی جوڑی ہے جو خاش شہر کو ہر طوفان میں سہارا دیتے ہیں۔“

وہ اندھیری رات تھی گل بی بی اور شہسوار اپنی جھگی میں سو رہے تھے۔ کہ گل بی بی کو کچھ دنبوں کی آواز سنائی دی۔ گل بی بی شہسوار سے بولی۔ ”حیرت انگیز، رات کے اس پہر دنبوں کی آوازیں ہماری طرف آ رہی ہیں۔“ پھر اس نے بندوق اٹھالی۔

شہسوار بولا ”یہ چوری شدہ دنبے نہیں ہیں۔ معاملہ کچھ اور لگ رہا ہے۔ چلو باہر چل کر دیکھتے ہیں۔“

جب میاں بیوی باہر نکلے تو ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور نزدیک پہنچ کر بولا۔ ”شہسوار، جنرل ڈائر نے کچھ دنبے بھیجے ہیں۔“

شہسوار نے تیز آواز میں کہا۔ ”واپس کر دو۔“ مگر گل بی بی نے اسے روک دیا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفر آباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بورے والہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	پتوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی فون 35895313
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

''اے شہسوار مجھے لگتا ہے جنرل ڈائر نے ہار مان لی ہے اور یہ دنبے بطور دوستانہ دعوت کے لیے بھیجے ہیں تاکہ ہم ان کی دعوت کریں۔ یہ دنبے امن اور ہار کی نشانی ہیں لگتا ہے جنرل ڈائر نے ہتھیار پھینک دیے ہیں۔''

شہسوار نے قریب کھڑے ساتھی سے کہا، ان دنبوں کو باڑے میں لے جاؤ اور کچھ کھانے کو بھی دو۔

شہسوار اور گل بی بی نے انگریز سرکار جنرل ڈائر کے دیئے گئے تحفے کو قبول کرلیا تھا۔ گل بی بی اور شہسوار دونوں جھگی میں واپس ہوئے کیونکہ سردی بڑھ رہی تھی۔ ہوائیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ شہسوار اور گل بی بی دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگے۔ کب نیند نے ان کو پکڑا، کب سو گئے۔ کچھ پتا نہ چلا۔

صبح کی کرنیں پوری آب و تاب سے پھیل رہی تھیں تمام پہرے دار اپنی اپنی جگہوں پر براجمان تھے۔ سورج کی کرنیں کبھی پہاڑوں کی اوٹ میں گم ہو جاتیں تو کبھی پہاڑوں کو چیر کر باہر نکلتی تھیں، اسی طرح دن گزر گیا۔ رات کی تاریکی میں ایک شخص دوڑتا ہوا شہسوار کے پاس پہنچا اور اس نے کہا کہ جنرل ڈائر کا بندہ آیا ہے۔ وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔

گل بی بی نے کہا۔ ''اسے بلالو، ہم ملاقات کریں گے۔''

اسے جھگی میں لایا گیا۔ وہ شخص گل بی بی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس پر ایک خوف سا طاری تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

''بولو کیا کہا ہے جنرل ڈائر نے؟'' شہسوار نے پوچھا پھر گل بی بی کی طرف چہرہ کرلیا۔

جنرل ڈائر نے کہا ہے کہ اب بہت جنگ ہوگئی ہے ہم امن کی طرف قدم رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ شخص جلدی سے بولا۔

''جنرل ڈائر آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔''

''جی بالکل ملاقات ہوگی۔ ان سے کہو ہم جمعرات والے دن ملاقات کریں گے۔''

''جی میں آپ کا پیغام ان تک پہنچا دوں گا۔'' شہسوار اور گل بی بی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بلوچی میں کہا۔ ''اتنا کچھ کھونے کے بعد آخر ہماری طاقت کا اندازہ ان کو ہوگیا ہے۔''

وہ جمعرات کی صبح تھی جس دن جنرل ڈائر خاش کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی جنرل ڈائر کی گھوڑے کی ٹپ ٹپ کی آواز گل بی بی کے کانوں میں پہنچی تو اس نے شہسوار سے کہا جاؤ مہمان کا استقبال کرو۔

شہسوار اپنی جھگی سے باہر نکل کر میدان میں آیا۔ جنرل ڈائر گھوڑی سے اترا اور شہسوار سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''لوگ مجھے جنرل ڈائر کہتے ہیں اور آپ ہو شہسوار۔''

شہسوار نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ ہمارے مہمان خانے پر تشریف لائے آپ کا شکریہ۔''

جنرل ڈائر ہنس کر بولا۔ ''شکریہ۔ میں اپنی شکست قبول کرنے آیا ہوں۔ میں نے خیر سگالی کے لیے دنبے بھیجے تھے۔ جسے آپ نے قبول کر کے میرا دل جیت لیا واقعی سچ کہتے ہیں۔ ''بلوچ کو تیر سے نہیں بلکہ محبت سے شکست دی جاسکتی ہے۔'' پھر وہ جھگی میں داخل ہوا۔

جھگی میں ایک لمبا سا ایرانی قالین بچھا ہوا تھا جس کے ہر کونے پر تکیے رکھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک خوبصورت حسین و جمیل عورت احتراماً کھڑی تھی جس کے سر پر دوپٹا تھا اور جسم پر بلوچی لباس۔ گل بی بی نے احتراماً تھوڑا سر جھکا کر سلام پیش کیا۔ اور کہا ''مجھے گل بی بی کہتے ہیں۔''

انگریز جنرل نے بی بی کی طرف دیکھا۔ چھوٹا سا قد انتہائی خوبصورت چہرہ۔ گل بی بی اور شہسوار ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔ تو گل بی بی نے کہا۔ ''ہم خاش شہر کی ایک چھوٹی سی جھگی میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔'' گل بی بی کی آواز میں گرج تھی۔

جنرل ڈائر نے اپنا ہتھیار نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ہندوستان میں بہت ساری مہم سر کی ہیں۔ یہاں پر آپ نے اور شہسوار نے میرے ہر عمل کو ناکام بنایا ہے۔ آپ کی مٹھی بھر فوج نے مجھے مٹھی میں بند کر دیا ہے۔''

گل بی بی بولی۔ ''آپ نے شکست نہیں کھائی بلکہ آپ نے تو صلہ کا راستہ اپنانے کے لیے دنبے بھیجے تھے جنہیں ہم نے امن کے طور پر قبول کرلیا۔ آپ نے دس سالہ جنگ کے خاتمے کا اعلان کر دیا تو ہم نے بھی قبول کرلیا ہے۔''

جنرل ڈائر بولا۔ ''شکریہ عزت افزائی کا۔''

جنرل ڈائر نے جب کھانا کھا کر گل بی بی سے اجازت مانگی تو ایک ایرانی قالین جنرل ڈائر کی خدمت میں پیش کیا گیا جسے جنرل ڈائر نے قبول کرلیا۔ جنرل ڈائر نے اس وقت خاش شہر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کیا۔ اس روز کے بعد خاش شہر کی جانب کسی انگریز نے سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا جہاں پر انہوں نے ایک خاتون سے شکست کھائی تھی۔

++

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

مارگلہ کا تندوا

طارق عزیز خان

مارگلہ کی پہاڑیوں میں روپوش جنگلی حیاتیات پر ایک مختصر سی مگر جامع تحریر۔ ان درندوں کا تذکرہ جو آبادیوں میں بہ آسانی آجاتے ہیں۔ وہ تندوا بھی آگیا تھا

دلچسپ انداز کی ایک مختصر سی تحریر

یہ اپریل 2020ء کے پہلے ہفتہ کی سیاہ رات تھی۔ ایک بھوکا تیندوا شکار کی تلاش میں مارگلہ کے پہاڑوں سے اترا۔ اس نے جنگلی سوروں کی تلاش میں اِدھر اُدھر گشت لگایا لیکن کھانے کو کچھ نہ ملا۔ گھنٹوں اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد وہ جنوب میں مارگلہ روڈ کی طرف بڑھا۔ کچھ دیر تک سڑک کنارے جھاڑیوں میں دبکا رہا اور پھر تیزی سے سڑک پار کر کے سیکٹر ایف سکس کی پوش آبادی میں داخل ہوگیا۔ تیندوے کے سامنے گھنے درختوں سے اٹا چوڑا گرین بیلٹ تھا جس کے پرے سیدھی قطار میں عالیشان بنگلے واقع تھے۔ تیندوا ایک بنگلے کے سامنے واقع گرین بیلٹ میں جا گھسا۔ اچانک بنگلے کے گیراج سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی، جس نے شاید درندے کی بو سونگھ لی تھی اور اب بھونک بھونک کر اپنے

مالک کو خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔ کتے کے بھونکنے پر تیندوا چونکا اور ایک جمپ لگا کر بنگلے کے گیٹ کی سائیڈ پر بنے پلر پر پہنچ گیا۔ کچھ لمحے وہاں رکا اور پھر بنگلے کے گیراج میں کود گیا۔ سیاہ رنگ کا بڑا سا کتا اس پر جھپٹا لیکن طاقتور تیندوے نے غراتے ہوئے اس کی گردن دبوچ لی۔ اس نے غصے سے کتے کو بھنبوڑا اور گھسیٹ کر گیراج کے کھلے حصے میں لے گیا۔ کھینچا تانی کے دوران تیندوے کی گرفت کمزور پڑی تو زخمی کتے نے خود کو چھڑا لیا اور زوردار آواز میں بھونکنے لگا۔ پالتو کتے کی چیخ پکار سن کر بنگلے کے اندر شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں جنھیں سن کر تیندوا گھبرا گیا۔ اس نے غراتے ہوئے کتے کو دھمکایا اور جمپ لگا کر واپس گیٹ کے اوپر سے ہوتے ہوئے باہر گھپ اندھیرے میں گم ہو گیا۔ بنگلے کے گیراج میں لگے سی سی ٹی وی کیمرے نے قریب ایک منٹ کی یہ نایاب ویڈیو ریکارڈ کی اور پھر اگلے دن یہ انٹرنیٹ پر وائرل ہو گئی۔

کچھ لوگوں نے اس ویڈیو کو اسلام آباد کے سیکٹر ایف ٹین کا بتایا اور بعض ذرائع اسے ایڈیٹ شدہ ویڈیو بتاتے ہیں جس کا تعلق انڈیا کے شہر گجرات سے ہے۔ محکمہ وائلڈ لائف اسلام آباد کے ذرائع کہتے ہیں کہ مارگلہ کے پہاڑوں پر تیندوے پائے ضرور جاتے ہیں لیکن اسلام آباد کی شہری آبادی سے ان کا کبھی سامنا نہیں ہوا۔ تاہم انٹرنیٹ پر موجود بعض دیگر ویڈیوز اور مصدقہ اخباری اطلاعات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ مارگلہ کے پہاڑی تیندوے صرف جنگل تک ہی محدود نہیں بلکہ اب کسی نہ کسی سطح پر ان کا واسطہ انسانوں سے بھی پڑنے لگا ہے۔ روزنامہ جنگ کے حامد میر صاحب نے اپنے 20 اپریل 2020ء کے ایک کالم میں اسلام آباد پولیس کے حوالے سے لکھا کہ ایک پہاڑی تیندوے کو مارگلہ روڈ کے قریب ایف سکس کے علاقے میں دیکھا گیا ہے۔ ایک اور وائرل ویڈیو میں تیندوے کو رات کے وقت سڑک پار کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ بی بی سی کے مطابق سڑک پار کرنے والے تیندوے کی ویڈیو کا تعلق پاکستان کے علاقے ٹیکسلا سے ہے۔ جبکہ چند سال پہلے سیاحوں نے شاہ فیصل مسجد کے شمال مغربی گنبد کے پاس ایک مادہ تیندوا کو اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ دیکھا تھا جو لوگوں کی مداخلت کے بعد وہاں سے چلی گئی۔ ایک واقعہ آزاد کشمیر کے علاقے پلندری کا ہے جہاں تیندوے کے ایک جوڑے نے کئی ہفتوں سے مقامی افراد کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ اس جوڑے کو جب موقع ملتا یہ مقامی گاؤں میں حملہ کر کے ایک آدھ مویشی کو ہلاک کر دیتا۔ مقامی افراد نے پہرا لگایا۔ ایک رات انھیں تیندوے کا جوڑا دکھائی دیا تو انھوں نے اس پر فائر کر دیا۔ بدقسمتی سے ایک تیندوا موقع پر ہلاک ہو گیا جبکہ دوسرا جان بچا کر جنگل میں بھاگ گیا۔ محکمہ وائلڈ لائف کے مطابق مقامی افراد نے تیندوے پر اپنا غصہ نکالا لیکن انتظامیہ نے تیندوے کی ہلاکت میں ملوث افراد پر جرمانے عائد کیے۔ اس کے علاوہ اردو اخبارات میں بھی گاہے بگاہے ایسی خبریں شائع ہوتی رہیں جن میں اسلام آباد کے نواحی علاقوں کوٹلی ستیاں، کہوٹہ، شاہدرہ، سید پور اور بری امام کے شمال میں واقع آبادیوں میں تیندوے کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔

قدرت سے محبت رکھنے والے لوگوں کے لیے یہ تمام خبریں ذہنی تسکین کا باعث ہیں کہ پاکستان میں بھی نایاب جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر اسلام آباد کے رہنے والوں کے لیے جنگلی حیات کا نظارہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ خوش قسمتی سے دارالحکومت کی حدود میں درجنوں اقسام کے جانور اور رنگ برنگے خوش نما پرندے پائے جاتے ہیں۔ یہاں عام پرندوں کے ساتھ ساتھ درختوں کے جھنڈوں پر منڈلاتے عقاب، شکرے اور پہاڑی طوطوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ بہنے والے نالہ کورنگ اور نالہ لئی کے کنارے سرسبز جھاڑیوں میں سرخاب اور تیتر بھی ملتے ہیں۔ ہم نے خود اپنے علاقے غوری ٹاؤن میں بہنے والے نالہ کورنگ میں دیگر آبی پرندوں کے ساتھ ساتھ نایاب قسم کی سیاہ مرغابیوں کو تیرتے دیکھا ہے جبکہ نالے کے کنارے درختوں پر شکرے اور طوطے بھی پرواز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہر میں نالوں، پارکوں اور گرین بیلٹس کے آس پاس اکثر رات کے وقت لومڑی، گیدڑ، لگڑ بگھے اور سور دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں پائے جانے والے بندروں نے تو خود کو شہری ماحول میں ڈھال لیا ہے۔ شکر پڑیاں، دامن کوہ، شاہدرہ اور فیصل مسجد کے علاقے میں بندروں کے غول دن میں بھی اٹکھیلیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بندروں نے سیکٹر ایف سکس کی آبادی کا بھی ناک میں دم کیا ہوا ہے اور موقع ملنے پر گھروں کے اندر سے کھانے پینے کی چیزیں اٹھا لے جاتے ہیں۔ بندر کی طرح جنگلی سور بھی اسلام آباد میں بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ سور زیادہ تر رات کے وقت باہر نکلتے ہیں لیکن اسلام آباد میں ایف سکس سے ایف ٹین سیکٹرز کے قرب و جوار میں انھیں دن کے وقت بھی دیکھا جا سکتا ہے تاہم اسلام آباد کی شہری آبادی میں درندوں کی در اندازی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کے واقعات کبھی سننے کو نہیں ملے۔ 1960ء کی دہائی میں جب دارالحکومت اسلام آباد کی تعمیر جاری تھی تب پیر سوہاوہ کے قریب سڑک پر کام کر رہے مزدوروں نے یہاں پہلی بار پہاڑی تیندوے کو دیکھا تھا۔ اسلام آباد کی حدود میں واقع جنگلات اور گھاٹیوں میں تعمیراتی سرگرمیوں کے باعث یہاں پائے جانے والے تیندوے نے مارگلہ کے پہاڑوں میں پناہ لے لی جہاں اس کے لیے خوراک کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اگلے پچاس سالوں تک تیندوے نے خود کو پہاڑوں تک محدود رکھا لیکن نئی صدی کی شروعاتی سالوں میں ایک بار پھر یہ نایاب درندہ پہاڑوں سے نیچے اتر آیا۔ آج کل انٹرنیٹ پر تیندوے سے متعلق ویڈیوز دیکھ کر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کے کن کن علاقوں میں پہاڑی تیندوے کی نسل موجود ہے اور یہ کہ مارگلہ کے پہاڑوں میں کتنے تیندوے موجود ہیں؟ یہ سوال بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ آخر کیوں تیندوے کو اپنا قدرتی مسکن چھوڑ کر انسانی آبادیوں کا رخ کرنا پڑ رہا ہے اور یہ کہ ان کی نسل کو کیا کیا خطرات لاحق ہیں؟ ان تمام سوالات کے جواب پانے کے لیے آپ کو اسلام آباد اور اس سے ملحقہ علاقوں کے جغرافیائی حالات سے آگاہی حاصل کرنا پڑے گی۔

پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کی بنیاد 1960ء میں رکھی گئی۔ اس شہر کے شمال میں مارگلہ کا سرسبز پہاڑی سلسلہ، مشرق میں راول جھیل اور کوٹلی ستیاں کے پہاڑ، جنوب مغرب میں راولپنڈی شہر اور جنوب میں روات کا دیہی علاقہ واقع ہے۔ دارالحکومت بننے سے پہلے یہ وسیع علاقہ سرسبز گھاٹیوں اور گھنے جنگلات پر مشتمل تھا جو تیندوں کے ساتھ ساتھ دیگر جنگلی حیات کا قدرتی مسکن تھا۔ 1960ء کی دہائی میں اسلام آباد کی تعمیراتی سرگرمیاں عروج پر رہیں جس کی وجہ سے جنگلی حیات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ سڑکوں کی تعمیر کے نام پر بہت سے قدیم اور نایاب درخت کاٹ دیے گئے۔ البتہ تاریخی نشانیوں کے طور پر بعض شاہراہوں کے کنارے کچھ قدیم درختوں کو محفوظ رکھا گیا۔ آج بھی مارگلہ روڈ پر چند قدیم اور نایاب درخت موجود ہیں جن کے قریب معلوماتی تختیاں آویزاں کی گئیں۔ شہر کی تعمیر کے دوران یہاں پائی جانے والی جنگلی حیات نے مارگلہ کے پہاڑوں اور اس سے ملحق جھیل کے علاقے کو اپنا مسکن بنا لیا۔ 1980ء میں اسلام آباد کی جنگلی حیات کو تحفظ دینے کے لیے مارگلہ ہلز نیشنل پارک کا قیام عمل میں آیا۔ راول جھیل، شکر پڑیاں، پیر سوہاوہ، شاہ اللہ دتہ اور

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

مارگلہ کے سرسبز پہاڑوں کو اس پارک کا حصہ قرار دیا گیا۔ مارگلہ ہلز نیشنل پارک کا کل رقبہ 17 ہزار 3 سو 86 ہیکٹر یا 67.13 مربع میل ہے۔ پارک میں واقع مارگلہ کے پہاڑوں کی سب سے اونچی چوٹی ''ٹیلا چارونی'' ہے جس کی بلندی 1604 میٹر یا 5262 فٹ ہے۔ موسم سرما میں اس چوٹی اور ملحقہ پہاڑوں پر برفباری بھی ہوتی ہے۔ سیاحوں کے لیے مارگلہ ہلز نیشنل پارک میں تفریحی مقام بنائے گئے جن میں راول جھیل پارک، روال ڈیم سائٹ، شکر پڑیاں پارک، دامن کوہ، پیر سوہاوہ ویلج اور مرغزار چڑیا گھر شامل ہیں۔ راول جھیل پارک میں نایاب پرندوں کی افزائش نسل کے لیے ایک قدرتی برڈ پارک بھی قائم ہے۔ یہ دنیا کا تیسرا بڑا برڈ پارک ہے جس کی لمبائی دو سو میٹر اور چوڑائی سو میٹر کے قریب ہے۔ جبکہ سترّ فٹ کی بلندی سے لے کر چاروں طرف ایک مضبوط جال تان دیا گیا ہے۔ اس وسیع و عریض پارک میں درجنوں اقسام کے پرندوں کے لیے مخصوص قدرتی ماحول تشکیل دیا گیا ہے جہاں انھیں آزادانہ پرورش پاتے دیکھا جاسکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پارک میں موجود تمام پرندے مقامی ہیں جو مارگلہ نیشنل پارک کی حدود میں پائے جاتے ہیں۔ راول جھیل کے علاوہ مارگلہ کے پہاڑوں کے شمالی حصے میں خان پور ڈیم کی وسیع جھیل بھی موجود ہے۔ اس جھیل میں شمال سے ہجرت کر کے آئے آبی پرندوں کی درجنوں اقسام یہاں موسم سرما گزارتی ہیں۔ شہر کے مشرق میں بارہ کہو کے علاقے سے متصل سملی ڈیم کی چھوٹی سی جھیل بھی آبی پرندوں کا مسکن ہے۔ اس کے علاوہ ہائیکنگ کے شوقین افراد کے لیے مارگلہ کے پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک درجن سے زیادہ پہاڑی راستے بنائے گئے ہیں۔ چھٹی کے دن سیاح ان پہاڑی راستوں پر چڑھ کر بلند چوٹیوں تک جاتے ہیں۔ اس پیدل مارچ کے دوران انھیں بہت سے نایاب پرندے اور ان کے گھونسلے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ قسمت اچھی ہو تو آپ کو گرے رنگ کی چھوٹی لومڑی، جنگلی خرگوش اور بلیاں بھی دکھائی دے جاتی ہیں۔ ان پہاڑی راستوں پر تیندوے سے ہوشیار رہنے کے بورڈ بھی آویزاں کیے گئے ہیں۔

مارگلہ ہلز نیشنل پارک میں پودوں کی 600 اقسام پائی جاتی ہیں جبکہ یہاں پرندوں کی 250، دودھ پلانے والے چھوٹے جانوروں کی 38 اور چھپکلیوں کی 13 اقسام ملتی ہیں۔ پرندوں میں گرسل، فاختائیں، دواقسام کے کوے، طوطے، تیتر، سرخاب، عقاب، شکرے، جنگلی کبوتر، ہڑے، درجنوں اقسام کی چڑیا اور نایاب تتلیاں شامل ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں چھوٹے بھورے قد کے پہاڑی بکرے جنھیں ہمالین گورل کہتے ہیں اونچی چوٹیوں پر ملتے ہیں۔ سرسبز پہاڑی ڈھلانوں پر بھونکنے والے ہرن (Barking Deer)، بندر، خرگوش، گیدڑ، سرخ اور گرے رنگ کی لومڑی، بھورے لگڑ بگھے اور چھوٹے قد کے سیاہی مائل جنگلی سور ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ کاک پل سے پہلے اسلام آباد ہائی وے کے مغربی علاقے سے متصل لوئی بھیر سفاری پارک میں کالے ریچھ بھی پائے جاتے ہیں۔ 1970ء کی دہائی میں لوئی بھیر اور اس سے ملحقہ جنگل میں کالے ریچھ آزاد گھوما کرتے تھے۔ 1988ء میں لوئی بھیر نیشنل پارک کا قیام عمل میں آیا۔ 1996ء تک اس پارک کی باقاعدہ حد بند کر کے یہاں موجود جنگلی حیات کو تحفظ دیا گیا۔

مارگلہ پر پایا جانے والا پہاڑی تیندوا جسے مقامی لوگ چیتا بھی کہتے ہیں مارگلہ ہلز نیشنل پارک کی سب سے نایاب جنگلی حیات میں سے ایک ہے۔ پہاڑی تیندوا بلی کی نسل کا ایک گوشت خور درندہ ہے۔ یہ چیتے سے مشابہت رکھتا ہے لیکن چیتے کی نسبت تیندوے کا جسم بھاری ہوتا ہے اور اس کے جسم پر سیاہ رنگ کے گہرے دھبے ہوتے ہیں۔ یہاں ہم یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں شیر اور چیتے کسی بھی علاقے میں نہیں پائے جاتے۔ جن لوگوں نے مری کی سیاحت کے دوران پنڈی پوائنٹ کی چیئر لفٹ کی سیر کی ہے انھوں نے چیئر لفٹ پر بیٹھے ہوئے نیچے وادی میں یہ بورڈ آویزاں دیکھے ہوں گے جن میں لکھا ہے کہ یہاں شیر اور چیتے کی پناہ گاہیں ہیں اس لیے نیچے اترنے سے گریز کریں۔ درحقیقت مقامی لوگ پہاڑی تیندوے کو ہی شیر چیتے کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ پاکستان میں تیندوے کی دو اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان میں ایک مارگلہ پر پایا جانے والا پہاڑی تیندوا ہے جس کی نسل شمال میں مری گلیات کے پہاڑوں اور صوبہ سندھ میں حب ندی کے ڈیلٹا میں بھی پائی جاتی ہے، ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں پہاڑی تیندوں کی کل تعداد 100 سے 150 کے درمیان ہے۔ محکمہ وائلڈ لائف کے مطابق مارگلہ کے پہاڑوں پر چھ تیندوؤں کی موجودگی ثابت ہے لیکن دیگر آزاد ذرائع کا کہنا ہے کہ ان کی تعداد 20 کے قریب ہے۔ مری گلیات کے پہاڑوں پر 30، آزاد کشمیر میں 50، گلگت بلتستان کے نچلے علاقوں میں 30 جبکہ بلوچستان حب میں 10 کے لگ بھگ تیندوے پائے

www.paksociety.com

جاتے ہیں۔ چترال کے بلند پہاڑوں پر نایاب برفانی تیندوا بھی پایا جاتا ہے۔ پہاڑی تیندوے کی نسبت اس کے سفید جسم پر ہلکے گول دھبے ہوتے ہیں جبکہ دم سمیت پورے جسم پر گھنے بال ہوتے ہیں۔ یہ عام طور پر خشک اور بلند پہاڑوں پر اپنا مسکن بناتا ہے اور اس کی زندگی کا دارومدار چھوٹے قد کے پہاڑی بکروں پر ہے جنھیں آئی بیکس کہتے ہیں۔ برفانی تیندوے کی کھال اس کی سب سے بڑی دشمن ہے جس کے لیے اس کا چوری چھپے شکار کیا جاتا ہے۔ خلیجی ممالک اور یورپی منڈیوں میں ایک برفانی چیتے کی بے داغ کھال ایک لاکھ امریکی ڈالر تک فروخت ہوتی ہے۔ جبکہ پہاڑی تیندوے کی کھال بھی کچھ کم قیمتی نہیں اور اس کے بھی بلیک مارکیٹ میں پندرہ سے بیس ہزار ڈالر تک مل جاتے ہیں۔ بعض ذرائع دعویٰ کرتے ہیں کہ گرمیوں میں پاکستان آنے والے یورپی سیاحوں میں جانوروں کے اسمگلر بھی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تیندوے کو پکڑنے کے لیے گولی مارنے کی بجائے پھندوں کا استعمال کرتے ہیں تاکہ جانور کی کھال کو نقصان نہ ہونے پائے۔ تیندوے کے قابو میں آنے کے بعد یہ اسے مار کر کھال اتار لیتے ہیں اور پھر خفیہ طریقے استعمال کرکے اس قیمتی کھال کو سمندر پار پہنچا دیا جاتا ہے۔ بے جا شکار اور دیگر موسمی حالات کی وجہ سے پاکستان میں برفانی تیندوا قریب قریب نایاب ہو چکا ہے اور شمالی علاقوں میں اس کی درست تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

مارگلہ کے پہاڑی تیندوے کی اوسط عمر 13 سال اور وزن 40 سے 90 کلوگرام تک ہو سکتا ہے۔ مادہ کی نسبت نر بھاری بھرکم ہوتا ہے۔ تیندوے کا بریڈنگ سیزن جنوری سے مارچ تک ہوتا ہے۔ نر اور مادہ دس سے بارہ دن ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ اس کے بعد نر اپنے راستے پر ہو لیتا ہے جبکہ مادہ تیندوا پہاڑی ڈھلان پر کسی تنگ درے یا غار میں اپنا مسکن بنا لیتی ہے۔ اگلے 90 سے 103 دن کے درمیان مادہ تیندوا چار سے پانچ بچوں کو جنم دیتی ہے۔ بدقسمتی سے بھوک، موسمی حالات اور دیگر عوامل کی وجہ سے تیندوے کا ایک بچہ ہی جوان ہو پاتا ہے۔ بچوں کو پالنے پوسنے کی ساری ذمے داری اکیلے مادہ کو اٹھانا پڑتی ہے۔ اس دوران پہاڑوں پر گھومنے والے آوارہ تیندوے چھوٹے بچوں کی تاک میں رہتے ہیں تاکہ انھیں مار کر مادہ کو دوبارہ جوڑا بنانے کے لیے تیار کر سکیں۔ عام طور پر نر تیندوا اپنے حقیقی بچوں کی جان نہیں لیتا اور کئی سال بعد بھی اگر اس کا اپنے بچے سے سامنا ہو جائے تو وہ اسے پہچان

گنبد (Dome)

نصف کرہ کی شکل کی ایک جام نما عمارت۔ عموماً مساجد و معابد کی زینت ہوتی ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا گنبد لوزیانہ سپرڈوم، نیو آرلینز (امریکا) میں ہے۔ اس کا قطر 207.26 میٹر یا 680 فٹ ہے۔ رومن پنتھین کا گنبد بڑا ہونے کے علاوہ قدیم بھی ہے اور سب سے خوبصورت بھی۔ قیصر آگسٹس کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ سینٹ پیٹر کے گرجے کا گنبد بھی روم ہی میں ہے، اس کا خول دوگنا ہے اور اونچائی میں 320 فٹ اور قطر میں 140 فٹ ہے۔ فلورنس کے گرجے کا گنبد 310 فٹ بلند اور 39 فٹ اور قطر میں 140 فٹ ہے۔ فلورنس کے گرجے کا گنبد 310 فٹ بلند اور 39 فٹ قطر میں ہے۔ سینٹ پال لندن کے گرجے کے گنبد کے 3 خول ہیں۔ ان کی اونچائی اور قطر بالترتیب 215 اور 112 فٹ ہیں۔ برٹش میوزیم کے مدور مطالعہ خانے کا گنبد 106 فٹ اونچا اور 140 فٹ قطر میں ہے۔ دنیا کا سب سے کشادہ گنبد برطانیہ میں Dome of Discovery (گنبد دریافت) کہلاتا ہے۔ یہ ایلومنیم کا بنا ہوا ہے۔ اس کا قطر 355 فٹ اور بلندی صرف 65 فٹ ہے۔ قسطنطنیہ (استنبول) میں سینٹ صوفیہ کی مسجد کا گنبد بھی نہایت شاندار ہے۔ ہندوستان میں آگرہ کے تاج محل کا گنبد ناشپاتی کی قسموں کے گنبدوں کا سرتاج ہے۔ اس کے دو حصے ہیں، ڈھول اور خول، برخلاف ہمایوں اور صفدر جنگ کے مقبرے کے گنبدوں کے جن کے صرف خول ہی خول ہیں۔ دہلی میں جدید اسمبلی ہال کا گنبد بھی فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ پاکستان میں لاہور کی شاہی مسجد کا گنبد، نیلا گنبد اور ملتان میں شیخ بہاول حق اور رکن عالم کے مقبروں اور کراچی میں ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کی مسجد طوبیٰ کا گنبد قابل ذکر ہیں۔ لفظ گنبد دراصل گونج بند تھا۔ کثرت استعمال سے گنبد ہو گیا۔

مرسلہ: ناہید فراز، ملتان

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

لیتا ہے۔ زندہ بچ جانے والے بچے دو سال تک ماں کے رحم و کرم پر رہنے کے بعد خود اپنے بل بوتے پر شکار کے قابل ہوتے ہیں۔ مارگلہ کے پہاڑوں پر پائے جانے والے تیندوے کی زندگی کا دارومدار ہرن، بکروں اور سوروں پر ہے۔ یہ موقع ملنے پر جنگلی خرگوشوں اور چھپکلیوں کو بھی شکار کرکے کھا جاتے ہیں۔ تیندوا سارا دن آرام کرتا ہے اور دنیا بھر کے درندوں کی طرح رات کے وقت شکار کے لیے باہر نکلتا ہے۔ تیندوے میں نر اور مادہ دونوں شکار کرتے ہیں۔ یہ درندہ شکار کی تلاش میں 25 کلومیٹر کے علاقے میں گشت لگاتا ہے۔ اگر شکار پھرتیلا ہو تو یہ اس کے پیچھے 58 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے بھاگ سکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر 9 فٹ اونچی اور 20 فٹ لمبی چھلانگ لگا سکتا ہے۔ شکار کو گھات لگا کر گردن سے دبوچتا ہے جس سے اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ تیندوا اپنے سے دگنے وزن کے شکار کو دبوچ کر گھسیٹ سکتا ہے۔ عام طور پر یہ شکار کی ہوئی جگہ پر کھانا پسند نہیں کرتا اور شکار کو گھسیٹ کر محفوظ علاقے میں لے جاتا ہے۔ شیر کے مقابلے میں یہ درخت پر بھی چڑھ سکتا ہے۔ شیر چیتے کے برعکس تیندوے کا خاندان چھوٹا ہوتا ہے اور اس میں ماں اور بچے ہی شامل ہوتے ہیں۔ نر تیندوے اپنا اپنا علاقہ تقسیم کرکے رہتے ہیں اور علاقے کی نشاندہی کے لیے درختوں کی چھال اور پتھروں پر جسم رگڑ کر اپنی بو چھوڑتے رہتے ہیں۔ اگر قسمت ساتھ دے تو ایک نر تیندوا ایک ہی سیزن میں دو مختلف مادائوں کے ساتھ جوڑا بناتا ہے۔ تیندوا ایک شرمیلا جانور ہے جو اپنی حدود میں چھپ کر زندگی گزارنا پسند کرتا ہے۔ یہ اس وقت تک کھلے علاقے میں نہیں آتا جب تک کہ بھوک یا بدترین موسمی حالات کی وجہ سے مجبور نہ ہو جائے۔ ایک صحت مند تیندوے کو زندہ رہنے کے لیے ہر روز ساڑھے تین کلو گوشت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کا شکار کے لیے کیا گیا ہر پانچ میں سے ایک حملہ ہی کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاتے چلیں کہ پہاڑی تیندوے کی یہی نسل بھارت کے شہر ممبئی سے ملحق سنجے گاندھی نیشنل پارک میں پائی جاتی ہے۔ انٹرنیٹ پر وائرل تیندوے کے انسانی آبادیوں پر حملوں پر مبنی اکثر وڈیوز سنجے گاندھی نیشنل پارک کی ہوتی ہیں۔ 2015 میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق بھارت میں پہاڑی تیندوں کی کل تعداد 7910 تھی جن میں سنجے گاندھی نیشنل پارک میں 905 تیندوے رہتے تھے۔ سنجے گاندھی نیشنل پارک کے تیندوے کی من پسند خوراک جنگلی سور ہے جہاں اس کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ممبئی کے تیندوے کی نسبت مارگلہ کے تیندوے کو سنگین خطرات لاحق ہیں۔ بے جا شکار کی وجہ سے مارگلہ ہلز پر ہرن اور بکروں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے جس کی وجہ سے تیندوے کو اپنی نسل کی بقا کے لیے جنگلی سور پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ سور کے تعاقب میں پہاڑوں سے نیچے اترنے پر مجبور ہیں۔ جہاں اکثر و بیشتر اس درندے کا واسطہ انسانوں اور ان کے پالتو جانوروں سے پڑ جاتا ہے۔ اگر یہ مقامی کسانوں سے بچ جائے تو گھات لگائے شکاری قیمتی کھال کے لیے اس کا شکار کرتے ہیں۔ مارگلہ ہلز پر پہاڑی بکروں اور ہرن کی تعداد انتہائی کم ہو چکی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پہاڑوں پر سو سے کم بھونکنے والے ہرن اور دو سو کے قریب پہاڑی بکرے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ موسم سرما میں ہرن اور بکرے کا بریڈنگ سیزن شروع ہوتا ہے۔ اس دوران یہ بلند چوٹیوں سے اتر کر نیچے ڈھلانوں پر آجاتے ہیں اور مارچ کے وسط تک وہیں قیام کرتے ہیں۔ موسم بہار کے آخر میں ہرن اور بکروں کے غول بلند پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں۔ جہاں گرمیوں میں ان کے بچے جنم لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے موسمی حالات اور دیگر عوامل کی وجہ سے ہر پانچ میں سے صرف ایک مادہ کا بچہ ہی جوان ہو پاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کی پرورش کے دوران ہرن اور بکرے مارگلہ کی اونچی چوٹیوں پر چرتے رہتے ہیں۔ یہ اپنی پسندیدہ گھاس اور پھول پتیوں کی تلاش میں مارگلہ کے پہاڑوں سے اتر کر شمال میں خانپور ڈیم کی جھیل تک کے علاقے میں گھومتے پھرتے ہیں۔ موسم سرما کے آغاز پر ہرن اور بکروں کے ساتھ ساتھ تیندوے کو بھی بلند پہاڑوں سے نیچے آنا پڑتا ہے۔ پہاڑی تیندوے کے لیے پھرتیلے ہرن اور بکرے کا شکار آسان نہیں ہوتا۔ یہ قلانچیں بھرتے ہرن کے پیچھے 58 کلومیٹر کی رفتار سے بھاگتے ہیں لیکن اس بھاگ دوڑ میں ان کے جسم کا درجہ حرارت تیزی سے بڑھتے ہوئے سو ڈگری فارن ہائیٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس حد تک بڑھا ہوا درجہ حرارت تیندوے کے دماغ کو سن کرسکتا ہے اس لیے یہ اچانک رک کر خود کو ٹھنڈا کرتے ہیں اور شکار کرنے کے لیے نئی حکمت عملی بناتے ہیں۔ زیادہ بھاگ دوڑ سے بچنے کے لیے تیندوا آسان شکار کا انتخاب کرتا ہے اور یوں اس کا واسطہ جنگلی سور سے پڑتا ہے۔

دنیا بھر کے شہری علاقوں سے متصل جہاں جہاں بھی پہاڑی تیندوا پایا جاتا ہے وہاں جنگلی سور بھی ملتے ہیں یہ پھرتیلے جانوروں کی نسبت جنگلی سور تیندوے کے لیے آسان شکار

ثابت ہوتے ہیں۔ ان سوروں کی تعداد پہاڑوں کی نسبت انسانی آبادیوں سے متصل جنگلی گھاٹیوں میں زیادہ ہے۔ اگر صرف اسلام آباد کی بات کریں تو پچھلی دو تین دہائیوں سے جنگلی سور نے بھی بندروں کی طرح خود کو شہری ماحول میں ڈھال لیا ہے۔ اسلام آباد کی شہری حدود میں پائے جانے والے سوروں کی تعداد کا اندازہ دو ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ جنگلی سوروں کی ساٹھ فیصد آبادی اسلام آباد کے شہری علاقے میں بہنے والے نالوں کے گرد پائی جاتی ہے۔ ان کی بیس فیصد آبادی اسلام آباد ہائی وے سے ملحقہ جنگلی پٹی میں رہتی ہے جبکہ باقی کے سوروں کی آماجگاہیں مارگلہ کی پہاڑی ڈھلانیں ہیں۔ جنگلی سور کی خوراک گندے نالوں کے کنارے جمی کائی، درختوں کے پتے اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر ہوتے ہیں۔ عام طور پر سور رات کے وقت کوڑے کے ڈھیروں کی چھان بین کرتے ہیں لیکن اسلام آباد کے سیکٹر ای اور ایف کے قریب انہیں دن کے وقت بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاتے چلیں کہ روات کے علاقے میں بھینس کے قد کے برابر سور بھی ملتے ہیں۔ ہمیں خود ایک بار انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ہم اتنی بڑی جسامت کا سور دیکھ کر حیران بھی ہوئے۔ جنگلی سور جھنڈ بنا کر رہتے ہیں اور ان کے ایک غول میں دس سے پندرہ تک کی تعداد ہوتی ہے۔ مارگلہ کے جنگلی سور کا بریڈنگ سیزن بھی سردیوں کے آغاز پر شروع ہوتا ہے اور قریب 114 دن کے بعد اپریل میں ایک مادہ چار سے پانچ بچوں کو جنم دیتی ہے۔ سور کے ایک غول میں زیادہ سے زیادہ دو مادائیں ہی ماں بننے لائق ہوتی ہیں۔ جنگلی سور کے بچے بہت نازک ہوتے ہیں اور سر پر لگی معمولی سی چوٹ بھی ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ یوں ایک سیزن میں پیدا ہونے والے بچوں کی آدھی تعداد ہی جوان ہو پاتی ہے۔ جنگلی سور انسانوں کے لیے کبھی خطرے کا باعث نہیں بنتے۔ انسان کی آہٹ پاتے ہی یہ سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہیں اور خطرہ محسوس کریں تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ تاہم اگر انہیں بھاگنے کی جگہ نہ ملے یا یہ انسان کو اپنے اوپر حاوی ہوتا ہوا محسوس کریں تو پھر یہ اپنے دفاع میں اسے ٹکر مارنے کو دوڑتے ہیں۔ کمر سے ملی ہوئی ان کی موٹی گردن کی ٹکر ایک کمزور انسان کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی انسان ان کی ٹکر سے زخمی ہوکر گر پڑے تو یہ اسے پاؤں سے روندنے کی کوشش کے دوران مزید ٹکریں مارتے ہیں جس سے انسان کی جان چلی جاتی ہے۔ البتہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کوئی انسان جنگلی سور کا نشانہ بن جائے۔ پہاڑی تیندوے کے لیے سور ایک آسان شکار ثابت ہوتا ہے۔ تیندوا بھوک مٹانے کے لیے کبھی بھی کتے، بندر اور گیدڑ وغیرہ کا شکار نہیں کرتا۔ البتہ اگر کتا یا بندر کسی بھوکے تیندوے کے راستے میں آجائیں تو یہ غصے میں انہیں بھنبھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

تیندوے کے انسانوں سے تعلق کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ درندہ کبھی بھی آدم خور نہیں رہا۔ تیندوے نے انسان پر اسی وقت حملہ کیا ہے جب اسے اپنی جان خطرے میں محسوس ہوئی۔ تاہم اس کے باوجود پاکستان میں تیندوے کے حملوں میں انسانی جانوں کے ضیاع کی بات کی جائے تو سن 2005ء سے لے کر 2019ء تک تیندوے کے انسانوں پر حملے کے گیارہ واقعات پیش آئے جن میں سے زیادہ تر کے پی کے میں واقع ایوبیہ نیشنل پارک کے نواح میں ریکارڈ کیے گئے جبکہ باقی کے واقعات مری گلیات کے پہاڑوں پر پیش آئے۔ تیندوے کے ان حملوں میں 15 افراد جن میں آٹھ خواتین اور چھ بچے بھی شامل ہیں ہلاک ہوئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تیندوے جان بوجھ کر انسانوں کو اپنا شکار نہیں بناتے۔ اس درندے کے انسانوں پر زیادہ تر حملے پالتو جانوروں کے باڑوں سے متصل علاقوں میں ہوئے جبکہ چند ایک واقعات ایسے بھی تھے جن میں لکڑیاں چنتی خواتین تیندوؤں کے علاقوں میں پائی گئیں جہاں درندوں سے خبردار کرنے کے بورڈ آویزاں کیے گئے تھے۔ تاہم وجہ جو بھی ہو، تیندوے کے حملوں میں نقصان اٹھانے والے لوگ اس درندے کو اپنا جانی دشمن مانتے ہیں اور موقع ملنے پر اس کی جان لینے سے بھی نہیں چوکتے۔ محکمہ وائلڈ لائف کے مطابق پاکستان میں پہاڑی تیندوے کی نسل کو قانونی طور پر تحفظ دیا گیا ہے اور اس کے شکار پر وائلڈ لائف ایکٹ کے مطابق دو لاکھ روپے تک جرمانہ اور تین ماہ سے لے کر تین سال تک قید یا دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں۔ تاہم پاکستان میں مشکل یہ ہے کہ تیندوے کو مارنے پر تو سزائیں موجود ہیں لیکن جب یہ درندہ انسانی جان و مال کو نقصان پہنچاتا ہے تو اس پر متاثرین کی امداد کے لیے کوئی واضح حکمت عملی موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے مقامی لوگ تیندوے کو مار کر اس کی لاش غائب کر دیتے ہیں۔

پہاڑی تیندوے کی نسل کو شوقیہ شکاریوں سے بھی خطرہ ہے۔ یہ لوگ صرف ایڈونچر کی تلاش میں اس نایاب جانور کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ انٹرنیٹ پر ایک ویڈیو میں دیکھا جاسکتا

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ہے کہ مری گلیات کے مقامی لوگوں نے سڑک کے کنارے ایک تیندوے کو رسی سے باندھا ہوا ہے۔ تیندوے کی پچھلی ٹانگیں اور کمر پتلی رسی سے بندھی ہیں اور وہ خوفزدہ ہوکر ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ گلیات کے مقامی ذرائع بتاتے ہیں کہ اس تیندوے نے کسی انسان اور اس کے پالتو... جانور کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ دراصل شکار نہ ملنے کی وجہ سے یہ تیندوا کمزور ہو چکا تھا اور بے بسی کے عالم سڑک کے کنارے ایک گڑھے میں پڑا تھا کہ چند نوجوانوں کی نظر اس پر پڑ گئی۔ انھوں نے اس کمزور جانور کو قابو کر کے گھٹنوں تک اس کا تماشا بنایا۔ یہاں تک کہ محکمہ وائلڈ لائف کو خبر ہوگئی اور سرکاری اہلکاروں نے موقع پر پہنچ کر تیندوے کی جان خلاصی کروائی۔ دراصل تصویر کا یہ رخ قدرت سے متعلق ہمارے غیر متوازن رویے کی عکاسی کرتا ہے۔ گدھے کو ہم نے بیوقوفی کی علامت سمجھ لیا ہے اور بندر کو دیکھتے ہی ہم لوگ پتھر مارنے کو دوڑتے ہیں۔ ہمیں پالتو اور جنگلی جانوروں کا فرق معلوم نہیں اور نہ ہی ہم ان کے بریڈنگ سیزن کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں۔ ہم پرندوں کو دانہ ڈالنے کے برتن تو رکھتے ہیں لیکن ان کے رہنے کی جگہوں کو برباد کرتے جا رہے ہیں۔ ہم لوگ گھروں کی تعمیر پر لاکھوں کروڑوں خرچ کر دیتے ہیں لیکن ان کی پرچھتیوں اور منڈیروں کے پاس چند سوراخ نہیں بنا سکتے جہاں پرندے اپنا مسکن بنا سکیں۔ قدرت سے متعلق ہمارے اس رویے کی سب سے بڑی وجہ مطالعے، مشاہدے اور معلومات سے ہماری عدم دلچسپی ہے۔ اگر ہم اسی رفتار سے قدرتی ماحول کی تباہی پر کمربستہ رہے تو یقین جانیے پہاڑی تیندوا تو ایک طرف رہا ہماری آنے والی نسلوں کے لیے گھروں میں پائی جانے والی عام بلی بھی نایاب ہو جائے گی۔

ایک مطمئن معاشرہ کس طرح انسانوں اور جانوروں کے رویوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس بارے میں ہمارا آنکھوں دیکھا واقعہ بھی ملاحظہ کیجیے۔ چند سال پہلے ہم اپنے آبائی شہر رحیم یار خان کی ایک مصروف سڑک سے گزر رہے تھے کہ ہماری نظر ریچھ کا تماشا دکھانے والے پر پڑی جو اپنے کالے ریچھ کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ تماشے والے نے پاس سے گزرتے ایک پہنچی رکشے کو ہاتھ دے کر روکا۔ جیسے ہی رکشے نے بریک لگایا، ریچھ اپنے مالک کے ساتھ رکشے پر چڑھا اور پچھلی سیٹ سے ٹیک لگا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ آپ یقین کریں جب تیسری سواری رکشے کی پچھلی سیٹ کی طرف لپکی تو ریچھ سواری کو دیکھتے ہی بالکل انسانوں کی طرح ایک طرف کھسک گیا۔ یہ منظر دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ اس پر طرہ یہ کہ نہ تو تیسری سواری اور نہ ہی رکشے کی باقی سواریوں نے ریچھ کے بیٹھنے کا کوئی نوٹس لیا۔ ان کی بلا جانے پیچھے ریچھ تھا یا شیر انھیں تو بس اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ یہ مختصر سا واقعہ ہمارے معاشرے کے قدرت کے ساتھ روا رکھے غیر متوازن ناروا سلوک کی عکاسی کرتا ہے۔ جس میں ایک گوشت خور جنگلی درندہ بھی یہ جانتا ہے کہ اس کی بقا کا دارومدار انسانی رویے پر ہے۔ ایک بار ہم نے کسی نیوز چینل پر یہ خبر بھی دیکھی کہ سندھ کے ایک گاؤں میں پینگولین (Pangolin) کو دیکھ کر لوگ ڈر گئے۔ گاؤں کے ایک سیانے کو بلوایا جنھوں نے پینگولین جیسے نایاب جانور کو بلا قرار دے کر اپنی نگرانی میں مارنے کا فریضہ ادا کیا اور پھر جلوس کی صورت میں اسے دور نہر میں پھینک آئے۔

عام لوگوں کی معلومات کی بنیاد ذرائع ابلاغ ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں قدرتی معلومات سے متعلق ایک بھی چینل نہیں ہے۔ جہاں تک بیرونی چینلز کی بات ہے تو وہ معلومات کی فراہمی کا بہترین اور موثر ذریعہ ہیں لیکن ان کی نشریات کا دکھایا جانا بھی حکمرانوں کی مرضی پر منحصر ہے۔ اب یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب ہم قدرتی معلومات فراہم کرنے والے چینلز کو بھی ممنوعہ قرار دے کر بند کر دیں گے تو پھر پینگولین کو بلا کہیں یا تیندوے کو رسی سے باندھ کر نچائیں کیا فرق پڑتا ہے۔

مارگلہ کے تیندوے کے تحفظ کے حوالے سے محکمہ وائلڈ لائف جو بھی موقف اپنائے لیکن اوپر بیان کیے گئے حقائق یہ بتاتے ہیں کہ پاکستان میں اس درندے کی نسل کو سنگین خطرات لاحق ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسانوں اور درندوں کے درمیان کم ہوتے فاصلے کا زیادہ تر نقصان درندے کو ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہ نقصان ان علاقوں میں اور بھی زیادہ ہوتا ہے جہاں بغیر کسی ٹاؤن پلاننگ کے انسانی آبادی کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہو۔ ہمارے سامنے اس کی سب سے بڑی مثال اسلام آباد کی ہے۔ جس کی تیزی سے پھیلتی حدود مارگلہ کے قدرتی حسن اور نایاب جنگلی حیات کے لیے سنگین خطرہ بنتی جا رہی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم مارگلہ کے پہاڑی تیندوے کی حفاظت کے لیے اپنی ذمے داریوں کا احساس کرتے ہوئے سائنسی انداز میں جدید طریقے اختیار کریں۔ ایسے طریقے جن سے نہ صرف قیمتی انسانی جان کا تحفظ ممکن ہو بلکہ معدوم ہوتی نایاب جنگلی حیات کو بھی ان کے قدرتی مسکن تک محدود کیا جا سکے۔

++

www.pakistanipoint.com

حاضر دماغ

ابو الفرح ہمایوں

جرائم کہاں نہیں ہوتے، یورپ میں تو سب سے زیادہ جرائم ہوتے ہیں اور اس انداز سے ہوتے ہیں کہ عقل حیران رہ جائے۔ اس شخص نے بھی ایک ایسا جرم کیا کہ عقل حیران اور ذہن پریشان ہوگیا۔

اس وقت مجھے رقم کی اتنی شدید ضرورت تھی جتنی کہ زندگی میں پہلے کبھی نہیں محسوس ہوئی تھی۔ مجھے ایک لمبی رقم کی طلب تھی تاکہ میں گزشتہ ایک سال کا گھر کا کرایہ اور ہوٹل کے کھانے کا خرچا ادا کرسکوں ورنہ آج میری خیر نہ تھی۔ مکان مالک اور ہوٹل کے مالک نے جو دونوں ایک ہی شخصیت تھے، مجھے آخری بار بڑے پیار سے سمجھایا تھا کہ کہیں نہ کہیں سے اور کسی بھی صورت سے مجھے کم از کم نصف رقم کا بندوبست کرنا ہے ورنہ ایسی اذیت ناک موت مارے جاؤ

گے کہ جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

گولڈن براؤن بڑی ہی ڈراؤنی شکل وصورت کا مالک تھا، اور اسی طرح دیوزاد بھی۔ وہ کئی برسوں سے ایک بیس منزلہ عمارت کرائے پر چلا رہا تھا جس میں چالیس فلیٹ تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک اوسط درجے کے ہوٹل کا مالک بھی تھا، تاکہ قانون کو دھوکا دے سکے، در پردہ اس کا کاروبار کچھ اور تھا۔ اپارٹمنٹ کے ایک مخصوص حصے میں وہ فحاشی کا اڈا چلا رہا تھا۔ دوسری طرف جوا اور قمار بازی چلتی تھی۔ منشیات کی درآمد و برآمد کا سلسلہ بھی خوب چلتا تھا۔ اس نے پورے شہر میں اپنی دھاک بٹھائی ہوئی تھی اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس کے خلاف کچھ بول سکتا۔ قانون کے محافظ اپنا اپنا حصہ وصول کر کے آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔

شومئی قسمت سے میں بھی گولڈن براؤن کے جال میں پھنس گیا تھا اور یہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ بقول اس کے ''غداری کی سزا موت'' مجھے وہ کارندے کی طرح وقت ضرورت استعمال بھی کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ حساب کتاب بالکل صاف رہنا چاہیے۔ چنانچہ میرے کام کا جو معاوضہ ہوتا وہ اس مد میں کٹ جاتا اور میرے ہاتھ کچھ بھی نہ آتا۔۔۔۔ اب یہ رقم پانچ ہزار پاؤنڈ سے تجاوز کر چکی تھی۔ میری زندگی کا دارومدار اب اسی وجہ سے برقرار رہ سکتا تھا کہ جیسے بھی بن پڑے، میں آج ہی یہ رقم اسے ادا کر دوں۔

سب تیاری اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت میں پکاڈلی سرکس کے چوراہے پر کھڑا تھا۔ مجھے کسی ایسے ''دوست'' کی تلاش تھی جو عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ہو۔ یہ وہ مقام ہے جس کے بارے میں کسی دانشور نے کہا ہے کہ اگر تم بیس منٹ یہاں کھڑے رہو تو کوئی نہ کوئی بیس سال پرانا دوست مل جائے گا۔ میں بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ''کوئی مرغا'' تلاش کر رہا تھا۔ بالآخر بیس منٹ پورے ہوتے ہی مجھے اپنے مطلب کا بندہ نظر آ گیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ، منحنی سا، فارغ البال شخص تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔۔۔ اپنے انداز اور چہرے مہرے سے دولت مند بھی نظر آتا تھا۔ وہ اس وقت بڑے انہماک سے ونڈو شاپنگ کر رہا تھا۔ شاید کسی خاص چیز کی تلاش میں تھا۔

میرا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور میں نے اس پر داؤ آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہی میرا وہ پرانا دوست تھا جسے آج میں بیس سال کے بعد دیکھ رہا تھا، ایک فیصلہ کر کے میں آگے بڑھا اور جلد ہی اس کو پالیا۔ ''ہیلو ٹامی ولسن! میرے پرانے یار ٹامی ولسن! کتنی خوشی کی بات ہے کہ آج بیس سال بعد تمہارے دیدار نصیب ہو گئے واللہ، آج میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے'' اور میں زبردستی اس سے یوں بغل گیر ہو گیا جیسے کہ مجھے بھی دنیا کی دولت نصیب ہو گئی ہو۔

میری اس والہانہ حرکت پر وہ اجنبی اچانک اچھل پڑا اور میری طرف یوں حیرت سے دیکھنے لگا جیسے اس نے کسی عفریت کو دیکھ لیا ہو۔ چند سیکنڈ بعد جب اس کے اوسان بحال ہوئے تو اس نے آنکھ مٹکا کر مجھے پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ہکلا کر کہا۔

''معاف کیجیے۔ میں.....ٹامی ولسن.....نہیں ہوں، میرا نام چارلی.....اسٹراس۔''

''اچھا؟'' میں نے حیرت اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ اپنا نام بدل لیا۔ چالاک اور ہوشیار لوگ اکثر اپنا نام بدل لیا کرتے ہیں تاکہ قانون یا کسی غیر قانونی پھندے سے بچے رہیں، مگر یاروں سے تو نہیں چھپ سکتے جو ہر آن تمہیں دیکھتے رہتے ہیں۔''

وہ دبلا پتلا اجنبی غصے سے لال پیلا ہونے لگا۔ مگر تھا مہذب ''جناب! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری آپ سے ملاقات پہلے کبھی نہیں ہوئی ہے۔''

''ہاں میرے دوست! دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب دولت آ جاتی ہے تو وہ غریب دوستوں کو بھول جاتے ہیں'' اور پھر یاس انگیز لہجے میں اسے اپنی اوقات یاد دلانے لگا۔

''تمہیں وہ زمانہ یاد ہے جب ہم تم ایک ہی اسکول میں پڑھا کرتے تھے اور پھر بعد میں ایک ہی کالج میں داخل ہو گئے۔'' اور پھر میں نے مخمور لہجے میں کہا۔ ''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ ہم تم دونوں ایک ہی لڑکی پر عاشق ہو گئے تھے مگر ہوا یہ کہ اس نے ہم دونوں کو چھوڑ کر ایک تیسرے لڑکے سے شادی کر لی اور ہم دونوں ہاتھ ملتے رہ گئے۔''

چارلی غیض وغضب سے تلملا رہا تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ مجھے کچا چبا جائے، مگر کمزور اور بیمار ہونے کی وجہ سے دانت کچکچا کر رہ گیا۔ ''تم کیوں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو؟ میں نے کہا نا کہ میں تمہارا دوست چارلی ولسن نہیں بلکہ ٹامی اسٹراس ہوں۔ میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔''

''اچھا اب مذاق چھوڑو۔ سیدھی طرح مان لو کہ تم

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

چارلی ولسن ہو۔ بعد میں تمہیں ایک بینک میں ملازمت مل گئی۔ وہاں تم نے کافی مال کمایا اور پھر ایک عمر رسیدہ دولت مند عورت سے شادی کرلی۔ مگر صرف دو ماہ بعد وہ تمہیں چھوڑ کر امریکا چلی گئی۔'' وہ ہکا بکا میرا منہ تک رہا تھا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ آج کل کہاں رہتے ہو۔ میں گھر پر آکر تم سے ملوں گا۔ یہاں یہ باتیں کرنا ٹھیک نہیں.....''

چارلی کے غصہ کا پارا اب آسمان کو چھونے لگا تھا۔ ''تم جیسے اوباشوں اور رہزنوں کو میں خوب پہچانتا ہوں۔ سیدھی طرح اپنی راہ لو ورنہ مار مار کر تمہارا بھرکس نکال دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کسی ارنے بھینسے کی طرح میری طرف بڑھا۔

''یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں۔ تم بچپن سے ہی ایسے ہو۔ غصہ تمہاری ناک پر دھرا رہتا ہے لیکن کچھ کر نہیں سکتے۔'' میں نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ''اگر اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں۔ کیا تمہاری کسی اور بچھڑے ہوئے دوست سے ملاقات ہوئی ہے؟''

چارلی نے شدت جذبات میں آکر ایک زبردست چانٹا میرے گال پر رسید کردیا۔ میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ لہٰذا ایک منٹ تک تو میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اور پھر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا، کیونکہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ ''مجھے تمہاری یہی بے تکلی پسند ہے، تم بہت شرارتی ہو۔'' اس اثنا میں چند راہ گیر وہاں کھڑے ہوگئے اور ہماری شرارت کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ''مائی ڈیئر ٹامی! آج کل وہ کالی، موٹی اور بھدی عورت کہاں ہے جسے تم نے اغواء کرلیا تھا اور پھر چند دن گزار کر اس کو چلتا کردیا۔'' میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ اتنے لوگوں کے سامنے اس کی بے عزتی ہو رہی تھی۔ میں بھی بیوقوفی میں یہ بات بھول گیا تھا۔ ازالہ کرنے کی خاطر میں نے اس کو بڑے پیار سے چمکارا۔ ''آؤ! اب گھر چل کر بات کرتے ہیں۔ اتنے عرصے بعد ملے ہیں، باتیں تو ختم نہیں ہوں گی۔ تمہارے گھر چلتے ہیں یا تم میرے گھر چلو۔''

میری باتیں سن سن کر چارلی پاگل ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی آستینیں چڑھائیں۔ منہ کف سے بھر گیا آنکھوں سے خونخوار چنگاریاں برسنے لگیں اور حلق سے ہیڑیے جیسی غراہٹ کی آواز بلند ہوتی چلی گئی جو لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی لیکن یہ سب گیدڑ بھبکی تھی۔ اس جیسے

ہوائی جہاز کے پرکے اجزاء

ہوائی جہاز کے پر کئی حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ پر کا بنیادی ڈھانچا اسپار اور رب (پسلی) کو جوڑ کر بنایا جاتا ہے۔ بعض پروں میں اسٹرنگر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اسپار اور اسٹرنگر دائیں بائیں رخ ہوتے ہیں جبکہ رب آگے پیچھے رخ پر ہوتے ہیں۔ آگے والے اسپار کے آگے سلیٹ لگائے جاتے ہیں جبکہ سب سے پچھلے اسپار کے ساتھ فلیپ اور ایلیرون جوڑے جاتے ہیں۔ فلیپ فیوزلاج کے ان بورڈ (اندرون) کی طرف اور ایلیرون آؤٹ بورڈ (بیرون) کی طرف لگائے جاتے ہیں۔ پر کے بنیادی ڈھانچے پر ڈیورالیومن کی چادر چڑھائی جاتی ہے۔ ڈھانچے کے اوپر سامنے کی طرف اسپائیلر لگائے جاتے ہیں۔ پروں کے ان تمام حصوں کے مخصوص کام ہوتے ہیں۔

بنیادی ڈھانچا جہاز کو لفٹ مہیا کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایندھن کی ٹنکیاں بھی اسی بنیادی ڈھانچے میں بنائی جاتی ہیں۔ سلیٹ اگلے اسپار کے آگے کی طرف اور فلیپ پچھلے اسپار کی پچھلی طرف سرکائے جا سکتے ہیں۔ فلیپ اور سلیٹ جہاز کے ٹیک آف اور لینڈنگ کے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ ان کو استعمال کر کے جہاز کی کم رفتار کی حالت میں بھی، پر کا رقبہ بڑھا کر، جہاز کی لفٹ میں اضافہ ہوجاتا ہے جو جہاز کی پرواز کی چڑھائی کے دوران اور اترتے وقت درکار ہوتی ہے۔ اسپائیلر پرواز کے دوران (اٹھا کر) جہاز موڑنے میں مدد دیتے ہیں گو کہ جہاز کو موڑنے کے لیے ایلیرون استعمال ہوتے ہیں۔ جب سیدھے ہاتھ کا ایلیرون اوپر کی طرف اٹھایا جاتا ہے اور الٹے ہاتھ کا نیچے کی طرف جھکایا جاتا ہے تو جہاز سیدھے ہاتھ کی طرف ڈول جاتا ہے۔ اس ڈولنے کی وجہ سے جہاز سیدھے ہاتھ مڑ جاتا ہے۔ زمین پر اترنے کے بعد اسپائیلر جہاز کی رفتار کم کرنے کے استعمال میں آتے ہیں۔

www.paksociety.com

نحیف ولاغر شخص کی کیا مجال کہ مجھ جیسے دیوقامت مشٹنڈے پر حملہ کر پاتا۔ بہرحال ہمت جمع کر کے وہ میری شان میں گستاخی کر ہی گیا۔

''خوا مخواہ میری جان سے چمٹے چار ہے ہو۔ کیسی دوستی اور کیسی یاری۔ میں نے تو آج سے پہلے یہ منحوس شکل دیکھی ہی نہیں۔ بڑا آ گیا ہے پرانا دوست بن کر۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میں ٹامی ولسن نہیں بلکہ چارلی اسٹراس ہوں۔ جاؤ! خدا کے لیے میری جان چھوڑ دو۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

لیکن میں بھی ہار ماننے والا کہاں تھا۔ کتنے طویل انتظار اور محنت کے بعد تو یہ مرغا قابو میں آیا تھا۔ اسے بھلا میں کیسے چھوڑ دیتا۔ چنانچہ معصوم سی صورت بناتے ہوئے میں نے بڑی عاجزی سے تماش بینوں سے گزارش کی کہ وہ خوا مخواہ اپنی راہ کھوٹی نہ کریں اور اپنی، اپنی راہ لیں۔ ہم دونوں بہت اچھے اور پرانے دوست ہیں۔ ذرا ہنسی مذاق کر رہے ہیں۔ میری بات سن کر بھیڑ چھٹنے لگی اور تب میں نے چارلی کو ایک آخری داؤ مار کر چت کر دیا۔

''اچھا چارلی! اب مذاق بہت ہو چکا۔ کام کی بات کرتے ہیں۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ ہم دونوں نے مل کر ایک سپر مارکیٹ میں ڈاکا ڈالا تھا۔ کافی مال ہاتھ لگا۔ لیکن تم بڑے چالاک نکلے۔ رقم کا تھیلا لے کر تم اچانک غائب ہو گئے اور میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہ گیا۔ تمہاری حالت سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس مال کے ذریعہ تم خوب پھل پھول رہے ہو۔ یہ ٹھیک آج سے بیس سال قبل کی بات ہے لیکن کہاں آن کے ٹوٹی کمند، آج تم پھنس ہی گئے۔''

چارلی میری طرف منہ پھاڑے یوں دیکھ رہا تھا گویا میں نے کوئی شعبدہ دکھا دیا ہو۔ بالآخر اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ ''لیکن وہ تم تو نہیں تھے؟ اس کارروائی میں میرے ساتھ ایک دبلا پتلا نوجوان لڑکا تھا جو جرائم کی دنیا میں نیا نیا آیا تھا۔''

اپنا داؤ کامیاب دیکھ کر میں خوشی سے پھولا نہ سمایا لیکن بظاہر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہاری یادداشت کمزور ہو گئی ہے۔ وہ میں ہی تھا۔ ورنہ یہ سب کچھ مجھے کیسے معلوم ہوتا؟ پولیس آج بھی ان دونوں کی تلاش میں ہے۔'' میں نے چوری، چوری اس کی حالت کا جائزہ لیا۔ وہ شکاری کے جال میں پھنسا کسی نازک پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ ''خیر! تم میرے دوست ہو۔ میں تمہاری اس اضطراری حرکت کو معاف کرتا ہوں لیکن تمہیں بھی کچھ قربانی دینی ہوگی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''بتاؤ! تم اب کیا چاہتے ہو؟'' چارلی نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

میرا سینہ فخر سے تن گیا۔ داؤ چل گیا تھا۔ حالانکہ واقعی اس ڈاکے میں میں اس کے ساتھ شامل نہیں تھا۔ میں نے بڑے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''تم کو میں نے دوست کہا ہے اس لیے تمہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ بس دس ہزار پاؤنڈ دے دو... اور میں ہمیشہ کے لیے اپنی زبان بند کر لوں گا۔ مجھے اتنا اندازہ تو ہے کہ وہ رقم ایک لاکھ سے اوپر ہی ہوگی۔''

چارلی کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اب گرا کہ تب گرا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کو تھام لیا۔ ''چارلی! ہوش میں آؤ۔ یہ وقت ڈراما کرنے کا نہیں ہے، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بس دس ہزار پاؤنڈ چپکے سے دے دو۔''

چارلی کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ اس نے مرے مرے لہجے میں میرے بازوؤں میں جھولتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تو میرے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہے بس پانچ ہزار میری جیب میں ہیں۔ یہ لے لو اور اپنی منحوس شکل لے کر دفع ہو جاؤ۔'' مارے غصے اور مجبوری کے وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو رہا تھا۔

میں نے دل میں کہا۔ ''بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی۔ اچھا لاؤ! وہی دے دو۔ باقی کا حساب کتاب پھر کبھی کر لیں گے اگر زندگی رہی۔''

چارلی نے لرزتے ہاتھوں سے رقم نکالی اور بڑی بے چارگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے میرے حوالے کر دی جس کو میں نے فوراً ہی اپنی اندرونی جیب میں منتقل کر دیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے پانچ ہزار پاؤنڈ گولڈن براؤن کے سامنے پھینک دیے اور بڑی نخوت سے اکڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو اپنی رقم اور آئندہ مجھے تنگ نہ کرنا، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔''

''اب تم آرام سے چند ماہ یہاں گزار سکتے ہو۔'' گولڈن براؤن نے بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

++

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کالے میگھا

شیراز خان

بارش نہ ہو تو خشک سالی اور ہوجائے تو علاقہ جل تھل۔ بارش کے لیے دنیا بھر میں کیسے کیسے ٹوٹکے کیے جاتے ہیں۔توہمات کے اسیر کیسی کیسی بچکانہ حرکتیں کرتے ہیں۔

عقل حیران کردینے والی تحریر

بارش و برسات۔ یہ ایک دلچسپ اور رومان پرور موضوع ہے۔اس کے کئی پہلو ہیں۔

ایک پہلوتو وہی رومان پرور ہے، دلوں کو موہ لینے والا، یادوں کو تازہ کرنے والا،تحریک دلانے والا۔

''موسم بدلا رت گدرائی اہلِ جنوں بے باک ہوئے۔''

''بارش ہوئی تو گل کے بدن چاک ہوگئے۔'' موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہوگئے۔''

قدرت نے اس موسم کوکتنا حسین کردیا ہے۔میں وہاں کی بات کرر ہاہوں، جہاں صفائی کا نظام ہو۔ جہاں بارش کا پانی جمع نہیں ہوتا۔ جہاں بارش باعثِ رحمت ہوتی ہے۔ باعثِ زحمت نہیں۔

اپنے شہر کا حال دیکھ لیں، گندے نالے ابل پڑتے

ہیں، ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ، ہر طرف افراتفری، جہاں آپ انجوائے کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔

کبھی کبھی تو بارش ہوتی ہے اور انتظامیہ کی نااہلی کی وجہ سے سارا لطف غارت ہو کر رہ جاتا ہے۔ ورنہ ''ابر میخانے پہ چھایا ہے کئی سال کے بعد..... ہوش برسات کو آیا ہے کئی سال کے بعد۔''

ویسے اس مضمون کا مرکزی خیال تو کچھ اور ہے لیکن تحریر کے وقت برمحل اشعار یاد آتے جا رہے ہیں اسی لیے لکھتا جا رہا ہوں۔

پروین شاکر کا خوبصورت شعر ہے۔ ''بارش ہوئی تو گل کے بدن چاک ہو گئے..... موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہو گئے۔''

مجھے یاد ہے کہ اپنے بچپن میں ہم بارش لانے یا بارش کا زور ختم کرنے کے لیے کیسے کیسے ٹوٹکے استعمال کیا کرتے تھے۔ ''کالے میگھا پانی دے..... سوہرس کی نانی دے۔'' وغیرہ یا جب بارش ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تو مٹی کی گڑیا بنا کر آنگن میں رکھ دیتے۔

یا پھر وہ غزل جو جگجیت نے گائی ہے۔ ''کاغذ کی پھرناؤ بنے اور جل تھل برسے ساون بھی..... تم آؤ تو لوٹ کے آئے بھولا بسرا بچپن بھی۔'' یا پھر وہ غزل ''وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی۔''

اب کہاں تک بچپن کو یاد کیا جائے۔ ہمیں اس مضمون میں دیکھنا ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں بارش کے لیے کیسے کیسے ٹوٹکے کیے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک معلوماتی مضمون ہے۔

لیکن اس سے پہلے یہ دیکھیں کہ بارش آخر ہے کیا اور کیوں ہوتی ہے۔

جہاں جہاں پانی موجود ہے۔ چاہے وہ ندی ہو یا نالہ ہو سمندر ہو یا جھیل سورج کی تیز کرنوں سے اس کا پانی بھاپ بن کر فضا میں جاتا رہتا ہے اور گیس کی صورت میں بادلوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وہ بادل جمع ہو کر بھاری ہوتے ہیں اور بارش کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

لیکن بارش اچانک نہیں ہوتی۔ بوندا باندی سے شروع ہوتی۔ ننھے ننھے قطرے مقدار میں زیادہ ہوں اور زمین پر ایک ساتھ گرنے لگیں تو بارش کہلاتی ہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ محکمہ موسمیات بتاتا ہے کہ آج اتنے ایم ایم بارش ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے پتا چلا کہ اتنے ملی میٹر بارش ہوئی ہے۔ تو اس کے ناپنے کے لیے مختلف اوزار استعمال کیے جاتے ہیں۔

کسی زمانے میں مرغ بادنما ہوا کرتا تھا۔ ہوسکتا ہے آج کی نسل نے یہ مرغ نہیں دیکھا ہو۔ اس کو چھت پر نصب کرتے تھے۔

اس میں ایک تیر ہوتا تھا جو ہوا کی ڈائریکشن بتاتا تھا اس سے بارش کے ہونے کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ اب تو بہت کچھ آ گیا ہے۔

جیسے Barometer, Anemom, Thermo, Weather vane Hygrome, Rain Gauge وغیرہ۔

انسانی تاریخ میں ایسی بارشوں کا سراغ ملتا ہے جنہوں نے زمین نگاہوں سے اوجھل کر دی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔

ہماری تاریخ میں ایک طوفان یا سیلاب بہت مشہور ہے اور وہ ہے طوفانِ نوح جس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ مذہبی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی اس طوفان کی نشانیاں مل جاتی ہیں۔

اس موضوع پر فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ جب بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابتدائی ایام میں جب زمین آگ کا گولہ تھی۔ اس وقت بے تحاشہ بارشیں ہوئی تھیں۔ ان بارشوں کی وجہ سے زمین ٹھنڈی ہوئی اور جنگل زمین کے سینے پر نمودار ہوئے۔

ایسی ہی تیز اور موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے سیلاب وجود میں آتے ہیں۔

تاریخ کے چند خطرناک سیلابوں کی کہانی کچھ یوں ہے۔

چین میں ایک جان لیوا سیلاب 1931ء میں زرد دریا میں آیا تھا۔ اس کے بعد دریا کا پانی ایک مہیب آسیب یا بلا کی طرح کناروں کو توڑتا ہوا بستیوں اور شہروں میں گھس آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دس سے چالیس لاکھ انسان اس سیلاب میں ہلاک ہوئے تھے اور 88 ہزار کلومیٹر کا رقبہ زیرِ آب آ گیا تھا۔

یہ ایک قیامت تھی جو اچانک ہی اس شہر پر نازل ہوئی تھی۔

کبھی کبھی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے دریا کنارے بنے بند بھی توڑ دیے جاتے ہیں۔

1938ء میں چین میں ایسا ہی ہوا تھا۔ کم از کم چار لاکھ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ا د ہلاک ہوگئے تھے۔

ایسا ہی ایک سانحہ 1975ء میں چین ہی میں ہوا تھا۔ ب کی لہریں دس سے تیس فٹ تک بلند تھیں۔ یہ پھنکارتا اب بے دریغ شہروں میں گھس آیا تھا اور تین لاکھ افراد بہا کر لے گیا۔ آفاتِ ناگہانی کسی کو سوچنے سمجھنے یا سنبھلنے کا نہیں دیتیں، دیکھتے دیکھتے سب کچھ تباہ ہوجاتا ہے اور ہلکے تنکوں کی طرح تیرنے لگتے ہیں۔

اسی لیے ناگہانی سے محفوظ رہنے کی دعائیں مانگی جاتی

طوفانِ نوح کی بات اور ہے۔ بار بار تنبیہ کی گئی، خبردار یا لیکن بدبخت لوگ پیغمبر کا مذاق اڑاتے رہے۔ پھر جو وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

1900ء میں امریکا میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ علاقہ تھا سان، اچانک بارش اور سیلاب نے سب کچھ اس طرح تباہ یا جس طرح کوئی دیو اپنے زبردست ہاتھوں سے کھلونوں پھوڑ کر رکھ دے۔

فون اور بجلی کے کھمبے اکھڑ گئے۔ کئی ریلیں اس سیلاب بہہ گئے۔ ہزاروں افراد ہلاک ہوگئے۔ مکانات تو مٹی وندے ثابت ہوئے تھے۔ ظاہر ہے ایسی مہیب آفات مقابلہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔

یہ ایک طویل فہرست ہے۔ بارشوں نے جہاں کھیتیاں کی ہیں، وہاں بستیاں برباد بھی کی ہیں۔

نہیں جب بارش نہیں ہوتی۔ کھیتیاں سوکھنے لگتی ہیں۔ سالی کا خطرہ ہوجاتا ہے۔ اس وقت دعائیں مانگی جاتی

نماز پڑھی جاتی ہے، جسے نمازِ استقسا کہتے ہیں۔ بہت ایک میدان میں جمع ہوکر خدا سے بارش کی دعائیں ہیں اور رحمتِ الٰہی کو جوش آجاتا ہے، بارش ہوجاتی

لیکن یقین محکم کی ضرورت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک طرح میدان میں نماز ادا کی گئی۔ بہت سے لوگ جمع ان میں صرف ایک بچہ تھا جو اپنے ساتھ چھتری لے کیوں کہ اسے یقین کامل تھا کہ اتنے لوگ بارش کی رہے ہیں اس لیے ضرور بارش ہوگی۔ اسلام میں تو سادہ طریقہ ہے جو بہت نیچرل ہے۔ جس میں کوئی ڈراما جاتا لیکن دنیا کے بہت سے ملکوں میں بارش کو بلانے طریقے ہیں۔

اس کا جائزہ لیں تو حیرت ہوتی ہے۔

یہ طریقے ٹوٹکے ہیں۔ اپنے طور پر وہ جادو جگانے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی کبھی بارش ہو بھی جاتی ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ان کے جادو اتنے طاقتور ہیں کہ ان کی وجہ سے بارش ہونے لگتی ہے۔۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خدا کو اس زمین کی تشنگی پر رحم آجاتا ہے اور وہ بادلوں کو حکم دیتا ہے کہ جاؤ، سیراب کردو، اور یہ بادل بارش برسانے لگتے ہیں۔

اکثر ملکوں میں پانی صرف بارش سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ بارش کے بغیر کھیتی تباہ ہوجاتی ہے۔ انسان اور جانور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرجاتے ہیں۔ لوگ نقل مکانی کرجاتے ہیں۔

غیر متمدن معاشرے میں بارش برسانے کے لیے ایک جادوگر ہوتا ہے۔ اس کو معاشرے میں ایک خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

جب بارش کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ جادوگر مصنوعی بارش یا بادلوں کا سوانگ رچاتے ہیں۔۔ اور جب موسم کو خشک کرنا ہوتا ہے تو یہ آگ جلاتے ہیں۔ اس قسم کے جادوئی عملیات وسطی آسٹریلیا کے علاوہ مشرقی اور جنوبی افریقا میں کیے جاتے ہیں۔

روس میں (Darput) کے علاقے میں جب بارش کی ضرورت ہوتو بارش بادلوں اور گرج چمک کا مکمل سوانگ رچا جاتا ہے۔

تین آدمی صنوبر کے متبرک درخت کے پاس جاتے ہیں۔ ایک کیتلی لے کر درخت پر چڑھ جاتا ہے۔ دوسرا درخت کے پاس ماچس لے کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ تیسرے کے پاس بھی ایک کیتلی ہوتی ہے۔ جس میں پانی بھرا ہوتا ہے۔

اب ایک آدمی کیتلی لے کر درخت پر چڑھ کر کیتلی کو زور زور سے بجانے لگتا ہے۔ جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ بادل گرج رہے ہیں۔ اور بارش ہونے والی ہے۔ ماچس والا بار بار ماچس کی تیلیاں جلا کر بتاتا ہے کہ بجلی چمکنے لگی ہے۔

جبکہ تیسرا کیتلی کے پانی کا ہر طرف چھڑکاؤ کرنے لگتا ہے۔ یعنی بارش شروع ہوگئی......

لیں صاحب عمل پورا ہوگیا۔ اب بارش ہو یا نہ ہو۔

پلوسا گاؤں میں خشک سالی ختم کرنے کے لیے پورے گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں برہنہ ہوکر ہاتھوں میں پانی سے بھرے برتن لے کر گیت گاتی ہوئی گاؤں کی سرحد تک برہنہ حالت میں جاتی ہیں اور پانی کا چھڑکاؤ کرتی ہیں۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نیوگنی کے Halma Hira اور گیلولو نامی جزیرے میں جادوگر ایک مخصوص درخت کی شاخ کو پانی میں بھگو کر چاروں طرف جھٹکا دیتا ہے۔ جس سے پانی کے چھینٹے دور دور تک جاتے ہیں۔ اس طرح گویا اس نے پانی کو مدعو کرلیا ہے۔

نیو Britan میں جادوگر سبز پتوں کو کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر دفن کردیتا ہے۔ اس کے بعد اپنے منہ میں پانی بھر کر منہ سے پانی کی پھوار نکالتا ہے۔ یہ اس کا عمل ہے۔ شمالی امریکا کے ''اوماہا انڈینز'' قبائل کی فصلیں جب خشک سالی سے تباہ ہورہی ہوتی ہیں تو متبرک ارکان (مذہبی پیشوا) ایک بڑے برتن کو پانی سے بھرنے کے، بعد اس کے گرد چار دفعہ ناچنے کے بعد ان میں سے ایک رکن منہ میں پانی بھرنے کے بعد ہر طرف اس کی پھوار مارتا ہے۔

اس کے بعد اس پانی کو زمین پر بہادیا جاتا ہے اور سب لوگ زمین پر لیٹ کر اس پانی کو زبان سے چاٹتے ہیں اور کیچڑ کو منہ پر مل کر گاؤں واپس آجاتے ہیں۔ ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے.....

بارش کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے۔ جی ہاں یہ بھی ایک ٹوٹکا ہے۔

شمالی امریکا کے Natc Hez میں لوگ بہار کے موسم میں جادوگر کے یہاں اکٹھے ہوکر جاتے ہیں اور اس سے اپنی فصلوں کے لیے اپنی پسند کا موسم خرید لیتے ہیں۔ بارش کے طلب گاروں کو جادوگر بانس کے ایک بڑے پائپ میں پانی بھر کر دائرے کی صورت میں بیٹھا دیتا ہے۔ اس کے بعد پائپ بجانے کو کہتا ہے۔ اس طرح چاروں طرف پانی کی پھوار گرنے لگتی ہے۔ لیجیے صاحب، بارش اب آنے والی ہے۔

اسی طرح جب بارش روکنی ہو تو جادوگر ایک بانس لے کر بادلوں کو ہٹ جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ بادل چھٹ جاتے ہیں۔

میں بار بار یہی کہوں گا کہ ان رسومات کے تقابل میں ذرا اپنے مذہب کو دیکھیں۔ آپ کو ہر جگہ خرافات کا جمعہ بازار دکھائی دے گا اور آپ اپنے مذہب پر فخر محسوس کریں گے۔

اب وسطی انگونی لینڈ کی ایک رسم دیکھ لیں۔

اگر وقت پر بارش نہ ہو تو علاقے کے لوگ بارش کے مندر کی مرمت شروع کردیتے ہیں۔ وہ مندر کے اردگرد کی گھاس پھونس ہٹاتے ہیں۔ پھر سربراہ ایک گڑھا کھودتا ہے۔ اس میں شراب بھردی جاتی ہے۔

اس کے بعد سربراہ بلند آواز میں کہتا ہے۔ ''اے میرے آقا چاؤٹا، تم نے اپنا دل ہماری طرف سے کیوں کرلیا ہے۔ ہماری خطائیں معاف کردو۔ تمہاری سرد ہمیں فنا کردے گی۔ ہم تمہارے بچے ہیں۔ دیکھو ہم تمہارے پینے کے برتن کو شراب سے بھردیا ہے۔ اب بارش کی بھیک دے دو۔''

اس کے بعد قبیلے کے تمام چھوٹے بڑے اس گڑ کے شراب کو پی جاتے ہیں۔ مائیں گود کے بچوں تک کو شر چٹاتی ہیں۔

شراب پینے کے بعد وہ ہاتھوں میں ٹہنیاں پکڑ کر نا اور بارش کی طلب کے گیت گاتے اپنے گاؤں کو واپس آجا ہیں۔

گاؤں کے دروازے پر ایک بوڑھی عورت ایک بڑ برتن میں پانی لیے کھڑی رہتی ہے۔ آنے والے اپنی چھڑی اس پانی میں بھگو کر چھینٹے اڑاتے ہیں۔ اس کے س ہی ان کے عقیدے کے لحاظ سے کالے بادل چھانے ہیں۔

آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ان تمام رسومات کے دو ہیں۔ ایک جادوئی اور دوسرا مذہبی۔

پانی کے چھینٹے اڑانا۔ منہ میں پانی بھر کر چھینٹے اڑا یہ سب جادوئی عمل ہے لیکن شراب کا نذرانہ دینا اور دعا مانگنا مذہبی عمل ہے۔ (یہ ان کے مذہبی عمل کا حصہ ہے)

شمالی آسٹریلیا کے مارا قبیلے کا جادوگر قحط سالی کے خا کے لیے تالاب پر جاکر جادوئی گیت گاتا ہے۔ اس کے ب اسی تالاب کے پانی کو منہ میں بھر کر چھڑکتا جاتا ہے۔

ایک عرب مؤرخ حضرت موت کے خانہ بدوش قبا کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ بارش روکنے کے لیے درختوں ٹہنیاں جلاتے ہیں پھر ان جلتی ہوئی ٹہنیوں پر پانی گرا ہیں۔ اس طرح بارش رک جاتی ہے۔

انڈیا میں منی پور کے لوگ بھی اسی قسم کا ٹوٹکا کر ہیں۔

عربوں کے علاوہ ساری دنیا کے لوگ بارش روکنے کے لیے اسی قسم کا ٹوٹکا کرتے ہیں۔

(ہمارے اسلام میں بارش کی زیادتی اور کسی آفات روکنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم آذانیں دیتے ہیں۔ کتنا باوقا طریقہ ہے)

وسطی آسٹریلیا کے ڈیری قبائل کی بارش برسانے کی رسمیں بہت انوکھی اور دلچسپ ہیں۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ان کا یہاں بارش کا دیوتا مورا موزا ہے۔

اس کو متوجہ کرنے کے لیے ایک بڑا سا گڑھا کھودا جاتا ہے۔ اس گڑھے پر شہتیر اور دیگر لکڑیاں رکھ کر ایک بڑا سا جھونپڑا بنا دیتے ہیں۔ اس جھونپڑے کی چھت پر دو بھاری پتھر رکھ دیتے ہیں۔

اس عمل کے بعد جادوگروں کی آمد ہوتی ہے۔ یہ وہ ہوتے ہیں جو مورا موزا کی روح کو بلانے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔

دو جادوگر ہوتے ہیں۔ دونوں کسی تیز دھار آلے سے اپنی دونوں کہنیوں کو زخمی کر کے اس کا خون نکالتے ہیں۔ پھر اس خون کو چلو میں بھر کر لوگوں پر چھڑکا جاتا ہے۔ کچھ خون لوگوں کو لگ جاتا اور کچھ زمین پر گر جاتا ہے۔

زمین پر گرنے والا خون بارش کی اور لوگوں کو لگنے والا خون بادلوں کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

کہانی یہیں پہ ختم نہیں ہوتی۔ اب دونوں پتھر جھونپڑے کی چھت سے اتارے جاتے ہیں اور دونوں جادوگر ان پتھروں کو لے کر پندرہ بیس میل کا سفر طے کر کے کسی بڑے درخت کے اوپر رکھ دیتے ہیں۔

یہ بادلوں کی علامت ہیں۔ اب زمین پر جپسم پیس کر ایک طویل لکیر بنائی جاتی ہے تا کہ بارش کا دیوتا اس کو اوپر سے دیکھ کر سمجھ جائے کہ ان لوگوں کو بارش کی ضرورت ہے۔

پھر وہ سب واپس اسی جھونپڑے کے پاس آتے ہیں اور اس کے چاروں طرف دوزانو بیٹھ جاتے ہیں، اپنے سروں سے جھونپڑے کی دیواروں کو ٹھوکر مارنے لگتے ہیں۔ اس حد کہ ان کے سر سے خون ٹپکنے لگتا ہے پھر وہ کسی سے کچھ بولے بغیر چلے جاتے ہیں یعنی عمل ختم ہوا، اب بارش کا انتظار کریں، (دیکھا کیسی کیسی محنت کی جاتی ہے)

بارش برسنے پر بعض قبائل کے لوگ اپنے بازوؤں اور سینے پر چیرے لگواتے ہیں۔ جب خون بہنے لگتا ہے تو زیادہ سرخی ظاہر کرنے کے لیے گیرو بھی لگاتے ہیں۔ اس عمل میں بچے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور خوب اچھلتے کودتے ہیں تا کہ بارش مسلسل ہوتی رہے۔

ہوتا یہ ہے کہ زخموں کی وجہ سے اور بارش میں بھیگنے کی وجہ سے ان لوگوں کو بخار آجاتا ہے جنہوں نے چیرے لگوائے ہیں۔ یہ سمجھ لیں کہ بارش آئے یا نہ آئے بخار ضرور آجاتا ہے۔ کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں۔

اب ایک عقیدہ اور دیکھ لیں۔ یہ عقیدہ جڑواں بچوں کے حوالے سے ہے۔

لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جڑواں بچے موسم پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور سیلاب وغیرہ لا سکتے ہیں۔ یہ انوکھا وہم برٹش کولمبیا کے بعض قبائل کو بہت زیادہ ہے۔

یہ لوگ دعا بھی اس طرح مانگتے ہیں۔ ”جڑواں بچوں کے حوالے سے ہمیں بارش دے یا بارش کو روک دے۔“

ان کا عقیدہ ہے جڑواں بچے مچھلی کی تحلیلی شکل ہیں۔ اسی لیے وہ ایسے بچوں کو پانی کے قریب نہیں جانے دیتے کہ وہ کہیں دوبارہ مچھلی نہ بن جائیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ایسے بچے اپنے ہاتھوں کی حرکت سے ہوا کو روک سکتے ہیں یا بارش لا سکتے ہیں۔ یا کسی بیمار کو اچھا کر سکتے ہیں۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 12000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 11000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا ثمر عباس: 2454188-...
سرکولیشن منیجر سید منیر حسین: 269-...

جاسوسی ڈائجسٹ ... 2020ء

یہ ایک طویل سلسلہ ہے، اندازہ لگالیں کہ دنیا بھر میں کیسے کیسے واہمے ہیں۔

ہندوستان میں اور بھی عجیب طریقے رائج ہیں جوان کی مذہبی کتابوں میں درج ہیں۔

اندرا دیوی بارش اور بجلی کی دیوی ہے۔

پروفیسر اولڈن برگ نے ریسرچ کے بعد اور ہندو برہمن سے طویل انٹرویو کے بعد لکھا ہے کہ ہندو کچھ کلمات کا اشلوک کرتے ہیں بارش کے لیے، لیکن ان کلمات کو دہرانے یا ان کو پڑھ کر بارش برسانے کی ذمے داری چند خاص لوگوں کی ہوتی ہے جو کچھ شرائط پوری کرتے ہیں۔

یہ اشلوک اندرا دیوی کے لیے ہوتے ہیں جس کے ہاتھ میں بجلی کا کوڑا ہوتا ہے اور جس کی سواری بادلوں پر ہوتی ہے، وہ چند کلمات دہراتے ہیں، یہ ایک گیت ہے۔

یہ کلمات ایک قدیم ہندی کتاب ''سام وید'' کے ہیں۔

اس کو سکواری کا گیت کہتے ہیں۔

برہمن اپنے چند شاگردوں کو بن باس کے لیے جنگل کی طرف بھیج دیتا ہے۔ اس بن باس کا عرصہ ایک برس سے لے کر بارہ برس تک محیط ہوتا ہے۔

اس دوران ان لوگوں کو مختلف شرائط کی پابندی کرنی ہوتی ہے۔ جیسے

1۔ کالے کپڑے پہننا اور کالی اشیا کھانا۔

2۔ دن میں تین بار پانی کو چھونا۔

3۔ بارش کے وقت سائبان یا چھت کے نیچے سے نکل کر بارش میں بیٹھنا۔

4۔ سکواری پڑھنا (گیت)

5۔ جب بجلی کا کوندا لپکے تو کہنا۔ ''یہ سکواری نغمہ کی مانند ہے۔

6۔ بادل گرجنے پر کہنا۔ ''عظیم دیکتا اس آواز کو پیدا کررہا ہے۔''

7۔ ندی کے پانی کو چھو کر پرنام کرے بغیر ندی پار نہ کرنا۔

8۔ جب تک اس کی زندگی کو خطرہ نہ ہو سمندری سفر نہیں کرسکتا اور بحری جہاز میں سوار ہوتے ہوئے وہ پانی کو ضرور چھوئے گا۔

9۔ پانی کو دیکھ کر وہ کہے گا۔ ''سکواری کے نغمے کا حسن میرے سامنے ہے۔''

بن باس مکمل ہونے کے بعد اسے سکواری کا نغمہ الاپنے کی اجازت مل جاتی ہے، وہ اس وقت اپنے برتن یا صراحی میں کئی قسم کے پودے لے کر ان کو پانی میں تر کر دیتا ہے، پھر کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈبو دے۔

اس کے بعد اس شخص کو پرجانیا کا خطاب مل جاتا ہے اور اس کے قبضے میں بارش برسانے کی قوت آجاتی ہے۔

اولڈن برگ کہتے ہیں کہ وہ کالا لباس اس لیے نہیں پہنتا کہ کہیں اس پر بجلی نہ گر پڑے۔ اتفاق سے خود ہمارے یہاں بھی اس قسم کا واہمہ موجود ہے۔

اب تو مصنوعی بارشیں بھی برسائی جانے لگی ہیں۔

بہت سے ملکوں میں بارشوں کا تجربہ کیا جاچکا ہے۔

حالیہ برسوں میں دبئی میں بھی مصنوعی بارش ہوئی تھی۔

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا ہو جائے گی۔

اب یہ دیکھیں کہ مصنوعی بارش کیسے ہوتی ہے۔

ہوا میں پانی کے ذرات شامل ہوتے ہیں جو بادل تو بناتے ہیں لیکن اتنے بوجھل نہیں ہوتے کہ بارش کی صورت میں برس سکیں۔ ایسی صورت میں کچھ کیمیکلز کی مدد لی جاتی ہے۔ جیسے Caciam Oxide, Compond of Urea, Ammo Nium Nitrate وغیرہ۔

ان کیمیکلز کو بادلوں کے اوپر چھڑک دیا جاتا ہے۔ بادل بوجھل ہو کر بارش برسانے لگتے ہیں۔

یہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بارش بہت مہنگی پڑ جاتی ہے۔ کیمیکلز بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ دبئی جیسے ملک ہی برداشت کرسکتے ہیں۔

یہ سب چند باتیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہوگا۔

ہندوستان میں بارش کے وقت لڑکیاں جھولے ڈال لیتیں۔ طرح طرح کے پکوان تلے جاتے۔ خاص طور پر پکوڑے، یا بیسن کی کوئی اور چیز۔

اس طرح بارش کا استقبال کیا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ بارش ایک رحمت ہے۔ خدا کی۔

سائنسی ریسرچ کے مطابق۔ بادلوں میں بجلی کا کوندا بھی ایک نعمت ہے۔ آس پاس کے علاقوں سے مختلف قسم کے معدنیات سمٹ کر بادلوں میں آجاتی ہیں پھر وہ سب بارش کی صورت میں زمین پر آجاتی ہیں اور کھیتیوں کو وہ منرلز مل جاتے ہیں جو انسانی کوششوں سے نہیں مل سکتیں۔

پس تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

گائیڈ

منظر امام

ایک اچھے قلمکار کی پہچان یہی ہے کہ اس کی تحریر قارئین کے ذہن و دل پر نقش ہوجائے۔ ''مال گڑی ڈیز'' کی کہانیاں بھی ایسی ہی کہانیاں ہیں جن پرفلمیں بھی بنیں اور ڈراماسیریلیز بھی۔

ایک مقبول عام کہانیوں کے مجموعہ کا تذکرہ

ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھے ہوئے آر کے نارائین کو بہت کچھ دکھائی دے رہا تھا۔

وہ ایک خاموش علاقہ تھا۔ شہر کے ہنگاموں سے دور۔ نارائین اکثر یہاں آکر بیٹھ جاتا تھا اور کہیں دور سے ریل کی سیٹی سنائی دیتی تھی۔ نارائین کے لیے اس سیٹی میں بہت کشش تھی۔ اسے ایسا لگتا جیسے زندگی مسافرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ بس چلتے ہی جانا ہے کسی انجانی منزل کی طرف۔

نارائین کی آنکھوں کے سامنے صرف ایک میدان کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس میدان کے کنارے کنارے بہت سے پیڑ بھی تھے جن سے اس علاقے کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔

اس کی آنکھیں ان مناظر سے پرے بہت کچھ دیکھ رہی تھیں۔

نارائین ایک رائٹر تھا۔ اس نے بہت کچھ لکھا تھا۔

اس کی آنکھیں ہمیشہ ایک ایسے شہر یا بستی کے خواب دیکھا کرتیں جس کو وہ اپنی مرضی کا بنا سکتا۔ اپنی مرضی کے چھوٹے بڑے گھر، سڑکیں، گلیاں، دکانیں۔ ان میں بیٹھے ہوئے دکاندار۔ سودا خریدنے والے۔ آتی جاتی لڑکیاں۔ ان کی محبتیں۔ ان کے مسائل۔ گلیوں میں کھیلتے ہوئے بچے۔ وہ ایک الگ دنیا ہوتی۔ اس کی اپنی دنیا جس میں وہ جس کو چاہتا غریب کردیتا جس کو چاہا دولت دے دی۔

اس بستی کے سارے کردار اس کی مرضی کے پابند ہوتے۔

نارائین نے اس بستی کے خاکے بننے شروع کردیئے اور اس کی یہ سوچ اس کے لیے شہرت کا سبب بن گئی۔ اس نے ایک خیالی بستی آباد کردی۔ جس کا نام اس نے ''مالا گڈی'' رکھا۔

اب یہاں سے تخیل کی کارفرمائیاں شروع ہوتی ہیں۔ اس نے ڈھیروں کردار تخلیق کیے اور انہیں اپنی خیالی بستی مالاگڈی میں لاکر آباد کردیا اور پھر ان کرداروں کی کہانیاں شروع ہوگئیں۔

وہی سب کچھ ہونے لگا جو کسی بھی بستی میں ہوا کرتا ہے۔

آر کے نارائین ساؤتھ انڈیا کے شہر مدراس میں 1906ء میں پیدا ہوئے تھے۔ میسور کے مہاراجا کالج میں تعلیم پائی۔ ان کا پہلا ناول ''سوامی اور دوست'' تھا۔ اس کے بعد مالاگڈی ان کے سپنوں کا شہر بن گیا اور جتنی بھی شارٹ اسٹوریز لکھیں۔ وہ اسی شہر کے پس منظر میں لکھیں۔

سوامی اور دوست، اسی خیالی شہر کے ایک اسکول سے شروع ہونے والی کہانی ہے۔ جس میں سوامی تعلیم حاصل کررہا ہے۔ اس اسکول میں ہر طرح کے طالب علم ہیں۔ سوامی ایک جذباتی لڑکا ہے۔ وہ اپنے بھگوانوں کی توہین برداشت نہیں کرسکتا جبکہ اس اسکول کا کرسچن ٹیچر ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کا مذاق اڑاتا رہتا ہے۔

ایک اور لڑکا ہے جس کا باپ ایک بڑا پولیس آفیسر ہے۔ وہ اپنی گاڑی پر آیا کرتا ہے۔

یہ اس کی مالاگڈی کے پس منظر کی پہلی کہانی ہے۔

وجے آنند کئی فلمیں بنا چکا تھا۔

اس کی فلموں کی ایک خاص بات یہ ہوا کرتی کہ وہ مصنوعی ماحول اور مصنوعی کرداروں سے پرہیز ہی کیا کرتا تھا۔

اب اس کا ارادہ ایسی کسی فلم کا تھا جس کا ماحول بھی شہر سے الگ تھلگ ہو اور جس کے کردار بھی زندگی کی فضاؤں میں سانسیں لے رہے ہوں، یہ زمانہ تھا 1964ء کا جب اس نے پلاننگ کی تھی۔

اس کے ایک دوست نے اسے ایک ناول لاکر دیا۔

''یہ لو اسے پڑھو پھر اپنی رائے دو۔''

''کس کا ناول ہے؟''

''آر کے نارائین کا۔'' دوست نے بتایا۔

''وہی تو نہیں جس نے ایک خیالی دنیا آباد کر رکھی ہے؟''

''ہاں! یہ اسی کا ناول ہے۔ اس میں زندگی ایک صاف ستھرے ماحول میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔'' دوست نے کہا۔ ''میں نے جب یہ ناول پڑھا تو مجھے خیال آیا کہ یہ ناول تمہارے ارادوں کے لیے بالکل مناسب ہوگا۔ کیوں کہ شاید تم کو اسی قسم کی کہانی کی تلاش ہوگی۔''

آنند نے اس ناول کو پڑھنا شروع کردیا جیسے جیسے وہ اس ناول کو پڑھتا گیا ویسے ویسے ناول اس کے ذہن و دل میں اپنی جگہ بناتا چلا گیا۔ کمال کا ماحول تھا اور لاجواب منظر نگاری تھی۔

زندگی کی دھڑکنیں وہاں کے ہر گوشے اور ہر کونے سے سنائی دیتی تھیں۔

یہ انسان کی transformation of personality کی بہت اچھی کہانی ہے۔

کہانی کا مختصر خلاصہ کچھ یوں ہے۔ ''راجو ایک ریلوے اسٹیشن کے پاس پیدا ہوا۔ اسی ماحول میں اس نے پرورش پائی ہے۔ راجو کے باپ کی دکان اسٹیشن کے پاس ہی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں بستی والوں کی ضروریات کا سامان فروخت ہوا کرتا۔

راجو چونکہ اسی ماحول اور اسی علاقے میں پیدا ہوا ہے۔ اس نے اس علاقے کی سیر کے لیے آنے والوں کی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

رہنمائی بھی شروع کردی۔ فرصت ملتے ہی وہ دکان سے نکل کر ان سیاحوں کے پاس آجاتا' پھر وہ باقاعدہ گائیڈ بن گیا۔ اس کی باتیں بھی لچھے دار ہوا کرتیں اسی لیے سیاح اس کو بہت پسند کرتے تھے۔

ایک بار دو سیاح اس علاقے کی سیر کے لیے آئے۔ ایک روزی جو ایک ڈانسر تھی۔ کلاسیکل ڈانسر۔ جس کی زندگی آرٹ کے لیے تھی جو نیچر کی دلدادہ تھی اور دوسرا اس کا شوہر مارکو جو ایک اسکالر اور ایک انتھراپولوجسٹ تھا۔ جس کی زندگی کا مقصد آثار قدیمہ کی کھوج تھا جو قدیم محلات اور کھنڈرات میں حسن تلاش کیا کرتا۔ اس کی بیوی روزی ایک جوان اور خوب صورت عورت تھی لیکن مارکو کے لیے حسن سنگ تراشی کے پرانے شہکاروں میں تھا۔

ان دونوں نے راجو کی خدمات بطور گائیڈ حاصل کرلیں۔ انہوں نے راجو کے بارے میں سن رکھا تھا۔ ان دونوں نے ایک ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ راجو روز صبح ان کے پاس پہنچ جاتا اور دونوں اس کے ساتھ سیر کے لیے چل پڑتے۔ مارکو (روزی کا شوہر) کھنڈروں اور غاروں پہ ریسرچ ورک کرتا رہتا جبکہ روزی راجو کے ساتھ اِدھر اُدھر کی سیر کے لیے نکل جاتی۔ ایک بے فکری کی لاابالی زندگی گزر رہی تھی۔ جتنے بھی دن تھے... وہ بہت خوش گوار تھے۔ راجو کو پہلی بار ایسا تجربہ ہورہا تھا۔ جب اس کی دھڑکنیں بے تاب ہونے لگی تھیں۔

ایک بار روزی نے کہا۔ ''راجو میں نے سنا ہے کہ اس علاقے میں کنگ کوبرا کا ڈانس بھی ہوتا ہے۔''

''جی میم صاحب! پرسوں ہونے والا ہے۔ اس کو دیکھ کر آپ اپنا ڈانس بھی بھول جائیں گی۔''

''اوکے! تم مجھے دکھا دینا۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''جی میم صاحب۔ صاحب کو بھی ساتھ لے لینا۔'' راجو نے کہا۔

روزی خاموش ہوگئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''کسی پتھر کو ایسی چیزیں دکھانے کا کیا فائدہ؟''

یہ پہلا موقع تھا کہ روزی نے اپنے شوہر مارکو سے ایک بےزاری کا اظہار کیا تھا۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ اگر مارکو اس کے ساتھ ہوتا تو کیا وہ ان پہاڑیوں اور کھنڈرات میں اس کی طرح بھاگ دوڑ کرسکتی تھی۔ کیا ایک دوسرے کو [illegible]نے کا کھیل کھیل سکتی تھی۔

کیا زندگی کی اتنی ڈھیر ساری مسرتیں اس کے پاس آسکتی تھیں؟ کبھی نہیں۔

ہوا بھی یہی۔ جب راجو نے مارکو سے کہا۔ وہ کنگ کوبرا کا ڈانس دیکھنے چلے تو مارکو نے معذرت کی۔ اسے ایک پرانے کھنڈر میں بدھ مت کے آثار پر ریسرچ کرنی تھی۔ روزی اور راجو وہ ڈانس دیکھنے چلے گئے۔

دونوں نے ایک دوسرے کے قرب کو نا صرف محسوس کرلیا تھا بلکہ قبول بھی کرلیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ یہ بہت پرانی کہاوت ہے اور زندگی کے تجربات سے کشید کی گئی ہے۔

یہاں بھی یہی ہوا۔ ان دونوں کی دلچسپی مارکو سے اوجھل نہیں رہ سکی۔ اس نے محسوس کرلیا کہ روزی کی پرواز کی فضا کچھ اور ہے اور خود اس کی دنیا کچھ اور ہے۔ وہ ایک دن روزی سے بول کر مدراس واپس چلا گیا جہاں سے دونوں آئے تھے۔

اب راجو تھا اور روزی تھی۔ اس علاقے کی ہوائیں تھیں۔ رومان پرور ماحول تھا۔ رقص تھا اور زندگی تھی لیکن کب تک زندگی کا یہ لاابالی انداز کب تک ساتھ دیتا ہے (یہ راجو کی زندگی کا پہلا فیز تھا)

اس کی زندگی کا دوسرا فیز اس وقت سامنے آیا... جب باپ کی دکان فیل ہوگئی۔ کیوں کہ راجو تو اب صرف روزی کا ہوکر رہ گیا تھا۔ اس کو دکان کی دیکھ بھال کرنی تھی لیکن وہ نہیں کرسکا جبکہ باپ کا بھی انتقال ہوچکا تھا۔ صرف ماں تھی۔

ماں کے لیے ایک پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے راجو کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں سننے لگی تھی۔ گاؤں والے اسے بتاتے تھے کہ اس کا بیٹا ایک شادی شدہ عورت کے جال میں گرفتار ہوگیا ہے اور اسی کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔

ماں کو اس بات کا بہت دکھ ہوا۔ اس نے راجو کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ بھوت آسانی سے اترنے والا کہاں تھا۔ ماں راجو سے ناراض ہوکر گھر چھوڑ کر اپنی بہن کے یہاں چلی گئی۔ راجو کی دکان تو بند ہو ہی چکی تھی۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

اس نے ایک دن روزی سے کہا۔ ''روزی تم بھارت ناٹیم کی ماہر ہو۔ کیوں نا زندگی کو آسان کرنے کے لیے تم یہ رقص کا سلسلہ دوبارہ شروع کردو۔''

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''لیکن اب مجھے پریکٹس نہیں رہی۔'' روزی نے بتایا۔

''تم اگر گھر میں پریکٹس کرلو تو میرا خیال ہے کہ تمہاری مہارت واپس آجائے گی۔''

''لیکن اس سے ہوگا کیا؟''

''بہت کچھ ہوگا۔'' راجو نے کہا۔''تم یہاں کے بڑے بڑے مندروں میں اپنے رقص کے جوہر دکھاؤ گی۔ اس کا تمہیں معاوضہ ملے گا۔ ہماری مالی پریشانیاں دور ہوجائیں گی۔''

روزی نے ڈانس کی ابتداء کردی۔ راجو اس کا مینیجر بن گیا تھا۔

اب پیسے آنے لگے تھے۔ راجو نے اپنی دکان کے چکر میں اور روزی کو گھمانے پھرانے کے لیے بہت سوں سے قرض لے رکھا تھا۔ اس کے لیے ادائیگی مشکل ہورہی تھی۔ اس نے اب مجبور ہوکر پینٹنگ شروع کردی۔ اس نے روزی کا چیک بک چرا کر اس کے جعلی دستخط بنا کر بینک سے پیسے نکلوانے شروع کردیئے۔

روزی کو پتا چل گیا لیکن راجو کے رونے دھونے پر اس نے کچھ نہیں کہا۔

اس دوران مارکو روزی کو منانے کے لیے واپس آگیا۔ راجو نے ایک حرکت اور کی اس نے روزی کے زیورات چرا کر بیچ دیئے۔ مارکو کو پتا چل گیا اس نے پولیس میں رپورٹ کروادی۔

راجو گرفتار ہوگیا۔ اس کو دو سال کی سزا ہوگئی تھی۔

یہ اس کی زندگی کے دوسرے فیز کا اختتام تھا۔

اس کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب وہ جیل سے رہا ہوکر باہر آیا۔ اس کے پاس اب کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی مستقبل نہیں۔ کوئی منزل نہیں۔ صرف طویل راستے تھے جو اسے کسی طرف لے جارہے تھے۔ (یہاں سے اس کی زندگی کا تیسرا فیز شروع ہوتا ہے)

اس طرف گاؤں کا ایک آدمی آنکلتا ہے۔ وہ راجو کو مہاتما سمجھ لیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ گاؤں کے مندر میں کوئی اوتار اتر آیا ہے۔ وہ گاؤں والوں کو جا کر بتاتا ہے۔ اب کیا ہے۔ لوگ اس کے درشن کے لیے آنے لگتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اس کے لیے کھانے پینے کی چیزیں اور کپڑے وغیرہ بھی لاتے ہیں۔

ہر طرف یہ بات پھیل جاتی ہے کہ ایک دیوتا اس مندر میں آکر رہنے لگا ہے۔

راجو کے لیے یہ زندگی کا ایک نیا اور دلکش روپ ہے۔ اس کو اس گاؤں میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ لوگ اس کا دیدار کیا کرتے ہیں۔

اب وہ اپنی تعلیم اور اپنے تجربات کام میں لاتا ہے۔ وہ گاؤں والوں کو نصیحتیں کرتا ہے۔ انہیں سچائی کی راہ پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کی باتیں سن سن کر بہت سے بے راہ رو سیدھے راستے پر آجاتے ہیں۔

یہ transformation کا ایک لاجواب کیس ہے جس کو نارائن نے بہت خوبی سے تحریر کیا ہے۔ ناول نگار نے انسانی گہری نفسیات کی پرتیں کھولی ہیں۔ یہ بتایا ہے کہ زندگی ہر روپ میں امتحان لیتی ہے۔

کیسے کیسے فیز اس کے سامنے آتے رہے۔ جب وہ باپ کی موت کے بعد مفلس ہوگیا تھا تب بھی ایک امتحان ہی کا مرحلہ تھا۔ جب روزی سے اس کی ملاقات ہوئی اور اس نے جعل سازی کی وہ مرحلہ بھی امتحان کا تھا۔

قدرت ہر انداز میں اس کو آزما کر دیکھ رہی تھی اگر وہ اس وقت سنبھل جاتا تو ممکن تھا کہ کہانی کچھ اور ہو جاتی لیکن اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ وہ خود پر قابو نہیں رکھ سکا اور اسے سزا ہوگئی۔ اس کے بعد اسے ایک اور موقع دیا گیا۔

ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہم سب کی زندگی میں قدرت ہمیں سنبھلنے کا موقع ...دیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ وہ قید سے رہا ہوکر ایک مندر میں پہنچا اور اسے وہاں سادھو صفت سمجھ لیا گیا۔

یہ اس کی زندگی کا ایک اور امتحان تھا۔ قدرت نے اسے سنبھلنے کا ایک اور چانس دے دیا تھا۔ زندگی کی جھولی میں یہ سارے تماشے رکھے رہتے ہیں۔

ایک پریشان حال دیہاتی اس مندر کی طرف آنکلتا ہے۔ وہ راجو کو سویا ہوا دیکھ کر یہ خیال کرتا ہے کہ یہ کوئی مہاتما ہے۔ راجو جاگ جاتا ہے۔ وہ دیہاتی اسے اپنی پریشانی بتاتا ہے۔ اس کی ایک پریشانی یہ ہے کہ اس کی بہن شادی کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی۔ راجو اس کی بہن کو بلا کر سمجھاتا ہے۔ اس کی باتوں میں ایسا اثر ہے کہ وہ شادی کے لیے تیار ہوجاتی ہے۔ وہی دیہاتی راجو کو پورے علاقے میں مشہور کردیتا ہے۔

اس گاؤں کی کئی لڑکیاں اس سے متاثر بھی ہو جاتی ہیں۔ کیوں کہ وہ ایک خوبصورت سادھو ہے۔ اس کے

علاوہ وہ ایک عالم بھی ہے۔ اس کی باتیں بہت دلکش ہوتی ہیں۔ وہ اپنی بات منوانے کا طریقہ جانتا ہے۔

لیکن راجو کو اب زندگی کے اس پہلو سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

وہ روزی سے محبت کر چکا ہے۔ اس کے اسٹاک میں جتنے خواب لکھے تھے وہ سارے خواب وہ دیکھ چکا ہے۔ اب اسے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اب وہ لڑکیوں کو صرف مشورے دیا کرتا ہے۔ زندگی باقی ہے گزارنے کے راستے بتاتا ہے۔ اس کا احترام کیا جاتا ہے۔ زندگی کسی حد تک سیٹل ہو چکی ہے۔ کھانے پینے کی فکر ختم ہو چکی ہے۔ وہ گاؤں کے جس گھر سے چاہے اپنے لیے کھانا منگوا سکتا ہے۔

کپڑوں کی طرف سے بھی بے فکری ہے۔ گاؤں والے اس کے لیے لباس لے کر آجاتے ہیں۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن سب کچھ ٹھیک کہاں ہوتا ہے۔ سکون تو اوپری سطح پر تھا۔ اس کے نیچے تو ایک ہلچل سی ہوئی تھی۔ طوفان سے پہلے کا سناٹا تھا۔

اور وہ سناٹا ختم ہو ہی گیا۔

گاؤں والوں پر ایک آفت ٹوٹ پڑی۔ وہ آفت موسم کی تھی۔ قحط سالی کی تھی۔

بادلوں نے اس طرف کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کھیتیاں سوکھتی جارہی تھیں۔ اگر اناج ہی نہ ہو تو پھر کیا ہوگا۔

زندگی کس طرح گزرے گی۔

پیٹ تو کھانے کو مانگتا ہے۔ اسے آپ کی مجبوریوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ بادل برسے ہیں۔ گاؤں والے ایک جگہ جمع ہو گئے۔

''اب کیا ہو؟''

''اگر بارش نہیں ہوئی تو پھر ہمارا کیا ہوگا؟''

''ہم اپنے بیوی بچوں کو لے کر کہاں جائیں گے؟ ہمارا ساتھ دے گا؟''

اچانک ایک آدمی بھیڑ میں کھڑا ہو گیا۔ ''وہ سوامی کس دن کام آئے گا؟''

''کیا مطلب؟ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔''

سیدھی سی بات ہے۔ وہ انتریامی ہے۔ بہت مہان ہے۔ ہمارا گاؤں کب سے اس کی خدمت کر رہا ہے۔ وہ بھگوان سے پراتھنا کرے گا تو ضرور بارش ہو گی۔

اسلامیہ یونیورسٹی

پاکستان میں قائم ہونے والی پہلی اسلامی یونیورسٹی۔ اس کا قیام جامعہ عباسیہ بہاولپور کی حیثیت سے 1965ء میں ہوا اسے جامعہ ازہر قاہرہ مصر کی نہج پر اسلامی علوم کی تعلیم کے مرکز کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا۔ 1964ء میں اس کا نام جامعہ عباسیہ سے تبدیل کر کے جامعہ اسلامیہ رکھ دیا گیا اور جدید سائنسی علوم کی تدریس کا آغاز ہوا۔ 1975ء میں پنجاب اسمبلی کے ایکٹ کے مطابق اسے ملک کی دیگر جامعات کے مساوی درجہ دے دیا گیا جس میں سائنس، سوشل سائنسز، لسانیات، ایم بی اے اور کمپیوٹر سائنس میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تدریس اور تحقیق کا آغاز ہوا۔ یہ ملک کی واحد یونیورسٹی ہے جس میں ایم اے / ایم ایس سی کی سطح پر اسلامیات لازمی کا مضمون متعارف ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا کلیۂ علوم اسلامیہ پاکستان کے ممتاز کلیات میں شمار کیا جاتا ہے اور اسلامی علوم کی تحقیق کے حوالے سے اس کا ایک منفرد مقام ہے۔ 2002ء میں تین نئے شعبہ جات قائم کیے گئے جن میں (1) قرآن وتفسیر (2) حدیث وسیرت اور (3) تقابل ادیان شامل ہیں۔ شعبۂ علوم اسلامیہ، شعبۂ عربی زبان وادب، شعبۂ اسلامی تاریخ اور سیرت چیئر کا ایک ریسرچ سیل پہلے ہی سے کام کر رہا ہے۔ سیرت چیئر سیل کو یونیورسٹیز کی سطح پر پہلی انٹرنیشنل سیرت کانفرنس منعقد کرانے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس سیل کے تحت اب تک چھ مستقل تحقیقات سامنے آچکی ہیں۔ کلیۂ علوم اسلامی کا تحقیقی مجلہ بھی شائع ہوتا ہے۔

مرسلہ: اقرار الحسن سومرو۔ خیرپور میرس

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بھگوان ایسے لوگوں کی بہت جلدی سن لیتا ہے۔"

"ہاں! یہ تو ہے۔" لوگوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "چلو ہم سب چلتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے برت رکھے گا تو اس کی ضرور سنی جائے گی۔ (برت بھگوان کے نام پر فاقہ کرنے کو کہتے ہیں)

راجو اس وقت اپنے چبوترے پر سویا ہوا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ گاؤں والے اس کے لیے کچھ کھانے کو نہیں لائے تھے۔ ورنہ اس کا ناشتا صبح ہی آ جاتا تھا... پھر اس نے لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

وہ تیس چالیس آدمی تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنے لوگوں کو ایک ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ سب اس کے پاس آ کر اسی طرح جھک گئے جس طرح پہلے جھکا کرتے تھے۔

راجو نے ان لوگوں کو دعا دی۔ ویسے ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔

"مہاراج! ہم آپ کے پاس ایک بنتی لے کر آئے ہیں۔" ایک نے کہا۔

"ہاں کہو۔"

"مہاراج آپ دیکھ رہے ہیں کہ برکھا رانی ہم سے روٹھ گئی ہے۔ ہماری کھیتوں پر بارش ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ ہماری کھیتیاں سوکھ رہی ہیں۔ اگر بارش نہیں ہوئی تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔"

"ہم دانے دانے کو محتاج ہو جائیں گے۔"

"ہمارے بچے بھوکوں مر جائیں گے مہاراج۔"

"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ برت رکھ کر ہمیں اس مصیبت سے نجات دلوا سکتے ہیں۔ آپ کا رکھا ہوا برت ہمارے اور ہمارے بچوں کے کام آ جائے گا۔"

راجو ایک مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ یہ سیدھے سادے لوگ سمجھ رہے تھے کہ اس کے برت رکھنے سے مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔

راجو کو برت رکھنا پڑا تھا۔

پورے چودہ دنوں کا برت تھا۔ یعنی کچھ کھانا نہیں تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ گاؤں والے اس جگہ گھیرا ڈالے بیٹھے تھے جہاں وہ برت کے لیے بیٹھا تھا۔ اسے ہر حال میں اپنا بھرم رکھنا تھا۔ ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی تھی کہ

گاؤں والوں کا یقین ختم ہو جائے۔

ایک رات بارش ہوئی اور وہ مر گیا۔ اسی بارش میں۔

انتہائی خوبی کے ساتھ لکھے ہوئے اس ناول کے انجام کو سوچنے والوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

"کیا راجو کی موت واقع ہو گئی تھی؟"

"کیا وہ سخت بارش میں گاؤں والوں کی نگاہوں سے چھپ کر فرار ہو گیا تھا؟"

"کیا گاؤں والوں نے یہ جان لیا تھا کہ وہ کوئی سادھو مہاتما نہیں ہے بلکہ ایک مجرم ہے جو جیل سے نکل کر آیا ہے؟"

یہ ناول سوچ کے دریچے کھول دیتا ہے۔ انسان کے کتنے روپ ہوتے ہیں۔ اس کی ماہیتِ قلب کس طرح ہوتی ہے۔

کبھی محبت ملتی ہے اور کبھی چٹیل میدان کی طرح ہو جاتا ہے۔

وہ ایک مجرم تھا۔ کیا وہ ایک مجرم تھا؟ وہ ایک سادھو تھا۔ کیا وہ ایک سادھو تھا؟

نہیں وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ صرف ایک انسان تھا اور انسان کے ساتھ یہ سب ہوتا رہتا ہے۔

دھوپ اور چھاؤں کا کھیل لگا ہی رہتا ہے۔ یہ تھا اس ناول کا مختصر سا خلاصہ۔

اب آ جائیں فلم کی طرف اپنے زمانے کی کامیاب فلم تھی۔ یہ فلم 1964ء میں بنائی گئی تھی لیکن آج بھی باذوق دیکھنے والوں پر ایک سحر سا طاری کر دیتی ہے۔

اس فلم کے گانے سحر انگیز تھے۔

ایس ڈی برمن نے ایسی دھنیں بنا دی تھیں جو اس کے شایانِ شان تھیں۔

"آج پھر مرنے کی تمنا ہے"

"دن ڈھل جائے" یا "گاتا رہے میرا دل" وغیرہ۔

اس فلم کو کئی اعزازات سے نوازا گیا تھا۔ مشہور جریدے "ٹائم میگزین" نے اس فلم کو بہترین کلاسیکی فلم میں شمار کیا ہے۔

کسی بھی اچھے ناول کو اگر سلیقے سے فلما لیا جائے تو شہکار کی تخلیق ہو جاتی ہے۔

+

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

فلم نگری

پردۂ سیمیں

انور فرہاد

کراچی جو کبھی پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ روشنیوں کا شہر تھا، تجارت کا مرکز تھا، علم و ادب کا گوشہ تھا، یہاں کی فلمی دنیا کا ماحول بھی لاہور سے کچھ الگ تھا۔ کراچی کے سینما گھر، اداکار و اداکارائیں، ہُنر مند اور ان کے کارناموں پر ایک مختصر مگر تفصیلی تحریر۔

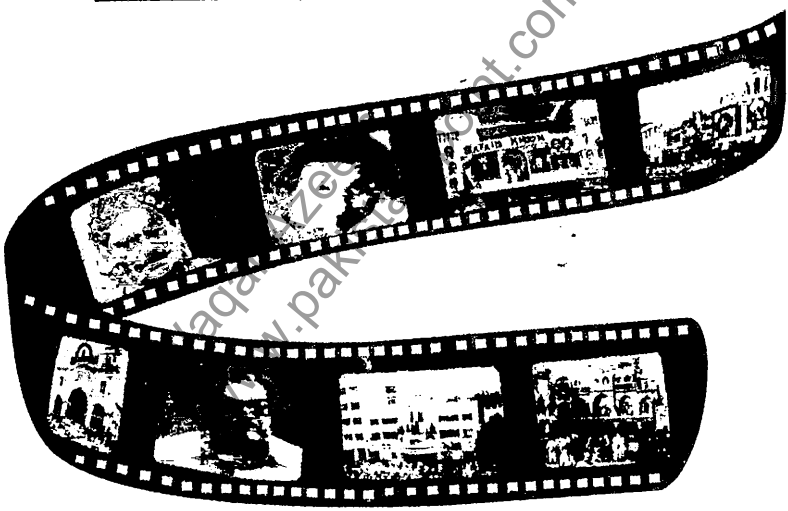

پاکستانی فلمی صنعت کا ایک سنہرا باب

اللہ بھلا کرے میرے ان پڑھنے والوں کا جو میری تحریر پڑھنے کے ساتھ ساتھ مجھے گائیڈ بھی کرتے رہتے ہیں اور مجھے نت نئے موضوعات پر لکھنے کی ترغیب بھی دیتے رہتے ہیں۔

ایسے ہی ایک قاری سے ملاقات ہوئی۔ مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔ ''آپ نے مجھے پہچانا؟''

''جی نہیں۔''

''لیکن میں آپ کو جانتا ہوں اور پہچانتا بھی ہوں اور

یہ جان پہچان بہت پرانی ہے۔ میں آپ کا ایک قاری ہوں۔ بہت دنوں سے آپ کی تحریریں پڑھ رہا ہوں۔''

''شکریہ.....'' میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔ اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد وہ ایک دم پوچھ بیٹھے.....

''آپ کراچی میں کب سے مقیم ہیں۔''

''میرا خیال ہے.....نصف صدی سے بھی کوئی سال بھر زیادہ کا عرصہ گزار چکا ہوں اس شہر میں۔''

''اس کے باوجود شاید آپ کو اس شہر سے کوئی انس، کوئی لگاؤ، کوئی محبت نہیں۔''

''نہیں ایسی بات نہیں یہ تو میرے خوابوں کا شہر ہے۔''

''ہم کیسے یقین کرلیں؟ آپ نے اپنی تحریروں کے حوالے سے کبھی اس کا ثبوت نہیں دیا۔ لاہور سے تعلق رکھنے والے فلم والوں کی کتنی پرانی دھرانی باتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہیں اور ان کے بارے میں بتاتے ہیں مگر اپنے خوابوں کے شہر سے تعلق رکھنے والے فلم والوں کو کبھی اس قابل نہیں سمجھتے کہ.....''

''نہیں میرے بھائی!'' میں نے انہیں آگے کچھ کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے یہاں والوں کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ کیا آپ کی نظروں سے وحید مراد، جاوید شیخ، ناشاد، شیخ حسن، بابرہ شریف، تسلیم فاضلی وغیرہ کی میری تفصیلی تحریریں نہیں گزریں۔ ان کے علاوہ بھی اپنی دیگر تحریروں کے دوران کراچی سے وابستہ فنکاروں اور ہنر مندوں کا ذکر کرتا رہتا ہوں۔''

میرا وہ پیارا دوست مسکرایا۔ ''میری مراد یہ ہے کہ آپ کبھی تو کراچی کی فلم انڈسٹری کے بارے میں بھی ہمیں خاص طور پر نئی نسل کو یہ بتائیں کہ اس شہر نے بھی فلم انڈسٹری کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ کیا کراچی کی فلمی خدمات کوئی نہیں پاکستان فلم انڈسٹری میں؟''

میں نے اپنی نئی تحریر کے لیے جو پلاننگ کی تھی، اسے ملتوی کردی کہ اس پر بھی لکھوں گا اور اپنے اس قاری کی فرمائش پر لکھنے کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ غالب نے کہا تھا۔

بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

کچھ ایسا ہی حال میرا بھی تھا۔ بہت لکھا کراچی والوں کے بارے میں لیکن میرے پڑھنے والے کہتے ہیں کہ اور لکھو۔

تو چل میرے خامے بسم اللہ.....

پاکستانی فلمی صنعت میں لاہور، کراچی اور ڈھاکے کی فلم انڈسٹری کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لاہور کی فلمی صنعت متحدہ ہندوستان کے دور میں قائم ہوگئی تھی۔ ہندوستان کی تقسیم ہوئی تو لاہور کی مستحکم فلم انڈسٹری فسادیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوگئی۔ جسے 1948ء سے دوبارہ بحال کرنے کا کام شروع کردیا گیا۔ کراچی میں فلمی صنعت کا کوئی وجود نہیں تھا اس لیے یہاں فلم میکنگ کرنا مشکل کام تھا کیوں کہ یہاں پر سہولت خود حاصل کرنا تھی۔ حوصلے بلند، ارادے پختہ ہوں تو ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے۔ لاہور کی بیشتر فلمیں کراچی کے انویسٹرز کے سرمائے سے بنائی جاتی تھیں۔ لہٰذا کچھ حوصلہ مند لوگوں نے کراچی میں فلمسازی کا منصوبہ بنایا اور اللہ کا نام لے کر فلم بنانے کا آغاز کردیا۔ جلد ہی ایک دو نگار خانے بھی بن گئے اور فلمسازی کا کام چل نکلا۔

مشرقی پاکستان میں لاہور کی بنائی ہوئی فلمیں دیکھی اور دکھائی جاتی تھیں پھر کراچی کی فلمیں بھی دکھائی جانے لگیں۔ لہٰذا وہاں کے لوگوں کو بھی فلم.....بنانے کا خیال آگیا۔ پہلے وہاں کی مقامی زبان بنگالی میں فلمیں بنائی گئیں۔ وہاں کی حکومت نے فلمسازی کے فروغ کے لیے ایف ڈی سی (فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن) کے زیر اہتمام ایک جدید نگار خانہ قائم کیا اور تیزی کے ساتھ فلمسازی کا کام جاری وساری ہوگیا، پھر وہاں اور فلمیں بنائی گئیں تو انہوں نے ملک گیر کامیابیاں حاصل کیں۔

ادھر کراچی میں بھی فلمسازی کا کام بڑی تیزی کے ساتھ جاری رہا۔ کراچی کی فلمی صنعت کی ترقی اور پختگی کے لیے بڑی تیزی سے ہر شعبہ کے لیے نئے نئے فنکار اور ہنر مند متعارف کرائے گئے۔ جس کے نتیجے میں کراچی کی فلمی صنعت نے مثالی کام کیا۔ کلاسک اور شاہکار فلمیں تخلیق کی گئیں۔ کراچی میں ہمیشہ ہی کوشش کی جاتی تھی کہ مختلف موضوعات پر فلم بنا کر شائقین فلم کے ذوق کے لیے پیش کی جائیں۔ لہٰذا کئی ایسی فلمیں بھی کراچی میں بنائی گئیں جنہیں پاکستانی فلمی تاریخ میں ''پہلی فلم'' کا اعزاز حاصل ہوا۔ مثلاً ''عمر ماروی''۔

یہ پہلی سندھی فلم تھی... جو 1965ء میں سینماؤں کی زینت بنی۔ یہ سندھ کی لوک رومانوی کہانی پر مبنی کاوش تھی یہ کراچی کی فلمی صنعت کے قیام کا ابتدائی دور تھا۔ اس کے

www.pakistanipoint.com

باوجود یہ تاریخی کارنامہ سرانجام دیا گیا۔ اس پہلی سندھی فلم نے ہر ایک کو متاثر کیا۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ بھارت میں بھی اسے بے حد پسند کیا گیا۔ اس سپرہٹ فلم کے فلمساز فاضلانی، ہدایتکار شیخ حسن، موسیقار غلام نبی عبداللطیف، عکاس سہیل ہاشمی، آرٹ ڈائریکٹر اقبال حسین، جبکہ نگہت سلطانہ، فاضلانی، چارلی، اور شیخ حسن مرکزی ستارے تھے۔ فاضلانی فلمز کے بینر تلے یہ فلم بنائی گئی تھی۔ اسی سال سے پاکستان میں قومی صدارتی ایوارڈز کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اس فلم ''عمر ماروی'' کو دو صدارتی ایوارڈز بہترین آرٹ ڈائریکٹر کا اقبال حسین اور بہترین عکاسی کا سہیل ہاشمی کو ملا۔ واضح رہے کہ 1993ء میں اس فلم کو ''ماروی'' کے نام سے ری میک کیا گیا۔

کراچی فلم انڈسٹری کی دوسری قابل ذکر فلم ''یوسف خان شیر بانو'' تھی۔ یہ پاکستان کی پہلی پشتو فلم تھی جو 1970ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ پشاور پختونوں کا شہر ہے۔ آج پشتو فلموں کا سب سے بڑا مرکز پشاور ہی ہے مگر کتنی عجیب بات ہے کہ پشتو فلمیں بنانے کا آغاز کراچی کی فلمی صنعت سے ہوا۔ پہلی پشتو فلم ہونے کی وجہ سے پٹھان بھائیوں نے اس کا زبردست خیر مقدم کیا۔ پاکستان میں جہاں جہاں پختون بستے ہیں انہوں نے اپنی زبان میں بنی فلم بڑے ذوق وشوق سے دیکھی۔ اس طرح یہ فلم پسند کی گئی اور اس نے توقعات سے بڑھ کر باکس آفس پر کامیابی حاصل کی کیونکہ روزگار کے سلسلے میں یہاں پٹھان بھائیوں کی بہت بڑی تعداد بستی ہے۔ وژن پکچرز کے بینر تلے بنائی جانے والی اس فلم کے فلمساز نذیر حسین، ہدایت کار اور مکالمہ نگار عزیز تبسم، موسیقار لال محمد اقبال، عکاس مدن علی مدن تھے۔ جبکہ مرکزی کردار بدر منیر اور یاسمین خان نے کیے تھے۔ دیگر آرٹسٹوں میں نعمت سرحدی، ترنم، ماہ پارہ اور ساقی شامل تھے۔ اس پہلی پشتو فلم کی سپرہٹ کامیابی کے بعد، پشتو فلموں کی فلمسازی کے دروازے کھل گئے۔ بعد کی پشتو فلموں کے لیے کراچی سے ہی بہت سے فنکار متعارف کرائے گئے۔ جن میں بڑے بڑے نام شامل ہیں۔

کراچی شہر میں گجراتیوں کی بھی بہت بڑی آبادی ہے۔ ان کی موجودگی کو پیش نظر رکھ کر کچھ لوگوں نے سوچا۔ اگر یہاں سندھی فلم بنائی جاسکتی ہے، پشتو فلم بنائی جاسکتی ہے تو گجراتی زبان کی بھی فلم بنائی جاسکتی ہے اس سوچ کے تحت ''ماں تے ماں'' کے نام سے پہلی گجراتی فلم شروع کردی گئی۔ ایشین موویز کے بینر تلے شروع کی جانے والی اس پہلی گجراتی فلم کے فلمساز قدیر خان اور ہدایت کار اقبال اختر تھے۔ لال محمد اقبال سے اس فلم کی موسیقی کمپوز کروائی گئی۔ اس کی کہانی صبا فاضلی نے لکھی اور گیت مسرور انور سے لکھوائے گئے۔ عکاسی جان محمد نے کی۔ اس کی کاسٹ میں شائستہ قیصر، آغا سجاد اور ساحرہ مرکزی ستارے تھے۔ یہ پہلی گجراتی فلم 1970ء میں سینماؤں کی زینت بنی مگر اس نے پہلی پشتو اور پہلی سندھی فلموں جیسی کامیابی حاصل نہیں۔ اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ گجراتیوں کی آبادی سندھیوں اور پختونوں کے مقابلے میں کم ہے اور گجراتیوں کو آرٹ اور ادب کے مقابلے میں اپنے کاروبار اور دھندوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس کے بعد چند گجراتی فلمیں بنائی گئیں مگر انہیں بھی متوقع کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

پاکستان میں فلمی صنعت کے قیام سے تمام فلمی مرکزوں پر ہر طرح کی اور ہر زبان کی فلمیں بنائی جاتی رہیں مگر کسی کو انگریزی زبان کی فلم بنانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اگرچہ پاکستان میں پڑھے لکھے اور انگریزی زبان سے واقف لوگوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ یہاں باہر کی انگریزی فلمیں دکھائی اور دیکھی جاتی ہیں۔ فلمی صنعت کے قیام کے 28 برس بعد ایک شخص کو خیال آیا کہ کیوں نا ایک انگریزی فلم بنائی جائے۔ یہ پڑھے لکھے شخص جاوید جبار تھے جو سندھ کی ایک نامور سیاسی شخصیت بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کراچی کی فلمی صنعت کا انتخاب کیا اور اللہ کا نام لے کر پاکستان کی پہلی انگریزی زبان کی فلم ''بیانڈ دی لاسٹ ماؤنٹین'' کا آغاز کردیا۔ جاوید جبار صاحب اس فلم کے فلمساز، ہدایت کار اور کہانی نویس تھے۔ انہوں نے مکالمے اسد محمد خان سے لکھوائے اور نغمات عبداللہ علیم سے تحریر کروائے۔ اس فلم کی عکاسی اشتیاق احمد نے کی۔ اس کی کاسٹ میں عثمان پیرزادہ، ماریہ حق، شمیم، انوشکا، مرزا غضنفر، سبحانی بایونس، ظہور احمد اور راجا جمیل شامل تھے۔

''بیانڈ دی لاسٹ ماؤنٹین'' ایک منفرد اور ویسٹرن اسٹائل کی فلم تھی جسے خاصا پسند کیا گیا۔ بعدازاں اس کا اردو ورژن ''مسافر'' کے نام سے اسی سال یعنی 1976ء میں ریلیز کیا گیا۔ اس طرح پہلی پاکستانی انگریزی زبان کی فلم بنانے کا اعزاز بھی کراچی فلم انڈسٹری کو حاصل ہوا۔

کراچی میں بلوچ بھائی بھی شروع ہی سے رہتے

آئے ہیں۔ آج بھی یہاں اس شہر میں رہائش پذیر ہیں اور زندگی کے متعدد شعبوں سے وابستہ ہیں۔ ان میں کچھ شوبز سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ ان میں ایک نام انور اقبال کا بھی ہے۔ انہیں بھی شوق چرایا کہ بلوچی زبان کی کوئی فلم بنائیں۔ انہوں نے ایسے کچھ بلوچیوں کو اپنے مشن میں شامل کیا جن کا تعلق ادب یا ثقافت سے کسی نہ کسی عنوان سے تھا۔ ان میں ایک جواں سال صحافی نادر شاہ عادل بھی تھے۔ انور اقبال نے نہ صرف ان سے رائٹنگ سائیڈ میں کام لیا بلکہ ان سے اداکاری بھی کروائی۔ اس ٹیم کو سرمائے کی فراہمی سے لے کر فلم مکمل کرنے کے ہر مرحلے میں دندان شکن حالات کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کے حوصلے جوان تھے کسی نہ کسی طرح انہوں نے اپنی پہلی بلوچی فلم ''حمل و ماہ گنج'' مکمل کر لی مگر جب اس کی نمائش کا مرحلہ آیا تو اسے زبردست احتجاج کا سامنا کرنا پڑا۔ بلوچیوں نے اس فلم کو اپنی تہذیب اور ثقافت کے لیے زہر قاتل قرار دے کر کہا۔ ''ہم اس فلم کو ہرگز نمائش کی اجازت نہیں دیں گے۔ اگر کسی سینما گھر میں یہ فلم دکھائی گئی تو اسے جلا کر خاکستر کر دیں گے۔''

شہر بھر کی شاہراہوں میں ایسے پوسٹر آویزاں کیے گئے اور دیواروں پر جعلی حروف میں احتجاجی نعرے لکھوائے گئے۔ جس کے بعد اس پہلی بلوچی فلم کی نمائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت سے آج تک یہ فلم ڈبوں میں ہی بند ہے۔ جس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

پاکستان میں فلمیں بن رہی تھیں، دیکھی جا رہی تھیں، پسند کی جا رہی تھیں، ملک سے باہر بھی بھیج کر ان سے زرمبادلہ کمایا جا رہا تھا مگر یہ سب کچھ اپنے سرمائے اور اپنے وسائل سے کیے جا رہے تھے جبکہ دنیا کے بہت سے ممالک دوسرے ملکوں کے اشتراک سے بھی فلمیں بنا رہے تھے۔ اس بات سے ہمارے فلم والے بھی باخبر تھے۔ لہٰذا کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ ہمیں بھی کو پروڈکشن کے تحت فلم بنانے کا تجربہ کرنا چاہیے۔ لہٰذا اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کراچی فلم انڈسٹری ہی سے اس کام کا آغاز کیا گیا۔ جرمنی اور اٹلی دو ممالک سے اشتراک کے بعد پاکستان کی پہلی کو پروڈکشن فلم ''ٹائیگر گینگ'' کا کام شروع کر دیا گیا۔ یہ فلم پاکستان میں 1974ء میں اردو زبان میں جبکہ جرمنی اور اٹلی میں انگریزی زبان میں پیش کی گئی۔ اس فلم کے پاکستانی ڈائریکٹر اقبال شہزاد تھے جبکہ اٹلی کے ہدایت کار ہوریلڈ تھے۔ اس کی موسیقی خلیل احمد اور دیبو بھٹا چاریہ نے کمپوز کی تھی۔ عکاسی کے فرائض اٹلی کے ایف عزائیلی اور پاکستان کے صادق موتی نے ادا کیے تھے۔ اس کی کاسٹ میں پاکستان کے محمد علی، زیبا، علی اعجاز، نشو، قوی، زرقا، رخشی، شریک ممالک کے ٹونی کینڈی، بریڈ ہیرس، گیلا ہیان، مس کلے، روبرٹ اور ایزلینڈر شامل تھے۔ تینوں ممالک کی مشترکہ مشاورت سے اس فلم کے لیے جو کہانی منتخب کی گئی تھی وہ انٹرنیشنل طرز کی جاسوسی کہانی تھی۔ کو پروڈکشن کے اس کامیاب تجربے کے بعد وقتاً فوقتاً پاکستان میں دوسرے ممالک کے ساتھ مشترکہ فلمیں بنائی گئیں جن میں بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال اور انڈونیشیا قابلِ ذکر ممالک ہیں۔

پاکستان کی پہلی بین الاقوامی معیار کی اسلامی تبلیغی فلم ''اللہ اکبر'' بھی کراچی فلمی صنعت کی قابل فخر تخلیق تھی جو 1976ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم کی عکسبندی سعودی عرب کے مقدس مقامات میں کی گئی تھی۔ اس فلم میں کسی آرٹسٹ نے کام نہیں کیا تھا۔ البتہ محمد علی کی آواز میں پس پردہ کامنٹری تھی۔ مقدس مقامات کے بارے میں وہ بڑی محبت اور عقیدت سے معلومات سے آگاہ کرتے تھے۔ ''اللہ اکبر'' کے خالق رفیق چمن تھے۔ تبلیغی نوعیت کی یہ فلم بین الاقوامی سطح پر مقبول ہوئی۔ پاکستان سے زیادہ اس فلم کی خرید و فروخت سعودی عرب میں ہوئی ہے۔ حج و عمرے کے لیے آنے والے تمام اسلامی ممالک کے لوگ واپس جاتے وقت مقدس مقامات کی زیارت کی دیگر فلموں کے ساتھ یہ فلم بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

کراچی کی فلم انڈسٹری میں ایک ایسی فلم بھی بنائی گئی جس کی شوٹنگز پاکستان کے ساتھ ساتھ لندن پیرس اور بیروت میں بھی کی گئیں۔ یہ فلم جزوی طور پر رنگین بھی تھی۔ اس خوبصورت رومانوی فلم کا نام ''رشتہ ہے پیار کا'' ہے۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی پاکستانی فلم تھی جو کراچی کی فلمی صنعت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے فلمساز اقبال بٹ، ہدایت کار قمرالدین، موسیقار ناشاد، مصنف سلیم احمد تھے۔ عکاسی سہیل ہاشمی نے کی تھی۔ وحید مراد، زیبا، حنیف، فریدہ، کمال ایرانی وغیرہ اس کے مرکزی ستارے تھے۔

کراچی کی فلم انڈسٹری کو اس بات کا بھی اعزاز حاصل ہے کہ پاکستان کی پہلی جاسوسی فلم بھی یہیں بنائی گئی۔ اگرچہ عام جاسوسی فلمیں ہمارے ہاں باکس آفس پر مقبول

www.pakistanipoint.com

نہیں ہوتیں مگر کراچی میں بنائی گئی یہ جاسوسی فلم نہ صرف بہت پسند کی گئی بلکہ معیار کے لحاظ سے بھی اسے بہت سراہا گیا اور سال بھر کی فلموں میں بہترین فلم کے طور پر بھی اس نے نگار ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ 1959ء میں سینماؤں کی زینت بننے والی یہ فلم ''راز'' تھی۔ اگرچہ اس فلم میں لاہور کی فلمی صنعت سے تعلق رکھنے والے آرٹسٹوں نے کام کیا تھا کیونکہ کراچی کی بیشتر فلموں میں لاہور سے آرٹسٹ بلا کر کام کرایا جاتا تھا۔ عام طور پر اس فلم کے بارے میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ لاہور میں بنی ہے مگر حقیقتاً یہ صد فیصد کراچی کی فلم ہے اور یہیں بنائی گئی تھی۔ ''راز'' کے فلمساز ہدایت کار ہمایوں مرزا، مصنف سلیم احمد، موسیقار فیروز نظامی اور عکاس مسعود الرحمٰن تھے۔ مسرت نذیر، اعجاز، شمیم آراء، طالش، علاؤالدین، مجید اور دلجیت مرزا اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اس فلم کے گیتوں نے بھی مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس فلم کو تین نگار ایوارڈ ملے تھے۔

☆☆☆

عالمی معیار کی پہلی سائنسی فلم ''شانی'' کی تخلیق کا سہرا بھی کراچی فلم انڈسٹری کے سر بندھا۔ اس فلم کے ہدایتکار و عکاس سعید رضوی تھے۔ کہانی آغا نذیر کاوش کی تھی۔ موسیقار انجم تھے۔ محمد علی، بابرہ شریف، شیری ملک، آصف خان، طالش اور نیر سلطانہ نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ تاشقند کے فلمی میلے میں شانی کو زبردست پذیرائی ملی۔ اس فلم کو روس، چین اور سری لنکا میں بھی بہت پسند کیا گیا۔ پاکستان میں ''شانی'' کو سال کی بہترین فلم سمیت مختلف شعبوں میں سات نگار ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پاکستان میں ویسٹرن اسٹائل کی کاؤبوائے ایکشن فلم بنانے کا پہلا تجربہ بھی کراچی کی فلمی صنعت میں کیا گیا۔ یہ فلم تھی ''بارہ بجے'' جو 1961ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اپنے انداز کی یہ منفرد اور یادگار فلم ہدایت کار باقر رضوی نے بنائی تھی۔ اس کے فلمساز یوسف افغانی، مصنف ایم اے بیگ، موسیقار لال محمد اقبال اور عکاس ایم حسین تھے۔ علاؤالدین، نیلو، جسونت، ساقی اور طالش کاسٹ میں شامل تھے۔ کراچی فلم انڈسٹری میں کیا جانے والا یہ تجربہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکا کیونکہ یورپی ممالک میں بنائی جانے والی کاؤبوائے فلموں کے مقابلے میں یہ بہت کمزور فلم تھی اس لیے دوسروں نے ایسی فلمیں بنانے کا رسک نہیں لیا۔

کراچی کی فلمی صنعت کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہاں بنائی جانے والی فلموں میں ایسی فلم بھی شامل ہے جس نے پاکستان میں پہلی پلاٹینم فلم ہونے کا تاج اپنے سر پر سجایا۔ یہ فلم تھی ''ارمان'' جو 1966ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس دور میں پلاٹینم جوبلی ہونے کا کارنامہ انجام دینا ایک ریکارڈ ہے۔ کراچی کی اس ریکارڈ ہولڈر فلم کے فلمساز، کہانی نویس اور ہیرو وحید مراد تھے۔ ہدایت کار پرویز ملک، گیت اور مکالمہ نگار مسرور انور، موسیقار سہیل رعنا اور عکاس نذیر حسین تھے۔ وحید مراد کی ہیروئن زیبا تھیں۔ دیگر ستاروں میں ترنم، نرالا، روزینہ، کمال ایرانی وغیرہ شامل تھے۔ اس فلم نے سال کی بہترین فلم سمیت سات نگار ایوارڈز حاصل کیے تھے۔ یہ فلم کل کی طرح آج بھی مقبول ہے۔

دوستو! یہ تو تھے وہ کارنامے جو کراچی کی فلم انڈسٹری میں انجام دیے گئے مگر اس انڈسٹری سے وابستہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو قابلِ ذکر ہیں۔ اس فلمی مرکز سے بڑے بڑے فلمی ستاروں نے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا۔ بڑی خدمات انجام دیں اور پاکستانی فلمی تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف میں لکھوایا۔ ان میں سے بہت سی شخصیات کے بارے میں میری تحریریں آپ پڑھ چکے ہیں۔ جن میں شمیم آراء، کمال، رونا لیلیٰ، وحید مراد، محمد علی، تسلیم فاضلی، جاوید شیخ، شیخ حسن، بابرہ شریف اور غلام محی الدین قابلِ ذکر ہیں لیکن اور بھی بہت کچھ لکھنے کا مواد موجود ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آج کی اس نشست میں ان کے بارے میں بھی آپ کو معلومات فراہم کروں۔

کراچی کی فلمی صنعت کو اس بات کا بھی اعزاز حاصل ہے کہ یہاں بننے والی ایک فلم کا افتتاح مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے ہاتھوں ہوا۔ یہ فلم تھی ''چراغ جلتا رہا'' جس کے تخلیق کار فضل احمد کریم فضلی تھے۔ فضلی صاحب اعلیٰ سرکاری عہدے دار کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دینے کے بعد جب ریٹائرڈ ہوگئے تب انہوں نے یہ فلم بنائی تھی۔ فضل احمد کریم فضلی بلند پایہ شاعر اور ناول نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں ایک مقام رکھتے تھے۔ ان کی یہ پہلی فلم جوان ہی کی کہانی پر بنائی گئی تھی، اپنے موضوع کے اعتبار سے تو اچھی فلم تھی مگر تکنیکی طور پر ایک کمزور فلم تھی جو باکس آفس پر کامیابی تو حاصل نہ کرسکی مگر اس فلم کی وجہ سے پاکستانی فلمی صنعت کو چند انمول ہیرے مل گئے۔ فضلی صاحب نے اپنی

www.pakistanipoint.com

اس فلم میں زیادہ تر نئے آرٹسٹوں کو متعارف کرایا تھا۔ جن میں محمد علی، زیبا، دیبا اور کمال ایرانی نے بہترین پرفارمرز کی حیثیت سے آگے چل کر بہت نام کمایا اور پاکستانی فلموں کے گولڈن اسٹارز ثابت ہوئے۔ اس فلم کی مکمل اور تفصیلی روداد میں بہت پہلے تحریر کر چکا ہوں۔ غالباً محمد علی کے بارے میں جو تحریر تھی، اسی میں فضلی صاحب کی اس فلم ''چراغ جلتا رہا'' کے متعلق بھی معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ انہوں نے اس فلم کے بعد دو اور فلمیں بھی بنائیں اور ان کے حوالے سے بھی نئے فنکاروں کو متعارف کرایا۔

کراچی جسے روشنیوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی فلمی صنعت نے بھی فلمسازی کے حوالے سے بڑی روشنیاں بکھیری ہیں۔ اس کی اس روشنی نے پوری پاکستانی فلم انڈسٹری کو بڑی تقویت پہنچائی، اسے چکا چوند کر دیا۔ کراچی کی فلمی صنعت نے ایسے لاثانی فنکار پیدا کیے جن کے فن سے پاکستانی فلمی صنعت نے بھرپور استفادہ حاصل کیا۔ کراچی نے محمد علی، وحید مراد اور ندیم جیسے ایکڈمی کی حیثیت رکھنے والے سپر اسٹارز عطا کیے۔ زیبا، بابرہ شریف، شمیم آراء اور فردوس جیسی اپنے عہد کی عظیم اداکارائیں کراچی نے دی۔ مہدی حسن، احمد رشدی، مسعود رانا اور مہناز جیسے بے بدل سنگرز کراچی نے پیش کیے۔ لہری، مصطفیٰ قریشی، بدر منیر، آصف خان اور سید کمال جیسے اعلیٰ پرفارمر بھی کراچی ہی کی دریافت ہیں۔ پرویز ملک، اقبال یوسف، اقبال شہزاد، رفیق رضوی، سعید رضوی جیسے ہدایت کاروں نے بھی کراچی کی فلم انڈسٹری سے اپنی تخلیقی سرگرمیاں شروع کیں۔

فلمسازی کا ایسا کون سا شعبہ ہے جس میں کراچی کی فلم انڈسٹری کی چھاپ نہیں ہے کراچی سے وابستہ فلمی شخصیات کے بارے میں تفصیلی تحریریں تو میں لکھتا رہا ہوں اور لکھتا رہوں گا اس وقت کراچی فلم انڈسٹری کی کارکردگی کی بات ہو رہی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے کراچی کے فلم والوں کے بارے میں نہایت اختصار کے ساتھ بتاؤں۔ جن میں بہت سے تو ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں پرانے لوگوں کو بھی علم نہیں کہ ان کا تعلق کراچی سے تھا۔

ہدایت کاروں میں سب سے نمایاں نام پرویز ملک کا ہے۔ انہوں نے باضابطہ ڈائریکشن کی تربیت بیرون ملک جا کر حاصل کی واپس آ کر اپنے دوست وحید مراد کی فلم ''ہیرا اور پتھر'' سے ہدایت کاری کی ابتداء کی اس کے بعد اپنی دوسری فلم ''ارمان'' بنا کر اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ اس فلم نے پلاٹینم جوبلی کا میابی حاصل کی پھر ان کا نام اعلیٰ معیار کی کامیاب فلمیں بنانے والوں میں شمار کیا جانے لگا۔

رفیق رضوی جنہیں عرف عام میں باپو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کراچی فلم انڈسٹری کے سینئر ہدایت کار تھے۔ انہوں نے متحدہ ہندوستان سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ ان کی پاکستان میں پہلی فلم ''بیداری'' تھی۔ کراچی کے مقبول اور بہترین ڈائریکٹر شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے کریڈٹ میں بے شمار فلمیں ہیں۔

اقبال یوسف، ہدایت کار ایس ایم یوسف کے صاحبزادے تھے۔ والد سے تربیت حاصل کر کے ڈائریکٹر کا شعبہ منتخب کیا اور ''رات کے راہی'' جیسی کامیاب فلم بنا کر، کامیاب ہدایت کاروں میں اپنا نام لکھوالیا۔ ان کی آخری فلم ''راز'' تھی جو 1992ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ کراچی کے ان نامور ہدایت کاروں میں تھے، جو بطور اداکار بھی پرفارم کر لیتے تھے۔

اقبال اختر نے کراچی سے ابھر کر پاکستانی فلمی صنعت کو اعلیٰ معیار کی گھریلو فلمیں دینے والے ہدایت کار کی حیثیت سے بہت نام کمایا۔ ''دوسری ماں'' سے ہدایت کاری کی ابتداء کی جو 1968ء میں ریلیز ہوئی۔ متعدد کامیاب فلمیں بنا کر پاکستانی فلمی صنعت کی خدمت کی۔

اقبال شہزاد نے بھی بطور فلمساز اور ہدایت کار کراچی ہی سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا ''رات کے راہی'' سے بطور فلمساز متعارف ہوئے۔ پھر ''ٹائیگر گینگ'' اور ''بدنام'' جیسی فلمیں ڈائریکٹ کر کے صف اوّل کے ہدایت کاروں میں شامل ہو گئے۔

ہمایوں مرزا نے 1955ء کی فلم ''انتخاب'' کی ہدایت کاری سے کراچی ہی میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ بطور فلمساز ہدایت کار کئی کامیاب فلمیں بنائیں۔ ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے ''آگ کا دریا'' ہی کافی ہے۔

عزیز تبسم، پاکستان کی پہلی پشتو فلم بنانے والے ہدایت کار کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں جو کراچی میں بنائی گئی تھی۔ یہ ہدایت کار پرویز ملک کے ہونہار شاگرد تھے۔ انہوں نے پشتو فلموں کے علاوہ اردو فلمیں بھی ڈائریکٹ کیں اور مقبولیت حاصل کی۔

سعید رضوی کا فنی خمیر بھی کراچی کی فلمی صنعت سے

www.paksociety.com

اٹھا ہے۔ وہ پہلے عکاس اور پھر ڈائریکٹر کے طور پر منظر عام پر آئے۔ بطور عکاس 1971ء میں انہوں نے سندھی فلم ''محبوب مٹھا'' سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ جبکہ 1989ء میں بطور ہدایت کار ''شانی'' سے اپنا نام ہدایت کاروں میں لکھوالیا۔ سعید رضوی، رفیق رضوی کے ہونہار صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے بیرونِ ملک جا کر عکاسی کی جدید ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کی اور برصغیر میں پہلی ویژول ایفکٹ عکاسی کر کے اپنا نام آوّلین ویژول ایفکٹ کری ایٹر کا اعزاز حاصل کیا۔

اے ایچ صدیقی کراچی کے مقبول ہدایت کار ہیں۔ انہوں نے 1960ء میں فلم ''انصاف'' سے ہدایت کاری کی ابتداء کی تھی۔ برسوں تک کراچی کی فلمی صنعت کی ترقی کے لیے فلمیں تخلیق کیں اور اپنی فلموں کے ذریعے نئے نئے فنکار بھی متعارف کرائے۔

یونس راٹھو نے بھی کراچی میں ہدایت کاری سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ان کی پہلی فلم ''کردار'' تھی جو 1970ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

شیخ حسن جنہوں نے اپنی فلم ''عمر ماروی'' سے سندھی فلمیں بنانے کی ابتداء کی اور کراچی کی فلم انڈسٹری کے سر پر اس اعزاز کا تاج سجایا۔ انہوں نے 1945ء میں متحدہ ہندوستان کی فلم ''پربھو کا گھر'' سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ کراچی آنے کے بعد اپنی پہلی اردو فلم ''ہماری زبان'' ڈائریکٹ کی، پھر دیگر کئی فلموں کے بعد پہلی سندھی فلم ''عمر ماروی'' بنا کر سندھی ادب اور آرٹ کے محسن بن گئے۔ اگرچہ نہ ان کی زبان سندھی تھی نہ سندھی ادب و ثقافت سے وہ واقف تھے، مگر جب اپنی فلموں کے لیے نئے موضوعات کی تلاش میں انہوں نے اندرون سندھ کا دورہ کیا تو انہیں سندھ کی لوک رومانی کہانی ''عمر ماروی'' سننے کا اتفاق ہوا اور انہوں نے اسے سندھی زبان ہی میں فلم کے روپ میں پیش کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ شیخ حسن ہدایت کاری کے ساتھ ساتھ اداکاری بھی کیا کرتے تھے۔

منور رشید بھی کراچی کے ہدایت کاروں میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ تفریحی نوعیت کی فلمیں بنانے میں پیش پیش رہتے تھے۔ بطور ہدایت کار ان کی پہلی فلم ''انسان بدلتا ہے'' تھی جو 1961ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم کے بعد بھی انہوں نے کامیاب فلمیں بنا کر اچھے ہدایت کار ہونے کا ثبوت دیا۔

فضل احمد کریم فضلی نے صرف تین فلمیں بنائیں مگر پاکستان کی فلمی تاریخ میں اپنا نام سنہری حرفوں سے لکھوالیا۔ انہوں نے ان تین فلموں کے ذریعے ایسے فنکار متعارف کرائے جن کے حوالے سے ان کا نام ہمیشہ زندہ تابندہ رہے گا۔

پاکستان کی پہلی کاؤ بوائے فلم ''بارہ بجے'' بنانے والے باقر رضوی نے اس فلم کے علاوہ کچھ جاسوسی نوعیت کی فلمیں بھی بنائیں۔ ''بارہ بجے'' 1961ء میں ریلیز ہوئی تھی اور ناکام ثابت ہوئی تھی۔ جبکہ ان کی دوسری فلمیں کامیاب ہوئی تھیں۔

جان محمد نے اپنا فلمی کیریئر اگرچہ بطور عکاس شروع کیا تھا۔ اس سلسلے کی ان کی پہلی فلم ''استادوں کے استاد'' تھی۔ مگر 1976ء میں بطور ہدایت کار فلم ''دیکھا جائے گا'' ڈائریکٹ کی جو پسند کی گئی اور پھر وہ ہدایت کاری کے میدان کے کامیاب پہلوان بن گئے۔ 1980ء کے بعد تفریح اور ایکشن سے بھرپور سپرہٹ فلمیں بنا کر بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔

فلمی مصنفوں کی حیثیت سے بھی کراچی کی فلمی صنعت میں کئی نامور شخصیتوں نے اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ ریاض شاہد نے یوں تو لاہور کی فلم انڈسٹری کے لیے زندگی بھر کام کیا مگر کراچی کی فلم ''بھروسا'' سے انہوں نے بطور کہانی نویس اور مکالمہ نگار اپنی فلمی زندگی کی ابتداء کی۔

ابراہیم جلیس بھی ایسے ہی فلمی مصنفوں میں تھے جنہوں نے لاہور کی کئی فلموں کے ساتھ ساتھ کراچی کی فلموں کے لیے بھی کہانیاں لکھیں اور مکالمے تحریر کیے۔

بشیر نیاز نے فلمی صحافت کے حوالے سے فلم انڈسٹری میں قدم رکھا اور کراچی کی فلم ''چھوٹی بہن'' سے بطور مصنف اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا۔ گھریلو کہانیاں لکھنے اور دلوں میں اتر جانے والے مکالمے تحریر کر کے انہوں نے فلم والوں کو بہت متاثر کیا اور پھر وہ وقت آیا جب لاہور فلم انڈسٹری انہیں کراچی سے ''چک'' کر لاہور لے گئی اور وہاں انہوں نے اپنی تحریروں سے دھوم مچادی۔

دکھی پریم نگری کا تعلق بھی کراچی کی فلم انڈسٹری سے تھا۔ ''لاکھوں فسانے'' سے انہوں نے کراچی فلم انڈسٹری میں انٹری کی تھی۔ کہانیاں اور مکالمے لکھنے کے ساتھ ساتھ نغمہ نگاری بھی کرتے تھے۔ ''جاگ اٹھا انسان'' ان کی بہترین فلم تھی۔ ان کا ابتدائی دور بمبئی میں گزرا تھا۔ جہاں

www.pakistanipoint.com

بطور صحافی کام کرتے تھے اور پھر وہیں سے فلم رائٹنگ کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ ان کو فلم رائٹر بنانے میں ہدایت کار شیخ حسن کا بڑا ہاتھ ہے۔ بمبئی میں بھی شیخ حسن ہی نے انہیں فلم نگاری پر لگایا تھا۔ پاکستان میں بھی شیخ حسن نے اپنی فلموں کے لیے ان سے کہانیاں اور مکالمے لکھوائے۔

اقبال رضوی کا شمار بھی کراچی کی فلموں کے مصنفوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کئی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے تحریر کیے اور کچھ فلموں کی ہدایت کاری بھی کی۔ وحید مراد کی فلم ''ہیرا اور پتھر'' کا اسکرپٹ انہی کا تحریر کردہ تھا اور انہوں نے اس کی ہدایت کاری بھی شروع کردی تھی کہ پرویز ملک ڈائریکشن کی تعلیم و تربیت حاصل کرکے واپس آئے تو وحید مراد نے اس فلم کی ہدایت کاری اقبال رضوی کی بجائے پرویز ملک سے کروائی۔ اقبال رضوی نے بعد میں سنگیتا کی ہوم پروڈکشن کے لیے بھی کام کیا۔

دانش دیروی نے بھی کراچی کی فلمی صنعت کے لیے اس کے ابتدائی دور میں بطور مصنف گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ''اور بھی غم ہے'' کے نام سے ان کی لکھی ہوئی فلم کو سرکاری طور پر بھی اعزاز کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ یہ فلم تعلیم کے موضوع پر بنائی گئی تھی۔ دانش دیروی بھی بنیادی طور پر ادیب اور صحافی تھے۔ وہ فلمی دنیا کے ماحول میں فٹ نہ ہوسکے اور جلد ہی فلم انڈسٹری سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

آغا نذیر کاوش بھی بنیادی طور پر صحافی تھے۔ ان سے بھی کراچی کے کئی فلمسازوں اور ہدایت کاروں نے فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھوائے مگر وہ بھی مستقل طور پر وہاں ٹک نہ سکے۔

موسیقی کے شعبے میں بھی کراچی فلم انڈسٹری نے کئی نامور موسیقاروں کو منظر عام پر لایا۔ ان میں سہیل رعنا کا نام بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے 1963ء کی فلم ''جب سے دیکھا ہے تمہیں'' سے فلمی موسیقی دینا شروع کی۔ اس سے پہلے وہ ریڈیو اور ٹی وی پر موسیقی کمپوز کیا کرتے تھے۔ اعلیٰ اور معیاری فلمی موسیقی کے حوالے سے سہیل رعنا کا نام اور مقام بہت بلند ہے۔ انہیں کراچی کا فخر اور فلمی موسیقی کا مان سمجھا جاتا ہے۔

ناشاد کا شمار کراچی کے قابل فخر اور پاکستان کے گریٹ موسیقاروں میں ہوتا ہے۔ ناشاد نے متحدہ ہندوستان کی فلم ''دلدار'' سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور بھارتی فلموں کی کامیاب موسیقی ترتیب دینے لگے تھے۔ فلمساز، ہدایت کار اور نغمہ نگار نخشب جارچوی نے جب کراچی آکر اپنی فلم ''میخانہ'' شروع کی تو انہیں بمبئی سے بلا کر اس کی موسیقی کمپوز کروائی۔ نخشب صاحب چند فلمیں یہاں بنا کر واپس بمبئی چلے گئے مگر ناشاد یہیں رہ گئے۔ ناشاد کا اصل نام شوکت دہلوی تھا۔

لال محمد اقبال یہ دو موسیقاروں کی جوڑی کا نام ہے جس نے کراچی کی فلم ''بارہ بجے'' سے اپنی فلمی زندگی کی ابتداء کی تھی۔ ''بارہ بجے'' تو کامیاب نہ ہوسکی مگر اس کی موسیقی اور موسیقی کے حوالے سے اس کے موسیقار کامیاب قرار پائے اور کراچی کی متعدد فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ اس سریلی جوڑی کی نئی کارکردگی کی ابتداء 1961ء میں ہوئی تھی۔

غلام نبی، عبداللطیف بھی دو موسیقاروں کی جوڑی کا نام ہے جس نے شیخ حسن کی پہلی فلم ''ہماری زبان'' کی موسیقی ترتیب دے کر اپنی فنی کارکردگی کی ابتداء کی تھی۔ بعد میں اس جوڑی نے متعدد فلموں کے لیے عمدہ موسیقی کمپوز کی اور کراچی کے مقبول موسیقاروں میں شامل ہوگئے۔

نثار بزمی پاکستانی فلموں کے سپر کلاس موسیقار تھے۔ ان کے ذکر کے بغیر پاکستانی موسیقی کی تاریخ مکمل نہیں سمجھی جائے گی۔ کراچی کی فلم انڈسٹری کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ اس کی فلم ''ہیڈ کانسٹیبل'' پاکستان میں ان کی پہلی فلم تھی۔ متحدہ ہندوستان میں فلم ''جمنا کے پار'' سے انہوں نے اپنی فلمی موسیقی کی ابتداء کی تھی۔ تقسیم کے بعد بھارتی فلموں کے لیے بھی انہوں نے موسیقی ترتیب دی۔ پاکستان آئے تو کراچی میں سکونت اختیار کی اور تاحیات یہیں رہے۔ مگر لاہور کی فلم اور فلم والوں کے لیے بھی کام کرتے رہے۔ ان کی ترتیب دی ہوئی موسیقی نے پاکستانی فلموں کو ایک نیا اچھوتا اور خوبصورت اسلوب عطا کیا۔ پاکستانی فلموں کے گیتوں کو حیات دوام بخشی۔

نغمہ نگاری کے شعبے میں بھی کراچی فلم انڈسٹری نے بڑے اور نامور گیت نگاروں کو منظر عام پر لایا۔ مسرور انور جن کی نغمہ نگاری کے بارے میں کچھ کہنا، سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہوگی۔ کراچی کی فلم ''بنجارن'' بطور فلمی نغمہ نگار ان کی پہلی فلم تھی۔ انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی بدولت گیت نگاری میں بے پناہ کامیابی اور مقبولیت حاصل کی۔ ان کا شمار پاکستان کے چند بڑے نغمہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے چند فلموں کی کہانیاں اور

کالمے بھی تحریر کیے، اور فلمسازی بھی کی۔

تسلیم فاضلی نے فلمی گیت نگاری کی ابتداء کراچی کی فلم ''تم ملے پیار ملا'' سے 1966ء میں کی مگر یہ فلم 1969ء میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم سے پہلے ان کی بعد کی فلموں نے ریلیز ہو کر انہیں کامیاب نغمہ نگاروں کی صف میں لاکھڑا کردیا۔ بعد میں لاہور کے موسیقاروں نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بہت مختصر عرصے میں تسلیم فاضلی نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

کلیم عثمانی جیسے نغمہ نگار کو متعارف کرانے کا سہرا بھی کراچی فلم انڈسٹری کے سر ہے انہوں نے پہلی فلمی نغمہ نگاری [illegible]ء میں کراچی کی فلم ''انتخاب'' کے لیے کی تھی۔ لاہور گئے تو پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

حمایت علی شاعر نے اپنی ادبی شاعری کی طرح فلمی نغمہ نگاری میں بھی بڑا نام کمایا۔ انہوں نے ''اور بھی غم ہیں'' سے فلمی نغمہ نگاری کی ابتداء کی۔ یہ سن 1960ء کی فلم تھی۔ اس کے بعد متعدد فلموں کے گیت لکھے اور ''لوری'' جیسی بلند معیار کی فلم بھی بنائی۔

صہبا اختر بھی ادب کی دنیا سے تعلق رکھنے والے ممتاز شاعر تھے جو فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے بھی کامیاب ثابت ... کراچی کی فلم ''آزادی یا موت'' بطور گیت نگار ان کی پہلی فلم تھی۔ کراچی اور دیگر شہروں میں یہ فلم 1966ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے بعد کراچی کی کئی فلموں کی گیت نگاری کی اور کامیاب نغمہ نگاروں میں شامل ہوگئے۔

... ج لکھنوی بھی کراچی کی فلموں کے مقبول فلمی نغمہ نگار تھے۔ ان کی پہلی فلم ''مسٹر ایکس'' تھی جو 1963ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ان کا تعلق بھی شعر و ادب کی دنیا سے تھا مگر فلموں کے لیے بھی انہوں نے کامیاب گیت نگاری کی۔

یونس ہمدم نے بھی صحافت کے کوچے سے گزرتے ہوئے فلمی گیت نگاری سے ناتا جوڑا۔ ان کی گیت نگاری کی پہلی فلم ''ہمدم'' کراچی کی فلم تھی جو 1967ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ بعدازاں انہوں نے لاہور کی بھی کئی فلموں کی گیت نگاری کی۔

شور لکھنوی اور شیون رضوی نے بھی بطور نغمہ نگار کراچی کی فلموں کے لیے خدمات انجام دیے۔ شور لکھنوی ... منائی۔

... کی تخلیق میں جہاں موسیقاروں اور گیت ... ہوتا ہے وہاں انہیں اپنی خوبصورت آوازوں سے سجانے والے سنگرز کا بھی نمایاں حصہ ہوتا ہے۔ کراچی کی فلم انڈسٹری نے گانے والے اور گانے والیوں کو متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

مہدی حسن، جنہیں سرِ سنگیت کا شہنشاہ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے کراچی کی فلم ''کنواری بیوہ'' سے فلمی گلوکاری کی ابتداء کی اور پھر اپنی جادوئی آواز کے سہارے وہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی کہ انہیں کراچی ہی کے نہیں بلکہ پاکستان کا فخر اور اثاثہ قرار دیا گیا۔ وہ پاکستان کے سب سے بڑے گلوکار ہی نہیں اکیڈمی کا درجہ رکھنے والے بھی تھے۔ گلوکاری میں انہیں جو مقام ملا وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔

احمد رشدی بھی پاکستان کے صفحہ اوّل کے گلوکار تھے۔ یہ ہر طرح کے گیت گانے کے ماہر تھے۔ یہ کراچی ہی نہیں بلکہ پاکستان کا گوہر نایاب سرمایہ تھے۔ کراچی کی فلم ''انوکھی'' جو 1956ء میں ریلیز ہوئی تھی، اس سے فلمی گلوکاری کی ابتداء کی۔ اس سے پہلے وہ ریڈیو کے لیے گاتے تھے۔

مسعود رانا مقبولیت اور کامیابی کے لحاظ سے پاکستان کے تیسرے بڑے گلوکار ہیں اونچے سروں میں نغمہ سرائی کے ماسٹر تھے۔ فلمی تاریخ میں انہیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔ ان کی پہلی فلم ''انقلاب'' تھی جو کراچی میں بنی تھی اور 1962ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

اخلاق احمد بھی ایک خوبصورت آواز کے خالق اور مقبول گلوکار تھے جن کی پہچان ان کی پُرسوز اور پُرکشش آواز تھی۔ وہ اپنے عروج کے دور میں خون کے سرطان کا شکار ہو کر عالم شباب میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ انہوں نے بھی کراچی کی فلم ''پازیب'' سے اپنی فلمی گلوکاری کی ابتداء کی تھی۔

مجیب عالم بھی کراچی کی دریافت تھے۔ ان کی پہلی فلم ''جلوہ'' 1966ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ وہ بھرپور گلوکار تھے۔ ان کی آواز میں جادو تھا جو سننے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا تھا۔ وہ گانے کے شوقین حضرات وخواتین کے فیورٹ سنگر تھے۔ انہوں نے اپنی آواز سے گیتوں کو جو حسن عطا کیا وہ انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

اے نیر جو مقبول و معروف گلوکار کی حیثیت سے شہرت کے حامل تھے یہ بھی کراچی کی دریافت تھے۔ انہوں نے شوخ اور پاپ ٹائپ کی گائیکی سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔

Waqar Azeem www.pakistanpoint.com

سلیم شہزاد یہ مقبول گلوکار بھی کراچی کی دریافت ہیں۔ انہوں نے بطور اداکار فلم ''اپنا پرایا'' اور بطور گلوکار فلم ''سویرا'' سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ان کی مقبولیت ان کی گلوکاری کے سبب ہوئی۔ بطور اداکار وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

ایس بی جون نے بھی کراچی کی فلم ''سویرا'' سے نغمہ نگاری کی ابتداء کی 1959ء میں ریلیز ہونے والی اس فلم کے لیے سدا بہار ایک ایسا گیت گایا جوان کی پہچان بن گیا؟ گیت تھا ''تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے...... یہ مانا کہ محفل جواں ہے حسیں ہے۔'' انہوں نے بہت کم گلوکاری کی مگر اپنے اس ایک گیت کے سہارے وہ یاد کیے جاتے ہیں۔

وسیم فاروقی بھی کراچی کے مقبول اور کامیاب گلوکار تھے۔ اپنے دور میں کراچی کی فلموں کی ضرورت بھی تھے اور پسند بھی کیے گئے۔ ان کی پہلی فلم ''اور بھی غم ہیں'' 1956ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

گانے والیوں میں بھی کئی مشہور اور معروف نام کراچی ہی سے تعلق رکھتی ہیں جن میں رونا لیلیٰ کا نام سر فہرست ہے۔قدرت نے انہیں گائیکی کا ایسا فن عطا کیا تھا کہ جلد ہی ہر دلعزیز گلوکارہ بن گئیں۔ یہ بنگالی نژاد ہیں مگر انہوں نے ہر زبان کی گائیکی میں ذرا بھی محسوس ہونے نہیں دیا کہ یہ ان کی زبان نہیں۔شوخ انداز کے نغمات کی گائیکی میں بے مثال رہیں۔ مادام نور جہاں کی موجودگی میں اپنی صغیر سنی میں اتنی مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ بڑی بڑی گلوکاراؤں کو ان سے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔اگر ان کے والدین انہیں اپنے ساتھ بنگلہ دیش نہ لے جاتے تو پاکستانی فلمی موسیقی کو اور بھی نکھرنے اور سنورنے کا موقع ملتا اور بھی ترقی کرنے کا موقع ملتا۔

مہناز اپنی منفرد گائیکی کے لحاظ سے پاکستان کی قابل فخر گلوکاراؤں میں شمار کی جاتی ہیں۔انہوں نے بھی کراچی کی فلموں سے اپنے ابتدائی دور میں اپنی کارکردگی جاری رکھی مگر جلد ہی اپنی خوبصورت آواز اور فن موسیقی کی مہارت کی وجہ سے تمام بڑے موسیقاروں کو متاثر کیا اور وہ ان کی نغمہ سرائی سے استفادہ کرنے لگے۔

نگہت سیما نے بھی کراچی کی مقبول گلوکارہ کی حیثیت سے فلموں کے لیے گلوکاری کی ان کی پہلی فلم ''شرارت'' تھی۔

نسیمہ شاہین نے بھی کراچی کی فلم ''بارہ بجے'' سے فلم انڈسٹری میں انٹری دی تھی۔ اس کے بعد بھی متعدد فلموں کے لیے گاتی رہیں۔

روبینہ بدر نے بھی مقبول گلوکارہ کی حیثیت سے اپنی فنی خدمات انجام دیں۔انہوں نے 1964ء میں کراچی کی فلم ''ہیڈ کانسٹیبل'' سے بے بی روبینہ کے نام سے اپنا فنی کیریئر شروع کیا تھا۔ جوانی میں بے حد مقبول ہوئیں۔ان کے گیتوں میں

ہائے اللہ میں کیوں جوان ہوگئی

سپر ہٹ گیت تھا۔

سہیل ہاشمی نے بطور عکاس جو اعلیٰ معیار کی عکاسی کی وہ انہیں اس شعبہ کی کارکردگی میں دوسروں سے بہت زیادہ نمایاں اور منفرد مقام عطا کرتی ہے۔انہوں نے بلیک اینڈ وائٹ کے بعد رنگین عکاسی میں بھی اعلیٰ پیمانے کی فوٹوگرافی کی۔انہوں نے کراچی کی سندھی فلم ''عمر ماروی'' سے عکاسی کی ابتداء کی تھی۔ بعدازاں اپنی بہترین فنی کارکردگی کی بنیاد پر پاکستان کے صف اوّل کے عکاسوں میں شمار ہوئے۔

اے سعید نے بطور فلم ایڈیٹر (تدوین کار) کراچی کی فلموں کی ایڈیٹنگ میں بہترین کارکردگی کا ثبوت دیا۔ یہ ہدایت کار اقبال اختر کے شاگرد تھے مگر وہ اپنی اعلیٰ تدوین کاری میں اتنے کامیاب ثابت ہوئے کہ انہیں ہدایت کاری کی طرف جانے کا وقت نہیں ملا۔ان کی ایک پہچان یہ بھی تھی کہ وہ احمد رشدی کے بھانجے تھے۔

اداکاری کے شعبہ کی بات کی جائے تو کراچی کی فلمی صنعت نے بڑے بڑے فنکار دریافت کیے مگر ان کا بڑا فائدہ پاکستان کے بڑے فلمی مرکز لاہور کے فلمسازوں نے اٹھایا۔اس کی مثال ایک دو نہیں متعدد ہیں۔

محمد علی نے کراچی کی فلم ''چراغ جلتا رہا'' سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا مگر جلد ہی وہ لاہور کے ہو کر رہ گئے۔

وحید مراد بھی خالصتاً کراچی فلم انڈسٹری سے تعلق رکھتے تھے مگر انہیں بھی لاہور والے لے اڑے، اگرچہ انہوں نے کراچی کی فلموں میں اداکاری کے ساتھ ساتھ یہاں فلمسازی بھی کی اور ایک فلم ''اشارہ'' کی ہدایت کاری کا بھی تجربہ کیا۔

اداکارہ زیبا نے بھی کراچی کی فلم ''چراغ جلتا رہا'' سے اپنی اداکاری کا دیا روشن کیا مگر جب ان کی روشنی سے فلمیں چکا چوند ہونے لگیں تو لاہوری فلم میکرز نے لاہور بلا کر ان کے پیروں میں اپنی فلموں کی سنہری زنجیر ڈال دی اور،

بھی وہیں کی ہو کر رہ گئیں۔

ایسا ہی کچھ بابرہ شریف کے ساتھ ہوا یہ چھوٹی قد کی بہت بڑی اداکارہ کراچی کے ٹی وی ڈراموں سے جب اپنا فنی قد کاٹھ نکالنے میں کامیاب ہو گئیں تو لاہوری فلموں کی ضرورت بن گئیں۔ انہیں کراچی کی فلموں میں کام کرنے کی بہت کم مہلت ملی۔

شمیم آراء بھی خالص کراچی کی پیداوار تھیں مگر انہیں بھی لاہور کی فلمی آب و ہوا راس آئی اور وہ بھی بالآخر وہیں کی ہو رہیں۔ ان کی پہلی فلم کراچی کی ''کنواری بیوہ'' تھی۔ جو ناکام ہوئی تھی مگر وہ کامیاب اداکارہ بن کر ابھری تھیں اور ان کی کامیابی سے فائدہ اٹھایا لاہوریوں نے، وہ بھی وہیں کی ہو کر رہ گئیں۔

سید کمال، جو باکمال اداکار، اور فلم میکر لاجواب تھے۔ انہوں نے بھی اداکاری اور ہدایت کاری کے شعبوں میں اپنی کامیاب کارکردگی کا ثبوت دے کر اپنے لیے ایک خاص مقام حاصل کیا۔ راج کپور سے ملتی جلتی شکل وصورت کی وجہ سے لاہور کی فلم ''ٹھنڈی سڑک'' میں ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور راج کپور کی طرح شوخ اداکاری کرائی گئی مگر فلم فلاپ ہو گئی اور لوٹ کے بدھو گھر آ گئے۔ کراچی واپس آ کر انہوں نے اپنے بل بوتے پر کامیاب اداکاری کی اور بعد ازاں کامیاب فلمیں بنا کر کامیاب فلمساز و ہدایت کار بنے۔

جاوید شیخ بھی صد فیصد کراچی کے تھے اور اب بھی کراچی کے ہیں۔ کراچی کی فلم ''دھماکا'' سے کیریئر کا آغاز کیا۔ اس فلم کی ناکامی کی وجہ سے ان کا فنی سفر کچھ عرصہ کے لیے ملتوی ہو گیا مگر جب ٹی وی ڈراموں کے ذریعہ ان کی فنی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں تو ایک بار پھر انہیں فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد سے وہ اب تک فلموں اور ٹی وی ڈراموں کے کامیاب پرفارمر ہیں۔ اداکاری کے ساتھ ساتھ فلمسازی اور ہدایت کاری بھی کی۔ انہوں نے لاہور کی فلموں میں بھی کام کیا مگر رہے کراچی ہی میں۔

غلام محی الدین نے ورسٹائل اداکار کی حیثیت سے جو کامیابیاں انجام دی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ بھی کراچی کی پیداوار ہیں۔ ٹی وی ڈراموں سے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ شباب کیرانوی نے انہیں کراچی سے بلا کر فلم کا ہیرو بنا دیا۔ اس کے بعد وہ کراچی اور لاہور کی فلموں میں اداکاری کرنے لگے۔ اردو اور پنجابی فلموں میں ہر طرح کی اداکاری کر کے ثابت کیا کہ وہ سپر پرفارمر ہیں۔ 45 برس بعد بھی وہ اب تک اداکاری کے شعبہ سے وابستہ ہیں اور ٹی وی ڈراموں اور فلموں میں اداکاری کر رہے ہیں۔

دیبا نے بھی کراچی کی فلم ''چراغ جلتا رہا'' سے بیک اسٹار کی حیثیت سے باضابطہ اداکاری شروع کی تھی جبکہ بطور چائلڈ اسٹار ان کی پہلی فلم ''فیصلہ'' تھی۔ بعد ازاں انہوں نے جو عزت شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

روزینہ نے بھی کراچی کی فلم ''ہماری زبان'' سے رشیدہ کے نام سے اپنی اداکارانہ کیریئر کی ابتداء کی تھی۔ بعد ازاں وہ اپنے خوبصورت اور شوخ کرداروں کی ادائیگی کی وجہ سے کراچی اور لاہور کی فلموں میں یکساں مقبول ہوئیں۔

ایس گل بھی کراچی کے فنکار تھے۔ انہوں نے اداکاری کے ساتھ ساتھ فلمسازی اور ہدایت کاری بھی کی۔ سندھی فلموں کی ترقی کے لیے بھی بہت کام کیا۔

ندیم اور سنگیتا میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں کراچی میں پیدا ہوئے اور یہیں پل بڑھ کر بڑے ہوئے مگر ان دونوں کی پہلی فلم ڈھاکے میں بنی۔ ندیم نے احتشام کی فلم ''چکوری'' سے اداکاری شروع کی جبکہ سنگیتا نے اداکارو ہدایت کار رحمٰن کی فلم ''کنگن'' سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ندیم نے ڈھاکے کی کئی فلموں میں کام کر کے مقبولیت کا نیا ریکارڈ قائم کیا تو لاہوریوں نے ندیم کو لاہور منتقل ہونے پر مجبور کر دیا۔ سنگیتا ''کنگن'' کی ناکامی کے بعد کراچی ہی میں رہ کر اپنے بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کرتی رہیں پھر جب ابھرتی ہوئی اداکارہ کی حیثیت سے ان کے حسن و شباب نے فلمسازوں کو متاثر کرنا شروع کیا تو انہیں بھی لاہور میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس طرح کراچی کی یہ اداکارہ بھی لاہور کو پیاری ہو گئی۔

ولن کے کردار کرنے والے کئی مشہور فنکار مصطفیٰ قریشی، ادیب، ہمایوں قریشی اور آصف خان نے بھی کراچی کی فلمی صنعت سے اداکاری کی دنیا میں قدم رکھا۔

مصطفیٰ قریشی نے 1956ء سے ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے اپنا فنی سفر شروع کیا۔ 1958ء سے سندھی فلم ''پردیسی'' سے فلمی دنیا میں آئے۔ اس کے بعد اردو اور پھر پنجابی فلموں کی اوّلین ضرورت بن گئے۔ ادیب نے بھارتی

www.pakistanipoint.com
Azeem

فلم ''فٹ پاتھ'' سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ پاکستان آئے تو کراچی میں قیام کیا اور یہاں کی فلموں سے اداکاری شروع کی۔ پاکستان میں ان کی پہلی فلم ''دال میں کالا'' تھی۔ وہ بھی لاہور گئے تو پھر وہیں کے ہو رہے۔ 2014ء میں ریلیز ہونے والی ان کی آخری فلم ''دنیا'' تھی جس کے بعد وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ہمایوں قریشی بھی کراچی کی دریافت تھے۔ ان کی پہلی فلم ''کلہ خزاں کلہ بہار'' تھی جو پاکستان کی دوسری پشتو فلم تھی۔ انہوں نے بہترین ولن کے طور پر اردو اور پنجابی فلموں میں اداکاری کر کے بڑی شہرت حاصل کی۔ آصف خان کی پہلی فلم ''درۂ خیبر'' تھی جو پشتو زبان میں بنائی گئی تھی اس میں انہوں نے ایکشن سے بھرپور اداکاری کر کے اپنا نام سپر پرفارمر میں شامل کرلیا۔

بدر منیر پشتو فلموں کے حوالے سے بہت بڑا نام تصور کیا جاتا ہے۔ انہوں نے پشتو فلموں کے ساتھ اردو اور پنجابی فلموں میں بھی جاندار اداکاری کر کے اپنے لیے ایک ممتاز مقام بنایا۔ ان کی پہلی فلم ''یوسف خان شیر بانو'' کراچی میں بنائی گئی تھی جو پاکستان کی پہلی پشتو فلم تھی۔

کراچی فلم انڈسٹری نے نامور کامیڈین بھی روشناس کرائے ہیں۔ لہری جنہیں کامیڈی کنگ کہنا غلط نہیں ہوگا۔ انہوں نے 1956ء میں کراچی کی فلم ''انوکھی'' سے اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا تھا۔ انہوں نے اپنے منفرد اسٹائل کی مزاحیہ اداکاری سے پاکستانی فلموں کو ایک نیا رنگ ایک نئی شناخت دی۔

عمر شریف بھی خالص کراچی کی پیداوار ہیں۔ انہوں نے اسٹیج ڈراموں سے اپنا جوفی سفر شروع کیا تھا۔ اس سے فلم والوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ بطور کامیڈین کے انہوں نے اداکاری بھی کی اور فلمساز و ہدایت کار کی حیثیت سے بھی فلمیں تخلیق کیں۔

نرالا بھی کراچی کے مشہور کامیڈین تھے۔ جو اپنے دور میں فلموں کی ضرورت بھی بنے اور بڑی کامیابی حاصل کی۔ ان کی پہلی فلم ''اور بھی غم ہیں'' تھی جبکہ آخری فلم ''مسٹر 420'' تھی۔

کامیڈی کا ذکر ہو اور معین اختر کی بات نہ کی جائے، اس سے بڑی بھول تو ہو ہی نہیں سکتی۔ کراچی کو اس بات پر فخر ہے کہ معین اختر جیسے ورسٹائل کامیڈین اس سے تعلق رکھتے تھے۔ اسٹیج، ٹی وی اور فلم والوں نے ان کی خداداد فنکارانہ صلاحیتوں سے بھرپور فیض اٹھایا۔ وہ کمپیئرنگ کے بھی ماسٹر تھے۔ ان کی پہلی فلم ''تم سا نہیں دیکھا'' 1974ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ انہوں نے فلموں سے زیادہ ٹی وی ڈراموں اور اسٹیج شوز میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

کچھ ایسی اداکارائیں جن کے بارے میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ خالص لاہوری ہیں مگر بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ ان کا آغاز کراچی کی فلموں سے ہوا۔ ایسی ہیروئنوں میں نشو بھی ہیں جن کی پہلی فلم ''بازی'' ان کی پہلی فلم کراچی کی ''ایسا بھی ہوتا ہے'' تھی۔ جو بعد میں اردو اور پنجابی فلموں کی مقبول اداکارہ ثابت ہوئیں۔ فردوس جو پنجابی فلموں کی ٹاپ ہیروئن شمار کی گئیں، جنہوں نے اردو فلموں میں بھی اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ان کے کیریئر کا آغاز بھی کراچی کی فلم ''فانوس'' سے ہوا جو 1963ء کی فلم تھی۔

لیجنڈ فنکاروں میں طلعت حسین کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے ٹی وی ڈراموں ہی میں نہیں فلموں میں بھی ناقابل فراموش اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ پاکستانی فلموں کے علاوہ بھارتی فلم کے لیے بھی انہیں اداکاری کی دعوت دی گئی۔ ''سوتن کی بیٹی'' میں بھی ان کی اداکاری کا فن عروج پر نظر آیا۔ انگریزی فلم ''جناح'' میں بھی اپنے منفرد کردار میں پراثر اداکاری کی۔ انہوں نے بھی ''چراغ جلتا رہا'' سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا تھا جو کراچی کی فلم تھی۔

روحی بانو بھی ایسی ہی لیجنڈ اداکارہ تھیں جن کی اداکاری کو اکیڈمیز میں بطور ''سبق'' پڑھایا جاتا تھا۔ اداکاری سیکھنے والے طالب علموں کو روحی بانو کے ڈرامے دکھا کر پرفارمنگ آرٹ کا درس دیا جاتا تھا۔ آج بھی ان کے ڈرامے بھارتی اکیڈمیز میں رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہ ماسٹر کی ڈگری یافتہ اداکارہ بھی کراچی سے تعلق رکھتی تھی۔ مگر فلم والے ان کے فن کا صحیح فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ان کی پہلی فلم ''پاکی'' تھی۔

کراچی فلم انڈسٹری سے کئی فنکار سندھی فلموں کے حوالے سے بھی مقبول اور مشہور ہوئے مشتاق چنگیزی جو سندھی فلموں کے دلیپ کمار کہلائے گئے انہوں نے کراچی میں بنائی جانے والی فلم ''شہر و فیروز'' سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔

''چکوری'' بھی سندھی فلموں کی مقبول ہیروئن تھیں۔ انہوں نے اردو اور پنجابی فلموں میں بھی بہت کام کیا۔ ان کی بھی پہلی فلم ''شہر و فیروز'' تھی جو 1968ء میں ریلیز ہوئی

www.pakistanipoint.com

تھی۔

وسیم بھی سندھی فلموں کے بڑے ہیروز میں شمار کیے جاتے تھے۔ یہ رومانوی ہیرو تھے۔ ان کی پہلی فلم ''گھونگھٹ الانوار'' تھی جو 1970ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

نگہت سلطانہ نے بھی اداکاری کی ابتدا سندھی فلم ''عمر ماروی'' سے کی تھی۔ اپنے ابتدائی دور میں انہوں نے ہیروئن سے لے کر مرکزی اور کیریکٹر کردار تک بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ ادا کیا اور کافی عرصے تک کام کرتی رہیں۔

پشتو فلموں کے حوالے سے دو مشہور نام نعمت سرحدی اور یاسمین خان نے بھی اپنا فنی کیریئر کراچی کی فلم ''یوسف خان شیر بانو'' سے شروع کیا تھا۔ یہ دونوں بعد ازاں پشتو فلموں کے ساتھ اردو فلموں میں بھی کام کرتے رہے۔

کراچی کی فلمی صنعت کی بات ہو تو اس کی ترقی و ترویج کے ضمن میں سعید اے ہارون کا ذکر نہ ہو، ایسا ممکن نہیں۔ انہوں نے کراچی میں ایسٹرن فلم اسٹوڈیو کے نام سے نگار خانہ قائم کر کے فلمسازی کی ایک بنیادی ضرورت پوری کی تھی۔ ان کا تعلق کراچی اور سندھی کی نامور کاروباری اور سیاسی خاندان ہارون فیملی سے تھا۔ انہوں نے کراچی میں فلمیں بھی پروڈیوس کیں اور انگریزی زبان کا ایک ...یاری میگزین بھی جاری کیا۔ اپنی فلموں کے ذریعہ متعدد نئے لڑکے لڑکیوں کو اداکاری کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی ...ش کیا۔

کراچی میں جب فلمسازی کا کام بہت بڑھا تو ایک اور کاروباری شخص نے ماڈرن فلم اسٹوڈیو کے نام سے دوسرا نگار خانہ بنایا۔

کراچی کی فلم انڈسٹری کو پروان چڑھانے میں کراچی کے چند ڈسٹری بیوٹرز کا بھی احسن کردار ہے۔ ان میں نثار مراد، جے سی آنند اور غفار دانا والا کے علاوہ مجید صاحب بھی قابلِ ذکر ہیں۔ نثار مراد، وحید مراد کے والد محترم تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اداکار بنانے سے پہلے فلمساز بنایا اور اپنے فلمساز ادارے سے متعدد فلمیں بنائیں۔

جے سی آنند صاحب بھی متحدہ ہندوستان کے زمانے سے کراچی میں تقسیم کاری کا کام کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے تقسیم کاری کے ساتھ فلمسازی بھی کی اور بڑی فلمیں بنائیں۔ ان کے ہونہار صاحبزادے ستیش چند آنند آج بھی اپنے والد کے ادارے سے وابستہ ہیں۔

غفار دانا والا نے بھی طویل عرصے تک پاکستانی فلموں کی سرپرستی کی۔ انہوں نے بھی بطور فلمساز کئی فلمیں بنائیں۔ ان کی پہلی فلم ''جوش'' تھی جو 1966ء میں بنائی گئی تھی۔

ایس اے غفار نے بھی بطور فلمساز کئی فلمیں کراچی میں بنائیں۔ ان کی پہلی فلم ''پردیسی'' سندھی زبان کی فلم تھی جو 1958ء میں بنائی گئی تھی۔

اس موقع پر کراچی کے فلمی صحافیوں کا ذکر نہ کیا جائے تو ناانصافی ہوگی۔ صحافیوں میں دو طرح کے صحافی تھے۔ ایک تو وہ جو کسی اخبار یا جریدے کے مالک اور مدیر تھے، دوسرے وہ جو ورکنگ جرنلسٹ تھے۔ الیاس رشدی، خواجہ بقاء اللہ، ذکی عثمانی، ایس اے چاولہ، سعید امرت، منیر حسین اور کنور مجید فلمی اخباروں اور جریدوں کے مالک و مدیر تھے۔ الیاس رشیدی کا ہفت روزہ اخبار نگار، خواجہ بقاء اللہ کا ہفت روزہ کردار، ایس اے چاولہ کا ہفت روزہ نور جہاں، ذکی عثمانی کا ہفت روزہ شاہجہاں، سعید امرت کا ماہنامہ رومان، ماہنامہ شمع اور منیر حسین کا ماہنامہ فلم ایشیاء نے بھی کراچی کی فلموں اور فلم انڈسٹری کے علاوہ پاکستانی فلموں اور فنکاروں کی بڑی خدمت انجام دی۔ نگار کے علاوہ نگار ایوارڈ سے بھی الیاس رشیدی نے پاکستانی فلموں اور فنکاروں کی ترقی و ترویج کے لیے زبردست خدمات انجام دیں۔ آج ان کے اخبار نگار کے علاوہ سارے اخبار اور جریدے موجود نہیں اب نگار الیاس صاحب کے صاحبزادے اسلم الیاس رشیدی نکالتے ہیں۔

ورکنگ جرنلسٹوں میں اس دور کے صحافیوں میں، جب کراچی کی فلمی صنعت اپنے عروج پر تھی، جو بڑے اور نمایاں تھے ان میں صفدر برلاس، اے آر سلوٹ، اقبال احمد خان، ممتاز احمد خان، ولی رضوی، اے کے شاد، یوکملانی، لطیف شیخ، اثر ضیائی، صلاح الدین پراچہ، دکھی پریم نگری، دانش دیروی اور آغا نذیر کاوش قابلِ ذکر ہیں۔

صفدر برلاس اور اے آر سلوٹ، انگریزی اخباروں سے وابستہ تھے جبکہ یوکملانی اور لطیف شیخ گجراتی اخباروں کے لیے کام کرتے تھے۔ ممتاز صاحب اردو اخبار روزنامہ حریت کے فلمی صفحے کے انچارج تھے۔ آغا نذیر کاوش اور صلاح الدین پراچہ ہفت روزہ کردار سے منسلک تھے۔ دکھی پریم نگری فری لانسر کی حیثیت سے نگار، نور جہاں اور دیگر

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اخباروں کے لیے مضامین تحریر کرتے تھے۔ نادر شاہ عادل بھی فری لانسر کے طور پر نور جہاں کے لیے لکھتے تھے۔ اقبال احمد خان روزنامہ جنگ کا فلم میگزین (فلمی صفحہ) ترتیب دیا کرتے تھے۔ بعدازاں ریاض فرشوری اور انعام درانی نے بھی یہ ذمے داری نبھائی۔ ولی رضوی روزنامہ مشرق سے وابستہ تھے۔ اسد جعفری اداکاری کرتے کرتے صحافت کے میدان میں کود پڑے تھے۔ اثر ضیائی نور جہاں اور دوسرے اخباروں کے لیے لکھا کرتے تھے۔

ان سینئرز کے بعد کراچی کے صحافیوں کا جو گروپ سامنے آیا ان میں پرویز مظہر، الیاس شاکر، وسیع قریشی، ناصر رضا، اطہر جاوید صوفی، شاہد سردار، مرزا افتخار بیگ، شہنشاہ حسین، ناصر حسین، مشتاق احمد سبحانی، راشد لطیف، یونس ہمدم، فرقان حیدر برنی، ش م خ، ندیم اسرار عثمانی، ایم اے مغنی اور زخمی کانپوری کے نام شامل ہیں اور بھی کئی صحافی ہیں مگر ان کے نام یاد نہیں آرہے ہیں۔

☆☆☆

یہیں تک لکھ سکا تھا کہ میرے اور میری تحریر کے شیدائی میرے دوست اور بھائی بدرالحسن آگئے اور سلام دعا کے بعد ایک دم پوچھ بیٹھے...... ''کیا لکھ رہے ہو؟''

''کراچی کی فلمی صنعت کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔''

''اچھا!!'' کہہ کر مسکرائے۔ ''آخر خیال آ ہی گیا آپ کو بے چاری کراچی کی فلم انڈسٹری کا۔''

''کیوں...... مجھے کب خیال نہیں تھا؟''

''وہ جو ایک مصرعہ ہے نظیر صدیقی کا...... فرصت زمیں سے ہو تو کریں آسماں کی بات۔ تو کچھ یہی حال تمہارا بھی ہے۔ تمہیں لاہور کی فلم انڈسٹری اور فلمی لوگوں سے فرصت ملے تو تم کراچی اور کراچی والوں کے بارے میں لکھو......''

''یار! تم جیسے قاری کے منہ سے ایسی بات اچھی نہیں لگتی۔ کراچی کے فنکاروں اور ہنرمندوں کے بارے میں بھی میں متعدد بار تحریریں لکھ چکا ہوں اور تم پڑھ چکے ہو پھر بھی تم کراچی والوں کے بارے میں نہ لکھنے کا طعنہ دے رہے ہو۔''

''میری شکایت اپنی جگہ درست ہے۔ تم نے کراچی والوں کے بارے میں جو لکھا ہے وہ میں پڑھ چکا ہوں۔ تقریباً یہ سارے ہی ٹاپ کے پرفارمر ہیں۔ تم مقبول یا جن کے بارے میں لوگ کم جانتے ہیں ان کے بارے میں لکھنے سے تم کیوں دامن بچاتے ہو؟''

''سلیم شہزادہ اور جہانگیر کے متعلق بھی تحریر کیا ہے میں نے۔''

''ہاں ایسے ہی لوگ...... جن کا ذکر تمہاری تحریروں میں تو ہوتا ہے مگر عام لوگ ان کے بارے میں اور بھی بہت کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد بدرالحسن مزید گپ شپ لگا کر چلے گئے اور مجھے اپنے حال پر ترس آنے لگا۔ میری کیفیت بھی اس مداری جیسی ہے جسے اپنے تمام تماشائیوں کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔ عوامی رائٹر بننا کوئی آسان کام نہیں اور پھر جلد ہی میں نارمل ہو گیا اور سوچا، تو پھر کیوں نا اسی تحریر میں کچھ کراچی والوں کا ذکر ذرا تفصیل سے بھی یہاں کر دیا جائے تاکہ بدرالحسن جیسے قاری مطمئن ہو جائیں۔

☆☆☆

جن دنوں میں نگار میں بطور ایڈیٹر کام کرتا تھا انہی دنوں کی بات ہے، نغمہ نگار مسرور انور ایک دن دفتر آئے۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد بتایا۔ ''اپنے نفیس بھائی بھی شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ آپ شادی میں گئے تھے؟''

''نہیں، میں نہیں جاسکا۔ بھائی الیاس گئے تھے۔''

''بہت دنوں تک دامن بچاتے رہے۔'' مسرور انور مسکراتے ہوئے بولے۔ ''آخر آ ہی گئے زیرِ دام......''

''مسرور بھائی! ان کی اس شادی کے بارے میں کچھ لکھ دیجیے نا۔'' میں نے فرمائش کی۔

''ارے یار!'' کہہ کر وہ ذرا دیر خاموش رہے پھر بولے۔ ''لکھو......'' اور ایک قطع لکھوا دیا۔ جس کے مجھے اس وقت دو مصرعے ہی یاد ہیں۔

نفیس بھائی کنواروں کا ساتھ دے نہ سکے
کہ جیسے چاند ستاروں کا ساتھ دے نہ سکے

ابراہیم نفیس سے میری بھی بڑی اچھی صاحب سلامت تھی۔ ان سے حمید کاشمیری کی کتابوں کی دکان پر اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ وہ نام کے ہی نفیس نہیں، حقیقی زندگی میں بھی بڑے نفیس انسان تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی فرقان حیدر سے بھی اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی جو اسٹیج ڈرامو کے نامور ہدایت کار تھے۔

کراچی شہر اور یہاں کی ثقافتی سرگرمیوں سے ابرا

Naqar Azeem www.pakistanipoint.com

نفیس کا بڑا گہرا تعلق تھا، لہٰذا اس تحریر کے حوالے سے سب سے پہلے ان کا نام یاد آ گیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ ابراہیم نفیس بھائی کے بارے میں ذرا تفصیل سے لکھوں اور اپنے قارئین کو بتاؤں کہ وہ کیسے تھے۔ خاصے پڑھے لکھے، ادب اور آرٹ کے دلدادہ..... بے حد شریف النفس..... مگر بعض فلموں میں ایسے خطرناک اور خوفناک روپ میں غنڈہ، بدمعاش اور چور نظر آتے تھے تو تعجب ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک اداکار تھے اور ہر کردار میں ڈھل جانے کا انہیں ہنر آتا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک باصلاحیت فنکار تھے۔ انہیں ہر کردار میں چاہے وہ تھیٹر کا ہو، اسٹیج کا ہو، ٹی وی ڈراموں کا ہو یا پھر فلم کا ہو، اس کے عین فطری تقاضوں کے مطابق ادا کرنے میں بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے لاتعداد ٹی وی ڈراموں، اسٹیج ڈراموں اور 100 سے زائد فلموں میں اپنی اداکارانہ خوبیوں کا مظاہرہ کیا اور ناقدین، مبصرین اور ناظرین سے داد و تحسین حاصل کی۔ ان کی پہلی فلم ''رات کے راہی'' تھی۔ جس کے فلمساز اقبال شہزاد اور ہدایت کار اقبال یوسف تھے۔ یہ اقبال یوسف کی بھی بطور ہدایت کار پہلی فلم تھی۔

واضح رہے کہ اقبال شہزاد کراچی میں ساؤنڈ ریکارڈسٹ ہوا کرتے تھے۔ ''رات کے راہی'' میں ابراہیم نفیس نے پولیس کے ایک ایماندار ڈی آئی جی کا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن ریحانہ تھیں، جو بمبئی کی متعدد فلموں میں کام کر چکی تھی۔ فلمساز اقبال شہزاد کی فلم ''بنجارن'' ابراہیم نفیس کی شناخت بنی۔ اس فلم میں ان کی فطری اداکاری نے فلمسازوں اور ہدایت کاروں کو بہت متاثر کیا اور وہ ایک ورسٹائل اداکار کی حیثیت سے ہر طرح کرداروں کے لیے کاسٹ کیے جانے لگے۔ ''بنجارن'' کے ہدایت کار حسن طارق تھے۔ اس فلم کی سپرہٹ کامیابی کے بعد وہ بھی ہٹ ہو گئے۔ انہیں، ولن، کیریکٹر ایکٹر، معاون اداکار، سائیڈ ہیرو اور ہیرو کے مرکزی کرداروں کے لیے کاسٹ کیا جانے لگا۔ فلم ''عشقِ حبیب'' میں ابراہیم نفیس نے مرکزی کردار میں ناقابلِ فراموش کردار نگاری کی۔ فلم ''ہیرا اور پتھر'' میں ایک سنگدل بھائی اور بیٹے کے روپ میں سپر اداکاری کی۔ فلم ''جب جب پھول کھلے'' میں ایک شاطر اور مکار ولن کا رول بڑی خوبی کے ساتھ کیا۔ فلم ''آج اور کل'' میں ایک شفیق باپ کے کردار میں جو اپنی بیٹی کو معاشرے کی ایک بڑی لعنت (جہیز) کے خاتمہ میں مدد کرتا ہے۔ فلم ''بدلتے موسم'' میں ایک گھمنڈی باپ۔ فلم ''انمول محبت'' میں اپنی ہی بیٹی کی بربادی کا باعث بننے والا باپ ہوتے ہیں۔

اگر ہم ان کے ادا کیے ہوئے باپ ہی کے کردار کو لے لیں تو اس میں وہ مختلف روپ میں نظر آئیں گے اور اس سے ان کی پرفارمنگ کوالٹی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ہدایت کار اقبال یوسف کی آل ٹائم کلاسک ایکشن مووی ''ان داتا'' میں دوست کا کردار ادا کرنے والے ابراہیم نفیس کو کون بھول سکتا ہے جو اپنے ہی جگری دوست سے صرف دولت کے لالچ میں غداری کرتا ہے۔

اسی طرح گینگ کے سربراہ کے کردار میں ان کی فلمیں ''جان کے دشمن''، ''لو اِن یورپ''، ''وعدے کی زنجیر'' اور ''جان کی بازی'' بھی ان کی اداکاری کے حوالے سے یادگار ہیں۔ فلم ''سچائی'' میں سچائی کو نیچا دکھانے والا گھمنڈی شخص بھی فلم بینوں کو یاد ہوگا۔ ابراہیم نفیس کے ایسے متعدد کردار ہیں جنہیں بھلایا نہیں جا سکتا بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ ناقابلِ فراموش کردار ابراہیم نفیس کی یاد دلانے کے لیے کافی ہیں۔

ابراہیم نفیس ان فنکاروں میں ہیں جنہیں بلیک اینڈ وائٹ اور رنگین فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ ایک دور تھا جب پاکستان میں صرف سیاہ و سفید فلمیں بنا کرتی تھیں۔ رنگین فلموں کا دور بہت بعد میں آیا۔

ابراہیم نفیس جب فلم انڈسٹری سے جڑے، اس دور میں لیجنڈ آغا طالش اور علاؤالدین کا کیریکٹر ایکٹر کے طور پر طوطی بولتا تھا۔ اس دور میں کسی نووارد کا کیریکٹر ایکٹنگ کے حوالے سے ٹکنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ابراہیم نفیس نے ان کے درمیان رہ کر اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ یہ بلیک اینڈ وائٹ فلموں کا دور تھا۔ اس دور کی ان کی یادگار فلموں میں رات کے راہی، عشقِ حبیب، بنجارن، جاگ اٹھا انسان، احسان، دوراہا، فسانہ دل، زندگی کتنی حسین ہے، پھر چاند نکلے گا، نورین، ہیرا اور پتھر، انسان بدلتا ہے، شہیدہ تیتو میر، میرے بچے میری آنکھیں، پھر صبح ہوگی، ناخدا، استادوں کے استاد اور جب سے دیکھا ہے تمہیں شامل ہیں۔

www.pakistanipoint.com

ہماری شوبز کی دنیا بھی بڑی عجیب دنیا ہے۔ یہاں چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے۔ جب کوئی فنکار عروج پر ہوتا ہے تو سب ہی اس کے چاہنے والے ہوتے ہیں لیکن جب کسی پر ذرا سا زوال آجائے تو پھر ایسے ہو جاتے ہیں جیسے جانتے نہیں پہچانتے نہیں۔ اکثر ہمارے فنکاروں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہی کچھ لیجنڈ اداکار ابراہیم نفیس کے ساتھ بھی ہوا۔ تین چار سال تک وہ بستر علالت پر رہے مگر کسی کو ان کی خیریت معلوم کرنے کی توفیق نہ ہوئی پھر ان کی بصارت اور یادداشت کم ہوتی چلی گئی اور...... ایک دن وہ.. کومے میں چلے گئے۔ ایک ماہ تک کومے میں رہنے کے بعد.. بالآخر 20 مئی 2012ء کو اس بے مروت دنیا سے کوچ کر گئے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ انہوں نے ایک بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی کو سوگوار چھوڑا۔ موت کے وقت ان کی عمر 86 برس تھی۔

☆☆☆

ابراہیم نفیس جیسے فن کے گوہر گراں مایہ اور بھی بہت ہیں جن کو منظر عام پر لانے کا کریڈٹ کراچی کی فلمی صنعت کا ہے۔ کراچی کبھی فن و ثقافت کا ایسا گہوارہ تھا جس نے اس شہر کو شوبز کی ترقی و ترویج کا مرکز بنا دیا تھا۔ پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک پاکستان کا تجارتی حب کا درجہ رکھنے والا یہ شہر اس کا سرمایہ، اس کے تخلیق کاروں کی کاوشیں اور فنکاروں کی پرفارمنس اور اس کے سینما گھر، سب نے مل کر پاکستانی فلم انڈسٹری کی ناقابل تردید خدمات انجام دیں۔

قیام پاکستان کے بعد سے ہی نہیں، تقسیم ہند سے پہلے بھی کراچی میں خوبصورت سینما گھر موجود تھے اور یہاں بمبئی اور لاہور سے بنائی جانے والی فلمیں اہلیانِ کراچی کو سستی تفریح بڑی فراخدلی سے پیش کرتے تھے۔ جبکہ قیام پاکستان کے بعد یہاں سینما انڈسٹری نے جو فقید المثال کامیابی حاصل کی اس کے نتیجے میں اس شہر میں 126 سینما گھروں میں فلموں کی نمائش کی جانے لگی۔

قیام پاکستان سے پہلے کراچی میں موجود چند سینما گھروں کے بارے میں آپ کی معلومات میں اضافہ کے لیے عرض کروں گا کہ یہ شہر متحدہ ہندوستان کے زمانے میں بھی شوبز کے حوالے سے بڑا مددگار رہا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد تو جیسے جیسے اس شہر کی آبادی بڑھتی گئی ویسے ویسے سینما گھروں میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور اسی شہر کراچی کا فلم بزنس پورے پاکستان میں دوسرے شہروں سے زیادہ ہونے لگا۔ اپنے زیادہ سینماؤں کی وجہ سے اس کا شمار پاکستان میں سب سے زیادہ سینما والے شہر میں ہوتا تھا۔

قیام پاکستان سے پہلے کراچی کے دیگر سینما گھروں میں دو سینما گھر جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے سڑک کے آر پار تھے اور جن کا نام بڑا دلچسپ تھا۔ ایک کا نام رادھا تھا تو دوسرے کا نام کشن۔ رادھا اور کشن ہندوؤں کے دو دیوی دیوتا، پریمیوں کے نام تھے۔ بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) میں یہ دونوں سینما گھر تھے۔ ان کے ہندو مالک انہیں چھوڑ کر بھارت چلے گئے تو رادھا سینما ناز سینما بن گیا اور کشن کا نام نشاط رکھ دیا گیا۔ واضح رہے کشن (نشاط)، رادھا (ناز) کے بعد قیام پاکستان سے کچھ قبل 1940ء میں بنایا گیا تھا۔ ہندو تماشائیوں کے لیے یہ دونوں سینما گھر بڑے اچھے تفریح گاہ تھے۔

قیام پاکستان کے وقت ہنگاموں کی وجہ سے ان سینماؤں کے مالکان انہیں چھوڑ کر بھارت چلے گئے پاکستان بننے کے بعد ان سینماؤں کو پاکستانی مالکان نے خریدا اور چلانے لگے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کشن کو جب دوبارہ نشاط کے نام سے فعال کیا گیا تو اس کا افتتاح 25 دسمبر 1947ء کو محترمہ فاطمہ جناح نے کیا۔ نشاط سینما میں ریلیز ہونے والی پہلی فلم ہدایت کار ایس۔ کے اوجھا کی بھارتی فلم ”ڈولی“ تھی۔ ”کشن“ کو خرید کر نشاط بنانے والے ایک پارسی سیٹھ کوڈراج کانڈا والا تھے۔ نشاط سینما میں ریلیز ہونے والی پہلی پاکستانی فلم ”شہری بابو“ تھی جس میں سورن لتا اور سنتوش کمار نے مرکزی کردار کیے تھے۔ یہ پنجابی فلم 1953ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس سینما کا شمار ملک کے صف اوّل کے سینماؤں میں ہوتا تھا 1963ء میں اسے معروف ڈسٹری بیوٹر ندیم مانڈی والا کے والد حکیم مانڈی والا نے خرید لیا۔ یاد رہے کہ علی زیب کی پہلی فلم ”چراغ جلتا رہا“ اسی نشاط سینما میں ریلیز ہوئی تھی اور اس کا افتتاح بھی مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اس سینما گھر میں دکھائی جانے والی چند یادگار فلموں میں باجی، چندا، خاندان، ایسا بھی ہوتا ہے، نادرہ، عید مبارک، عادل، حاتم طائی، درشن، جوکر، تاج محل، دل میرا دھڑکن تیری، سلام محبت، قسم اس وقت کی، بازی، سوغات، دل اور دنیا، دشمن اور کوشش کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جبکہ جو ڈر گیا وہ مر گیا، چیف صاحب، سلاخیں، انتہا، کا مین تھیٹر بھی نشاط تھا۔ 1972ء

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

میں اس سینما میں انگریزی فلموں کی نمائش کا آغاز ہوا۔ سیمسن (ڈی لیلا) اس سلسلے کی پہلی فلم تھی۔ بن حر (سیکنڈ ٹائم) کنز آف نیورآن (سیکنڈ ٹائم)، گریٹ اسکیپ (سیکنڈ ٹائم) گولڈ مین اور کئی شاہکار انگریزی فلمیں یہاں دکھائی گئیں پھر فلمسازی کے بحران کی وجہ سے یہ سینما 4 مارچ 2004ء میں بند کردیا گیا اور تقریباً دو سال بعد ''مغل اعظم'' کی آمد نے اسے دوبارہ کھلوایا۔ مغل اعظم کے بعد یہاں کئی بھارتی فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں آوارہ پن، ریس، تارے زمین پر، گول مال ریٹرن، مائی نیم از خان نے بہت اچھا بزنس کیا۔ 21 دسمبر 2012ء کو نشاط سینما احتجاجیوں کے ہاتھوں نذر آتش ہوا۔ آج بھی اس کا جلا ہوا ڈھانچا ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے کہ مجھے کس جرم میں یہ سزا دی گئی ہے؟

ناز سینما جو نشاط کے مقابل تھا اور جس کا پرانا نام رادھا ٹاکیز تھا۔ 1990ء میں بند ہوگیا۔ بعدازاں ناز پلازا کے نام سے یہاں ایک کاروباری بلڈنگ تعمیر کی گئی جو اب کمپیوٹر مارکیٹ کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت موجود کراچی میں چند دیگر اہم مرکزی اور سائیڈ کے سینما گھروں کے بارے میں بتاتا چلوں۔ پیلس سینما سول لائنز، ہوٹل میٹروپول کے قریب ہی واقع تھا۔ یہ مئی 1983ء میں بند ہوگیا۔ کمار یہ سینما نیپئر روڈ پر آج بھی موجود ہے۔ نگار جس کا پرانا نام پربھات ٹاکیز تھا۔ یہ بھی نیپئر روڈ پر موجود تھا بند ہوچکا ہے مگر اس کی عمارت موجود ہے۔ راکسی جس کا پرانا نام راما ٹاکیز تھا نیپئر روڈ پر آج بھی چل رہا ہے۔ نور محل، پرانا نام جگدیش ٹاکیز نیپئر روڈ پر واقع تھا۔ 1987ء میں مسمار کرکے رہائشی پلازا بنادیا گیا۔ ایمپائر جس کا پرانا نام موتی محل تھا 1963ء میں اس کا نام قسمت رکھا گیا یہ مشن روڈ پر واقع تھا۔ 1979ء میں اسے گرا کر بلڈنگ بنادی گئی۔ میٹرو یہ قدیم سینما کیماڑی میں ہوا کرتا تھا جو 1952ء میں بند ہوگیا۔ کراچی میں مسمار ہونے والا یہ پہلا سینما تھا۔ پرانا نام کیماڑی ٹاکیز تھا۔ یہ 1968ء میں توڑ دیا گیا۔ گنیمہ کیماڑی میں واقع یہ سینما قیام پاکستان سے پہلے تعمیر کیا گیا تھا جو 1983ء میں ایک رہائشی اپارٹمنٹ میں تبدیل ہوگیا۔ لائٹ ہاؤس جس کا پرانا نام گلوب ٹاکیز تھا لنڈا بازار ایم اے جناح روڈ پر تھا۔ 1989ء میں بند ہوگیا۔ پکچر ہاؤس ایک چھوٹا سا سینما لائٹ ہاؤس سے چند قدم کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس انوکھے سینما

زندگی نامہ

اصل نام۔ سید محمد ابراہیم رضوی
فلمی نام۔ ابراہیم نفیس
ولادت۔ 1936ء
مقام۔ آگرہ (ہندوستان)

وہ اپنے 9 بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔

11 برس کے تھے کہ اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آگئے اور پشاور میں سکونت اختیار کی۔

فنی سرگرمیاں۔ 1952ء میں ریڈیو پاکستان پشاور سے منسلک ہوگئے۔ حیدرآباد میں ریڈیو کا اجراء ہوا تو وہاں ان کو 1958ء کو منتقل کردیا گیا پھر تھیٹر، اسٹیج اور ٹی وی سے ہوتے ہوئے فلمی دنیا تک پہنچ گئے۔

میں اسکرین کی جگہ ایک دیوار پر سفیدہ لگا کر فلم چلائی جاتی تھی۔ یہ میٹرو کیماڑی کے بعد ٹوٹنے والا دوسرا سینما تھا جو 1956ء میں پیٹرول پمپ میں تبدیل ہوگیا۔ میجسٹک، اللہ والا مارکیٹ کے ساتھ ایم اے جناح روڈ پر جہاں آج لکھنو مارکیٹ ہے کسی زمانے میں ایک قدیم سینما میجسٹک ہوا کرتا تھا۔ 1978ء میں اسے گرا کر لکھنو مارکیٹ تعمیر کی گئی۔ اس کا پرانا نام اسٹار ٹاکیز تھا۔ رٹیز سینما ایم اے جناح روڈ پر واقع اس قدیم سینما کا پرانا نام امپیریل ٹاکیز تھا۔ یہ میجسٹک سینما کے بالکل سامنے سول اسپتال کی طرف جانے والی سڑک کے کارنر پر تھا۔ جہاں اب مریم مارکیٹ ہے۔ 1975ء میں یہ سینما بند ہوگیا تھا۔ تاج محل ریڈیو پاکستان کراچی کی پرشکوہ عمارت کے سامنے یہ سینما ہوا کرتا تھا۔ جہاں اب الحمرا اپارٹمنٹس ہے۔ 1988ء میں تاج محل گرادیا گیا۔ پلازا کراچی شہر کا ایک خوبصورت معیاری مرکزی سینما تھا جو ایم اے جناح روڈ پر واقع تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے اس کا نام کراؤن ٹاکیز تھا۔ 1986ء میں یہ سینما ختم ہوکر ماضی کا ایک قصہ بن گیا۔

مے فیئر یہ اوپن ایئر تھیٹر تھا جہاں صرف دوشو ہوا کرتے تھے۔ یہ فاطمہ جناح روڈ پر جہاں آج کل ایٹریم مال ہے اسی روڈ پر واقع تھا۔ 1958ء میں یہ اوپن ایئر سینما بند ہوگیا۔

پیراڈائز سینما صدر کوآپریٹو مارکیٹ کے بالکل برابر

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

پیراڈائز ہوٹل کے بازو میں واقع تھا۔ کسی زمانے میں یہ کراچی کا ایک معیاری اور خوبصورت سینما ہوا کرتا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے اس سینما میں انگریزی فلموں کی نمائش ہوا کرتی تھی۔ جمعہ 23 دسمبر 1977ء کو یہاں سپر اسٹار بابرہ شریف اور محمد علی کی ناقابلِ فراموش فلم ''سلاخیں'' ریلیز ہوئی جو اس سینما کی آخری فلم تھی۔ اس کے بعد اسے مسمار کرکے اس کی جگہ ایک خوبصورت پلازا بنادیا گیا۔ کیپٹل سینما صدر میں کریم سینٹر کی گلی میں واقع اس خوبصورت سینما کا شمار بھی قیام پاکستان سے قبل کے اہم مرکزی سینماؤں میں ہوتا تھا۔ جہاں بڑی بڑی بلاک بسٹر انگریزی فلموں کی نمائش ہوتی تھی۔ آسکر ایوارڈ یافتہ انگریزی فلم ''بن حر'' پہلی بار پاکستان میں اسی سینما کے اسکرین کی زینت بنی تھی۔ اس سینما کی لابی میں ایک وی آئی پی ریسٹورنٹ گلوری کے نام سے واقع تھا۔ یہاں شہر کی ہائی جنیٹری آیا کرتی تھی۔ خاص طور پر یہاں کا مسکہ بن لوگوں کو آج بھی یاد ہوگا۔ 1978ء میں یہ سینما گرادیا گیا۔ اب یہاں ریڈی میڈ گارمنٹس کی مارکیٹ ہے۔ سپر سینما بھیم پورہ کی گلی کے کارنر پر واقع تھا۔ گلی سے باہر نکلتے تو نیپئر روڈ شروع ہوجاتا تھا۔ بھیم پورہ اور نیپئر روڈ کے سنگم میں سپر کے نام سے بننے والا یہ سینما اپنی طرز تعمیر اور معیار کے حوالے سے اپنے نام کی طرح اس علاقے کے باقی تمام سینما گھروں میں سپر تھا۔ فیملیز کا یہ پسندیدہ سینما ہوا کرتا تھا۔ یہ سینما اپریل 1984ء کو منہدم کردیا گیا اور اس کی جگہ ایک رہائشی اپارٹمنٹ تعمیر کردیا گیا۔

☆☆☆

اس سے پہلے کہ قیام پاکستان کے بعد بننے والے سینما گھروں کے متعلق معلومات کا پٹارہ کھولا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کراچی کے ایک بڑے اداکار کے بارے میں کچھ باتیں کرلی جائیں جو ہر لحاظ سے ایک اچھے اداکار کے ساتھ ساتھ ایک نفیس انسان بھی تھے مگر ان کو وہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ حقدار تھے۔ یہ کمال ایرانی تھے جو تھے تو کراچی کے پیداوار مگر انہوں نے بھی لاہور کی فلموں میں کام کیا۔ اردو اور پنجابی فلموں کے علاوہ پشتو فلموں میں بھی اداکاری کی۔ ان کی فلموں کی مجموعی تعداد 244 ہے جن میں 188 اردو، 43 پنجابی، 8 سندھی اور 5 پشتو فلمیں ہیں۔

کمال ایرانی کا اصل نام کمال الدین صفوی تھا۔ وہ 5 اگست 1932ء کو بروز جمعہ پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد ایران سے آکر سندھ میں بس گئے تھے۔ اس لیے کمال ایرانی کو اپنے بزرگوں کی کچھ باتیں ورثے میں ملیں۔ جیسے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ ایرانی شامل کیا۔ گھر میں فارسی بولی جاتی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اردو اور انگریزی آسانی کے ساتھ اور روانی کے ساتھ بول لیتے تھے۔ سندھی زبان انہیں بخوبی بولنے کی پریکٹس تھی کہ جام کنڈیے اور گری گوٹھ جیسے اندرون سندھ علاقوں میں ان کی رہائش تھی جہاں ان کی کھیتی باڑی تھی۔ وہ اور ان کے بڑے طویل عرصے تک کھیتی باڑی کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ان علاقوں میں بلوچی زبان بھی بولی جاتی تھی اور کمال ایرانی بلوچی زبان بھی بڑی آسانی سے بول لیتے تھے۔ کمال ایرانی اپنے آبائی پیشے کاشتکاری کو چھوڑ کر کراچی آگئے اور سندھ مدرستہ الاسلام میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے دوران ہی سے ڈراما کلب کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کردیا۔ اس کے بعد اسٹیج تک پہنچ گئے اور اسٹیج ڈراموں میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے لگے۔ وہاں ان کو کسی نے بتایا کہ اچھے اداکار کے لیے اچھا صداکار بننا ضروری ہے اور ریڈیو سے بہتر صداکاری سکھانے والا کوئی دوسرا ادارہ نہیں۔ لہٰذا وہ ریڈیو پاکستان کراچی پہنچ گئے۔ یہاں انہیں بڑے بڑے صداکاروں کے ساتھ صداکاری کرنے اور ان سے تربیت حاصل کرنے کا بہترین موقع ملا۔ پھر بھی ریڈیو پاکستان تھا جہاں سے انہیں پرفارمنگ آرٹ میں ابھرنے کا سنہری موقع ملا۔ جب فضل احمد کریم فضلی نے اپنی پہلی فلم ''چراغ جلتا رہا'' کے لیے ریڈیو کے اعلیٰ حکام سے رابطہ کیا اور کہا۔ ''مجھے اپنی فلم کے لیے کچھ باصلاحیت آرٹسٹوں کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں میری معاونت کیجیے۔''

تو ریڈیو سے جو لوگ فضلی صاحب کے پاس بھیجے گئے ان میں محمد علی، صفیہ معینی، امیر خان، اور کمال ایرانی تھے۔ واضح رہے کہ اس فلم کے ہیرو عارف اور دیبا، طلعت حسین اور زیبا کا تعلق ریڈیو سے نہیں تھا۔ ''چراغ جلتا رہا'' 9 مارچ 1962ء کو نمائش پذیر ہوئی اور اس کا افتتاح مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کے ہاتھوں ہوا۔ یہ فلم کاروباری طور پر تو کامیاب نہ ہوسکی مگر اسے بڑی شہرت ملی اور اس فلم کے حوالے سے اس میں اداکاری کرنے والے آرٹسٹوں کو بھی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

پذیرائی نصیب ہوئی۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ زیبا اور محمد علی کی طرح کمال ایرانی کی بھی یہ پہلی فلم ہے مگر پہلی فلم کے حوالے سے یہ ان کی پہلی فلم نہیں، دوسری فلم تھی جس سے انہیں عوامی حلقوں میں شناخت ملی۔ ان کی پہلی فلم دو سال پہلے ریلیز ہونے والی فلم ''خان بہادر'' تھی۔ یہ بھی کراچی میں بنی تھی اور 12 اگست 1960ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی مگر یہ بری طرح ناکام ہوگئی تھی یہی وجہ ہے اس کے بارے میں بہت کم لوگوں کو علم ہے۔

''چراغ جلتا رہا'' کی ریلیز کے بعد اگلے سال 1963ء میں کمال ایرانی کی دو فلمیں ''ہمیں بھی جینے دو'' اور ''دل نے تجھے مان لیا'' سینما گھروں کی زینت بنیں۔ اگلے برس یعنی 1964ء میں وحید مراد کی فلم ''ہیرا اور پتھر'' میں کام کر کے کمال ایرانی کی شہرت دوچند ہوگئی اور کراچی کے فلمسازوں کے علاوہ لاہور کے فلم میکرز کے لیے بھی باصلاحیت فنکاروں کی صف میں شامل ہوگئے، لاہور کی فلموں کے لیے بھی کاسٹ کیے جانے لگے۔ اس طرح وہ کراچی اور لاہور کی فلموں کے لیے ہر طرح کے کردار ادا کرنے لگے۔ ان کی فلمی زندگی تین دہائیوں پر محیط ہے۔

اس دوران انہوں نے کیریکٹر ایکٹر کے علاوہ کچھ فلموں میں ولن کے کردار بھی بڑی خوبی سے ادا کیے۔ ولن کے طور پر انہوں نے ''آئینہ'' (1966) اور ''جاگ اٹھا انسان'' (1966) قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی دیگر فلموں میں ہم دونوں (1964)، بیس دن (1964)، لہو پکارے گا (1967)، وقت کی پکار (1967)، دل دیوانہ (1967)، السلام علیکم (1969)، سنگدل (1968)، جھک گیا آسمان (1969)، ڈاکٹر شیطان (1969)، مالکہ (1969)، شمع پروانہ (1970)، مجرم کون (1971)، جیمز بانڈ 008 آپریشن کراچی (1971)، یادیں (1971)، بہارو پھول برساؤ (1972)، نیا راستہ (1972)، غلام (1973)، سادھو اور شیطان (1973)، عزت (1974)، مٹی کے پتلے (1974)، چکر باز (1974)، سوہنی مہیوال (1976)، دیکھا جائے گا (1976)، آخری گولی (1977)، آئینہ (1977)، پاکیزہ (1979)، چاہت (1979)، بیوی ہو تو ایسی (1982)، مشرق مغرب (1985)، مس بنکاک (1986)، میران جمالی (1990)، شامل ہیں۔

کمال ایرانی ایک شریف النفس انسان تھے۔ تمام چھوٹوں بڑوں سے بڑی محبت اور خلوص و اپنائیت کے ساتھ ملتے تھے۔ ہم عصر فنکاروں سے بھی ان کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہتے تھے۔ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ مشترکہ خاندان میں رہے اور سب کو ساتھ لے کر چلنے والوں میں تھے۔

کمال ایرانی کی دو اولاد نرینہ تھی۔ بڑے کا نام سید آغا جعفر صفوی اور چھوٹے کا نام سید علی عباس صفوی تھا۔ ان

زندگی نامہ

اصل نام۔کمال الدین صفوی
فلمی نام۔کمال ایرانی
پیدائش۔5 اگست 1932ء

ان کے بڑے ایران سے آکر اندرونِ سندھ کے علاقے جام کنڈے اور گری گوٹھ کے علاقے میں آباد ہوگئے تھے۔ کراچی آکر سندھ مدرستہ الاسلام میں داخلہ لے لیا۔ سندھ مدرستہ الاسلام میں پڑھتے ہوئے ہی ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ پھر ریڈیو پاکستان میں صداکاری شروع کر دی۔ یہیں سے فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ فضل احمد کریم فضلی صاحب نے انہیں پہلی بار اپنی فلم ''چراغ جلتا رہا'' میں اداکاری کا چانس دیا مگر ایک روایت یہ ہے کہ ان کی پہلی فلم ''خان بہادر'' تھی جو 12 اگست 1960ء کو ریلیز ہوئی تھی جبکہ ''چراغ جلتا رہا'' کی تاریخ نمائش 9 مارچ 1962ء ہے۔ آخری فلم سندھی زبان کی فلم ''میراں جمالی'' جو ان کے انتقال کے بعد 1990ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

بیٹے کی اداکاری

کمال ایرانی کے بڑے بیٹے سید آغا جعفر صفوی نے بچپن میں کئی اداکاروں کے بچپن کے کردار ادا کیے اور بڑا ہونے کے بعد مختلف ڈراموں میں سپورٹنگ کردار ادا کیے مگر جلد ہی اس اداکاری سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کے بیٹے ان کی طرح شوبز کے دلدادہ نہیں تھے۔ بڑے بیٹے آغا جعفر کا کہنا ہے ''مجھے اداکاری سے اس لیے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ میں نے اپنے والد کا آخری زمانہ دیکھا تھا، جو بہت تکلیف دہ تھا۔''

اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ والد صاحب کے دور میں اداکاری کے معاوضے بہت کم ہوا کرتے تھے۔ جبکہ ثانوی کردار کرنے والوں کو تو بہت ہی کم پیسے ملتے تھے۔ جس دور میں وہ فعال تھے اور فلموں میں کام کرتے تھے، اس وقت بھی گزر بسر بڑی تنگی ترشی کی حالت میں ہوتی تھی۔

سید آغا جعفر صفوی 1969ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں انہوں نے کئی فلموں میں اداکاروں کے بچپن کے کردار ادا کیے۔ پھر کراچی میں 2004ء سے 2006ء تک ٹیلی وژن اداکار قیصر نظامانی کے پروڈکشن ہاؤس کے لیے مختلف ڈراموں میں سپورٹ کردار ادا کیے۔ جبکہ ان کے چھوٹے بھائی سید علی عباس صفوی کو سرے سے فنونِ لطیفہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

کمال ایرانی کا آخری وقت بھی اچھا نہیں گزرا۔ پریشانی کے عالم میں گزرا اور آبائی پیشہ کھیتی باڑی کا ہی سہارا لیا۔ وہ لاہور سے اس لیے واپس آگئے تھے کہ 1977ء سے جب لاہور کی فلمی صنعت میں بحرانی کیفیت پیدا ہونا شروع ہوئی تو ان کی مصروفیت میں بھی بتدریج کمی آنے لگی تھی اس لیے مجبوراً انہیں واپس کراچی آنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

کراچی واپس آکر کچھ دنوں تک یہیں رہے۔ ان دنوں عمر شریف، عالمگیر اور محمد علی شہکی وغیرہ سے ان کی دوستی ہوگئی تھی اور اکثر ان کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔ لاہور میں تھے تو طالش اور علاؤالدین سے ان کی بڑی دوستی تھی، اور وہ اکثر کمال ایرانی کے گھر آتے تھے۔ ان کے گھر آنے والوں میں محمد علی اور ندیم بھی ہوا کرتے تھے جو ان سے اور ان کے بچوں سے بہت پیار کیا کرتے تھے۔

اگر اداکار کمال ایرانی کی زندگی کا اجمالی جائزہ لیا جائے تو بڑی حیران کن باتیں سامنے آتی ہیں۔ ان کے بزرگوں کا تعلق ایران سے تھا۔ وہ ادھر آئے تو شہر کی بجائے سندھ کے دیہی علاقوں کا رخ کیا اور جام کنڈے اور گڑی گوٹھ جیسے پس ماندہ علاقوں کو رہائش کے لیے منتخب کیا اور وہیں کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کیا۔ اس خاندان کا ایک نوجوان جو اس علاقے میں اچھی طرح رچ بس گیا تھا اور سندھی اور بلوچی زبانیں بڑی آسانی اور روانی سے بول سکتا تھا۔ اپنی آبائی زبان فارسی بھی بولتا تھا کیونکہ اب تک ان کے گھر میں فارسی ہی بولی جاتی تھی پھر یہ نوجوان اندرون سندھ سے کراچی آگیا اور سندھ مدرستہ الاسلام میں تعلیم حاصل کرنا شروع کردی۔ یہ وہی تعلیمی ادارہ تھا جہاں کبھی بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ کراچی کی ہوا لگی تو ادب اور آرٹ سے انسیت پیدا ہوئی اور اس کے بعد اسٹیج ڈرامے کیے، ریڈیو کی صداکاری کی، ٹیلی وژن ڈراموں میں بھی کام کیا اور پھر فلموں کی دنیا تک جا پہنچے۔ اردو، پنجابی، سندھی اور پشتو فلموں میں کام کیا اور اپنے لیے ایک باعزت مقام حاصل کیا مگر اس پیشے میں انہیں وہ خوش حالی نہیں ملی جو ملنی چاہیے تھی کیونکہ شوبز کی دنیا میں سارے پرفارمرز کو ایک جیسے پیسے نہیں ملتے، ایک جیسی کامیابیاں حاصل نہیں ہوتیں۔ عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ تمام اداکارائیں اور اداکار بہت عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے، ہر دور میں چند فنکار ہی ایسے ہوتے ہیں جو بہت کماتے ہیں اور بہت خوش حال زندگی بسر کرتے ہیں۔ کمال ایرانی کی فنکارانہ زندگی میں یہ کمال پیدا نہ ہوسکا۔ جس کے نتیجے میں ان کے بچے تک باپ کے پروفیشن سے خوش نہیں تھے۔ وہ خوش گفتار اور خوش اطوار ہی نہیں، خوش لباس بھی ہوا کرتے تھے اور شیروانی کے اندر اپنی پریشانی چھپائے رکھتے تھے۔

ان کی تمام تر اچھائیوں کے اعتراف کے باوجود ان کی اولاد کو ان سے اس بات کی شکایت تھی کہ ان کے والد نے اداکاری کا پیشہ اختیار کرکے اپنے شوق کی تکمیل تو کی مگر اپنے اہل خانہ کو خوش حالی اور فارغ البالی کے ساتھ زندہ رہنے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر ہمارے والد اپنے گاؤں گوٹھ ہی میں رہتے اور آبائی پیشہ کھیتی باڑی ہی کرتے تو شاید ہم لوگ زیادہ خوش حال زندگی بسر کرتے۔

بہرحال وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے جیسے بھی تھے ایک باصلاحیت فنکار کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ کراچی کے فنکاروں میں ان کا نام بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا وہ منگل کے دن 12 ستمبر 1989ء کو اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کوچ کرگئے۔ ان کی آخری فلم ''میراں جمالی'' ان کے انتقال کے بعد 1990ء میں ریلیز ہوئی، یہ سندھی زبان کی فلم تھی۔

(جاری ہے)

www.pakistanipoint.com

فلم سازی

شکیل صدیقی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

تمثیل یا ڈرامے تفریح کا ذریعہ تھے لیکن جب سینما کی آمد ہوئی تو ایک جہان اس کا اسیر ہوگیا۔ سب سے سستی تفریح یہی تھی، لیکن اس بارے میں بہت سے لوگ لاعلم ہیں کہ سینما کی تاریخ کیا ہے، کن مراحل کو طے کرکے یہ آج کی شکل میں پہنچی ہے۔

معلومات کے شائقین کے لیے ایک تحفہ

مشہور سائنس داں ٹامس ایڈیسن نے جب آواز کو ریکارڈ کر کے دوبارہ سنانے کا مرحلہ طے کرلیا تو اس نے متحرک فلم ایجاد کی جو پروجیکٹر سے چلائی جاتی تھی۔ فلم رول کے کنارے پر ایک سوئی لگی ہوتی تھی جو رول سے رگڑ کھاتی تھی اور آواز نکلنے لگتی تھی مگر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ سب سے پہلے جو فلمیں بنیں وہ خاموش تھیں جنہیں فیچر فلم کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، اس لیے کہ ان میں باقاعدہ کہانی نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً ایک لڑکی رقص کر

رہی ہے۔ایک جنرل افواج کی سلامی لے رہا ہے۔ایک جوڑا جو آپس میں محبت کرتا ہے۔پہلے بازاروں اور گلیوں میں گھومتا پھرتا ہے اور پھر ایک دن وفورِ محبت سے بے قابو ہو کر ایک دوسرے سے لپٹ جاتا ہے اور بوس و کنار میں مصروف ہو جاتا ہے۔وہ دنیا کا غالباً طویل ترین بوسہ تھا۔تماشائی کافی محظوظ ہوئے لیکن فلم وہیں پر ختم ہو گئی۔

فلم لوگوں کے لیے نہایت انوکھی تفریح تھی۔انہوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔لوگ جوق در جوق آئے، مگر دس یا پندرہ منٹ کی فلم دیکھنے سے ان کی تسلی و تشفی نہیں ہوئی اس لیے لوگوں نے اس طرف توجہ دینا چھوڑ دی۔ایڈیسن اور اس کے ساتھیوں نے سوچا پبلک کو کرسی سے باندھنے کے لیے لازم ہے کہ طویل دورانیے کی فلمیں بنائی جائیں جن کی کوئی کہانی اور باقاعدہ انجام ہو۔

فلمیں پہلے پارک، ریستورانوں یا تفریحی مقامات پر اسکرین لگا کر پروجیکٹر کے ذریعے دکھائی جاتی تھیں اور لوگوں سے کچھ نہیں لیا جاتا تھا۔ایڈیسن نے سوچا جب طویل فلمیں بنائی جائیں تو انہیں سنیما ہالوں میں دکھایا جائے اور لوگوں سے ٹکٹ لیا جائے تاکہ لاگت پوری ہو سکے، چنانچہ دنیا کا پہلا سنیما ہال پیٹس برگ میں اوڈین کے نام سے بنا۔سنیما ہال میں فلمیں تقریباً ایک گھنٹا طویل دورانیے کی ہوتی تھیں اور ان کی باقاعدہ کہانی ہوتی تھی۔

فلمی انقلاب وہاں سے آیا جب 1904ء میں پہلی فیچر فلم فلمبند ہوئی جس کا نام ''دی گریٹ ٹرین روبری'' تھا۔اس کے ایک برس بعد برطانیہ میں بھی طویل دورانیے کی فلم ''دی ڈے لائٹ'' فلمبند ہوئی اور خوب چلی۔لوگوں کو اس زمانے میں فوٹو گرافی، اداکاری، صداکاری یا مکالموں سے اتنی دل چسپی نہیں تھی۔وہ تو تفریحی نقطۂ نظر سے فلم دیکھا کرتے تھے۔بس کہانی متاثر کن ہونا چاہیے تھی۔

آئندہ برسوں میں رنگین فلمیں بننے لگیں، لیکن ان میں صرف ایک رنگ ہوتا تھا اور مکالمے بہت کم۔کوششیں جاری رہیں اور 1928ء میں مکمل بولتی فلم ''دی لائٹ آف نیویارک'' ریلیز ہوئی۔اسے بھی لوگوں نے بہت پسند کیا۔اس میں ان کی دل چسپی کا بہت سامان تھا۔وہ مسالا فلم تھی۔عشق و محبت لڑائی دنگے کے ساتھ۔

اس کی بھی ضرورت محسوس کی گئی کہ ہدایت کار اور فلم ساز معیاری فلمیں بنائیں، لہٰذا ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔جس کا نام آسکر ایوارڈ رکھا گیا۔دنیا کی پہلی بہترین فلم ''دی ونگز'' قرار پائی۔یہ تین رنگوں میں بنائی گئی تھی۔اسے ٹیکنی کلر کہا گیا۔

فلم میکنگ میں ترقی ہوئی تو سنیما اسکوپ اور تھری ڈی فلمیں بننے لگیں۔تھری ڈی کی تیکنیک علیحدہ تھی اور اس میں آبجکٹ کی موٹائی بھی پیش کی جاتی تھی چنانچہ پردۂ سیمیں پر دکھائے جانے والے مناظر ناظرین کو حقیقی معلوم ہوتے تھے۔جب ایک ہدایت کار نے تھری ڈی پر ہیبت ناک فلم بنائی تو لوگ چیخیں مار کر سیٹوں کے نیچے چھپ گئے۔مثلاً ایک شخص نے دوسرے شخص کو قتل کر دیا۔مقتول کی لاش بستر پر گر گئی۔دھڑ تو بستر پر پڑا رہ گیا لیکن گردن کی ایک رگ نہیں کٹ سکی چنانچہ کھوپڑی بستر سے لٹکتی رہ گئی۔کیمرا جب لاش کو دکھا کر کھوپڑی کی طرف آیا تو تماشائیوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے خون ٹپکاتی کھوپڑی ان کی گود میں رکھی ہو۔وہ چیخیں مارنے لگتے تھے۔ورلڈ فلم آرگنائزیشن نے ایسی فلموں پر پابندی عائد کر دی، جو تھری ڈی پر بنی ہوں (بعد میں یہ پابندی ہٹا لی گئی)

فلمیں بننا شروع ہو گئی تھیں لیکن ان کے لیے باقاعدہ کوئی اسٹوڈیو نہیں تھا۔لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے بچنے اور آواز کی اچھی ریکارڈنگ کے لیے اسٹوڈیو کی ضرورت محسوس کی گئی۔لاس اینجلس میں کیلیفورنیا کے مقام پر ہالی ووڈ کا قیام عمل میں آیا اور دنیا کا پہلا فلم اسٹوڈیو قائم کیا گیا۔

وہاں اسٹوڈیو قائم کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ

www.pakistanipoint.com

...م بے حد دل فریب اور خوش گوار تھا۔زیادہ تر سبزہ تھا،اس لیے آؤٹ ڈور فلمبندی کے دوران کہیں اور جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔مزدوری بھی ...تی تھی اس لیے فلمیں بھی کم لاگت میں بن جاتی تھیں۔

اب ترتیب وار فلموں کی تاریخ ملاحظہ فرمائیے۔یہ ترتیب اداکاروں یا پھر فلموں کی ریلیز کے حساب سے ہے۔سب سے پہلے ہم چارلی کا تذکرہ کرتے ہیں۔کسی کو ہنسانا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔یہ دشوار کام چارلی چپلن نے کیا اور دنیا سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔اس کی فلمیں خاموش تھیں لیکن اپنی اداکاری،حرکات و سکنات اور جذباتی کہانیوں کی بنا پر وہ ازحد کامیاب رہا۔اس کی بعض فلموں میں مکالمے لکھے ہوئے اسکرین پر آتے تھے۔

چارلی چپلن ہرچند کہ برطانیہ میں پیدا ہوا تھا لیکن اس نے ہالی ووڈ میں فلمیں بنائیں۔اس کی ماں ایک تھیٹر میں کام کرتی تھی،لہٰذا چارلی میں اداکاری کے جراثیم ابتدا ہی سے پیدا ہوگئے۔اس نے بارہ برس کی عمر میں ایک ڈرامے ''شرلاک ہومز'' میں کام کیا۔ڈراما 40 ہفتوں تک اسٹیج کی زینت بنا رہا۔چارلی کو فی ہفتہ دو پاؤنڈ معاوضہ ملا کرتا تھا جو اسے بہت لگتا تھا۔

جب اس نے فلمیں بنانا شروع کیں تو ساری دنیا کی شناخت بن گیا۔اس کی ڈھیلی ڈھالی پتلون،بانس کی چھڑی،ٹیڑھا میڑھا ہیٹ،بڑے جوتوں اور ہٹلر کٹ مونچھوں کی بنا پر لوگ اسے دیکھ کر ہی ہنسنے لگتے تھے۔اسے اداکاری کم ہی کرنا پڑتی تھی۔

وہ دنیائے فلم کا خلاق ترین شخص تھا اس لیے کہ وہ بیک وقت اداکار،ہدایت کار،فلم ساز،اسکرپٹ رائٹر اور موسیقار تھا۔اس نے خاموش فلموں کے عہد سے فلمیں بنانا شروع کردی تھیں اس کی پہلی فلم 1915ء میں آئی جس کا نام ''دی ٹریمف'' تھا۔وہ 71 سال اسکرین پر رہا اور اس نے 30 فلموں میں کام کیا۔اسے ملکۂ برطانیہ نے ''نائٹ'' کا خطاب دیا۔

اس نے چار شادیاں کیں،جن سے اس کے آٹھ بچے ہوئے۔وہ بہت عاشق مزاج تھا اور اپنی فلموں کی ہیروئنوں سے شادی کرلیا کرتا تھا۔اس کی بیویاں اس کے مقابلے میں کم عمر،خوب صورت اور الھڑ تھیں۔دل چسپ بات یہ کہ اس کی ساری بیویاں 16 سے 18 برس کی تھیں۔

اس کی فلم ''سٹی لائٹ'' کو آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا۔اس کی ایک اور فلم ''لائم لائٹ'' کو بھی آسکر ملا تھا۔اس نے 1977ء میں سوئٹزرلینڈ میں انتقال کیا۔

جان وین نے 1930ء میں انڈسٹری میں قدم رکھا۔اس کی پہلی فلم ''دی بگ ٹرائل'' تھی۔اس نے تیس برس تک فلمی دنیا پر حکومت کی۔وہ پیدائشی کاؤبوائے تو نہیں تھا لیکن اس نے خود کو کاؤبوائے فلموں کے لیے مخصوص کرلیا تھا۔اس کی فلموں میں گھوڑے،چست لباس،ہیٹ اور گراری والے پستولوں کی دھائیں دھائیں ہوتی تھی۔لاقانونیت اس کے علاوہ۔اس کی مشہور فلموں میں ہاتاری،دی کاؤبوائز اور ریو بریو شامل ہیں۔اس نے 75 فلموں میں کام کیا۔تین شادیاں کیں جس کے نتیجے میں تین لڑکیاں ہوئیں۔ایک آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا۔

1931ء میں جیری لوئیس نے فلمی دنیا میں قدم رکھا۔وہ بے حد اسمارٹ اور کھلنڈرا تھا۔ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنا اس کا کام تھا۔وہ بچوں اور بچوں کی ماؤں میں بے حد مقبول تھا۔ایک زمانے میں پاکستان میں اس کی فلمیں سینما ہال میں چلتی تھیں۔لوگ اسے دیکھ کر بے ساختہ کہتے تھے کہ یہ تو ابن صفی کا کردار ''عمران'' معلوم ہوتا ہے۔اگر عمران سیریز کے ناول اس پر فلمبند کیے جائیں گے تو ضرور کامیاب ہوں گے۔

اس کی صلاحیتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔وہ ریڈیو پر پروگرام کرتا،نائٹ کلبوں میں گانا گاتا،ٹیلی وژن پر شو کرتا اور جب فلموں میں آیا تو اس نے اسکرپٹ لکھے،گلوکاری کی اور اداکاری کی۔اس نے ڈین مارٹن

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کے ساتھ جوڑی بنائی تھی۔وہ ’’کنگ آف کامیڈی‘‘ کہلاتا تھا۔اس کی فلمیں غنائیہ ہوتی تھیں، پانچ چھ گانے ضرور ہوتے تھے۔اس نے 60 فلمیں بنائیں۔ ایک آسکر ایوارڈ حاصل کیا۔اس کی مشہور فلمیں یہ تھیں۔ بل بوائے، ناٹی پروفیسر، سینڈریلا اور دی لیڈیز مین۔اس کے گیتوں کے البم لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئے۔دوبار شادی کی جن سے تین بیٹیاں ہوئیں۔اس نے 91 برس میں انتقال کیا۔

1959ء میں ہالی ووڈ میں سب سے تہلکہ خیز فلم ’’بن حر‘‘ بنی جسے 11 آسکر ایوارڈ ملے۔اس فلم کا ہدایت کار ولیم وائلر تھا۔جس نے بعد میں بھی معرکہ آرا فلمیں بنائیں۔’’بن حر‘‘ باکس آفس پر کامیاب رہی اور اس کا چرچا اب تک ہوتا ہے۔فلم میں چارلٹن ہیسٹن اور اسٹیفن بائڈ نے کام کیا تھا، جنہیں لوگوں نے بہت سراہا۔اس فلم میں ڈھائی ہزار گھوڑے، دوسو اونٹ اور دس ہزار ایکسٹرا استعمال کیے گئے۔ولیم وائلر کی مشہور فلموں میں فنی گرل، رومن ہالی ڈے اور وودرنگ ہائٹس شامل ہیں۔

امریکا میں خاموش فلموں اور پھر بولتی فلموں میں الفرڈ ہچکاک کا نام سرفہرست تھا۔وہ برطانیہ میں پیدا ہوا تھا، لیکن ہالی ووڈ میں فلمیں بنایا کرتا تھا۔وہ فل سسپنس اور جاسوسی فلمیں بنایا کرتا تھا۔اس کی فلموں میں بہت تجسس ہوا کرتا تھا۔الفرڈ ہچکاک کی پہلی برطانوی فلم ’’بلیک میل‘‘ تھی جو 1929ء میں ریلیز ہوئی۔اس کی فلموں میں زیادہ تر کیری گرانٹ ہیرو ہوا کرتا تھا۔الفرڈ ہچکاک ہمیشہ نیلا سوٹ پہنتا تھا۔اس نے ایک شادی کی اور اس سے ایک لڑکی ہوئی پھر اس کے بچے نہیں ہوئے۔جن دنوں اس کی کوئی فلم سیٹ پر ہوتی تھی تو وہ رات تین بجے اٹھ کر سوچا کرتا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ تخلیق کے لیے یہ سب سے اچھا وقت ہوتا ہے۔اس نے 53 فلموں میں ہدایت دی اور 81 برس میں انتقال کیا۔ اس کی عمدہ کارکردگی پر حکومت نے ’’سر‘‘ کا خطاب دیا۔

1932ء میں کیری گرانٹ فلموں میں ظاہر ہوا۔اس کی پہلی فلم ’’دی نائٹ‘‘ تھی۔وہ پیدا تو برطانیہ میں ہوا تھا لیکن اس نے اداکاری کے جوہر ہالی ووڈ میں دکھائے۔اس کے گھر کا ماحول خراب تھا اور اس کا باپ شراب پینے کے بعد اسے مارتا پیٹتا تھا چنانچہ اس کی ماں نے اسے رقص کرنے، پیانو بجانے اور اداکاری کرنے کے گر سکھا دیے۔فلموں میں آنے سے پہلے اس نے اسٹیج پر اداکاری کے جوہر دکھائے۔وہ ایک ورسٹائل اداکار تھا اور ہیروئنیں متمنی رہتی تھیں کہ اس کے مدمقابل کوئی کردار ملے۔وہ ایکشن نہیں بلکہ سوشل اور رومانی اداکار تھا۔اس کے مزاج میں رومانویت رچی بسی تھی اس لیے اس نے پانچ بار شادی کی۔1966ء میں اس نے 43 فلموں میں کام کرنے کے بعد ریٹائرمنٹ کا اعلان کردیا۔انتقال کے وقت اس کی عمر 82 سال تھی۔

1936ء میں انتھونی کوئن نے اسٹیج سے فلمی دنیا میں قدم رکھا۔اس کی پہلی فلم ’’پلینز مین‘‘ تھی۔وہ میکسیکو سے تعلق رکھتا تھا۔اس کے بعد لاس انجلس آگیا۔وہ رائٹر، پینٹر، کیمرا مین تھا اور پس پردہ صداکاری بھی کرتا تھا۔1947ء تک وہ چھوٹے موٹے کردار ادا کرتا رہا۔تین سال بعد اسے بڑے کردار ملنے لگے۔’’دی میسج‘‘ میں اس نے حضرت حمزہؓ کا کردار ادا کیا۔اس کی لازوال فلموں میں گنز آف نیور ون، ہنچ بیک آف ناٹرے ڈیم، عرف کبڑا عاشق، لائن آف ڈیزرٹ تھیں۔لارنس آف عریبیہ میں اس نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔اس نے دو بار معاون اداکار کی حیثیت سے آسکر ایوارڈ حاصل کیا۔اس نے تین شادیاں کیں، جن سے 11 بچے ہوئے۔اس نے 69 فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔86 برس کی عمر میں انتقال کیا۔اس کا مجسمہ لاس انجلس میں لگا ہوا ہے۔

1969ء میں امریکا میں بننے والی ’’میکناز گولڈ‘‘ ایک لازوال اور ناقابل فراموش فلم تھی، جو مکمل ایڈونچر تھی۔اس کے ستاروں میں گریگوری پیک، عمر شریف اور ٹیلی سلاویس تھے۔اس کی ہدایت جے لی تھامسن نے دی تھی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اس سے پہلے ''گنز آف نیورون'' سب سے بڑی ایڈونچر فلم کہلاتی تھی، لیکن ''میکناز گولڈ'' اس پر بازی لے گئی۔ اتفاق سے ''گنز آف نیورون'' کا ہیرو بھی گریگوری پیک تھا۔ گریگوری پیک نے تقریباً 53 فلموں میں کام کیا۔ وہ اپنی پہلی فلم سے لے کر آخر تک ہیرو کی حیثیت سے پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہوتا رہا۔ ایک فلم میں ابتدا میں اس نے ویلن کا کردار ادا کیا تھا۔ اس کی مشہور فلموں میں رومن ہالی ڈے، دی بگ کنٹری، دی اومن، موبی ڈک اور کیپ فیئر شامل ہیں۔ ایک شادی پر گزارا کیا جس سے اس کے پانچ بچے ہوئے۔ اس نے 87 برس میں انتقال کیا۔

چارلن برانڈو کا نام لیے بغیر امریکن فلموں کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ ابتدا میں وہ ایک سیاسی پارٹی میں بھی شامل تھا اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتا تھا۔ اس کی پہلی فلم ''فریش مین'' جو 1944ء میں ریلیز ہوئی۔ ایک فلم ''وائلڈ ون'' میں کام کرنے کے بعد وہ نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا۔ اس فلم میں برانڈو چند لڑکوں کے ساتھ جیکٹ اور جینز پہن کر گھومتا پھرتا تھا اور وارداتیں کرتا تھا۔ امریکن لڑکوں کو اس کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ وہ کاروں کے بجائے موٹر سائیکل پر بیٹھنے کو ترجیح دینے لگے۔ اس نے 1950ء سے 56ء تک ایسی دس فلموں میں کام کیا جنھوں نے باکس آفس پر ریکارڈ توڑ بزنس کیا اور لوگوں کی آنکھوں کا تارہ بن گیا۔ اس نے ایک فلم کی ہدایت بھی دی جو بری طرح سے فلاپ ہوئی۔ اس کے بعد اس نے ہدایت کاری سے توبہ کر لی۔ وہ امریکن فلم انسٹی ٹیوٹ کے مطابق چوتھا بڑا اداکار تھا۔ ٹائم میگزین نے اسے امریکا کے 100 اہم ترین افراد میں شامل کیا ہے۔

برانڈو نے پانچ شادیاں کیں جن سے 11 بچے ہوئے۔ اس کی مشہور فلموں میں جولیس سیزر، ویوا زاپاتا، دی لاسٹ ٹینگو ان پیرس اور گاڈ فادر شامل ہیں۔ اس نے 80 برس کی عمر میں انتقال کیا۔

عمر شریف ایک مصری اداکار تھا جس نے

ایک شخص کچھ چیزیں خریدنے ایک دکان پر پہنچا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک کتا بھی دکان میں داخل ہوا۔ کتے کے گلے میں ایک بیگ لٹک رہا تھا، کتے کو دیکھتے ہی دکاندار اس کی جانب لپکا۔ اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا' اندر ایک پرچی تھی۔ دکاندار نے پرچی میں درج چیزیں بیگ میں ڈالیں پھر بیگ کے اوپری خانے سے روپے نکالے اور چیزوں کی قیمت کے مطابق رقم کاٹ کر باقی پیسے وہیں رکھ دیئے۔ اس شخص نے کتے کو باہر جاتے دیکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ کتے کے مالک کو دیکھنا چاہتا تھا۔ کتا کچھ آگے جا کے بس اسٹاپ پر کھڑا ہو گیا۔ بس آئی تو وہ کتا اچھل کر اس میں سوار ہو گیا۔ وہ شخص بھی بس میں سوار ہوا۔ کتا کنڈیکٹر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ کنڈیکٹر نے بیگ سے ٹکٹ کے پیسے نکال لیے۔ کئی اسٹاپ کے بعد جب بس رکی تو کتا نیچے اتر گیا۔ وہ شخص بھی اتر گیا۔ کتا ایک گھر کے بند دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے برابر میں بیل کا بٹن تھا کتے نے دو پیروں پر کھڑے ہو کر اگلے پیر سے گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا اندر سے نکلنے والے نے تھیلا کتے کے گلے سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور پاس رکھے ڈنڈے سے کتے کی پٹائی شروع کر دی۔ یہ ظلم دیکھ کر اس شخص نے کتے کے مالک سے پوچھا کہ اتنا کام کرنے والے کتے کو ناحق کیوں پیٹ رہے ہو تو وہ بولا۔ ''یہ چابی لیے بغیر چلا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے میں سو نہیں پایا۔''

یہی زندگی کی سچائی ہے۔ جہاں آپ سے چوک ہوئی لوگ ساری اچھائیاں بھول کر برائی کرنا شروع کر دیں گے۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقرا سٹی۔ کراچی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

1950ء میں فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ پہلے اس نے مصری ڈراموں اور فلموں میں کام کیا پھر اس کے بعد وہ برطانیہ اور امریکا کی فلموں میں جلوہ گر ہوتا رہا۔ اس کی مشہور فلموں میں لارنس آف عریبیہ، ڈاکٹر ژواگو، گوئیورز ٹریول، پیٹر دی گریٹ شامل ہیں۔ اس نے 53 فلموں میں کام کیا۔ اس نے ایک شادی کی اور ایک بیٹی بیٹا ہے۔ اس نے 83 برس میں انتقال کیا۔

سلو سٹرا سٹالون نے 1967ء میں فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ اس کی پہلی فلم ''نو پلیس ٹو ہائیڈ'' تھی جو 1973ء میں ریلیز ہوئی۔ ابتدا میں اسے چھوٹے چھوٹے کردار ملتے رہے۔ لوگ اس سے آشنا ہو گئے مگر جب اس نے ''راکی'' میں اداکاری کی اور اس کا اسکرین پلے بھی خود لکھا تو یکدم سے مشہور ہو گیا۔ ''فرسٹ بلڈ'' میں کام کیا تو ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ وہ اداکار کے علاوہ ہدایت کار، فلمساز اور اسکرپٹ رائٹر بھی ہے۔ اداکار بننے سے پہلے وہ باڈی بلڈر تھا اور ورلڈ ہیوی ویٹ چیمپئن کا اعزاز دو بار حاصل کر چکا تھا۔ فلاڈلفیا کے ایک عجائب گھر کے نزدیک اس کا مجسمہ نصب کیا گیا ہے۔

پیدائش کے وقت غلط اوزار لگنے سے اس کے منہ کا دایاں حصہ خفیف سا ٹیڑھا ہو گیا اور زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔ اس کی مشہور فلموں میں ڈیموليشن مین، جج ڈریڈ، دی ایکسپنڈ ایبل، کوبرا، کلف ہینگر اور اسپائی کڈ شامل ہیں۔ اس نے 67 فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اسٹالون نے تین شادیاں کیں اور اس کے چھ بچے ہوئے۔ اس کی عمر 73 برس ہے۔

اسٹیون اسپیلبرگ بلاشبہ جدید ہالی ووڈ کے معروف ہدایت کاروں اور فلمسازوں میں شامل ہے۔ اس نے 1969ء میں ٹیلی وژن کے لیے فلمیں بنانا شروع کیں۔ اس وقت اس کی عمر صرف 21 برس تھی۔ فلم کی مصنفہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اتنی کم عمر ہدایت کار میری فلم کیسے بنائے گا؟ اس نے جا کر اسٹوڈیو کے مالک سے شکایت کی تو اس نے سمجھا بجھا کر اسے رخصت کیا۔ جب فلم بننے لگی تو اسے اسپیلبرگ کا کام دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا۔

ٹیلی ویژن کی فلمیں بنانے کے بعد اس نے فیچر فلمیں بنانا شروع کر دیں۔ جب اس کی ہدایت میں بننے والی فلم ''جاز'' ریلیز ہوئی تو ساری دنیا چونک پڑی۔ اسے باصلاحیت ہدایت کار اور فلمساز تسلیم کیا گیا۔ فلم کو تین آسکر ایوارڈ ملے۔ اس کی فلم ''ای۔ٹی'' کو چار آسکر ایوارڈ ملے۔ 1980ء کے بعد اس نے سانس نہیں لی اور دنیا میں ادھم مچائے رکھا۔ اس کی فلموں میں انڈیانا جونز، ریڈرز آف دی لاسٹ آرک، جیوراسک پارک نے اتنا بزنس کیا کہ پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اسے لاتعداد ایوارڈ ملے۔ اس نے تقریباً 127 فلموں کی ہدایت کاری کی۔ اسے پانچ بار آسکر ایوارڈ ملا۔ اس نے دو شادیاں کیں جن سے پانچ بچے ہوئے۔ اس کا نام امریکا کے 100 اہم ترین افراد میں لکھا گیا۔

آرنلڈ شیواز نیگر نے 1982ء میں فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ اس کی فلم ''کونان دی بار بیرین'' بہت پسند کی گئی۔ پھر ''دی ٹرمینٹر'' نے ساری دنیا میں دھوم مچا دی۔ وہ آسٹریا میں پیدا ہوا تھا۔ باڈی بلڈر کی حیثیت سے اس نے چھ بار اعزاز حاصل کیا۔ اس نے ایسی فلموں میں زیادہ کردار ادا کیے ہیں جس میں اس کے جسم کی نمائش کی گئی ہے۔ مثلاً کمانڈو، پریڈیٹر اور رننگ مین۔ اس نے 53 فلموں میں کام کیا ہے۔ وہ سیاسی حیثیت سے ریپبلکن ہے اور کیلیفورنیا کا گورنر رہ چکا ہے۔ اپنی گورنری کے دوران اس نے ریاست کی معاشی حالت بہتر بنائی ہے۔ اس نے ایک شادی کی اور اس کے چار بچے ہیں۔ اس کی عمر 72 برس ہے۔

1997ء میں ہالی ووڈ میں ''ٹائی ٹینک'' بنی، جو ساری دنیا میں باکس آفس پر کامیاب ہوئی۔ اس فلم نے 11 آسکر ایوارڈ حاصل کیے۔ اس کے ہدایت کار اور فلمساز جیمز کیمرون تھے۔ ہیرو لیونا رڈو ڈیسپیرو اور ہیروئن کیٹ ونسلٹ تھی۔ فلم کی کہانی حقیقت پر مبنی تھی۔ اس میں لوگوں کی دل چسپی کے لیے رومان کا

ٹھا دیا گیا تھا۔ یہ مشہور زمانہ بحری جہاز کی کہانی ہے۔ اس کے بنانے والوں نے دعوا کیا تھا یہ کبھی ڈوب نہیں سکتا لیکن اپنے پہلے سفر کے دوران ہی جو حادثہ پیش آتا ہے وہ اس میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ حادثہ 1912ء میں پیش آیا تھا۔

رچرڈ برٹن برطانیہ کے شہر ویلز میں پیدا ہوا تھا، وہ اپنے والدین کے تیرہ بچوں میں بارھواں تھا۔ ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد اس نے باپ کی طرح سے کوئلے کی کان میں کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ ائیر فورس میں کام کرنا چاہتا تھا لیکن بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے اَن فٹ قرار دیا گیا پھر اس نے اسٹیج کے کچھ ڈراموں میں کام کیا تو اسے اچھا معاوضہ ملا چنانچہ وہ ڈراموں میں کام کرنے لگا۔ ایک ہدایت کار کو اس کا کام پسند آیا تو اس نے برٹن کو لندن بلا لیا۔ اس کی قسمت کا تارہ چمکنے لگا اور اسے فلموں میں چھوٹے کردار ملنے لگے۔ جس فلم کمپنی میں وہ کام کرتا تھا اس نے برٹن کو 100 پاؤنڈ فی ہفتہ دینا شروع کر دیے۔ اسے کان کنی کی نسبت یہ کام بہتر لگا 1940ء سے 50ء تک وہ چھوٹے کردار ادا کرتا رہا لیکن اس کے کام کو تنقید نگاروں نے پسند کیا اور اس کے حق میں مثبت تبصرے لکھے۔

دوسرے مرحلے میں وہ ہالی ووڈ چلا گیا۔ جہاں اس کی اداکاری کو پسند کیا گیا اور قابل تعریف کردار ملنے لگے۔ وہ فلموں میں کامیابی کی ضمانت بن گیا۔ اس نے الزبتھ ٹیلر سے دو بار شادی کی اور 33 فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ اس کی مشہور فلموں میں قلوپطرہ، وھیر ایگلز ڈیر، دی روب اور بیکٹ شامل ہیں۔

پیٹر اوٹول ایک برطانوی اداکار تھا، جو آئیر لینڈ میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں اس نے اسٹیج ڈراموں میں کام کیا پھر فلمی دنیا میں آ گیا۔ اسٹیج ڈراموں میں اس نے زیادہ تر شیکسپیئر کے ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ اس کی مشہور فلموں میں لارنس آف عریبیہ، بیکٹ، لوائن ان ونٹر شامل ہیں۔ اس نے ایک شادی کی اور اس کی تین [illegible] ہیں۔ اس نے 81 برس کی عمر میں انتقال کیا۔

☆......☆

امریکا اور برطانیہ میں تقریباً ایک ساتھ فلمیں بننا شروع ہوئیں۔ امریکن فلموں میں گلیمر اور جنس پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، اس لیے سینما ہال کے مالکان انہیں چلانے کے لیے زیادہ خواہاں رہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ برطانوی فلمیں ایک طرف پڑی رہ جاتی تھیں اس لیے حکومت نے ایک قانون کے ذریعے یہ حکم دیا کہ سینما ہالوں میں محدود تعداد میں امریکی فلمیں دکھائی جائیں گی۔

بھارت میں برطانوی فلمیں سب سے پہلے چلائی گئیں اس لیے کہ بھارت، برطانیہ کی نوآبادیات میں شامل تھا۔ برطانوی فلمیں بھی امریکی فلموں کی پیروی کرتی تھیں۔ یعنی مار دھاڑ اور جنس پر مبنی ہوتی تھیں۔ جنوبی امریکا کو جب فلموں میں پیش کیا جاتا تھا تو ریوالور کی دھائیں دھائیں، گھوڑوں کی اچھل کود، لوگوں کا چست لباس اور پاناما ہیٹ ان فلموں کی خصوصیت ہوتی تھی جو لوگوں کا خون گرما دیتی تھیں۔

ہر چند کہ برطانیہ میں میکسیکو جیسے پہاڑی اور آزاد علاقے نہیں ہیں لیکن برطانیہ نے بھی مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں بنائیں۔ اس کی ایک بڑی مثال جیمز بانڈ کی فلمیں تھیں۔ جیمز بانڈ 007 کا مطلب تھا کہ وہ اپنا مشن کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے سات افراد کو ٹھکانے لگا سکتا ہے اور اس پر اس سے کوئی باز پرس بھی نہیں کی جائے گی۔ جیمز بانڈ کی پہلی فلم ''ڈاکٹر نو'' 1962ء میں سینما ہالوں کی زینت بنی۔ یہ فلم یونائیٹڈ آرٹسٹ کے تحت بنائی گئی تھی، جس میں برطانیہ کے ساتھ امریکی اداکاروں اور تیکنیک کاروں نے کام کیا تھا۔ دوسری فلم ''فرام رشیا ود لو'' تھی۔ اس فلم نے سینما گھروں میں کھڑکی توڑ بزنس کیا۔ ایک صحافی نے اس فلم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ فلم ناظرین کے لیے اس طرح سے ضروری ہے جیسے شام کی چائے کی پیالی۔ جیمز بانڈ کی فلمیں یان فلیمنگ کے ناولوں پر بنائی گئی تھیں۔ ابتدائی چھ فلموں میں سین کونری نے جیمز بانڈ کا کردار ادا کیا تھا۔ مجموعی طور پر

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اس نے 61 فلموں میں کام کیا۔اس نے دو بار شادی کی۔معاون اداکار کی حیثیت سے ایک آسکر ایوارڈ حاصل کیا۔اس کی عمر 88 برس ہے۔

خوف ناک اور ہیبت ناک فلموں میں برطانیہ امریکا پر بازی لے گیا۔ان فلموں میں خوف اور ہیبت کے علاوہ جنس پر بھی زور دیا جاتا تھا۔اس کی بڑی مثال ڈراکیولا کی فلمیں تھیں۔بڑے اور نکیلے دانتوں والا شخص جو .... لڑکیوں کی گردن پر دانت پیوست کر کے ان کا خون پی جایا کرتا تھا۔یہ کردار برام اسٹوکر کا لکھا ہوا تھا۔جسے کرسٹوفر لی نے ادا کیا۔کرسٹوفر لی نے پاکستان میں قائداعظم پر بننے والی فلم میں قائداعظم کا کردار بھی ادا کیا ہے۔برطانیہ میں بننے والی ہارر فلموں میں مکڑی کے جالے، چمگادڑیں اور قدیم مکانات ہیبت ناکی کو بڑھاوا دیتے تھے۔

1962ء میں برطانیہ میں ایک بڑی اور باکس آفس پر کامیاب ہونے والی فلم ''لارنس آف عریبیہ'' بنائی گئی جس میں کرنل لارنس کا کردار پیٹر اوٹول نے ادا کیا تھا۔کرنل لارنس ایک حقیقی کردار تھا جو عربوں اور ترکوں میں پھوٹ ڈلوانے آیا تھا۔وہ اپنی ان کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب رہا۔کرنل لارنس مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتا تھا اور ان ہی جیسا لباس پہنتا تھا تاکہ انہیں دھوکا دے سکے۔وہ روانی سے عربی بولتا تھا۔

ضیا محی الدین نے اپنی کتاب میں انکشاف کیا ہے کہ دلیپ کمار نے اس فلم میں کرنل لارنس کا کردار ادا کرنے کے لیے کوشش کی تھی لیکن قسمت نے یاوری نہیں کی۔

اس فلم میں عمر شریف بھی تھا۔جسے آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔اس فلم کا ہدایت کار ڈیوڈ لین تھا۔اس فلم نے 7 آسکر ایوارڈ حاصل کیے۔اس فلم کو خاص طور پر ان ہی جگہوں پر فلمبند کیا گیا جہاں کہ واقعات حقیقت میں پیش آئے تھے۔ڈیوڈ لین کی مشہور فلموں میں ڈاکٹر ژواگو، اے پیج ٹو انڈیا، دی برج آن دی ریور کوائی اور گریٹ اسکیپ شامل ہیں۔اس نے 16 فلموں میں ہدایت دی۔دو آسکر ایوارڈ حاصل کیے۔انہیں ''سر'' کا خطاب دیا گیا۔اس نے 83 برس میں انتقال کیا۔

اب ہم ہالی ووڈ بالی ووڈ کی جانب آتے ہیں۔

بھارت میں پہلے برطانیہ نے سنیما ہال میں فلمیں دکھانے کا پروگرام شروع کیا۔اس سنیما ہال کا نام ناولٹی سنیما تھا، جہاں 1896ء کو پانچ فلموں کی نمائش ہوئی۔فلموں کے چار شو ہوا کرتے تھے اور ٹکٹ چار آنے سے لے کر دو روپے تک تھا۔

دادا پھالکے نے برصغیر کی پہلی فلم ''راجا ہریش چندر'' بنائی، جو خاموش تھی۔اس میں کوئی مکالمہ سنائی نہیں دیتا تھا، بس اداکاروں کے ہونٹ ہلتے تھے۔یہ فلم 1913ء میں بنی تھی۔اس زمانے میں ہیروئن کاسٹ کرنا ایک مسئلہ تھا، لہٰذا پھالکے نے ایک لڑکے کو میک اپ کرانے کے بعد لڑکیوں والا لباس پہنا دیا۔فلم میں ایک بچی کا کردار بھی تھا، پھالکے نے اپنی سات سالہ بچی سے یہ کردار کروایا۔

اس کے بعد 1931ء میں اردشیر ایرانی نے برصغیر کی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' بنائی۔وہ ایک کاسٹیوم فلم تھی۔جب وہ سنیما ہال میں پیش کی گئی تو عوام نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔سات ہفتوں تک سنیما پر ہاؤس فل کی تختی لگی رہی۔یوں بھارت میں بولتی فلموں کا دور شروع ہوگیا۔اس فلم کا ہیرو ماسٹر وٹھل اور ہیروئن زبیدہ خانم تھی۔مستند اطلاعات کے مطابق اب اس فلم کا کوئی پرنٹ دستیاب نہیں ہے۔

ابتدائی فلموں کو کامیاب بنانے کے لیے جنس کا سہارا لیا جاتا تھا، لہٰذا برطانوی حکومت نے سنسر شپ عائد کردی تاکہ لوگوں کا اخلاق نہ بگڑے۔

جب تک فلمیں دکھانے کے لیے سنیما ہال نہیں بنے تھے بھارت میں لوگوں کو چھولداریاں اور خیمے لگا کر فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔اسکرین سے کچھ فاصلے پر پروجیکٹر سے فلم چلائی جاتی تھی اور لوگوں سے ٹکٹ لیا جاتا تھا۔

1932ء سے رنگین فلموں کا آغاز ''بلو

Aaqib Azeem
www.pakistanipoint.com

منگل'' نامی فلم سے ہوا، جسے میڈن تھیٹر کلکتہ نے بنایا تھا اور اس کی کلر پروسیسنگ جرمنی کی ایک لیبارٹری میں کی گئی تھی اس لیے کہ اس زمانے میں بھارت میں کلر لیبارٹری نہیں تھی۔ چونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی اس لیے کسی نے قائم ہی نہیں کی۔

1932ء میں بننے والی فلم ''اندر سبھا'' میں 71 گیت تھے۔ یہ فلم مدن تھیٹرز نے بنائی تھی اور اس کے ہدایت کار جے۔ جے مدن تھے۔ یہ فلم ایک ڈرامے پر بنی تھی جس کے قلمکار سید آغا حسن امانت تھے۔ فلم میں دو گلوکار تھے۔ فلم کا ہیرو عبدالرحمٰن کابلی اور ہیروئن مختار بیگم تھی۔

1935ء میں بھارت میں اسٹوڈیو بننا شروع ہو گئے۔ ان شہروں میں مدراس، کلکتہ، لاہور اور ممبئی شامل ہیں۔ فلمیں بہرحال لوگ دیکھتے تھے لیکن لوگوں کی توجہ شدت سے مبذول کرانے کے لیے مسالا فلموں پر زور دیا جانے لگا۔ جن میں ڈانس، گانے اور عشق و محبت کی چاشنی اور چاٹ ہوتی تھی۔ یقیناً آپ نے بھی ایسی فلمیں دیکھی ہوں گی جن میں ہیرو، ہیروئن کو حاصل کرنے کی تگ و دو کرتا ہے اور سنسان گلیوں میں ہیروئن کا تعاقب کر کے گانے پہ گانے گاتا ہے۔ بیچ میں ظالم سماج کے طور پر ہیروئن کے ابا یا اماں آتی ہیں، لیکن انہیں شکست ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات سائڈ ہیرو بھی اڑنگا ڈال دیتا ہے اور ہیرو کی جان کے درپے ہو جاتا ہے لیکن باطل طاقتوں کو شکست ہوتی ہے اور آخری ریل میں ہیرو اور ہیروئن ایک ہو جاتے ہیں اور ناظرین سکھ کا سانس لیتے ہیں۔

1936ء میں فلم ''باغی سپاہی'' نے دھوم مچا دی۔ اس فلم کا ہیرو گل حمید تھا، پشاور کے قریبی قصبے کا رہنے والا جو پہلے سے اداکاری کر رہا تھا لیکن اس فلم میں کام کرنے سے اس کا ستارہ عروج پر پہنچ گیا۔ اس فلم کی ہیروئن بملا کماری تھی فلم میں علامہ اقبال کی ایک غزل بھی تھی جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔

1943ء میں بننے والی ایک فلم ''قسمت'' نے بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ یہ نغماتی فلم تھی۔ اس زمانے میں لوگ گیتوں کی بنا پر ہی فلمیں دیکھا کرتے تھے۔

برصغیر میں ایوارڈ دینے کا سلسلہ 1946ء میں شروع ہوا۔ جسے ''ٹائمز آف انڈیا'' نے شروع کیا تھا۔ تاریخ کے مطابق خورشید انور کی فلم کو ان کی بہترین موسیقی پر ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے بعد حکومت نے، پھر ''فلم فیئر'' اور ''اسٹار ڈسٹ'' نے ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ دونوں بھی بھارت کے بڑے فلمی میگزینوں میں شمار ہوتے ہیں اور اب تک ایوارڈ تقسیم کر رہے ہیں۔

ایک طرف جہاں مسالا فلمیں بنیں، وہیں کچھ سنجیدہ ہدایت کار بھی تھے، جنھوں نے ناظرین کے لیے حقیقت پسندانہ فلمیں بھی بنائیں۔ ان میں خواجہ احمد عباس کی ''دھرتی کے لعل'' ادارہ آئی پی ٹی اے کی ''مدر انڈیا'' اور گرودت کی ''پیاسا'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ''دو بیگھہ زمین'' بھی ایک معرکہ آرا فلم تھی۔ کلکتہ کے ہدایت کار ستیہ جیت رائے تھے جنھوں نے زیادہ تر بین الاقوامی ایوارڈ جیتے۔ موجودہ زمانے میں سنجیدہ فلمیں گلزار بناتے ہیں۔

بھارت میں لیبارٹری میں کلر ہونے والی پہلی رنگین فلم ''آن'' تھی، جس کے ہدایت کار محبوب اور ہیرو دلیپ کمار تھے۔ فلم کی ہیروئن نادرہ اور سائڈ ہیروئن نمی تھی۔ فلم نے ہندو پاک میں اچھا بزنس کیا اس لیے نہیں کہ اسے محبوب نے بنایا تھا بلکہ دلیپ کمار کا کردار کافی تبدیل شدہ تھا۔ وہ اس سے پہلے ٹریجڈی ہیرو کہلاتے تھے اور غمگین فلموں میں کام کرتے تھے۔ ان کی فلم دیکھنے کے بعد ناظرین دل گرفتہ اٹھتے تھے مگر ''آن'' میں انہوں نے ایکشن ہیرو کے طور پر کام کیا اور تلوار بازی کے جوہر دکھائے۔

وہ فلموں میں آنے سے پہلے والد کے ساتھ ان کی دکان پر پھل بیچا کرتے تھے۔ انہیں فلموں میں کام کرنے کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے اپنی روز کی دہاڑی جتنا معاوضہ طلب کیا۔ معاملہ اس پر طے ہو گیا تو انہوں نے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اسٹوڈیو جا کر اپنے چہرے پر میک اپ کر لیا۔ ان کی پہلی فلم ''جوار بھاٹا'' تھی جو 1944ء میں بنی مگر یہ فلاپ ہوگئی۔

بہرحال دلیپ کمار (یوسف خان) فلاپ نہیں ہوئے۔ ان کی دوسری فلم ''جگنو'' تھی جس میں ان کے ساتھ نور جہاں تھیں۔ یہ فلم کامیاب ہوئی اور وہ باکس آفس پر کامیاب ہوگئے۔ وہ ایک زمانے میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے فن کار تھے۔ انہوں نے 65 فلموں میں کام کیا۔ ان کے مکالمے بولنے اور ان کی اداکاری کرنے کے انداز کو کوئی اداکار ابھی تک اپنا نہیں سکا۔ وہ اپنے فن میں یکتا تھے۔ ان کی مقبولیت کا گراف دیکھ کر پنڈت نہرو نے ایک بار کہا تھا کہ اگر کوئی شخص مجھے ایکشن میں ہرا سکتا ہے تو وہ دلیپ کمار ہے۔ اپنی ابتدائی فلموں میں وہ اپنی پیشانی پر بالوں کو اس انداز سے موڑا کرتے تھے کہ دو چاند بن جاتے تھے۔ وہ انداز مردوں اور عورتوں میں مقبول ہوا اور وہ کافی عرصے تک اس طرح سے بال بناتے رہے۔ ان کی یادگار فلموں میں مغل اعظم، گنگا جمنا، داستان، ندیا کے پار اور نیا دور شامل ہیں۔

تقسیم کے بعد بھارت میں فنانس کارپوریشن قائم ہوئی جس کے تحت حکومت فلم سازوں کو فلم بنانے کے لیے سرمایہ فراہم کرتی تھی۔ یوں انڈسٹری نے تیزی سے ترقی کی۔

بھارت کی پہلی سینما اسکوپ فلم ''کاغذ کے پھول'' تھی جسے گرودت نے بنایا تھا۔ گرودت سنجیدہ فلموں کے ہدایت کار تھے اور ان کی فلمیں اہل ذوق کو متاثر کرتی تھیں۔ وہ وحیدہ رحمٰن کے عشق میں گرفتار ہوئے اور انہوں نے وحیدہ رحمٰن کے پیچھے ہٹنے پر خودکشی کر لی۔ ان کی فلم ''پیاسا'' باکس آفس پر ہٹ ہوئی تھی۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ روس میں بھارتی فلمیں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ 1954ء سے 1991ء تک بھارت کی 206 فلمیں روس بھیجی گئیں۔ ان فلموں نے روسی فلموں سے زیادہ بزنس کیا۔ راج کمار کی فلم ''آوارہ'' کو چھ کروڑ روسیوں نے دیکھا۔

روس کے بعد چین بھی بھارتی فلموں کی اچھی مارکیٹ ہے۔ وہاں آوارہ، تھری ایڈیٹس، دنگل نے باکس آفس پر اچھا بزنس کیا۔

بڑی لاگت سے تیار ہونے والی پہلی فلم ''مغل اعظم'' تھی، جس کے ہدایت کار اور فلم ساز کے آصف تھے۔ یہ فلم بلیک اینڈ وائٹ میں بنی تھی لیکن ایک گا رنگین تھا جسے یورپ کی لیبارٹری میں پروسیس کیا گیا تھا۔ اس کے ہیرو دلیپ کمار اور ہیروئن مدھو بالا تھیں۔ 2004 میں اس فلم کو کمپیوٹر کے ذریعے رنگین کیا گیا۔ مغل اعظم کردار پرتھوی راج نے ادا کیا۔ ان کے تھیٹریکل انداز نے فلم میں جان ڈال دی۔ وہ فلموں سے پہلے تھیٹر میں کام کیا کرتے تھے، جہاں آخری قطار میں بیٹھے ناظرین کے کانوں تک اپنی آواز پہنچانا ہوتی تھی، لہٰذا گلے سے پوری قوت سے جان لگانا پڑتی تھی۔

فلم بڑے سرمایے سے بنی تھی اس لیے ایک فائدہ یہ ہو کہ فنانسروں کے حوصلے بلند ہوگئے کہ فلم میں بھارتی سرمایہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

امتیاز علی تاج بلند پایہ اور خلاق مصنف تھے۔ انہوں نے 1922ء میں ''انارکلی'' ناول لکھا جو بے حد مقبول ہوا۔ شہزادہ سلیم کو انارکلی نام کی کسی کنیز سے عشق نہیں ہوا تھا۔ یہ محض افسانہ تھا اور امتیاز علی تاج کا کمال کہ ان کے افسانے پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ اس کی کہانی سے متاثر ہو کر بھارت میں انارکلی پر دو بار فلم بنائی گئی۔

مغل اعظم بھی اسی کہانی سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی۔ پاکستان میں بننے والی فلم انارکلی کی کہانی بھی اسی سے ماخوذ تھی، مگر وہ فلم سدھیر کے سپاٹ چہرے کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔ مغل اعظم کو دیکھنے کے لیے بھارتی حکومت نے پاکستان کے فلمی شائقین کو پندرہ دن کا ویزا بھی دیا تھا، تاکہ وہ فلم دیکھنے کے علاوہ بھارت کے شہروں کی سیر بھی کر سکیں۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بھارتی فلم انڈسٹری میں دلیپ کمار کا طوطی عرصے تک بولتا رہا۔ اسی زمانے میں راج کپور بھی فلموں میں آیا تھا۔ وہ پرتھوی راج کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ پہلے تو اس نے فلموں میں اداکاری کی، اس کے بعد وہ ہدایت کار کی حیثیت سے ابھرا اور اس نے برسات، آوارہ، بابی، میرا نام جوکر، اناڑی اور سنگم بنا کر اپنی ہدایت کاری کا بھی لوہا منوالیا۔ اس کی فلم ''آوارہ'' جس میں وہ بطور ہیرو تھا اتنی مقبول ہوئی کہ اچھے خاصے سمجھ دار افراد جب پتلون پہنتے تھے تو اس کے پائنچے چڑھا لیا کرتے تھے، کیوں کہ اس فلم میں راج کپور نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

اس نے 31 فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ وہ بھارت کے ساتھ روس میں بھی مقبول ہوا۔ اس نے اپنی فلم ''میرا نام جوکر'' کے لیے روسی سرکس سے کام کرنے والے بلوائے تھے۔

راج کپور کے بعد بھارتی فلموں میں جو اداکار نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوا، وہ دیو آنند تھا۔ ایک فلم میں اس کے سگریٹ پینے کا انداز لوگوں کو اس قدر بھایا کہ وہ اس کی نقل کرنے لگے۔ دیو آنند کی مشہور و مقبول فلموں میں بازی، جوئیل تھیف، گائڈ، ہرے راما ہرے کرشنا، جونی میرا نام اور تیرے گھر کے سامنے شامل ہیں۔ اس کی پہلی فلم ''ہم ایک ہیں'' تھی جو 1946ء میں ریلیز ہوئی۔

دیو آنند نے اپنے جسم کو بہت سنبھال کر رکھا اور خود پر چربی نہیں چڑھنے دی، جس کی بنا پر وہ عرصہ دراز تک فلموں میں ہیرو کا کردار ادا کرتا رہا۔ اس کی چندیا صاف ہوگئی تو اس نے وگ لگالی۔ اس کے دانت بھی مصنوعی تھے۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ رات کو صرف ایک سیب کھاتا اور دودھ کا ایک گلاس پیتا تھا۔ اس نے اپنی موت تک 114 فلموں میں کام کیا تھا۔ اس نے ''پاسپورٹ ٹو ڈینجر'' نامی ہالی ووڈ کی انگریزی فلم میں جیمز بانڈ کا کردار بھی ادا کیا تھا۔

1960ء کے لگ بھگ بھارت میں رنگین فلمیں بننا شروع ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد ایک انقلاب آگیا اور بھارت دنیا کی بڑی فلم انڈسٹری میں شامل ہوگیا۔ فی زمانہ وہاں کروڑوں کے بجٹ سے فلمیں بنتی ہیں۔

فلموں کے اسکرین پر چھا جانے والے اداکاروں میں اشوک کمار، کشور کمار، سنیل دت، راجندر کمار، شمی کپور، سنجیو کمار اور راجیش کھنہ شامل تھے۔ شمی کپور، راج کا چھوٹا بھائی تھا۔ لڑکیاں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اسٹوڈیو پہنچ جایا کرتی تھیں اور وہاں جم غفیر ہوجاتا تھا۔

راجیش کھنہ کی ابتدائی 14 فلموں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ یوں وہ باکس آفس پر کامیاب ہیرو شمار ہونے لگا۔ اس کی پہلی فلم ''آخری خط'' تھی جو 1966ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کی فلموں میں ارادھنا۔ سچا جھوٹا۔ کٹی پتنگ۔ امر پریم۔ اور دشمن شامل ہیں۔ نوجوان نسل اس کی اتنی دیوانی تھی کہ لڑکیاں اپنے تکیوں کے نیچے اس کی تصویر رکھا کرتی تھیں اور برملا کہتی تھیں کہ انہوں نے راجیش کھنہ کی تصویر سے شادی کرلی ہے۔ اس نے 168 فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔

فلمی مصنفوں میں سلیم جاوید کا نام سرفہرست تھا اور 1970ء میں وہ عروج پر تھے۔ وہ دو مصنف تھے، سلیم خان اور جاوید اختر۔ انہوں نے رومانی فلموں کی بجائے جرم و سزا پر مبنی کہانیاں لکھیں امیتابھ بچن جب فلموں میں وارد ہوا تو اسے ہدایت کاروں نے رومانی اداکار بنانا چاہا لیکن وہ کامیاب نہ ہوا۔ اس کی پہلی فلم ''سات ہندوستانی'' تھی۔ ایک روایت ہے کہ وہ اپنے آبائی گھر کو لوٹنے والا تھا کہ سلیم جاوید نے اسے ''دیوار'' میں اینگری مین کا کردار دے دیا۔ امیتابھ اس میں اور اس کے بعد آنے والی فلم ''زنجیر'' میں کامیاب رہا اور اس طرح سے بھارت کو ایک نیا ہیرو اور فلم کو ایک نیا انداز مل گیا۔ یہ ایکشن فلموں کا دور کہلایا۔ امیتابھ کی ہر فلم میں مکے ٹوٹنے لگے اور ایکسٹرا اپنے جبڑے سہلانے لگے۔ خون بہتے مناظر دیکھنے والوں کو پسند آئے اور ''اینگری مین'' فارمولا فلموں کی کامیابی کی ضمانت بن گیا۔ امیتابھ نے اب تک 230 فلموں میں اپنے جوہر دکھائے ہیں اور اب تک

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

فلموں میں اداکاری کر رہا ہے۔اسے دنیائے فلم میں بلندی پر پہنچانے میں ہدایت کار من موہن ڈیسائی کی کاوشوں کا بھی ہاتھ ہے۔امیتابھ کے ساتھ مل کر انہوں نے بیس برس تک بھارتی فلمی دنیا پر حکومت کی۔اس کی کامیاب ترین فلم ''شعلے'' تھی۔جس کا بزنس ریکارڈ دوسرے نمبر پر ہے۔بزنس کے لحاظ سے ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' پہلے نمبر پر ہے۔''شعلے'' پانچ برس تک مسلسل چلتی رہی۔اس میں گبر سنگھ کا لازوال کردار امجد خان نے کیا تھا، جو فلم کی جان تھا۔

امیتابھ کی مشہور فلموں میں امر اکبر انتھونی، باغبان، ترشول، اگنی پتھ، نمک حرام، کالیا وغیرہ شامل ہیں۔

سنجے دت اور گووندا نے اپنے کیریئر کی ابتدا میں امیتابھ کی کاپی کی۔وہ بے حد کامیاب تو نہیں ہوئے۔البتہ گووندا نے جب قادر خان کے ساتھ مزاحیہ کردار ادا کرنا شروع کیے تو فلمی دنیا میں اس کا مقام بن گیا۔

یوں تو بہت سی اداکاراؤں نے فلمی دنیا میں دھوم مچائی جن میں نرگس، ریکھا، شبانہ اعظمی، مینا کماری، مادھوری ڈکشٹ، ہیما مالنی شامل ہیں، مگر جس اداکارہ نے بھارت کی اسکرین پر دھوم مچادی وہ سری دیوی تھی۔اسے بلاشبہ سپر اسٹار کہا جاسکتا ہے۔اس کی دس فلموں نے باکس آفس پر قیامت خیز بزنس کیا تھا۔وہ ہندی کے علاوہ تلگو اور تامل فلموں کی ہیروئن بھی تھی۔

نرگس نے سنیل دت سے، ہیما مالنی نے دھرمیندر سے، شبانہ اعظمی نے سلیم سے، مادھوری ڈکشٹ نے ایک ڈاکٹر سے اور مینا کماری نے کمال امروہی سے شادی کر کے دنیائے فلم کو چھوڑ دیا۔

1990ء کا سال ''خانوں'' کا سال تھا۔سلمان خان، عامر خان اور شاہ رخ خان نے بھارتی فلموں میں کمرشل فلموں کو بلندی پر پہنچا دیا۔سلمان خان نے ایکشن فلموں میں اپنے نام کا ڈنکا بجادیا۔اس کی پہلی فلم ''بیوی ہو تو ایسی'' 1988ء میں ریلیز ہوئی۔اس کی کامیاب فلموں میں بجرنگی بھائی جان، سلطان، وانٹیڈ، دبنگ، ٹائیگر، کک اور میں نے پیار کیا شامل ہیں۔وہ اب تک 101 فلموں میں کام کر چکا ہے اور اب بھی کر رہا ہے۔

ابتدا میں عامر خان نے روایتی فلموں میں کام کیا اور رومانی اداکار بن کر رہ گیا۔اس کی پہلی فلم ''قیامت سے قیامت تک'' تھی جو 1988ء میں ریلیز ہوئی۔ روایتی فلموں میں کام کرنے کے کچھ عرصے بعد اس نے سوچ لیا کہ اگر اسے زیادہ عرصے تک فلمی دنیا میں اپنا مقام بنانا ہے تو اسے منفرد فلموں میں کام کرنا ہوگا۔جس کے نتیجے میں پی کے، تارے زمین پر، گجنی، تھری ایڈیٹس، دنگل اور دھوم تھری شامل ہیں۔اس کی فلم ''تارے زمین پر'' کو چین میں بہت پسند کیا گیا تھا۔اس نے اب تک 51 فلموں میں کام کیا ہے اور اب تک پردۂ سیمیں پر جلوہ افروز ہو رہا ہے۔

شاہ رخ خان ابتدا سے رومانی ہیرو کے طور پر فلموں میں کام کر رہا ہے۔رومانس کنگ کہا جاتا ہے۔حال ہی میں اس نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا ہے۔اس کی پہلی فلم ''دیوانہ'' تھی جو 1992ء میں ریلیز ہوئی۔اس کی کامیاب ترین فلم ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' تھی۔جو 1995ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس نے 700 ہفتے چل کر ایک نہ ٹوٹنے والا ریکارڈ قائم کیا۔اس فلم نے بھارت میں ایک ارب، اسّی کروڑ روپے کا اندرون ملک اور بیرون ملک ایک ارب پچھتر کروڑ روپے کا بزنس کیا۔بھارت میں اب تک کوئی فلم اتنا نہیں چلی۔اس کی مشہور فلموں میں کچھ کچھ ہوتا ہے، کرن ارجن، زیرو اور محبت شامل ہیں۔

فلموں میں آنے سے پہلے وہ شادی شدہ تھا لیکن کاجول کے ساتھ اس کی جوڑی اتنی مقبول ہوئی کہ ایسا لگا جیسے وہ آپس میں شادی کر بیٹھیں گے۔بہر حال ایسا نہیں ہوا اور کاجول کو کوئی اور لے اڑا۔اس نے اب تک 83 فلموں میں کام کیا ہے۔

اکشے کمار مزاحیہ اور ایکشن فلموں کا ہیرو ہے۔اس کی پہلی فلم ''سوداگر'' تھی جو 1991ء میں ریلیز

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ہوئی۔اس نے حال ہی میں ایک فلم میں کام کرنے کا معاوضہ 20 کروڑ روپے لیا ہے۔اس سے پہلے اس نے نخیل ایڈوانی کی فلم ''چاندنی چوک سے چین'' تک میں کام کیا تھا۔یہ فلم 100 کروڑ میں بنی تھی۔اس نے اب تک 126 فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں اور اب بھی میدان میں جما ہوا ہے۔اس کی مشہور فلموں میں جانور،راوڈی راٹھور،تلاش ،ہیرا پھیری' رستم اور ٹوائلٹ،ایک پریم کتھا شامل ہیں۔ہیرا پھیری مزاحیہ فلم تھی،جس نے دھوم مچادی۔اس نے راجیش کھنہ کی بیٹی ٹوئنکل کھنہ سے شادی کی تھی۔

بھارت میں ہر سال 1600 فلمیں بنتی ہیں جو مختلف زبانوں میں ہوتی ہیں۔ایک اندازے کے مطابق 2011ء میں بھارت میں سنیما کے ساڑھے تین کھرب ٹکٹ فروخت ہوئے۔یعنی ہالی ووڈ کے مقابلے میں 9000000 سے زیادہ۔ممبئی کے علاوہ کلکتہ،چنائی' کوچن،بنگلور اور حیدر آباد میں فلمیں بڑی تعداد میں بنتی ہیں۔فلموں کی آمدنی کے لحاظ سے بھارت دنیا میں تیسرے ... نمبر پر ہے۔

بھارت میں بننے والی فلم ''کارگل'' طویل ترین تھی جس کا دورانیہ 4 گھنٹے اور 25 منٹ تھا۔اس فلم میں ان سپاہیوں کو پیش کیا گیا تھا جنہوں نے کارگل میں لڑتے ہوئے جان دی تھی۔

فی زمانہ بھارت میں رنبیر کپور،رنویر سنگھ،ارجن کپور،کترینہ کیف،سونم کپور اور عالیہ بھٹ اپنی اداکاری کے جوہر دکھا رہی ہیں۔ان میں کرینہ کپور اور پرینکا چوپڑا ایسی اداکارائیں جنھوں نے انڈسٹری میں 15 برس مکمل کر لیے ہیں۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے اداکارہ کی حیثیت سے خود کو منوالیا ہے۔

بھارتی فلموں کے مشہور گلوکاروں میں محمد رفیع،لتا منگیشکر،مناڈے،مکیش اور مہندر کپور شامل ہیں۔

اب اپنے یہاں یعنی لالی ووڈ کی جانب آتے ہیں:

وطن عزیز میں بننے والی پہلی فلم جو تقسیم کے بعد بنی ''تیری یاد'' تھی۔جس میں دلیپ کمار کے بھائی ناصر خان نے کام کیا تھا۔جب کہ ہیروئن آشا پوسلے تھی۔اس فلم میں مزاحیہ اداکار نذر محمد نے بھی کام کیا تھا۔اس فلم کا ہدایت کار داؤد چاند،فلمساز سرداری لال اور کہانی نویس سرداری لال تھے۔یہ فلم زیادہ نہ چلی اور فلاپ ہوگئی۔ حالانکہ اگست 1948ء میں عید الفطر پر لاہور میں ریلیز ہوئی تھی۔اب اس کا کوئی پرنٹ بھی دستیاب نہیں ہے۔

سدھیر (شاہ زمان خان آفریدی) فلم انڈسٹری میں وارد ہونے والا پہلا ستارہ تھا۔وہ برٹش انڈیا کے زمانے میں ''فرض'' نامی فلم میں کام کر چکا تھا۔تقسیم کے بعد پاکستان آگیا اور 1949ء میں اس کی فلم ''بچکولے'' نمائش کے لیے پیش ہوئی۔اس کے بعد 1952ء میں اس کی فلم ''دوپٹا'' ہٹ ہوگئی جس میں نور جہاں ہیروئن تھی۔تقریباً سب گیت بھی اسی کے تھے۔1954ء میں بننے والی فلم ''سسی'' نے گولڈن جوبلی منائی۔اس کے بعد وہ پنجابی فلموں کا لازوال ہیرو بن گیا۔

اس کی فلمیں ماہی منڈا،دلا بھٹی اور یکے والی ہٹ ہوئیں۔یکے والی مار کٹائی سے بھرپور فلم تھی۔جہاں سے لوگوں کا رجحان تبدیل ہوگیا۔اس نے جب مرزا غالب میں کام کیا اور فلم میں مرزا غالب کا رول نبھایا تو اس نے ایک انٹرویو میں کہا کہ میں آئندہ ایسی فلموں میں کام نہیں کروں گا۔میں نے یہ فلم سنیما ہال میں لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھی ہے۔جب پولیس مجھے گرفتار کر کے لے جارہی تھی تو ہال میں بیٹھے ہوئے تماشائی کہہ رہے تھے کہ اوئے دو کے مارنا،کیا چوڑیاں پہن رکھی ہیں؟

اس کی دو فلموں ''دلا بھٹی'' اور ''باغی'' سے اتنی آمدنی ہوئی کہ آغا جی اے گل نے ایور نیو اسٹوڈیو بنا لیا۔دل چسپ بات یہ کہ اس کی فلم ''یکے والی'' کی کمائی سے باری اسٹوڈیو بن گیا۔فلم ایک لاکھ میں بن گئی تھی لیکن اس سے 45 لاکھ آمدنی ہوئی پھر اسے ''ایکشن ہیرو'' کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔اس کی ہٹ ہونے والی فلموں میں ''فرنگی'' اور ''عجب خان'' شامل ہیں۔اس کی فلم ''جی دار'' نے پلاٹینم جوبلی کر

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ڈالی۔اس کے علاوہ ''ماں پتر'' نے بھی پلاٹینم جوبلی منائی۔فلم ''ساحل'' میں اس نے اصلی شیر کے ساتھ لڑائی لڑی اور اس منظر کو فلمبند کرایا۔اس کی فلم ''کرتار سنگھ'' تین برس تک چلتی رہی۔

سدھیر نے چار بار شادی کی۔دو تو اپنے خاندان میں اور دو فلم لائن میں۔تیسری بیوی شمی اور چوتھی زیبا تھی۔ان چاروں سے اس کے چار بچے ہوئے۔اسے تین بار نگار ایوارڈ سے نوازا گیا۔

نذیر احمد خان اداکار، ہدایت کار اور فلمساز تھے۔انہوں نے فلم انڈسٹری کو اپنی زندگی کے 55 سال دیے اور 200 فلموں میں مکمل طور پر یا جزوی طور پر کام کیا۔ان کا شمار بڑے اداکاروں میں ہوتا ہے،اس لیے ان کا ایک پاؤں ممبئی اور دوسرا کلکتہ میں ہوتا تھا۔وہ انڈسٹری میں ''باؤ جی'' کہلاتے تھے۔ان میں اور اے۔آر۔کاردار میں گہری دوستی تھی۔کاردار نے انہیں اپنی بہت سی فلموں میں ہیرو کے طور پر کاسٹ کیا۔جن میں راجپوتانہ کا شیر، چاندنی چوک، بدمعاش کا بیٹا، میلاپ اور سلطانہ شامل ہیں۔

نذیر احمد کا ممبئی میں ایک اسٹوڈیو تھا جسے تقسیم کے فسادات میں جلا دیا گیا چنانچہ وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔کاردار نے اس اثنا میں ان کا مکان اور اسٹوڈیو فروخت کیا تاکہ لاہور میں اپنی پروڈکشن کمپنی بنائی جا سکے۔لاہور میں پریشانی یہ اٹھانا پڑتی تھی کہ فلم بنانے کے لیے ساز وسامان تک نہیں تھا۔جو اداکار اور اداکارائیں لاہور میں تھیں وہ تقسیم کے بعد بھارت چلی گئیں۔اس کے باوجود انہوں نے پاکستان کی پہلی سلور جوبلی فلم ''پھیرے'' بنائی، جو جولائی 1949 میں ریلیز ہوئی۔انہوں نے پہلی شادی سکندرا بیگم سے کی جو کے۔آصف کی بہن تھی۔دوسری شادی ستارہ دیوی سے کی اور ان دونوں کو طلاق دینے کے بعد سورن لتا سے شادی کر لی۔

''پھیرے'' میں قابل ذکر اداکار علاؤالدین بھی تھا۔فلمی دنیا میں اداکار کے نام کے ساتھ اس کا کام بھی چسپاں ہوتا ہے۔مثلاً مصطفیٰ قریشی، اسلم پرویز اور ادیب کو ناظرین ولین کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔جب کہ علاؤالدین ہیرو، ولین اور مزاحیہ اداکار تھا۔ان کی اداکاری ورسٹائل تھی۔''پھیرے'' پاکستان کی پہلی کامیاب فلم تھی، جو پنجابی میں بنی تھی جس کے ہدایت کار نذیر احمد خان اور ہیروئن سورن لتا تھی۔علاؤالدین ولین کے کردار کی حیثیت سے پہچان بن گیا پھر اس نے محبوبہ، محفل، مکھڑا، چھومنتر، پلکاں، آخری نشان وغیرہ میں کام کیا اور اپنی شناخت کریکٹر ایکٹر کی حیثیت سے بنا لی۔

''فلم کرتار سنگھ'' میں سدھیر حالانکہ ہیرو تھا اور علاؤالدین ولین لیکن اس کے کردار کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔اس نے فلم میں جرائم پیشہ افراد کی نمائندگی کی تھی جو تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات میں پیش پیش تھے۔وہ فلم زمینی حقائق کے مطابق تھی۔بھارتی پنجاب میں یہ فلم چار برس تک مسلسل چلتی رہی۔

علاؤالدین کی اگر کوئی اور قابل ذکر فلم تھی تو وہ خلیل قیصر کی ''شہید'' تھی۔اس فلم میں اس نے عرب قبیلے کے سردار کا کردار ادا کیا تھا۔اس کے علاوہ ''فرنگی'' میں ملنگ، زرقا میں فلسطینی مجاہد، ''یہ امن'' میں ایک مغضوب کشمیری کے کردار یادگار تھے۔

تین مار خان اس کی مزاحیہ پنجابی فلم تھی جس کے فلمساز شباب کیرانوی اور ہدایت کار حیدر چوہدری تھے۔فلم کامیاب رہی اور اسے بہت سی پنجابی فلموں میں مزاحیہ کردار ملے۔مثلاً ہڈ حرام، مسٹر اللہ دتہ، پھنے خان اور دل دا جانی وغیرہ شامل ہیں۔جب کہ اردو فلموں میں علاؤالدین کو سولو ہیرو کے کردار زیادہ نہیں ملے لیکن فلم ''بدنام'' میں اس کا کردار مرکزی تھا۔یہ فلم سعادت حسن منٹو کے افسانے پر تھی۔اس کے فلمساز اور ہدایت کار اقبال شہزاد تھے۔اس فلم نے روسیوں کو متاثر کیا اور وہ روس کی 17 علاقائی زبانوں میں ڈب کر کے چلائی گئی۔

علاؤالدین نے 319 فلموں میں کام کیا۔ان میں سے 194 اردو اور 125 پنجابی تھیں۔وہ آل راؤنڈر تھا اور

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اس نے 60 برس کی عمر پائی تھی۔

1950ء میں ''دو آنسو'' لاہور کی کامیاب فلم تھی جس نے سلور جوبلی کی۔ اس کی کہانی حکیم شجاع پاشا نے لکھی تھی اور ان کے صاحبزادے انور کمال پاشا اس کے ہدایت کار تھے۔ اس کی کاسٹ میں صبیحہ، سنتوش کے علاوہ علاؤ الدین اور ہمالیہ والا تھے۔ اس فلم نے سلور جوبلی منائی اور فنانسروں کی ہمت بندھائی کہ فلموں پر بھی رقم لگائی جاسکتی ہے۔

انور کمال پاشا فلمی صنعت کے دھانسو ہدایت کار کہے جاتے تھے اس لیے کہ ان کی بیشتر فلمیں کامیاب ہوتی تھیں۔ انہوں نے کرسچین کالج لاہور سے گریجویٹ کیا تھا اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے آرٹ کی ماسٹر ڈگری لی۔ وہ ہدایت کار کے علاوہ فلمساز اور اسکرپٹ رائٹر بھی تھے۔ ان کی فلمیں رومانی اور معاشرتی ہوتی تھیں۔

انہوں نے متعدد فلمی اداکاروں کو اپنی فلموں میں متعارف کرایا، جن میں اسلم پرویز، صبیحہ خانم، مسرت نذیر، نیر سلطانہ اور بہار بیگم شامل ہیں۔ انہوں نے کل 24 فلمیں بنائیں۔ انہوں نے 62 برس میں انتقال کیا۔ ان کی کامیاب ترین فلموں میں دو آنسو، غلام، گمنام، قاتل اور دلا بھٹی شامل ہیں۔ اردو کے علاوہ انہوں نے پنجابی میں بھی فلمیں بنائیں۔

اپنی فلموں کی کامیابی سے وہ از حد مغرور ہوگئے تھے، چنانچہ وہ لوگوں کی توہین اور بے عزتی کر دیتے تھے۔ اس کے بعد جب ان کی گیارہ فلمیں لگاتار فلاپ ہوئیں تو وہ عرش سے فرش پر آگئے۔

نیلی آنکھوں والا درپن (عشرت عباس) سنتوش کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے ہر چند کہ کم فلموں میں کام کیا مگر رومانی اداکار کی حیثیت سے اس نے خود کو منوالیا۔ وہ 1950ء میں حیدر شاہ کی فلم ''امانت'' میں جلوہ گر ہوا۔ فلم کامیاب نہیں ہوئی۔ دوسری فلم ''بلو'' تھی۔ وہ بھی باکس آفس پر ناکام رہی۔ 53ء میں لقمان نے ''محبوبہ'' بنائی وہ بھی ناکام رہی تو وہ دل برداشتہ ہوکر بھارت چلا گیا۔ وہاں اس نے عدل جہانگیری، ہیر اور باراتی میں کام کیا۔ فلمیں کاروبار کے لحاظ سے نرم رہیں۔ اسی دوران وہ نگار سلطانہ کے عشق میں گرفتار ہوگیا۔ نگار سلطانہ نے مغل اعظم میں ویمپ کا کردار ادا کیا تھا اور ''شکاری عورت'' کے طور پر مشہور تھی۔ 57ء میں وہ پاکستان آگیا۔ یہاں اس نے ''باپ کا گناہ'' میں کام کیا لیکن باکس آفس پر کامیابی نہیں ملی، البتہ فلم ''نور اسلام'' میں ایک نعت کی وجہ سے مشہور ہوگئی۔ ''شاہ مدینہ..... یثرب کے والی۔ سارے نبی تیرے در کے سوالی۔''

درپن نے 59 میں فلم ''ساتھی'' بنائی اور اپنے مد مقابل نیلو کو لیا۔ فلم ہٹ ہوگئی۔ نیلو کے ساتھ اس کی جوڑی بھی پسند کی گئی۔ درپن کا بریک تھرو سال 1960ء تھا جب ایس ایم یوسف نے اسے ''سہیلی'' میں کاسٹ کیا۔ فلم نے باکس آفس پر کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اس فلم میں درپن کو بہترین اداکار کا صدارتی ایوارڈ بھی دیا گیا۔

اس کے بعد درپن نے ''رات کے راہی'' میں ہیرو کا کردار ادا کیا۔ 61ء میں درپن کی ایک اور سپرہٹ فلم ''گلفام'' ریلیز ہوئی جو اس کے چھوٹے بھائی نے بنائی تھی۔ فلم میں درپن کی اداکاری پسند کی گئی۔ 62ء میں درپن نے نیر سلطانہ سے شادی کرلی۔

درج بالا فلموں کے علاوہ بھی اس کی کئی فلمیں آئیں جن میں باجی، شکوہ، ایک تیرا سہارا اور تانگے والا تھیں۔ ''جب سے دیکھا ہے تمھیں'' میں درپن کی جوڑی زیبا کے ساتھ بنی، لیکن فلم درمیانے درجے کی تھی۔ البتہ 65ء میں بننے والی فلم ''نائلہ'' سپرہٹ ثابت ہوئی۔ جس میں اس کے بڑے بھائی سنتوش کے علاوہ شمیم آرا تھی۔ فلم کے ہدایت کار شریف نیر تھے۔ یہ فلم رضیہ بٹ کے ناول پر بنی تھی۔ فلم کی کامیابی میں شمیم آرا کا بڑا ہاتھ تھا۔ اسی نے نائلہ کا مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

جب اس کی فلمیں تیزی سے ناکام ہونے لگیں تو وہ مایوس ہوگیا۔ چند ایک فلمیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں لیکن وحید، ندیم اور محمد علی کے میدان میں آنے

www.pakistanipoint.com

سے باقی سب اداکاروں کے چراغ بجھنے لگے۔

درپن نے مجموعی طور پر 57 فلموں میں کام کیا۔ اس کی جوڑی شمیم آرا کے ساتھ بنی اس نے شمیم کے ساتھ 15 اور نیر سلطانہ کے ساتھ 16 میں کام کیا۔ زندگی کے آخری ایام میں اس نے گزارا کرنے کے لیے ٹریول ایجنسی کھول لی تھی۔ اس نے 54 برس کی عمر میں انتقال کیا۔

اسلم پرویز ہیرو کے طور پر چند فلموں میں کامیاب رہا۔ اس کی جوڑی بہار کے ساتھ بن گئی۔ اس کے بعد ناکامی اس کے قدم چومتی رہی۔ ہدایت کار یوسف نے اسے ”سہیلی“ ولین کا کردار دیا اور کہا کہ اگر اس نے یہ کردار نہیں کیا تو وہ فلم لائن سے آؤٹ ہو جائے گا۔ اسلم پرویز نے ان کی بات مان لی۔ اس طرح سے انڈسٹری کو ایک اچھا ولین مل گیا اور اسلم کے اکھڑے ہوئے قدم دوبارہ جم گئے۔

1954ء میں ہدایت کار ڈبلیو زیڈ احمد کی فلم ”روحی“ ریلیز ہوئی جو فلاپ ہوگئی۔ اس کے ستاروں میں سنتوش اور شمی تھے۔ ڈبلیو زیڈ احمد حالانکہ ایک اچھے اور ذہین ہدایت کار تھے اور بھارت میں دو کامیاب فلمیں بنا چکے تھے مگر یہاں آکر انہوں نے ایک معاشرتی تجرباتی فلم بنائی اور ناکام ہوگئے۔

پاکستان کے معروف اداکار سنتوش کا اصلی نام سید موسیٰ رضا تھا، جو ابتدائی فلموں ہی سے ہیرو کے طور پر جلوہ گر ہوا۔ وہ لاہور میں پیدا ہوا تھا مگر والدین اتر پردیش کے اردو اسپیکنگ تھے پھر وہ لوگ حیدرآباد دکن چلے گئے جہاں اس نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے گریجویٹ کیا تھا، اس کے بعد اس نے انڈیا سول سروس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ تقسیم کے بعد سنتوش ہجرت کر کے لاہور آگیا۔ لاہور میں اسے فلم میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی۔

اسی زمانے میں اس نے سی ایس پی افسر بننے کی درخواست دے رکھی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں تذبذب میں مبتلا تھا کہ اداکار بنوں یا افسر۔ پھر فیصلہ قسمت پر چھوڑ دیا کہ جہاں سے بھی پہلے بلاوا آجائے گا، وہیں چلا جاؤں گا۔ اتفاق سے فلم کی طرف سے پہلے بلاوا آگیا، لہٰذا وہ اداکار بن گیا۔ اس کی پہلی فلم ”بیلی“ تھی۔ اس کے بعد دوسری فلم ”دو آنسو“، جو سلور جوبلی ہوگئی۔ فلم ہٹ ہوئی تو اداکار بھی ہٹ ہوگیا۔

فلموں میں آنے سے پہلے اس کی شادی ہو چکی تھی لیکن اپنی فلمی جوڑی بنانے کے لیے اس نے صبیحہ خانم سے دوسری شادی کرلی۔

سنتوش کمار اردو اور پنجابی فلموں کا اداکار تھا اور اس نے اس وقت کی سب ہی اداکاراؤں کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس نے 1950ء سے 1974ء تک 85 فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھلائے اور 56 برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اسے تین بار نگار ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ اس کی موت کے کافی عرصے بعد صدر پاکستان نے ستارۂ امتیاز عطا کیا۔

اس نے فلم ”شام ڈھلے“ بنائی جس کا ہدایت کار بھی وہ خود تھا لیکن یہ فلم باکس آفس پر ناکام رہی تو اس نے ”ہدایت“ دینے سے توبہ کرلی۔ اس کی کامیاب ترین فلموں میں سات لاکھ، دو آنسو، مکھڑا اور بیداری شامل ہیں۔

یوسف خان 1954ء میں فلم ”پرواز“ سے متعارف ہوا۔ اس نے زیادہ تر کریکٹر ایکٹر رول کیے، مگر فلم ”ضدی“ میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اس کے خاندان والے فلم انڈسٹری میں کام کرنے کے مخالف تھے لیکن اس کی ہٹ دھرمی کے آگے ان کی نہ چلی۔

جب اس نے فلمی دنیا میں قدم رکھا اس وقت سدھیر، اسلم پرویز، سنتوش کمار اور درپن کا دور دورہ تھا۔ اپنی قامت، گوری رنگت اور اسمارٹ ہونے کی بنا پر اس نے بھی قدم جما لیے۔ ابتدا میں اپنی وجاہت کی بنا پر اسے فلموں میں کام تو مل گیا، لیکن وہ دوسرے درجے کا ہیرو تھا۔ ہدایت کار اسے سائیڈ میں رکھتے تھے لیکن فلم ”ضدی“ کی کامیابی نے اسے فن کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ پنجابی کے ساتھ اردو فلموں میں بھی اس کی مارکیٹ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بن گئی۔اس نے بھر دسا، غرناطہ، ناگن، جنرل بخت خان اور عمر مختار میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔

اس کی کامیاب ہونے والی پنجابی فلموں میں گڈی، چن پتر، بابل، شریف بدمعاش، سوہنی مہیوال اور اللہ رکھا شامل ہیں۔سلطان راہی کے ساتھ اس کی جوڑی بننے کے بعد دونوں نے مقبولیت کے ریکارڈ قائم کر دیے۔

وہ ایک محب وطن تھا،اس لیے بھارت کی فلمیں پاکستانی ٹیلی وژن پر چلنے کا مخالف تھا۔اس کے علاوہ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ پاکستانی گلوکار بھارت جا کر گانے گائیں۔

محمد علی نے منوج کمار کی ایک فلم میں کام کیا تھا اور اسے وطن آنے کی دعوت دی تھی۔منوج یہاں آیا تو محمد علی نے چاہا کہ اسے دو چار فلم اسٹوڈیو میں لے جائے لیکن وہ جس اسٹوڈیو میں بھی گیا وہاں تالا پڑا ہوا ملا۔یوسف خان کا کہنا تھا کہ منوج کمار پاکستان دشمن ہے،لہٰذا اسے اسٹوڈیو میں داخل ہونے کا کوئی حق نہیں۔اس بات پر کافی ہنگامہ ہوا،مگر محمد علی کو منہ کی کھانا پڑی اور منوج اسٹوڈیوز میں قدم نہ رکھ سکا۔

اس نے 80 برس کی عمر پائی اور 46 برس فلمی دنیا کی خدمت کی۔اس نے تقریباً 400 فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔اس نے اردو، پنجابی اور پشتو فلموں میں کام کیا تھا۔

اسے ایک نگار ایوارڈ ملا اور 2004ء میں اسے صدر پاکستان نے پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔

ایور ریڈی پکچرز نے 1954ء میں فلم ''دسی'' بنائی ،جو باکس آفس پر بے پناہ کامیاب رہی۔اس نے 50 ہفتے کا بزنس کیا۔مشہور پلے بیک سنگر احمد رشدی نے اس فلم سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور ''بندر روڈ سے کیماڑی'' گایا تھا۔

اکمل کو پاکستانی فلموں کا دلیپ کمار سمجھا جاتا تھا۔وہ سدھیر کے بعد دوسرا مقبول ترین ہیرو تھا۔فلم کی کاسٹ میں اگر وہ شامل ہوتا تو اسے کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔اس کا ڈیل ڈول اور جسامت دیکھ کر لوگ اسے گبرو کہتے تھے۔اس کے مکالمے بولنے کا انداز منفرد تھا۔اس کی فلم ''ملنگی'' جب بھی ریلیز ہوتی تھی تو باکس آفس پر کھڑکی توڑ بزنس کرتی تھی۔

اکمل (محمد آصف خان) کے والدین غریب تھے،اس لیے اسے تعلیم نہ دلا سکے۔لہٰذا اکمل اوباشیوں میں پڑ گیا۔پتنگیں اڑانے اور کبوتر اڑانے لگا۔جب جوان ہوا تو اسے روزگار کی تلاش ہوئی۔اس کا بھائی اجمل خان پہلے ہی سے فلم لائن میں تھا،لہٰذا وہ بھی فلموں میں کام کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔اس زمانے میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوتا تھا،اس لیے فلم میں کام کرنا مذاق نہیں تھا،چنانچہ اکمل اپنے بھائی اجمل کی سفارش سے میک اپ مین بن گیا۔

وہ میک اپ تو کرتا رہا اور اداکاروں کے رخساروں پر کریم ملتا رہا اور ان کے نقش و نگار سنوارتا رہا لیکن اس بات کو اس نے فراموش نہیں کیا کہ اسے اداکار بننا ہے۔ایک بار وہ انور کمال پاشا کے پاس گیا۔ان دنوں وہ ''قاتل'' بنا رہے تھے۔انہوں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ اسے فلم میں ایکسٹرا رول دیں گے چنانچہ 1955ء میں اسے ''قاتل'' میں چھوٹا سا رول مل گیا۔ان چھوٹے کرداروں کے بعد اسے بڑے کردار ملنے لگے پھر 1956ء میں اسے ''جبرو'' میں ہیرو کا کردار مل گیا۔فلم ہٹ ہو گئی اور وہ بھی ہٹ ہو گیا۔

وہ ہیرو لیا جانے لگا۔اس نے بودی شاہ، بچہ جمہورا، رانی خان اور مفت بر میں کام کیا جو پنجابی تھیں۔اس نے فردوس سے شادی کی جس سے ایک لڑکا اور چھ لڑکیاں ہوئیں۔وہ شراب زیادہ پینے لگا تھا،اس لیے اس کے گردوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ایک روایت ہے کہ اس کے سالوں نے اسے ہلاک کیا تھا۔

1956ء میں پاکستان کی پہلی سندھی فلم ''عمر ماروی'' بنی۔یہ فلم باکس آفس پر زیادہ کامیاب نہیں رہی۔

فلم انڈسٹری کی حوصلہ افزائی کے لیے مشہور صحافی

الیاس رشدی نے 1958ء میں ''نگار ایوارڈ'' دینے کا سلسلہ جاری کیا۔ ''نگار'' ہفت روزہ فلمی اخبار تھا، جس میں فلمی خبریں اور مضامین شائع ہوتے تھے۔

مشہور فلم ''ناگن'' 1956ء میں ریلیز ہوئی تھی جس کے ہدایت کار خلیل قیصر تھے۔ اس کے اداکاروں میں رتن کمار، نیلو، حسنہ اور یوسف خان تھے۔

رتن کمار پاکستان آنے سے پہلے چائلڈ آرٹسٹ کی حیثیت سے بھارتی فلموں میں کام کر چکا تھا۔ بھارت میں اس کی فلموں میں بوٹ پالش، دو بیگھ زمین اور جاگیرتی شامل ہیں۔ پاکستان میں اس نے بچوں کے لیے بنائی جانے والی فلم ''بیداری'' میں بھی کام کیا تھا۔ پاکستان میں اس کے بھائی وزیر علی نے ''جاگیرتی'' کا چربہ ''بیداری'' کے نام سے بنایا۔ یہ فلم کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ماسٹر صاحبان اسکول کے طالب علموں کو سنیما ہال تک لے جا کر رعایتی ٹکٹ پر فلم دکھاتے تھے۔

رتن کمار جب کچھ بڑا ہوا تو باقاعدہ ہیرو آنے لگا۔ اس کی فلموں کی زیادہ تر ہیروئن نیلو ہوتی تھی۔ اس کی سات سالہ بچی ایک حادثے میں ہلاک ہوگئی تو وہ دل برداشتہ ہوگیا اور سات یا آٹھ فلموں میں کام کرنے کے بعد امریکا چلا گیا اور کاروبار کرنے لگا۔ پھر پاکستان لوٹ کر نہیں آیا۔

اسلم پرویز کی پہلی فلم ''قاتل'' تھی جس کے ہدایت کار انور کمال پاشا تھے جو 1955ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے بعد اس نے نور جہاں کے مقابل ''پاٹے خان'' اور ''کوئل'' میں کام کیا۔ ابتدا میں اس کی فلمیں کامیاب ہوئیں۔ وہ متمول باپ کا بیٹا تھا، اس لیے فلمسازوں کی مالی مدد بھی کر دیتا تھا مگر جب ہیرو کی حیثیت سے اس کی فلمیں لگاتار ناکام ہونے لگیں تو ہدایت کار ایس ایم یوسف نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ان کی فلم ''سہیلی'' میں ویلن بن جائے۔ اسلم نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور ویلن بن گیا۔ اس کی مشہور فلموں میں انسان اور آدمی، تہذیب، بہارو پھول برساؤ اور ''ملنگی'' شامل ہیں۔ اس نے اردو کے علاوہ پنجابی فلموں میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس کی آخری فلم ''خوددار'' تھی۔

اسے تین بار نگار ایوارڈ ملا۔ 2018ء میں اسے صدر پاکستان نے پرائیڈ آف پرفارمنس عطا کیا۔ اس نے 257 فلموں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے تھے۔

وہ کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ اس نے اپنے پیچھے چار بچے چھوڑے ہیں۔

لہری (سفیر اللہ) کانپور میں پیدا ہوا تھا۔ تقسیم کے بعد اس کا خاندان پاکستان آ گیا۔ اس نے شارٹ ہینڈ سیکھ لی اور ٹائپسٹ کی حیثیت سے ایک فرم میں ملازمت کر لی۔ شام کو وہ صدر میں ہوزری کا سامان فروخت کیا کرتا تھا۔ لہری نے فلموں میں آنے سے پہلے ریڈیو پاکستان، کراچی میں کام کیا پھر وہ کئی اسٹیج ڈراموں میں بھی آیا۔ اس کی پہلی فلم ''انوکھی'' تھی جو 1956ء میں ریلیز ہوئی۔ اسے سیٹھ لچھو (شیخ لطیف) نے لاہور میں بنایا تھا۔ فلم اوسط درجے کی رہی، لیکن لہری کو مزاحیہ اداکار کی حیثیت سے پسند کیا گیا۔ اس نے چند پنجابی فلموں میں کام کیا مگر زیادہ تر اردو فلموں میں جلوہ گر ہوتا رہا۔ اسے جنوبی ایشیا کا بہترین اداکار کہا جاتا ہے۔ اس کی اداکاری منفرد تھی اور مکالمے بولنے کا انداز دوسرے اداکاروں سے جدا تھا۔ فلموں میں اس نے گھٹیا اور اوچھے کردار نہیں کیے۔ اپنی ابتدائی فلموں میں اس نے سائیڈ ہیرو کا کردار بھی ادا کیا۔

اس کی فلموں میں نئی لیلیٰ نیا مجنوں، رات کے راہی، جوکر، ایک نگینہ، ایک مسافر ایک حسینہ دامن، پیغام، کنیز اور چھوٹی امی شامل ہیں۔

اپنی یادگار اداکاری کی بنا پر اس نے 13 نگار ایوار حاصل کیے۔ اسے صدر پاکستان نے 1996ء میں، اس کی موت کے بعد پرائیڈ آف پرفارمنس بھی عطا کیا۔

اس نے 83 برس کی عمر میں بیماری کی حالت میں انتقال کیا۔

. اعجاز (اعجاز درانی) اداکار، ہدایت کار اور فلسا

تھا۔اس کی وجہ شہرت نور جہاں سے شادی کرنا بھی ہے۔ پردۂ سیمیں پر نرم و ملائم اور نستعلیق قسم کا شخص نظر آتا تھا، غالباً اسی لیے ابتدائی فلموں میں اس کے کردار وں میں یکسانی تھی۔شباب کیرانوی اسے گھریلو فلموں میں ہیرو کی حیثیت سے لیتے تھے۔

اس نے نور جہاں سے شادی کرنے کے بعد اداکارہ فردوس سے شادی کی پھر اس سے علیحدگی ہونے کے بعد شریف نیر کی لڑکی سے شادی کر لی۔ان تینوں سے اس کی لڑکیاں ہوئیں، جو نور جہاں نے عدالت کے ذریعے حاصل کر لیں اور ان کی پرورش خود کی۔

ہیروئن اسمگلنگ کرنے پر اسے لندن کے ہیتھرو ائیر پورٹ سے گرفتار کیا گیا اور پانچ سال کی سزا دی گئی۔وہ 1978ء سے 83ء تک جیل میں رہا۔

اس کے فلمی کیریئر کا آغاز 1956ء میں فلم ''حمیدہ'' سے ہوا۔اس کے بعد اس نے بے حساب اردو اور پنجابی فلموں میں کام کیا۔مثلاً مرزا جٹ، باؤ جی، دلاں دے سودے، تیرے عشق نچایا، عشق بنا کی جینا، بدنام، سلمیٰ، شہید، لاکھوں میں ایک، دوستی اور ہیر رانجھا۔

''ہیر رانجھا'' اپنی ٹریٹمنٹ، اداکاری اور موسیقی کی بنا پر بے حد پسند کی گئی۔فلم میں اجمل نے کیدو کی حیثیت سے ویلن کا کردار ادا کیا تھا، جو بہت جاندار تھا۔ ''ہیر رانجھا'' کے بعد اعجاز کا شمار سپر ہٹ ہیروز میں ہونے لگا اور اسے بہت سی فلمیں مل گئیں۔

خلیل قیصر کا ذکر کیے بغیر پاکستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ مکمل نہیں ہوگی۔ وہ اپنی سوچ میں منفرد اور یکتا تھے۔خیالات کے لحاظ سے وہ ترقی پسند تھے اور انگریز، امریکی فاشزم کے خلاف تھے۔ایک روایت ہے کہ جن دنوں انہوں نے فلم ''لوصبا'' بنانے کا اعلان کیا تھا اور علاؤ الدین کو مرکزی کردار کے لیے کاسٹ کر لیا تھا، انھی دنوں ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا، جس میں وہ چل بسے۔

فلمی دنیا میں ان کا ہم خیال گروپ تھا جس میں ریاض شاہد کہانی نویس، طالش اور علاؤ الدین اداکار کے طور پر شامل تھے۔ان کی مشہور فلموں میں شہید، فرنگی، عجب خان، ناگن اور یار بیلی شامل ہیں۔

حبیب (حبیب الرحمٰن) اپنے والدین کے ساتھ بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ابتدائی تعلیم اسکولوں میں حاصل کرنے کے بعد اس نے لاہور کے گورنمنٹ ایم اے او کالج سے اردو، فارسی اور انگریزی میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔اب ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ کسی کالج میں لیکچرار لگ جاتا اور طالب علموں کو پڑھانے لگتا لیکن نہ جانے کس کے مشورے پر وہ فلموں میں آ گیا۔اگر فلموں میں آنا تھا تو ڈگریاں سر پہ لادنے کی کیا ضرورت تھی؟ فلموں میں پڑھے لکھوں کا کیا کام؟ بہر حال انڈسٹری میں کامیابی نے اس کے قدم چومے۔

اسے 1956ء میں فلم ''لخت جگر'' میں کاسٹ کیا گیا مگر فلم فلاپ ہوگئی پھر اس کی چند اور فلموں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ 1958ء میں فلم ''آدمی'' میں اسے اہم کردار دیا گیا، جس سے اسے کامیابی ملی۔مزید اردو فلموں میں اس نے اداکاری کے جوہر دکھائے، مثلاً ایاز، زہر عشق، اولاد، ثریا، ماں کے آنسو، آشیانہ، عید مبارک اور دل کے ٹکڑے وغیرہ۔

اس نے پنجابی فلموں میں بھی کام کیا۔مثلاً ''موج میلہ'' جو گولڈن جوبلی ہوئی۔''جی دار'' جو پلاٹینم جوبلی ہوئی۔اس کے بعد فلمیں زیادہ کامیاب نہ ہوسکیں لیکن وہ چلتا رہا۔پھر دل دا جانی، یار مار، چن کھنا، دو مٹیاراں، کھڑا چن ورگا، چن پتر نے اس کا کیریئر مضبوط کر دیا۔ٹیلی ویژن پر اس کا سب سے مشہور ڈراما ''راہیں'' تھا۔

اس نے ہدایت کار کی حیثیت سے دو سندھی فلمیں بنائیں، نہ معلوم کس کے مشورے سے۔''باغی'' اور ''اللہ بچایو'' مگر دونوں کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔چند فلموں کا وہ فلمساز تھا مثلاً پردیس، ہار گیا انسان لیکن یہاں بھی قسمت نے یاوری نہیں کی اور باکس آفس پر ناکامی ہوئی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ایک شادی وہ خاندان میں کر چکا تھا اور اس کے دو بیٹے، چار بیٹیاں تھیں لیکن اس نے اداکارہ نغمہ سے بھی شادی رچالی۔ غالباً اس لیے کہ وہ ان دنوں فلمی دنیا میں واحد ہیروئن تھی اور اس کی مارکیٹ بنی ہوئی تھی۔ بہرحال شادی ناکام ہوگئی اور نوبت علیحدگی پر منتج ہوئی۔

اسے تین بار نگار ایوارڈ ملا، جب کہ 2011ء میں اسے صدر پاکستان نے پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔

اس نے 85 برس کی عمر میں انتقال کیا اور 60 برس تک فلم انڈسٹری کی خدمت کی۔ اسے مصروف ترین اداکار تسلیم کیا گیا ہے۔

سید کمال شباہت کے اعتبار سے بھارتی اداکار راج کپور جیسا تھا۔ وہی قد کاٹھ، چہرہ بیضوی اور بالکل اسی جیسی مونچھیں۔ وہ بھارت کی چار فلموں میں کام کر چکا تھا۔ راج کپور نے بھی اپنی ایک فلم ''جاگتے رہو'' میں کام دیا تھا، مگر تقسیم کے بعد جب فسادات شروع ہوئے تو ان کے خاندان کو بھارت چھوڑ کر پاکستان آنا پڑا۔

یہاں اس نے سب سے پہلے شباب کیرانوی کی فلم ''ٹھنڈی سڑک'' میں کام کیا جو 1957ء میں بنی تھی۔ فلم میں ظریف بھی اس کے ساتھ تھا۔ فلم تو کامیاب نہیں ہوئی لیکن کمال ہٹ ہوگیا اور لوگ اسے مزاحیہ اداکار کے طور پر دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ کمال نے اسی اسٹائل کو اپنا لیا۔ وہ راج کپور کی نقل کرنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ اگر راج نے بھارت میں ''میرا نام جوکر'' بنائی تو اس نے پاکستان میں ''جوکر'' بنائی۔

15 فروری 1964ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''توبہ'' باکس آفس پر ہٹ ہوگئی اور ملک کے چاروں کونوں میں دھوم مچ گئی۔ 1969ء میں ''منی لیلیٰ نیا مجنوں'' نے پلاٹینم جوبلی منائی۔ اس کی مشہور فلموں میں جوکر، آشیانہ، بہن بھائی اور روڈ ٹو سوات شامل ہیں۔ اس نے 13 فلموں کی ہدایت دی ہے۔ جس میں پنجابی فلم ''جٹ کڑیاں توں ڈردا'' نے زبردست بزنس کیا۔ ابتدا میں تو اس کی جوڑی شمیم آرا کے ساتھ بنی پھر اس نے نشو، زیبا اور دیبا کے ساتھ بھی کام کیا۔ اس نے اپنے بیٹے غالب کے لیے بہت کوشش کی، لیکن اسے فلم لائن میں کوئی مقام نہیں دلوا سکا۔ اس نے 79 برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اس کی موت حملۂ قلب سے ہوئی۔ اس کا ایک لڑکا غالب اور تین لڑکیاں تھیں۔

شباب کیرانوی (حافظ نذیر) حافظ قرآن تھے۔ ان کا تعلق کیرانہ، بھارت سے تھا۔ جہاں ان کی بال تراشنے کی دکان تھی۔ شباب کو ابتدا ہی سے ادب اور صحافت سے دل چسپی تھی اور وہ صحافی بننا چاہتے تھے۔ غالباً اسی لیے انہوں نے ایک فلمی رسالے کی ادارت بھی کی۔ اس زمانے میں اے۔ حمید جنہیں محبت سے انڈسٹری میں بھائیا حمید کہہ کر پکارا جاتا تھا، شباب کو فلم انڈسٹری میں متعارف کرادیا۔ انہوں نے سیر بین لمیٹڈ کے نام سے اپنا ادارہ قائم کیا اور 1957ء میں ''جلاں'' فلم بنائی۔ جس میں عنایت حسین بھٹی اور نادرہ تھے، مگر فلم فلاپ ہوگئی۔ انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور 60ء میں دوسری فلم ''ٹھنڈی سڑک'' بنائی جس میں مسرت نذیر کے ساتھ کمال تھا۔ دونوں کے بارے میں لوگوں کو خوش فہمی نہیں تھی، اس لیے کہ ان کا مزاج بہت مختلف تھا۔ وہ روزانہ سیٹ پر لڑپڑتے تھے۔ فلم کا بزنس نرم رہا۔ اس کے بعد شباب صاحب نے جادوئی فلم ''گلبدن'' بنائی۔ ان تینوں فلموں پر اے۔ حمید نے شباب کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ان کا نام ہدایت کار کی حیثیت سے دیا۔ فلم نرم رہی۔ 61ء میں شباب نے خود ''ثریا'' بنائی، جس میں نیر سلطانہ، حبیب اور اسد بخاری تھے۔ فلم ہٹ ہوگئی۔ شباب کے ہاتھ فارمولا آگیا کہ فلم معاشرتی، سماجی اور گھریلو ہونا چاہیے۔ جب ہی گھر کی خواتین اور ان کا خاندان متوجہ ہوگا۔ اس کے بعد ''مہتاب'' کی ہدایت دی، جس میں احمد رشدی کا گانا ''گول گپے والا آیا'' بے حد مشہور ہوا۔ جو علاؤالدین پر فلمبند ہوا تھا۔ ہیروئن نغمہ کو متعارف کرایا گیا تھا۔ ایک وہی نہیں شباب نے کمال، غلام محی الدین اور انجمن کو متعارف کرایا پھر وہ اپنے 30 سالہ کیریئر میں کسی نہ کسی ستارے کو متعارف کراتے رہے۔

www.pakistanipoint.com Waqar Azeem

شباب صاحب نے اس کے بعد انسان اور آدمی، میرا نام ہے محبت، دامن اور چنگاری بنائی۔ ''میرا نام ہے محبت'' میں انہوں نے بابرا شریف اور غلام محی الدین کو متعارف کرایا، جو آئندہ بیس برس تک انڈسٹری پر چھائے رہے۔

شباب صاحب کے دو بیٹے فلم انڈسٹری میں آئے۔ ظفر شباب اور نذر شباب۔ انہوں نے بہت سی فلمیں بنائیں لیکن وہ اوسط درجے سے زیادہ بزنس نہیں کر سکیں۔ شباب صاحب نے اپنی زندگی میں اسٹوڈیو بنایا تھا جس میں انہوں نے کئی فلموں کی شوٹنگ کی۔

رنگیلا (سعید خان رنگیلا) کا نام آتے ہی ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ ابھر آتی ہے۔ اس میں بے پناہ صلاحیتیں تھیں، اس لیے نہیں کہ وہ زندہ دل تھا اور مضمحل افراد کو دو گھنٹے تک سیٹ سے چپکا دیتا تھا اور ان کے غم سمیٹ لیا کرتا تھا بلکہ وہ اداکار کے علاوہ گلوکار، ہدایت کار اور فلمساز اور اسکرپٹ رائٹر بھی تھا۔ اس کی پہلی فلم ''نوراں'' تھی جو 1957ء میں بنی تھی۔ فلم کے ہدایت کار کو ایک منظر میں مزاحیہ اداکار کی ضرورت تھی۔ شوٹنگ ہو رہی تھی، ہدایت کار پر جلدی سوار تھی۔ اس نے شوٹنگ دیکھنے والوں کا جائزہ لیا اور رنگیلا سے کہا کہ اگر وہ اس کردار کو ادا کرنے کا خواہش مند ہے تو میک اپ کروا کر کیمرے کے سامنے آجائے۔ رنگیلا نے ایسا ہی کیا۔ اس روز سے وہ مزاحیہ اداکار بن گیا۔

اس کا خاندان افغانستان سے پاکستان آیا تھا۔ رنگیلا پہلے لاہور میں فلموں کے بورڈ پینٹ کرتا تھا اور اسے تن سازی کا بھی شوق تھا۔ فلموں کے بورڈ بناتے بناتے اس کے دل میں اداکاروں کو نزدیک سے دیکھنے کی خواہش ہوئی تو وہ اسٹوڈیو کے چکر لگانے لگا۔ قدرت نے اس کا ساتھ دیا اور درج بالا واقعہ پیش آگیا پھر ہدایت کار ایم جے رانا نے اپنی پنجابی فلم ''جٹی'' میں اسے ایک کردار دیا۔ وہ فلم 1958ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے بعد رنگیلا مستند قسم کا مزاحیہ اداکار بن گیا۔ 69ء میں اس نے اپنا ادارہ رنگیلا پروڈکشنز کے نام سے قائم کیا اور فلم ''دیا اور طوفان'' بنائی۔ فلم کی ہدایت کاری تو اس نے دی، مگر ایک گانا ''گا میرے منوا گاتا جا رے'' بھی گایا۔ فلم ہٹ ہوگئی اور رنگیلا ہر اعتبار سے ہٹ ہو گیا۔ اس نے بہت سی فلمیں بنائیں۔ وہ اردو اور پنجابی فلموں میں جلوہ گر ہوا۔ اس نے چالیس برس فلمی دنیا میں دھوم مچائی اور 300 فلموں میں کام کیا۔

اسے اسکرپٹ رائٹنگ اور مزاحیہ اداکاری پر 10 بار نگار ایوارڈ ملا۔ صدی کا بہترین اداکار کے طور پر بھی ایک ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 2005ء میں اسے صدر پاکستان نے پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔

اس نے تین بار شادی کی، جس کے نتیجے میں اس کے چھ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہوئیں۔ اس نے 68ء برس کی عمر میں انتقال کیا۔

حسن طارق امرتسر میں پیدا ہوا تھا۔ تقسیم کے وقت اس کا خاندان پاکستان آگیا۔ فلموں میں ہدایت دینے کا اسے بچپن ہی سے شوق تھا۔ اس نے اپنے کیریئر کا آغاز 1957ء میں معاون ہدایت کار کی حیثیت سے کیا اور اشفاق ملک کی فلم ''بنجارن'' بنائی۔ اس کے بعد 59ء میں ''نیند'' جس میں اسلم پرویز اور نیلو تھے۔ فلم کامیاب ہوئی اور حسن طارق کو ہدایت کار تسلیم کر لیا گیا۔

اس نے اپنے کیریئر میں 44 فلمیں بنائیں، جن میں سے دو پنجابی تھیں۔ اس کی مشہور فلموں میں دیور بھابی، وحشی، تہذیب، بہشت اور سنگدل شامل ہیں۔

اس کی کامیابی میں اس کی بیوی رانی کا بڑا ہاتھ تھا، جس نے امراؤ جان ادا، انجمن اور تہذیب میں بھرپور کردار ادا کیے اور حسن طارق کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

اس نے تین اداکاراؤں سے شادی کی جن میں نگہت سلطانہ، ایمی مینولا اور رانی شامل ہیں۔

فلم ساز اور ہدایت کار اشفاق ملک ایک کامیاب فلمساز اور ہدایت کار تھے۔ 1960ء میں ان کی کامیاب فلم ''سلمیٰ'' تھی، جس کے ستاروں میں اعجاز، یاسمین، طالش اور علاؤ الدین تھے۔ وہ گھریلو اور معاشرتی فلم تھی جس کا

Iqbal Azeem
www.pakistanipoint.com

میوزک اچھا تھا اس لیے فلم کامیاب ہوگئی۔ خاص طور پر یہ فلم خواتین کو پسند آئی۔

منور ظریف کو شہنشاہ ظرافت کہا جاتا ہے۔ وہ محض کامیڈین نہیں تھا بلکہ ورسٹائل ایکٹر بھی تھا۔ اس نے کئی فلموں میں ہیرو کا رول بھی ادا کیا۔ اس کے فلمی کیریئر کی ابتدا پنجابی فلم ''ڈنڈیاں'' سے ہوئی جو 1961ء میں ریلیز ہوئی۔ منور ظریف کو ہتھ جوڑی سے کامیابی ملی جو 64ء میں سنیما گھروں کی زینت بنی۔ ابتدا میں اس کی جوڑی الیاس کاشمیری کے ساتھ بنی اور کئی فلمیں باکس آفس پر کامیاب ہوئیں جن میں ''بنارسی ٹھگ'' اور ''جیرا بلیڈ'' شامل ہیں۔ اس کے بعد اس نے بہارو پھول برسا، عشق دیوانہ، پردے میں رہنے دو، زینت وغیرہ میں کام کیا۔ اس نے انڈسٹری میں 16 برس کے دوران 300 فلموں میں کام کیا۔ وہ مصروف ترین اداکار تھا۔ وہ پنجابی فلموں کے علاوہ اردو فلموں میں بھی ظاہر ہوا اور اس کی اداکاری سارے حلقوں میں پسند کی گئی۔

وہ رنگیلا کی نگاہ میں آ گیا تو اس نے منور کے ساتھ جوڑی بنا لی۔ جوڑی بہت کامیاب ہوئی۔ وہ دیا اور طوفان، رنگیلا اور منور ظریف میں رنگیلا کے ساتھ شامل تھا۔ اسے تین نگار ایوارڈ سے نوازا گیا۔

گردوں کی بیماری کی بنا پر اس نے 35 برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اس کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ شادی خاندان میں ہوئی تھی۔ وہ اداکار ظریف کا بھائی تھا۔

پاکستان کی پہلی ہارر فلم ''زندہ لاش'' تھی، جس میں اداکار ریحان نے ڈراکیولا کا کردار ادا کیا تھا۔ نوکیلے دانت جن سے خون ٹپک رہا تھا، اس کا امتیاز تھے۔

ریاض شاہد کشمیری تھے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی اور ایک صحافی کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا۔ وہ ہفت روزہ چٹان میں کام کرنے کے بعد فیض احمد فیض کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ لیل و نہار میں کام کرنے لگے۔ انہوں نے ایک ناول ہزار داستان بھی لکھا تھا۔

وہ ترقی پسند تھے اور خلیل قیصر کے گروپ میں شامل تھے۔ انہوں نے مشہور فلم ''شہید'' کی کہانی اور مکالمے 62ء میں لکھے۔ پھر ''فرنگی'' کی کہانی اور مکالمے بھی انہوں نے لکھے۔ اس کے بعد 62ء میں ایک فلم ''سسرال'' کی ہدایت دی۔ انہوں نے تین فلموں کی ہدایت دی، جن میں زرقا، حیدر علی اور یہ امن شامل ہیں۔ انڈسٹری میں وہ کہانی نویس اور مکالمہ نگار کی حیثیت سے مشہور تھے۔ مشہور زمانہ فلم ''خاموش رہو'' کی کامیابی کا ان سے ذکر کرتے ہوئے کسی نے بھولے سے یہ کہہ دیا کہ محمد علی نے اس فلم میں مکالموں کی ادائی جاندار طریقے سے کی ہے، اس لیے فلم باکس آفس پر کامیاب ہوگئی۔ ریاض شاہد نے جواب میں کہا کہ میں نے فلم کے مکالمے اتنے جاندار لکھے تھے کہ اگر انہیں گدھا بھی بول دیتا تو فلم کامیاب ہوجاتی۔ یہ بات محمد علی کے کانوں تک پہنچ گئی تو وہ ان سے برسوں تک ناراض رہا۔ جب محمد علی کی ناراضی ختم ہوئی تو انہوں نے اسے لے کر ''حیدر علی'' بنائی۔ یہ فلم باکس آفس پر کامیاب نہ ہوسکی۔

1969ء میں ریاض شاہد نے ''زرقا'' بنائی جو باکس آفس پر ہٹ ہوگئی لیکن جب اسے فلسطین بھیجا گیا تو اچھا رسپانس نہیں ملا۔ نیلو نے ریاض شاہد سے شادی کرنے کے بعد فلم انڈسٹری چھوڑ دی تھی لیکن وہ ''زرقا'' میں ایک بار پھر مرکزی کردار میں جلوہ گر ہوئی۔ ریاض شاہد کی موت کے بعد جب اس کے خاندان والوں نے اسے قبول نہیں کیا تو اس نے دوبارہ فلم انڈسٹری کا رخ کرلیا۔

''لاکھوں میں ایک'' سپرہٹ فلم تھی جو 67ء میں ریلیز ہوئی۔ شمیم آرا اس کی ہیروئن تھی۔ فلم کے گانے ہٹ تھے لیکن قابل ذکر اس کا ویلن مصطفیٰ قریشی تھا۔ جسے رضا میر نے متعارف کرایا تھا۔ کافی عرصے تک وہ اردو فلموں میں کام کرتا رہا لیکن معلوم نہیں کیسے اس نے پنجابی فلموں کی طرف رخ کرلیا اور اردو فلموں سے زیادہ کامیابی حاصل کرلی۔ سلطان راہی کے ساتھ اس کی جوڑی بن گئی۔ سلطان راہی ہیرو ہوتا تھا اور وہ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ویلن۔اس کی کامیاب ترین فلم ''مولاجٹ'' کہی جاسکتی ہے۔

وہ ریڈیو پاکستان میں کام کرتا تھا۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے اسلامک اسٹڈیز میں سندھ یونیورسٹی سے ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔

جن فلموں میں اس نے اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں، ان میں عندلیب، لال آندھی، خوفناک اور خطرناک شامل ہیں۔اس نے گلوکارہ روبینہ سے شادی کی تھی جس نے اب تک تقریباً دس ہزار سندھی لوک گیت گائے ہیں۔مصطفیٰ قریشی کی آخری فلم ''سلطنت'' ہے جو 2014ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

فلم ''دوستی'' جس میں مشرقی پاکستان کے اداکار رحمٰن نے بھی کام کیا تھا فروری 1971ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا اور ڈائمنڈ جوبلی منائی۔وہ مجموعی طور پر 101 ہفتوں تک سینما ہالوں کی زینت بنی رہی۔

جاوید چنار کی فلم BEYOND THE LAST MOUNTAIN پاکستان کی پہلی انگریزی فلم تھی، جو فلاپ ثابت ہوئی۔

شاہد (شاہد حمید) کی پہلی فلم ''آنسو'' تھی جو 1971ء میں ریلیز ہوئی۔فلم کامیاب ہوئی اس لیے اداکار بھی کامیاب ہوگیا۔فلم کا ہیرو ندیم تھا اور ہیروئن دیبا۔جب کہ شاہد کا کردار منفی تھا۔اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسکرین توڑ کر باہر آجائے گا۔اس کے بعد آنے والی فلمیں جن میں وہ ہیرو تھا، بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئیں، جن میں تہذیب، امراؤ جان ادا، انمول، شاہنہ، آپ کی خاطر اور مرزا جٹ شامل ہیں۔اس نے مجموعی طور پر 150 فلموں میں کام کیا۔اس کی آخری فلم ''زور'' تھی جو 1998ء میں ریلیز ہوئی۔اس نے دو بار نگار ایوارڈ حاصل کیا۔

اس نے تین شادیاں کیں۔اس کی بیویاں اداکارہ زمرد، عشرت چوہدری اور بابرا شریف ہیں۔

جب صدر ضیاء الحق نے اپنی حکومت قائم کی تو اسلامی اصولوں پر چلتے ہوئے فلم انڈسٹری پر بھی پابندیاں عائد کرنا شروع کر دیں، جس سے انڈسٹری کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔اس کے علاوہ کیسٹ پر بھی فلمیں آنے لگی تھیں، اس لیے لوگوں نے سینما ہالوں کا رخ کرنا بند کر دیا تھا۔

''آئینہ'' جس میں ندیم اور شبنم نے ہیرو، ہیروئن کی حیثیت سے کام کیا تھا مارچ 1977ء میں ریلیز ہوئی۔یہ فلم مجموعی طور پر سینما ہالوں میں 400 ہفتوں تک چلتی رہی۔یہ فلم کراچی کے سینما گھر اسکالا میں چار سال تک چلتی رہی۔

''مولاجٹ'' پنجابی فلم تھی جو 1979ء میں ریلیز ہوئی۔اس میں گنڈاسا کلچر کو پیش کیا گیا تھا اور اس کا ہیرو سلطان راہی تھا۔سلطان راہی کا نام یقیناً ''گنیز ورلڈ ریکارڈ بک'' میں آنا چاہیے اس لیے نہیں کہ اس نے گنڈاسا پکڑنے کا ایک نیا اور خونی اسٹائل فلم بینوں میں متعارف کرایا اور اپنے کپڑوں کو خون آلود کرنے کا آغاز بھی اس نے ہی کیا۔بلکہ 1989ء میں بننے والی 46 پنجابی فلموں میں سے 37 فلموں میں اس نے مرکزی کردار ادا کر کے قیامت برپا کر دی۔اس کی فلمیں ''مجھو'' اور ''زندانی'' صرف سولہ دن میں تیار ہوئیں۔جب کہ نیر خان صرف اکیس دن میں بنی۔سلطان راہی نے 90 فلموں میں سے 55 میں مرکزی کردار ادا کیے۔

اس کی زندگی میں فلم ''بشیرا'' ایک زبردست موڑ لے کر آئی۔گنڈاسا اور خون آلود کپڑوں نے اس کے فلمی کیریئر میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔''بشیرا'' کے ہدایت کار اسلم ڈار نے بتایا: ''میں نے فلم کے مرکزی کردار کے لیے اداکار ساون سے بات کی، مگر اس نے 70 ہزار روپے طلب کیے۔تب میں نے اس کی جگہ سلطان راہی کو صرف سات ہزار روپے میں کاسٹ کر لیا۔''بشیرا'' کی کامیابی سے سلطان راہی سپر اسٹار بن گیا اور اس کا معاوضہ ستر ہزار روپے تک پہنچ گیا۔

دل چسپ بات یہ کہ اس کی فلموں کا ویلن مصطفیٰ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

قریشی ہوا کرتا تھا۔ گنڈاسے اور خون آلود کپڑوں کے ساتھ دونوں ہی ایک دوسرے کو موت کے منہ میں پہنچانے کے لیے آمادہ رہتے تھے۔لیکن ہیروئن اسی کی طرف لگاوٹ سے دیکھتی تھیں اور اظہار عشق بھی کر ڈالتی تھیں۔ حالانکہ صورت وشکل کے اعتبار سے دونوں ہی خوں خوار لگتے تھے اور ان میں ملاحت اور ملائمت نہیں تھی۔

1986ء سے 1996ء تک گیارہ برس کے عرصے میں سلطان راہی نے 304 فلموں میں کام کیا، جو ایک اَن مٹ ریکارڈ بن گیا۔لوگوں کا خیال ہے کہ اب یہ ریکارڈ نہیں توڑا جاسکتا۔

اب کچھ ذکر ڈولیووڈ کا ہو جائے۔

آزادی سے قبل کلکتہ فلمی مرکز تھا۔ بارود کے علاوہ بنگلہ فلمیں بھی وہیں بنتی تھیں لیکن آزادی کے بعد مشرقی پاکستان کے لوگوں نے ڈھاکا میں بھی فلمیں بنانے کی پلاننگ شروع کی۔ تقسیم سے قبل ڈھاکا میں صرف دو سینما ہال تھے مگر آزادی کے فوراً بعد مزید چار سینما ہال، آزاد، شبستان، نشاط اور روپ محل کھل گئے۔اب فلم بنانے کی پلاننگ ہوئی تو آلات وغیرہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک کیمرا اور فلم رول کا انتظام ہوا۔''مکھ وموکھوش'' نامی بنگلہ فلم بنی جس کے ہدایت کار عبدالجبار خان تھے۔ پروسینگ، ڈبنگ وغیرہ کلکتہ میں ہوئی۔ تعصب کی بنا پر دانستہ اس فلم میں ڈبنگ، لپنگ کی بے شمار خامی چھوڑی گئی۔ کلکتہ کے اسٹوڈیو والوں نے ایسی ایڈیٹنگ کی کہ دیکھنے والے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔ اگلے شاٹ کا مکالمہ دوسرے شاٹ میں آتا لیکن 1959ء میں فتح لوہانی نے ''وکاش آرمائی'' بنائی جو ہٹ ہوئی۔ اردو فلموں کی شروعات 1959ء میں ''جاگو ہوا سویرا'' سے ہوئی مگر صحیح معنوں میں 1965ء میں ''آخری اسٹیشن'' سے ہوئی جو شبنم کی پہلی فلم تھی لیکن اس سے قبل ڈبل ورژن میں تلاش 1963ء، مالا 1965ء، سات رنگ 1965ء، آچکی تھی یہ گھر کی لاج 1966ء، ڈاک بابو 1966ء، روپ بان 1966ء، نواب سراج الدولہ 1963ء نے کامیابی حاصل کی چکوری، پیاسا، چندا، ناچ گھر، پریت نہ جانے ریت، سنگم، شادی، یہ بھی ایک کہانی ہے، بندھن، کارواں، ملن، مالن، کاجل، ساگر، بہانہ، کیسے کہوں، اجالا، پھر ملیں گے ہم دونوں، ایندھن، بے گانہ، پونم کی رات، بھیا، پروانہ، اس دھرتی پر، درشن، چھوٹے صاحب، ہمدم، انجھن، سوئے ندیا جاگے پانی، کھلونا، جگنو، تم میرے ہو، جنگلی پھول، گوری، قلی، جہاں باجے شہنائی، شہید تیتو میر، جینا بھی مشکل، داغ، اناڑی، کنگن، میرے ارمان میرے سپنے، مینا، چلو مان گئے، پائل، مہربان، جلتے سورج کے نیچے، پونم کی رات کے علاوہ بھی اردو فلمیں بنیں۔

ڈھاکا کی انڈسٹری کو ڈولی ووڈ بھی کہتے ہیں۔ ڈھاکا میں باصلاحیت ہدایت کاروں کی ایک ٹیم تھی، جو فلمیں بنا رہی اور لوگوں کی تفنن طبع کا سامان کر رہی تھی۔ ان میں عطا الرحمٰن خان، ظہیر ریحان، فتح لوہانی، سبھاش دتہ، احتشام، کاشی نذر السلام اور شیخ نعمت اللہ شامل تھے۔ ڈولی ووڈ انڈسٹری تو بہت قدیم ہے لیکن اتنی بڑی تاریخ بیان کرنے کے لیے یہ صفحات ناکافی ہیں، چنانچہ ہم وہاں سے واقعات بیان کرنا شروع کرتے ہیں جہاں سے انڈسٹری نے اردو میں فلمیں بنانے کی ابتدا کی۔ یعنی جب تک مشرقی پاکستان بنگلہ دیش نہیں بنا تھا۔

اس فلمی دنیا میں ترقی پسندوں نے قدم رکھا اور 1949ء میں ڈھاکا میں ''جاگو ہوا سویرا'' بنائی، جسے ماسکو کے فلمی میلے میں ایوارڈ دیا گیا۔ فلم کے کہانی نویس اور مکالمہ نگار فیض احمد فیض تھے۔ جنھوں نے اس کی کہانی ایک ناول سے ترجمہ کی تھی۔ جب کہ اس کے ہدایت کار اے۔ جے۔ کاردار تھے۔ فلم میں ہیرو کا کردار عطا الرحمٰن خان نے ادا کیا تھا جو بعد میں مشرقی پاکستان کے نامور ہدایت کار ثابت ہوئے۔ انہوں نے ''نواب سراج الدولہ'' اور ''سوئے ندیا جاگے پانی'' بنائیں۔ ایک اور اداکار زورین نے بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر اس فلم میں دکھائے ہیں۔ کچھ عرصے بعد اس نے فلم ''لاکھوں

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

میں ایک" میں بھی کام کیا تھا۔ "نواب سراج الدولہ" تاریخی فلم تھی۔ اس فلم کے ہر ایک فریم پر محنت کی گئی تھی۔ اداکاری، مکالمے اور اسکرپٹ ہر چیز جاندار تھی۔ فلم کامیاب رہی۔

ظہیر ریحان کی فلم "سنگم" پاکستان کی پہلی رنگین فلم تھی، جو 1964ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ جب کہ منشی دل کی فلم "عذرا" جزوی طور پر رنگین تھی۔ "سنگم" کامیاب رہی اور اس کا گانا "جو بڈھا مرگیا ہزار سال کا" مقبول ہوا۔ اس فلم کا ہیرو ہارون تھا۔

ظہیر ریحان نے اس کے علاوہ کوکہنو آشی اور جیبون تھیکے نیا بنائیں۔

رحمٰن کے علاوہ ڈھاکا میں اور بھی باصلاحیت فنکار تھے، جن میں روشن جمیل، انور حسین، غلام مصطفیٰ، عبد الرزاق، شبنم اور سمیتا دیوی کا بوری، شوچندا شامل ہیں۔

"مالا" پاکستان کی پہلی سنیما اسکوپ فلم تھی جو مشرقی پاکستان میں بنی تھی۔

اس کے علاوہ مشرقی پاکستان میں بننے والی اردو فلمیں یہ تھیں۔ ناچ گھر، پریت نہ جانے ریت، تنہا، شادی، بندھن، کارواں، کاجل، ساگر، آخری اسٹیشن، درشن، چھوٹے صاحب، سوئے ندیا جاگے پانی، شہید تیتو میر، جلتے سورج کے نیچے اور اناڑی۔

رحمٰن جب ایک حادثے میں اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہوگیا تھا تو اس نے "ملن" بنائی، جس میں دیبا نے معاوضے کے طور پر صرف ایک روپیا لیا تھا۔ "ملن" کا ہدایت کار وہ خود تھا۔ فلم کامیاب ہوئی۔ اس کے بعد رحمٰن نے "ایندھن" بنائی، مگر کامیاب نہ ہوا۔ وہ لاہور اور کراچی آتا جاتا رہا اور فلموں میں کام کرتا رہا۔ اس کی اگلی فلم درشن تھی، جو اس نے شبنم کے ساتھ بنائی۔ فلم کامیاب رہی۔ کنگن میں اس کے ساتھ سنگیتا تھی، مگر یہ فلم کامیاب نہ ہوسکی۔

وہ مغربی پاکستان میں "چندا" کے ذریعے متعارف ہوا تھا۔ اس کے بعد "تلاش" آئی اور وہ اسٹار بن گیا۔ وہ دھیمے لہجے میں مکالمے بولتا تھا اور اس کی

ملک ملک کے دلچسپ قوانین

☆ آرکنساس میں اگر کوئی عورت دوسری شادی کررہی ہے تو وہ سفید لباس نہیں خرید سکتی۔

☆ وکٹوریا (آسٹریلیا) میں آدھے دن کے بعد گلابی رنگ کی پینٹ پہننا قانونی جرم ہے اور اس پر جرمانہ ہوجاتا ہے۔

☆ کنیکٹی کٹ میں آئس کریم کون جیب میں رکھ کر چلنا منع ہے۔

☆ انٹرنیشنل فالس بٹی سولا میں اگر آپ اپنے کتے کو ساتھ لے گئے ہیں اور وہ کتا اگر اس بلی کے پیچھے پڑ گیا ہے جو اس سے بچنے کے لیے ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ گئی ہو تو آپ سزا کے مستحق ہیں۔ (اب کتوں کو کون سمجھائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ صرف ٹیلی فون کے کھمبے پر بلی چڑھ گئی ہو تو۔ وگرنہ کچھ بھی نہیں ہوگا)

☆ امریکا کی بہت سی ریاستوں میں دوسری شادی جرم ہے۔

☆ یونان میں پولیس کو اس آدمی کو گرفتار کرنے کا حق حاصل ہے جو ایڈز کا مریض ہے۔

☆ ویٹی کن اور فلپائن میں طلاق دینا قانوناً جرم ہے۔ پولیس شوہر کو گرفتار کرلیتی ہے۔

☆ سنگاپور میں چیونگ گم چبانا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس پر ایک ہزار ڈالر تک کا جرمانہ ہوجاتا ہے۔

☆ چین میں ابھی حال ہی میں ایک قانون پاس ہوا ہے کہ بیٹا یا بیٹی شادی کے بعد والدین سے الگ رہ رہا ہے تو اس پر لازم ہے کہ مہینے میں دو بار والدین کے پاس جایا کرے ورنہ وہ گرفتار کرلیا جائے گا۔

☆ آرکنساس میں بیوی کو مارنا جائز ہے لیکن مہینے میں صرف ایک بار مار سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ بار مارنے کی کوشش کی تو شوہر اندر ہوسکتا ہے۔

☆ ایری زونا میں ایک گھر میں دو سے زائد Vibrators لگانا جرم ہے اگر ایسا ہوا تو اسے سخت جرم سمجھا جاتا ہے۔

☆ ورجینیا میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بستر سے نیچے پھینک دے تو یہ بہت بڑا جرم ہوجاتا ہے۔

☆ ورماؤنٹ کا ایک دلچسپ قانون سن لیں۔ وہاں اگر بیوی خرابی کی وجہ سے دانت نکلوادے تو وہ شوہر کی تحریری اجازت کے بغیر نقلی دانت نہیں لگوا سکتی۔

☆ یوٹاہ میں کزن سے شادی کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ دونوں 65 سال سے زیادہ کے ہوچکے ہوں۔ اب بتائیں کہ ہے کوئی جواب اس قانون کا۔

مرسلہ: منیزہ یاسمین۔ رحیم یار خان

www.pakistanipoint.com

شخصیت میں دھیما پن تھا۔ اداکاری کرتا تو سب سے علیحدہ لگتا تھا۔ اس کا ایک خاص اسٹائل تھا۔

شور لکھنوی نے 1970ء میں چاند سورج بنائی جس میں ندیم کے ساتھ وحید مراد، روزینہ اور شبانہ تھے لیکن یہ فلم بھی کامیاب نہ ہوسکی۔

ندیم (نذیر بیگ) کراچی میں سکونت پذیر تھا اور اسے گلوکار بننے کا شوق تھا۔ ہدایت کار احتشام کی بیٹی پر فریفتہ تھا۔ مشرقی پاکستان چلا گیا۔ وہاں فلم ''چکوری'' کے ہیرو سے تنازعہ کی بنا پر ہدایت کار احتشام نے نذیر بیگ کو کیمرے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس کا فلمی نام ندیم رکھ دیا۔ فلم میں ہیروئن شبانہ تھی۔ اس کے علاوہ جلیل افغانی بھی تھا۔ ندیم کے چہرے کے چند زاویے دلیپ کمار سے مشابہ تھے۔ دوسرے فلم کی کہانی جاندار تھی۔ گانے اور موسیقی دل کو چھو لینے والی تھی، لہٰذا فلم نے کامیابی حاصل کر لی اور ندیم ہٹ ہوگیا۔ چند نرم گرم فلموں میں کام کرنے کے بعد اس نے شباب کیرانوی کی فلم ''سنگدل'' میں کام کیا۔ ''سنگدل'' اس نے مشرقی پاکستان میں رہتے ہوئے مکمل کی۔ جب شوٹنگ ہوتی تھی تو وہ طیارے میں بیٹھ کر لاہور آتا تھا اور طیارے کے ذریعے واپس ڈھاکا چلا جاتا تھا۔ یہ بات معاہدے میں شامل تھی کہ فلمساز یہ کرایہ ادا کرے گا۔ کچھ اور فلموں میں کام کرنے کے بعد ندیم لاہور آکر سیٹ ہوگیا۔ ابتدا میں ہدایت کاروں نے دلیپ کمار کے انداز میں پیش کیا، کرتہ، پائجامہ اور واسکٹ۔ اس کی فلمیں کامیاب ہونے لگیں۔ شبنم کے ساتھ اس کی جوڑی دوسری ہیروئنوں کی نسبت کامیاب رہی۔ دلیپ کمار کہاں تک چلتا، اس نے اپنا اسٹائل بنا لیا۔ بالوں کے بنانے میں بھی تبدیلی کر لی پھر اس نے اداکاروں کو پیچھے دھکیل دیا سرفہرست ہیرو بن گیا۔ ایک فلم میں گانا گا کر اپنا شوق بھی پورا کر لیا۔ اس میں ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے گلوکاری دھری رہ گئی۔

مشرقی پاکستان کی ایک فلم میں وحید مراد نے بھی کام کیا جس کا نام ''بھیا'' تھا، ہیروئن ہدایت کار قاضی

ظہیر کی بیوی چترا تھیں۔ فلم نے اوسط درجے کا بزنس کیا۔

☆......☆

کراچی میں ایسٹرن اسٹوڈیوز سعید ہارون کی نگرانی میں منگھوپیر روڈ پر قائم ہوا۔ وہاں وحید مراد، شمیم آرا، محمد علی، روزینہ، کمال ایرانی، زیبا، دیبا، نرالا اور دوسرے بڑے اور چھوٹے اداکار اور اداکاراؤں نے پہلی بار کام کیا مگر کراچی میں بنائی ہوئی فلمیں زیادہ کامیاب نہیں ہوتی تھیں۔ اس بنا پر اسٹوڈیو چل نہیں سکا۔ اس کے نہ چلنے کی وجہ سعید ہارون کا ڈسپلن بھی تھا۔ وہ لاہور کے اسٹوڈیوز کی طرح ایسٹرن اسٹوڈیوز میں کسی کو شراب پیتا یا غل غپاڑہ کرتے نہیں دیکھ پاتے تھے اس لیے کہ وہ شریف النفس تھے اور ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

فلم بن جانے کے بعد وہ اس کا فائنل پرنٹ اسٹوڈیو سے باہر نہیں لے جانے دیتے تھے، جب تک کہ اسٹوڈیو کے تمام واجبات نہ ادا کر دیے جائیں۔

اس کے علاوہ کراچی میں بننے والی فلموں کو لاہور کے تقسیم کار وہاں ریلیز کرنے کے لیے نہیں اٹھاتے تھے چنانچہ کراچی میں بننے والی فلمیں صرف سندھ سرکٹ میں چلا کرتی تھیں۔ ان پر لگائی ہوئی لاگت واپس نہیں آپاتی تھی۔

اسٹوڈیو میں بننے والی ناکام فلموں میں چراغ جلتا رہا، لاڈلا، عورت اور زمین، میخانہ، احسان، دوراہا، شرارت، مسٹر ایکس وغیرہ شامل ہیں۔ اسٹوڈیو میں گانوں کی ریکارڈنگ نہیں ہو پاتی تھی، چنانچہ اس کے لیے لاہور جانا پڑتا تھا۔ مثلاً ''ارمان'' اور ''دوراہا'' کے گانے لاہور میں ریکارڈ ہوئے۔

محمد علی کا تذکرہ کیے بغیر کراچی کی انڈسٹری کا تذکرہ ادھورا رہے گا۔ وہ شہنشاہ جذبات کہلاتا تھا۔ محمد علی کی پہلی فلم ''چراغ جلتا رہا'' تھی جو مارچ 1962ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے افتتاحی شو میں محترمہ فاطمہ جناح نے شرکت کی تھی۔ اسے دبستان محدود کے بینر تلے فضل احمد کریم فضلی نے بنایا تھا۔

Nadar Azeem
www.pakistanipoint.com

محمد علی اس سے پہلے ریڈیو پاکستان حیدر آباد میں کام کرتا تھا۔ وہاں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد وہ ریڈیو پاکستان کراچی آ گیا پھر اسے فلموں میں کام مل گیا۔ وہ وجیہہ، خوب صورت اور دراز قامت تھا۔ اس کا جسم ورزشی تھا۔ ”چراغ جلتا رہا“ کے بعد منور رشید کی فلم ”بہادر“ میں اسے ولین کا کردار دیا گیا۔ پھر کئی اور فلموں میں اسے ولین کا کردار دیا گیا، جن میں یوسف اقبال کی ”دال میں کالا“ جاوید ہاشمی کی ”دل نے تجھے مان لیا“ شامل ہیں۔ اس کی ہیرو کی حیثیت سے پہلی فلم ”مسٹر ایکس“ تھی، مگر ”شرارت“ پہلے ریلیز ہوئی۔ اس کے بعد وہ لاہور چلا گیا اور اس نے 1964ء میں ”خاندان“ میں کام کیا۔ 64ء ہی میں بننے والی فلم ”خاموش رہو“ میں اس نے اپنی آواز کا جادو جگایا اور انڈسٹری کو ایک نیا موڑ دیا۔ وہ گھن گرج کے ساتھ جذباتی مکالمے بولتا تھا۔

اس پر مہدی حسن کی آواز جچتی تھی، اس لیے بیشتر گانے مہدی حسن کی آواز میں فلمبند کیے گئے۔ ریکارڈ کے مطابق مہدی حسن نے 88 فلموں میں اس کے لیے 115 گانے گائے۔

زیبا کے ساتھ اس نے ”چراغ جلتا رہا“ میں کام کیا جس کے چار برس بعد انہوں نے ”تم ملے پیار ملا“ کی شوٹنگ کے دوران ستمبر 1966ء میں شادی کر لی۔ یہ شادی اس کی موت تک قائم رہی۔

اپنے فلمی کیریئر کے بیس برسوں کے دوران اسے 10 نگار ایوارڈوں سے نوازا گیا۔ اس کی مشہور فلموں میں آگ کا دریا، کنیز، خاموش رہو، صاعقہ، انسان اور آدمی، وحشی اور حیدر علی شامل ہیں۔

1984ء میں صدر جنرل ضیا نے اسے پرائڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔ اس کے بعد اسے تمغۂ امتیاز سے بھی نوازا گیا۔ اسے صدی کا بہترین اداکار بھی تسلیم کیا گیا۔

1965ء میں جب بھارت اور پاکستان میں جنگ چھڑی تھی تو پاکستان میں بھارتی فلموں پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

اسی زمانے میں سعید ہارون نے انگریزی میں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کہیں سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 750 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ایک فلم میگزین ''ایسٹرن فلم میگزین'' شائع کرنا شروع کیا، جو جزوی طور پر رنگین ہوتا تھا۔

وحید مراد نے فلم انڈسٹری میں 1966ء میں قدم رکھا۔ وہ تقسیم کار نثار مراد کا بیٹا تھا۔ اس کی بیوی سلمیٰ ایچ ایم سلک ملز کے مالک کی بیٹی تھی۔ ''ارمان'' سے پہلے وحید مختلف فلموں میں چھوٹے موٹے کردار ادا کر چکا تھا۔ لیکن ''ارمان'' کی کامیابی نے شہرت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ وہ نوجوانوں لڑکے اور لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا اور ''چاکلیٹ ہیرو'' کہلایا۔ وہ انگریزی میں ماسٹر تھا۔

''ارمان'' سے فلموں میں پاپ میوزک کی ابتدا ہوئی۔ جس کا سہرا بلاشبہ سہیل رانا اور احمد رشدی کے سر جاتا ہے۔ فلم ''ارمان'' نے 75 ہفتوں تک مسلسل چلنے پر پلاٹینم جوبلی منائی۔ اس کے ہدایت کار پرویز ملک تھے جنھوں نے زیبا کو بطور ہیروئن کاسٹ کیا تھا۔ ''ارمان'' کے بعد ان کی جوڑی قائم ہوگئی اور وحید نے زیادہ تر زیبا کے ساتھ کام کیا۔ وحید کی مشہور فلموں میں ہیرا اور پتھر، دل میرا دھڑکن تیری، عندلیب اور انجمن شامل ہیں۔ نوجوانوں میں اس کا ہیر اسٹائل بہت مقبول تھا، وہ اسی کی طرح بال بنانے کی کوشش کرتے تھے۔

وحید نے تقریباً 125 فلموں میں کام کیا۔ اسے مختلف ایوارڈوں سے نوازا گیا، جن کی تعداد 39 ہے۔ اس پر احمد رشدی کی آواز مناسب لگتی تھی، لہٰذا اس پر فلمائے گئے نغمات زیادہ تر احمد رشدی نے گائے ہیں۔ اس کی موت کے 27 برس بعد 2010ء میں صدر پاکستان آصف علی زرداری نے ستارۂ امتیاز سے نوازا۔ وحید نے 45 برس کی عمر میں بیماری سے انتقال کیا۔

پرویز ملک اور وحید مراد نے ایک ساتھ تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد منصوبہ بنایا کہ وہ امریکا جا کر فلم کی تربیت حاصل کریں گے لیکن وحید مراد چونکہ اپنے والد نثار مراد کی اکلوتی اولاد تھا اس لیے نثار مراد نے اجازت نہیں دی چنانچہ پرویز ملک اکیلے ہی لاس انجلس چلے گئے پھر وہ 63ء میں پاکستان واپس آئے۔ اس کے بعد انہوں نے 66ء میں ''ہیرا اور پتھر'' کی ہدایت کاری کی۔ فلم کامیاب رہی۔ ان کے حوصلے جوان ہوگئے اور انہوں نے فلم آرٹس کے تحت دوسری فلم ''ارمان'' بنائی جو پاکستان کی سپر ہٹ فلم ثابت ہوئی۔

وحید اور پرویز ملک کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو پرویز ملک لاہور چلے گئے۔ جہاں ملک صاحب نے ندیم اور محمد علی کو ہیرو لے کر فلمیں بنانا شروع کر دیں۔ وہ پڑھے لکھے اور سمجھ دار ہدایت کار تھے اس لیے ان کی فلمیں کامیاب ہوتی تھیں۔ ان کی بنائی ہوئی فلموں میں انمول، پہچان، تلاش، انتخاب اور قربانی شامل ہیں۔ انہوں نے 20 فلموں کی ہدایت کاری کی۔

انہیں صدر پاکستان نے 1992ء میں پرائیڈ آف پرفارمنس دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے دو نگار ایوارڈ بھی حاصل کیے۔

سعید رضوی کی فلم ''شانی'' سائنس فکشن تھی۔ اس میں اسپیشل افیکٹس دیے گئے تھے۔ اس فلم کو ماسکو، مصر اور کوریا میں ایوارڈوں سے نوازا گیا لیکن بد قسمتی سے یہ فلم پاکستان میں فلاپ ہوگئی۔

پاکستان کی فلم انڈسٹری 2000 تک زوال پذیر ہونا شروع ہوگئی تھی۔ چند قابل ذکر فلمیں بنیں جنھوں نے بزنس کیا۔ ان میں ہاتھی میرے ساتھی، چوڑیاں اور یہ دل آپ کا ہوا، خدا کے لیے اور بول شامل ہیں۔ اب اِکّا دُکّا فلمیں تو بن رہی ہیں لیکن انہیں ریلیز کرنے کے لیے سینما ہال دستیاب ہیں۔ کوئی جائے تو کہاں جائے؟ گھریلو اور سماجی فلمیں بننا بھی بند ہوگئی ہیں جنہیں شرفا سینما ہالوں میں بیٹھ کر فیملی کے ساتھ دیکھا کرتے تھے اس لیے یہ کاروبار تقریباً ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔

اس مضمون کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی فلموں کی دنیا کے 111 سال۔ (سجاد احمد سجاد)
مختلف مضامین اور انٹرنیٹ۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سفر پہلا پہلا

ندیم اقبال

احساسات، جذبات، فہم و فراست، حکمت و تدبر اور مشاہدے کو الفاظ کا پیرہن دینا۔ اندازِ بیان کے مختلف قرینوں، سلیقوں سے ناسٹلجیائی کیفیات اور عصری صورتِ حال کو اپنی اظہاری صلاحیت کے ذریعے قارئین کی نذر کرنا، اس طرح پیش کرنا کہ پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری اسیر رہے۔ یہ کمال ہے ندیم اقبال کا۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' اور ''شمشال سے ٹورنٹو'' کے بعد ان کا یہ تیسرا سفر نامہ جو جوانی کے ابتدائی ایام کا احوال ہے اور ایک نئے انداز سے لکھا گیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا۔

ایک نوجوان کے احساسات و جذبات میں گندھی سفر کہانی کا تیرہواں حصہ

لطیف چلا تو آیا مگر وہ منہ کھولے کھڑا مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ اصولی طور پر مجھے پہلے اسے بتانا چاہیے تھا کہ آ کر کیا بات کرنی ہے۔ جو ہوائیاں اس کے چہرے پر اڑ رہی تھیں اس سے مجھے لگا یہ کام خراب کر دے گا۔ مجھے ڈر ہوا کہیں سائیں کے خلاف کوئی الٹا سیدھا نہ بول دے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ لطیف میری خاطر اس کی والدہ اور سائیں کے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

درمیان رابطے کا کام کرے۔ مجھے اپنے آپ کو ان باتوں سے دور رکھنا تھا۔ اگر سائیں کا تاثر کسی طرح سے خراب ہو جاتا تو میں بھی بلیک لسٹ ہو جاتا۔

وہ لطیف سے بولیں "حضرت جی سے میری بات کروا دیں۔ کچھ گھریلو مسائل پر مشورہ کرنا ہے۔"

لطیف نے جواب دیا۔ "کون سا حضرت جی؟ میں تو کسی کو نہیں جانتا۔"

میری جانب اشارہ کر کے بولیں۔ "یہ تو کہہ رہا ہے تم ان کے خاص بندے ہو۔"

"خاص بندے......؟ آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟"

میں نے فوراً بتایا۔ "یہ پیر سائیں کی بات کر رہی ہیں۔"

لطیف بے ساختہ مسکرا پڑا۔ "وہ تو واقعی حضرت ہے۔"

"کیا مطلب واقعی حضرت ہیں؟" کنول کی والدہ نے پوچھا۔

لطیف سے تصحیح کی "ہم انہیں پیر سائیں کہہ کر بلاتے ہیں۔ واقعی ہمیں ان کو آئندہ سے حضرت جی کہنا چاہیے۔"

وہ کچھ لمحے غور و فکر کرتی رہیں۔ پھر بولیں "بیٹا۔ حضرت جی سے بات کروا دو گے؟"

"آنٹی۔ مناسب یہ ہے کہ ناران پہنچ کر بات کروں۔ یہاں بات کی تو برا مان جائیں گے۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں شغل کے لیے آیا ہوں کہ دم درود کرنے؟"

آنٹی نے حیرت سے پوچھا۔ "کون سا شغل؟"

لطیف نے بات کو سنبھالا۔ "وہ نہیں آ رہے تھے، مجھے کہا کہ کمرے میں بیٹھ کر کسی کے لیے وظیفہ مکمل کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ ہر وقت لوگوں کے بارے میں فکر رہتی ہے۔ کبھی آپ بھی ہمارے ساتھ شغل کر لیا کریں۔" پھر لطیف اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے بولا۔ "اسی شغل کی بات کر رہا تھا۔"

اس کی والدہ مطمئن ہو گئیں۔ سب کھڑے لطیف اور ان کی باتیں سن رہے تھے۔ میں نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم دوبارہ چلے اپنی منزل کی جانب ایک اور قدم بڑھا کر میں بہت خوشی محسوس کرنے لگا۔ میرا اس خاندان سے تعلق بڑھنے لگا تھا۔

میری قوت سماعت عقب میں تھی۔ جہاں کنول طاہرہ سے باتیں کرتی ہوئی آ رہی تھی۔ وہ طاہرہ کو بتا رہی تھی کہ … نے انٹر فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تو بابا ہمیں بطور … اس ٹرپ پر لائے ہیں پھر بولی۔ کومل سیکنڈ ایئر میں ہے … اطہر چھٹی کلاس میں ہے۔

کنول کی آواز سریلی تو تھی مگر اس کی باتوں میں … ساختگی بھی تھی۔ لہجہ قدرتی اور لفظ رواں تھے۔ ہر سوا… بھرپور اور ہر جواب مکمل تھا۔

پہاڑوں سے آتی برف ہمارے راستے میں ایک مو… تہہ کی صورت بچھی تھی۔ وہ برف کئی مقامات پر آئس یعنی … بن چکی تھی۔ اس پر چلنے سے گرنے کا خطرہ ہر دم رہتا تھا۔ برفیلا راستہ دراز ہو کر جھیل کے کنارے تک لیٹا ہوا تھا۔ ا… برف پر چلنے سے گھبرا رہا تھا۔ اس کے والدین فکر مند کھڑے تھے۔ ماں نے کچھ پڑھ کر پھونکا بھی مگر اس کا خوف کم … ہوا......

اس کا ہاتھ تھام کر میں نے کہا۔ "میرے ہمراہ چلو … نہیں گرو گے۔"

وہ ہاتھ جھٹک کر خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "نہیں۔ … پانی میں ڈوب جاؤں گا...... میں نے واپس جانا ہے۔"

میں نے طاہرہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بہن سے ابھی کہہ رہی تھی کہ اتنا بڑا ہو کر بھی … ہے۔"

"ایک نہیں ہزار بار کہے میں نے پھر بھی … جانا۔"

میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فلسفیانہ … میں بولا۔ "اطہر میری بات کو غور سے سننا۔ راستہ ایک ہوتا ہے مگر کسی کے لیے مشکل اور کسی کے لیے آسان ہوتا معلوم ہے کیوں؟"

"نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔"

"کیونکہ بہادر کو وہ راستہ آسان اور ڈرپوک کو راستہ مشکل لگتا ہے۔ نڈر آنکھیں بند کر کے گزر جاتا ہے … کمزور ساری عمر وہیں کھڑا سوچتا رہتا ہے۔ آج برف پر … کر ثابت کر دو کہ تم بہادر بچے ہو۔"

وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "امی سے پوچھ لیں … بہادر ہوں۔"

"تمہاری امی سے کیوں پوچھوں۔ تم چل کر بتاؤ۔" میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میرے بڑھے ہاتھ کی جانب دیکھ کر کہا۔ "

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

میں خود جاؤں گا۔"

پھر مزے سے چلتا ہوا وہ ٹکرا پار کر گیا۔

سب تالیاں بجاتے ہوئے پرتشکر نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے اور میں بے پرواہ سا بنا جھیل کے پانیوں کو دیکھنے لگا لیکن میرے کان وہیں لگے تھے۔

اس کی ماں لڑکیوں سے کہنے لگی۔"ایک چھوٹا بچہ گزر گیا مگر تم کھڑی ڈر رہی ہو۔"

میں نے مڑ کر دیکھا کہ کنول اب ثروت کے ہمراہ کھڑی میری جانب مدد طلب نظروں سے دیکھ رہی ہے...... جیسے کہہ رہی ہو کہ پار جاؤں گی تو تمہارے ساتھ ورنہ ساری زندگی یہیں کھڑی رہوں گی۔ میں نے ان کی نظروں میں لکھا پیغام پڑھا اور پیغام کو سمجھ کر ان کی جانب آیا۔ کہا۔"آپ لوگوں سے بہتر تو اطہر ہے جو میرا ہاتھ جھٹک کر اکیلا چلا گیا۔"

وہ آہستگی سے یوں بولی کہ اس کی ماں نہ سن لے۔

"آپ ہمارا ہاتھ پکڑیں تو سہی، کبھی نہیں جھٹکیں گے۔"

ثروت معنی خیز مسکراہٹ سجا کر میری جانب دیکھنے لگی۔ برف کے پار کھڑے سب ہمیں دیکھ رہے تھے۔

میں نے کہا۔"ہاتھ پکڑنا نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں......"

"ٹھیک ہے لیکن نہیں گرا نہ دینا......"

میں بولا۔"جب تک ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھو گی تو کبھی نہیں گرنے دوں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے ہاتھ بڑھایا اور اس نے مضبوطی سے تھام لیا۔ ایسا لگا تازہ دھنی روئی کی پہل میرے ہاتھ میں دے دی ہے۔ اس کے نرم ہاتھ نے میرے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔ اس لمس نے عجیب سی سرشاری طاری کردی۔ میری ہتھیلیاں بھیگ گئیں۔ دوسرے ہاتھ میں ثروت کا ہاتھ تھا۔ میں دونوں کو لے کر چلا اور پل جھپکتے وہ راستہ طے ہو گیا۔ وہ اب سامنے سب کے ہمراہ کھڑی ہنس رہی تھی مگر محسوس ہو رہا تھا ابھی تک میرا ہاتھ تھامے کھڑی ہے۔ اس کے لمس کی مہک میرے ہاتھ سے اٹھ کر میرے دل میں سما گئی۔

اس کی ماں اپنے شوہر کو بتا رہی تھیں۔"نئی سہیلیاں بنی ہیں تو میری بچی کے چہرے پر رونق بھی آگئی ہے۔ کتنی اداس اداس پھر رہی تھی......" یہ کہا اور کچھ پڑھ کر کنول پر پھونک دیا۔

والد بولے۔"کبھی کبھار سفر میں بچے ایک ہی قسم کے چہرے دیکھ دیکھ کر اکتا جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے جب راستے میں نئے دوست بنتے ہیں تو اسی طرح سے وہ خوش نظر آنے لگتے ہیں۔"

اس کے والد نے کتنی خوبصورت بات کی تھی کہ سفر آسان اور خوشگوار ہو جاتے ہیں جب کوئی دوست آملتا ہے۔ یہ بچے بڑے بن کر اپنی الگ راہیں سوچنے لگتے ہیں۔ ان کے موسم سہانے اور دن رات مہکنے لگتے ہیں۔ زمین و آسمان بدل جاتے ہیں۔ یہ نئے دوست کئی طرح کے نئے خواب لے آتے ہیں۔ یہ خواب انہیں کھلے آسمانوں پر اڑائے پھرتے ہیں۔ وہ دوستوں کے ساتھ کبھی بادلوں میں جاتے ہیں اور کبھی چاند کی طرف لپکتے ہیں۔ کبھی جھیلوں پر پرواز کرتے ہیں تو کبھی برف پوش پہاڑی چوٹیوں کو سر کر جاتے ہیں۔ وہ مل کر دلوں کا شہر آباد کرتے ہیں اور روح کی ظلمتیں دور کرتے ہیں۔ یہ دوست نہیں ہوتے بلکہ کسی گرم دوپہر میں ایک ٹھنڈی پھوار کی طرح برستے بادل ہوتے ہیں۔

☆☆☆

اس کے والد ہم سے مستقبل کی پلاننگ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میرا ارادہ کراچی شفٹ ہونے کا تھا۔ لطیف سے پوچھا تو اس نے اپنا کراچی شفٹ ہونے کا بتایا۔ جب مجھ سے پوچھا تو میں کھوئی نظروں سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ معلوم نہیں کیا سمجھے کہ مجھے نصیحتیں کرنے لگے......

"مستقبل کے اہداف ذہن میں ہمیشہ کلیر رکھو۔ یہ نہیں کہ کوئی پوچھے تو کنفیوز نظر آنے لگو۔"

میں شرمندگی سے سر کھجانے لگا۔ میری حالت دیکھ کر لطیف نے اپنے تئیں میری تعریف کی۔"اسے تو پڑھائی کے علاوہ کسی چیز کی فکر بھی نہیں ہوتی۔ اتنا مصروف ہوتا ہے کہ آگے کا بہت کم سوچتا ہے۔"

"میاں۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ اس پڑھائی کا کیا فائدہ جس میں مستقبل کا تعین نہ ہو۔ میں سمجھا تھا کہ تم نے اپنی ترجیحات طے کرلی ہوں گی۔ لڑکے تو مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں اور تم نے صرف کتابوں میں سر کھپایا ہوا ہے؟"

میں نے فوری طور پر اپنا بگڑتا تاثر ٹھیک کرنے کا سوچا اور نیچی آواز میں بولا۔

"سر پڑھائی کی مصروفیت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کچھ اور سوچنے کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ ویسے ارادہ امریکا جاکر سیٹل ہونے کا ہے۔"

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

سن کر وہ کریدتی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ لگتا تھا وہ مجھے پڑھاکو اور اساتذہ کے آگے پیچھے بھاگنے والا کوئی لڑکا سمجھتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ جب کلاس میں ٹیچر حاضری لگاتا ہے تو ہمارا نام آتے ہی چونک کر دیکھنے لگتا ہے۔ فرماتا ہے کہ ماشاءاللہ آپ بھی تشریف رکھتے ہیں۔ اس کے والد کو کیا بتاتا کہ ہم تو ہر کلاس کے غازی رہے ہیں۔ بچپن سے کلاس سے بیزاری کی پڑی عادت کو بھی نہ بدلا۔ دوسروں کے علاوہ میں نے بھی خود کو کئی بار سمجھانے کی کوشش کی کہ مستقبل کا بھی سوچو مگر دل نے ہر بار یہی کہا کہ سوچنے سے کبھی کسی کا مستقبل بنا ہے۔ یہ سوچنا وغیرہ بے کار چیزیں ہیں۔ جس نے پیدا کیا اس نے کچھ سوچ کر ہی پیدا کیا ہوگا اور میں کیوں سوچوں کہ اس نے کیا سوچا تھا جب مجھے پیدا کیا۔

وہ کہے جارہے تھے ”مکمل کامیابی کے لیے پڑھائی کے علاوہ دوسرے میدانوں میں بھی آگے آگے رہنا چاہیے۔“

وہ کچھ دیر اور بھی مجھے سمجھاتے رہے اور میں سر جھکائے سر ہلاتا رہا۔ آخر میں بولے۔ ”ارد گرد دیکھو کیا ہورہا ہے؟“

میں گھبرا کر ارد گرد جانب دیکھنے لگا۔ اسی بہانے پیچھے مڑ کر آتی کنول کو بھی دیکھ لیا اور حیرت سے بولا۔ ”سر یہاں تو کچھ نہیں ہورہا۔“

یہ سن کر میری سادگی پر اس کے ماں باپ دل کھول کر ہنسے۔ ”میاں۔ میں پوچھ رہا تھا کہ دنیا میں کیا ہورہا ہے۔ خطے میں کیا کیا تبدیلیاں آرہی ہیں۔ سیاسی، سماجی اور مذہبی تصورات کس طرح تیزی سے بدل رہے ہیں۔“ پھر مسکرا کر مجھے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ میری بات سمجھ رہے ہو ناں......؟

میں نے سر دوبارہ جھکا لیا اور ادب سے کہا۔ ”سر زیادہ تو نہیں۔ بس تھوڑا بہت جانتا ہوں......“

چیلنج کرنے والے انداز میں بولے۔ ”مجھے بتاؤ کیا جانتے ہو؟ دیکھو شرماؤ نہیں۔ بات سر جھکا کر نہیں بلکہ سر اٹھا کر کیا کرو۔“

”اس طرح سے؟“ میں نے اپنی تھکی گردن اٹھا کر کہا۔

”ہاں بالکل اسی طرح سے......شاباش۔“

میں نے ایک نظر ساتھ آتے لطیف پر ڈالی اور انہیں بتانے لگا۔ ”پچھلی ایک دہائی میں جو چند سیاسی فیصلے ہمارے ملک میں ہوئے ہیں ان کے بڑے دوررس نتائج ہوں گے۔ ایک فیصلہ صنعتوں اور تعلیمی اداروں کو قومیائے جانے کا اور دوسرا ڈاکٹر قدیر خان کو بلجیم سے پاکستان واپس لانے کا ہے۔ پہلے فیصلے سے ہماری صنعتی ترقی جو پورے ریجن میں سب سے زیادہ تھی، وہ رک گئی۔ رکی نہیں بلکہ ترقی معکوس کا عمل شروع ہوگیا۔ اس فیصلے کے وہ منفی اثرات ابھرے کہ ہمارا ملک دہائیوں تک اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ تعلیمی اداروں میں اسٹوڈنٹس یونین کے نام پر مار دھاڑ شروع ہوگئی ہے۔ پولیس مقابلے سے زیادہ تعلیمی اداروں میں قتل ہورہے ہیں۔ تعلیم کا لیول گر رہا ہے اور غنڈہ گردی بڑھ رہی ہے۔ دوسری جانب ڈاکٹر قدیر کو پاکستان لا کر ایک بڑا احسان اس قوم پر کیا گیا۔ 1974 میں انڈیا نے جو ایٹمی دھماکے کر کے اپنی برتری قائم کر لی تھی، اس میں دراڑ ضرور پڑے گی۔ جب بھی ہم نے ایٹم بم بنایا تو ہماری دفاعی صلاحیت انڈیا کے برابر ہو جائے گی۔ اس کے بعد وہ ہمیں ہڑپ کرنے کے خواب کیا دیکھے گا، اسے تو یہ خواب دیکھنے کے لیے نیند بھی نہیں آئے گی۔“

اب وہ مجھے حیرت سے دیکھے جارہے تھے۔ مجھے روک کر کہا۔ ”میاں......تمہیں تو بہت زیادہ معلومات ہیں۔ بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ مجھے حیرت ہے حیرت......کیا ارشاد احمد حقانی کے کالم پڑھتے ہو؟“

”سر کالم پڑھنے کی فرصت کہاں ملتی ہے۔ کبھی کبھار سرسری نظر ڈال لیتا ہوں۔“

وہ بولے۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ ہندوستان میں کیا ہورہا ہے؟“

”شعلے اچھی گئی تھی مگر قربانی پٹ گئی ہے۔ فیروز خان نے نازیہ حسن کا گانا بھی ڈالا مگر فلم نہیں چلی۔ ستے پہ ستہ بھی ٹھیک ہے مگر پریم روگ مجھے زیادہ اچھی لگی۔ نمک حلال میں کامیڈی بڑی مزے کی ہے اور بے تاب کے گانے بہت اچھے ہیں۔“

میں ان کو اور بھی بہت کچھ بتانے والا تھا مگر میاں بیوی کو بے تحاشہ ہنستے دیکھ کر خاموش ہوگیا۔

ہنستے ہنستے پوچھا۔ ”صاحبزادے کو فلموں کے علاوہ شاعری سے بھی دلچسپی ہے؟“

بتایا ”کبھی کبھی پڑھ لیتا ہوں۔ فرصت کہاں ملتی ہے......؟“

”ویسے کس کو پڑھا ہے......“

”ابھی تو صرف فیض، احمد فراز، محسن نقوی، قتیل

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

شفائی، ساحر لدھیانوی کے علاوہ پروین شاکر اور امجد اسلام امجد کو پڑھا ہے۔ اقبال کا کلام تو اسکول میں ہی سارا پڑھ لیا تھا...... وہی میرے پسندیدہ شاعر بھی ہیں۔‘‘

وہ بہت مرعوب ہوئے۔ پوچھا۔ اقبال کا کون سا شعر زیادہ پسند ہے؟

میں بھی انتظار میں کھڑا تھا۔

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

(یہ شعر مجھ پر پورا بھی اترتا تھا)

’’بہت اعلیٰ۔ بہت اعلیٰ...... اچھا یہ بھی بتا دو کہ ملک سے باہر سیاست میں کیا ہو رہا ہے؟‘‘

’’سر۔ روس نے دریائے آمو کو عبور کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ افغانستان میں اسے سخت مزاحمت کا سامنا ہے۔ افغانستان کی ’’پرچمی‘‘ اور ’’خلق‘‘ پارٹی میں اتنی جان نہ تھی کہ وہ روسیوں کے شانہ بشانہ مجاہدین سے لڑ سکیں۔ جس طرح امریکا ویت نام کی دلدلوں میں پھنسا، اسی طرح روس افغانستان کی سنگلاخ چٹانوں میں پھنس چکا ہے۔ امریکا تو شکست مان کر ویت نام سے نکلا تھا اور روس کا انجام بھی یہی ہوگا۔ انگریز اپنے پیچھے ڈیونڈر لائن کے علاوہ کشمیر کا تنازعہ بھی چھوڑ گئے ہیں۔ دوسری جانب ایران میں اسلامی انقلاب آچکا ہے۔ اس انقلاب نے علاقے میں اپنے اثرات پھیلانا شروع کر دیے ہیں۔ ادھر مصر میں اخوان المسلمین زور پکڑ رہے ہیں۔ الجیریا میں اسلام پسند اوپر آ رہے ہیں۔ ایک لہر نے اسلامی دنیا کو لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اس لہر کی موجودگی میں پاکستان ایٹم بم بنا رہا ہے۔ مغرب کبھی نہیں چاہے گا کہ پاکستان ایٹمی طاقت بنے مگر ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا۔ افغانستان میں اگر روس شکست کھاتا ہے تو اس کا اثر کشمیر میں پڑے گا۔ وہاں بھی آزادی کی ایک جنگ شروع ہو جائے گی۔ اقبال کا شاہین اس دور کا نوجوان ہے جو سینے پر کلمہ سجائے کھڑا ہے۔ اسلام کو قومیت اور لسانی حصوں بخروں میں بانٹنے والے نیشنلسٹ اور نام نہاد لبرل اپنی مکمل شکست کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ وہ اپنی بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ یہی غدار آج روس کی حمایت کر رہے ہیں اور کل امریکا کے پاؤں چاٹ رہے ہوں گے۔ مسلمانوں کو شکست اوروں نے نہیں ہمیشہ اپنوں نے دی، ہر مخلص لیڈر کے آگے مشکلات کھڑی کیں۔ مگر یہی قوم ان غداروں سے بھی نمٹ لے گی۔ سر! آپ دیکھنا مستقبل ہمارا ہوگا۔‘‘

یہ تقریر کرنے کے بعد میں نے ارمغان حجاز، بانگ درا، ضرب کلیم اور شکوہ جواب شکوہ سے علامہ اقبال کے کچھ اشعار سنائے پھر چور نظروں سے ان کی جانب دیکھ کر چپ ہو گیا۔ وہ میاں بیوی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

اس کے والد نے کہا ’’اخبار پڑھے بغیر یہ باتیں کہاں معلوم ہوتی ہیں۔ کون سا اخبار پڑھتے ہو؟‘‘

’’سرسری نظر ڈال لی تو ڈال لی۔ اپنی پڑھائی کے علاوہ تفسیر کے مطالعہ کے بعد ٹائم کہاں ملتا ہے؟‘‘

’’اچھا......؟ ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ تفسیر بھی پڑھ رہے ہو؟‘‘

میں نے نہایت ہی عاجزی سے کہا۔ ’’جی سر۔ پہلے مصر کے مفکر حسین ہیکل کی سیرت نبی Life of Muhammad کو پڑھا تاکہ وہ پس منظر سمجھ سکوں جس میں نبی پاک کو نبوت ملی۔ حجاز کی تہذیب کیا تھی اور تمدن کیا تھا اسے جاننے کی کوشش کی۔ جس قوم پر قرآن کا نزول ہوا تھا وہ اس وقت کس طرح کی سوچ رکھتے تھے۔ قرآن نے کس طرح سے انہیں بیدار کیا‘ پھر رومی اور اقبال کے مقالے پڑھے کہ ان کی نظر میں مومن کا کیا تصور ہے‘ پھر تقابلی جائزے کے بعد مولانا اصلاحی کی ’’تدبر قرآن‘‘ کا مطالعہ شروع کیا، جواب بھی جاری ہے۔‘‘

وہ میاں بیوی چلتے چلتے رک گئے۔ وہ میری ذہانت اور قابلیت سے بہت متاثر نظر آنے کے بعد مجھے رشک بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اتنے میں پیچھے چلتے لوگ قریب آ کر رک گئے۔ دوسری جانب اقبال کا شاہین پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر پرواز کرتا نیچے کنول کو بھی ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔ لطیف مسکرائے چلا جا رہا تھا۔

’’اور کیا کیا پڑھا ہے صاحبزادے؟‘‘

سوال سن کر میں گردونواح سے حوصلہ لے کر گویا ہوا ’’اقبال کے فلسفہ خودی کو بار بار پڑھا اور پھر اسے سمجھنے کے بعد اسلامی اور ہندوستانی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا۔ تبھی جا کر قائد کے نکات کو جان سکا۔‘‘

’’تو کیا جانا......؟‘‘ وہ غور سے کان لگائے کھڑے تھے۔

’’قائد بہت زیرک لیڈر تھے۔ وہ کانگریسی رہنماؤں کی سازش جان چکے تھے۔ لہٰذا وہ سخت مخالفت کے باوجود

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

پاکستان کے مطالبے پر چٹان کی طرح ڈٹ گئے۔ جاتے جاتے اپنی جان دے دی مگر برصغیر کے مسلمانوں کو ہمیشہ کی غلامی سے نجات دلا دی اسی لیے وہ مسلمان جو بھارت میں رہ گئے وہ بھی پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ ایک مسلم ریاست خطے کے سارے مسلمانوں کی اُمید اور بقا ہے۔''

میں اگلے کسی سوال کا انتظار کر رہا تھا مگر وہاں ایک سکوت طاری تھا۔ کئی ستائشی نظریں میری جانب اٹھی تھیں۔

اس کی ماں نے اپنے بیٹے اطہر کو قریب بلا کر ڈانٹا..... ''دیکھا بھائی کو؟''

وہ مجھے بغور دیکھنے لگا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا پ ''کئی بار دیکھا ہے۔''

مجھے خوف ہوا کہیں گنوانے نہ لگ جائے کہ کہاں کہاں دیکھا تھا... اور پھر یہ نہ بتا دے کہ کنول نے میرے لیے شملہ پہاڑی پر اس کے ہاتھ پکوڑے بھی بھیجے تھے۔ میرا خوف بجا تھا مگر اس سے پہلے ماں بیٹے پر بگڑ چکی تھیں۔

''بات کیا پوچھتی ہوں اور جواب کوئی اور ملتا ہے۔''

یہ کہہ کر اپنے شوہر کو ایک نظر دیکھا اور پھر گویا ہوئیں ''کچھ اور لوگوں کی طرح تم بھی میری نہ سننا۔ بتا یہ رہی ہوں کہ یہ لڑکا پڑھائی کے علاوہ بھی ہر میدان میں فرسٹ ہے۔ کھیل کود میں ٹائم نہیں گزارتا۔ نیلام گھر جائے تو طارق عزیز بغیر کوئی سوال پوچھے کار نہیں تو موٹر سائیکل اس کو ضرور دے دے گا..... اور بڑوں کا ادب دیکھو، نظریں تک نہیں اٹھا رہا۔''

اطہر بڑی معصومیت سے بولا۔ ''مگر نتھیا گلی میں تو مجھے یہ سمجھا رہی تھیں کہ ان کی طرح لوفر اور آوارہ نہیں بنتا کہ آدھی رات کو سڑک پر گھوم رہے ہیں۔''

یہ سن کر ایک کالا سایہ سا ان کے چہرے پر لہرایا مگر جلد ہی انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔ ''نکال ماں میں کیڑے..... نکال۔'' دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنے شوہر کو دیکھا..... اور خود کلامی کے انداز میں بولیں ''چھوٹے بڑوں ہی کی نقل کیا کریں گے ناں۔'' اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ''اسے تو ہر وقت صرف کرکٹ اور پتنگ بازی کا شوق ہے۔ کہتا ہے مجھے فاسٹ بولر بننا ہے۔ تو ہی اسے سمجھا۔''

اسی دوران میں نے اطہر کو کندھے سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا۔

اس کی والدہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''بیٹا یہ کچھ دن ہیں۔ اسے اپنے ساتھ ساتھ رکھو۔ کیا پتا تم سے کچھ سیکھ لے.....''

میں نے کہا۔ ''آنٹی۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ ایسا سمجھیں یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔''

''اور بیٹا اسے یہ بھی سمجھاؤ کہ پڑھائی کے علاوہ مولوی صاحب سے قران بھی باقاعدگی سے پڑھے۔ بہنوں سے لڑائی نہ کرے اور تمہاری طرح سب کے ساتھ تمیز سے بات کیا کرے..... یہ کل کا ٹڈا ہر بات پر مجھے دلیل دینے لگتا ہے۔''

کنول ہماری باتیں سن کر مسکرا رہی تھی۔ میں نے اس کی والدہ سے کہا۔ ''آنٹی کیا معلوم نہیں ہی اسے تنگ کرتی ہوں.....''

وہ ذرا سا بگڑ گئیں۔ ''جانتی ہوں تم بہت عقل مند ہو۔ چیزوں کا علم بھی ہے لیکن یہ نہیں سیکھا کہ بڑوں کو کبھی چھوٹوں کے سامنے جھوٹا نہیں کرتے۔ مانتی ہوں بہنیں اسے تنگ کرتی ہوں گی مگر یہ بات اکیلے میں بھی تم کر سکتے تھے؟''

میں شرمندہ ہو کر بولا۔ ''ابھی آپ کی چھوٹی بیٹی میرا منہ چڑا رہی تھی۔ ایسے ہی سوچا کہ اطہر کو بھی تنگ کرتی ہوگی۔''

کنول نے سنا تو کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔ ''استغفراللہ استغفراللہ۔ میں نے کب چڑایا؟ کھڑے کھڑے مجھ پر بات ڈال دی۔''

کنول بولی۔ ''یہ کمینی ہے ہی ایسی۔ کر کے مکر جاتی ہے۔ اس نے تو میں نپٹ لوں گی۔ تم بس اطہر کی تربیت کر دو۔''

میں پہلے تو اس کی والدہ کے بے ساختہ جملوں پر حیران تھا مگر بعد میں مزے لینے لگا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ایک تو ان کی گھر پر حکمرانی ہے اور دوسرا یہ کہ اپنی رائے کھلے دل اور بلا کسی جھجک کے دیتی ہیں۔

میں نے ان سے کہا۔ ''آنٹی میری ایک درخواست ہے کہ آپ میرے لیے دعا کیا کریں کہ اللہ خاتمہ ایمان پر کرے، اور اللہ مجھے مرنے سے پہلے اپنا گھر ایک بار ضرور دکھا دے۔'' یہ بول کر میں اپنا چہرہ افسردہ بنا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ حیرت کے مارے اپنی انگلی ناک پر رکھ کر بولیں۔ ''ہائے ہائے۔ یہ بوڑھوں والی دعائیں بچے اپنے لیے کہاں مانگتے ہیں؟ تو تو لڑکا ہے، یہ مانگ کہ اللہ میرا پرچہ چنگا کر دے۔'' یہ کہہ کر میری ''سادگی'' پر تادیر ہنستی رہیں۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

☆☆☆

طاہرہ اور ثروت نے مل کر جو زمین میرے لیے تیار کی تھی، اس پر میں نے اپنے کردار اور سیرت کے نہایت ہی رنگ دار اور خوشنما پھول لگا دیے۔ گو ان پھولوں میں خوشبو بھلے نہ تھی مگر نظروں کو تو خوبصورت لگ رہے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ میں خود بھی اپنی کارکردگی پر خاصا مطمئن تھا۔

لطیف ان کے والدین کو سائیں کی کرامات بتاتے بتاتے آگے نکل گیا۔ سائیں کی فتنے داری میں نے لطیف کو دی تو میری جان خلاصی ہوگئی تھی۔ اس کی والدہ نے لطیف کو پکڑ رکھا تھا۔

ادھر میں اطہر کو زندگی کی رمزیں سمجھاتے سمجھاتے پیچھے رہ گیا۔ کنول بھی آہستہ ہو کر میرے برابر چلنے لگی۔ درمیان میں ثروت، طاہرہ اور کومل ایک مخصوص فاصلہ رکھے ہم سے آگے آگے چل رہی تھیں۔ اطہر پتھروں کو پھلانگتا رکتا چلتا کبھی آگے اور کبھی پیچھے رہ جاتا۔

میرے سپنے حقیقت بن کر مجھ سے آملے۔ سوچا بھی نہ تھا کہ وہ میرے قدم سے قدم ملائے اس طرح سے میرے ساتھ ساتھ چلے گی۔ اس کی موجودگی کبھی سچ اور کبھی خواب لگتی۔ ہم دونوں خاموش مگر کچھ کہنے کے لیے بے تاب تھے۔ میں اُس کی جانب دیکھتا تو مسکرانے لگتی۔ اس سے نظریں ہٹاتا تو کہیں کھو سی جاتی۔ دوبارہ اسے دیکھتا تو کھوئی کھوئی سی لڑکی اچانک جاگ پڑتی۔ ہم محبت محبت کا کھیل کھیل رہے تھے۔ اس کھیل کو یا وہ جانتی تھی یا میں جانتا تھا۔ دوسروں کی نظروں میں ہم دونوں چپ تھے مگر کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہم دریا کی وہ بہتی موجیں ہیں جو ساتھ ساتھ ہنستی کھیلتی چلی جا رہی ہوتی ہیں۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اتنے میں دریا کی لہر کی مانند وہ آئی اور مجھے قریب سے چھو کر دور نکل گئی۔ دور تو وہ چلی گئی مگر اپنے کندھے کا لمس میرے بازو پر چھوڑ گئی تھی۔ اس کی جانب دیکھا تو اپنا چہرہ اس نے جھیل کی جانب پھیر لیا۔ مسکرا کر دیکھتا تو ماتھے پر شکنیں سجا لیتی۔ قریب ہونے لگتا تو دور نکل جاتی۔ کچھ کہنے لگتا تو انجان بن جاتی۔

میں نے بات کرنے میں دیر کی تھی اور وہ ناراض ہو گئی۔ مجھے باور کرا رہی تھی جب کچھ کہنے کا لمحہ آئے تو کہہ دیا کرتے ہیں۔ دل کی آگ دبانے سے نہیں بلکہ بھڑکانے پر ٹھنڈی ہوتی ہے۔ ان کہی باتیں کہنے پر اپنا اثر چھوڑتی ہیں۔

ذرا قریب ہو کر اس سے پوچھا۔ ”یہ اچانک خفا کیوں ہو گئی ہو؟“

”کیوں خفا نہ ہوں۔ سب کے سامنے فر فر بول رہے تھے۔ جب میرے سامنے آئے تو چپ لگ گئی؟“

”تم سے بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔“

مسکرا کر بولی۔ ”تاکہ مجھے امپریس کر سکیں؟“

”اپنا پہلا تاثر تو اچھا بٹھانا چاہیے۔“

”مجھے بابا یا امی کی طرح مت سمجھیں کہ آپ کے لفظوں سے متاثر ہو جاؤں گی۔“

”تھوڑی سی تو تعریف کر لو۔ تمہارے لیے کتنی مشکل اداکاری کی ہے۔“

”جی نہیں۔ جھوٹی تعریف کبھی نہیں کروں گی۔ نہ آج اور نہ بعد میں۔“

”تمہارے لیے کچھ بھی کر لوں تب بھی تعریف نہیں کرو گی؟“

”بالکل نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔“ اس نے اپنی خوبصورت مسکراہٹ کو لبوں پر سجا رکھا تھا۔

”اتنی زیادہ مجھ سے ناراض ہو؟“

”اس سے بھی زیادہ۔“

”ناراض ہو کر تم پہلے سے زیادہ اچھی لگتی ہو۔“

”مطلب کہ آپ چاہتے ہیں میں ہر وقت آپ سے ناراض رہا کروں؟“

”ہر وقت نہیں بلکہ کبھی کبھار اور وہ بھی ذرا دیر کے لیے۔“

”ذرا دیر کے لیے کیوں؟“

”تمہارا ذرا سا روٹھنا تم کو زیادہ خوبصورت بنا دیتا ہے مگر تمہارا زیادہ روٹھنا مجھے پسند نہیں......“

وہ بے ساختہ مسکرا دی، بولی۔ ”میں تو زیادہ ہی روٹھ جایا کروں گی......“

میں قریب آیا اور اسے بازو سے پکڑ لیا۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ”یہ کیا کر رہے ہیں؟“

”روٹھ جانے کی دھمکی دی تو سب کے سامنے اسی طرح سے ہاتھ پکڑ لوں گا۔“

”چھوڑیں کوئی دیکھ لے گا۔“

”کیا دیکھ لے گا؟“

اس کے لہجے میں درخواست تھی۔ ”پلیز......“

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''کہو..... کبھی مجھ سے خفا نہیں ہوگی؟''

''نہیں ہوں گی، مگر میرا بازو تو چھوڑ دیں۔''

''میں قریب آؤں گا تو دور بھی نہیں جاؤ گی؟''

''نہیں جاؤں گی۔''

''دوبارہ بولو۔''

''نہیں جاؤں گی مگر بازو تو چھوڑیں۔ قسم سے درد ہو رہا ہے۔''

''میں نے بازو چھوڑا تو وہ اسے سہلانے لگی۔ بازو سہلاتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اب لبوں کی مسکراہٹ آنکھوں سے بھی جھانکنے لگی تھی۔ میں نے دھمکی خیز لہجے میں کہا۔ آیندہ مجھ سے ذرا سا بھی دور ہوئی تو۔''

''تو کیا کرلیں گے؟''

''یہ تو وقت آنے پر بتاؤں گا۔''

''زیادہ دھمکیاں نہ دیں۔ کل اپنا چہرہ دیکھا جب میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔''

میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو اور بات تھی۔''

''اور میں بھی پریشان ہوگئی کہ یہ کیا اندر اشارہ کرکے کہہ رہے ہیں کہ ان کو کب سے جانتی ہو۔ میں حیران تھی یہ کیا پوچھ رہے ہو کہ ماں باپ کو کب سے جانتی ہوں۔''

''بندہ بھول بھی جاتا ہے۔ میں سمجھا تھا کہ یہ کمرا طاہرہ کا ہے۔''

چلتے چلتے بولی۔ ''جب میں نے کومل کو یہ سب بتایا تو ہم دونوں بہت ہنسے تھے۔''

''تو ہر بات اپنی بہن کو بتاتی ہو؟''

''جی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپاتے..... اسی نے مجھے بتایا کہ آپ بھی آج جھیل پر جا رہے ہو.....''

''پھر تو خوش ہوگئی ہوگی؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' یہ کہہ کر مسکرادی۔

تعریفی انداز میں اس سے کہا۔ ''تمہاری آواز کتنی خوبصورت ہے۔ دل کرتا ہے تم بولتی رہو اور میں سنتا رہوں۔''

''لگتا ہے جھوٹی تعریف کر رہے ہیں۔''

''نہیں سچ کہہ رہا ہوں۔ جس طرح بانسری کی لے متوجہ کرتی ہے اسی طرح تمہاری آواز میرا دل موہ لیتی ہے۔''

''اب تو لگتا ہے مذاق بھی اڑانے لگے ہو؟''

''معلوم ہے جب تم بولتی ہو تو کچھ لفظ گلے سے اور کچھ ناک سے نکلتے ہیں۔ اکثر تو ایسا لگتا ہے آنکھیں ساری باتیں بتا رہی ہیں۔ تمہارا بات کرنے کا ہر انداز خوبصورت ہے۔''

وہ مسکرادی۔ ''مجھے اپنی تعریف ہمیشہ مصنوعی لگتی ہے مگر آپ ضرور کیا کریں۔ معلوم نہیں کیوں اتنا اچھا لگ رہا ہے۔''

''کیونکہ تم جانتی ہو میں تم سے پیار کرتا ہوں۔''

''میں کیسے جان سکتی ہوں جب آپ نے ابھی تک کچھ کہا بھی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''محبت کرنے والوں کو کیا یہ ضرورت پڑتی ہے کہ بار بار زبان سے محبت کا اظہار کریں؟ محبت کا اظہار تو آنکھیں ہر وقت کرتی رہتی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''محبت تو محبت کا اظہار ہے..... کبھی آنکھوں سے اور کبھی بول کر کیا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ سننے کے لیے کان بھی ترس جائیں۔''

''محبت مشکل نہیں جتنا اس کا اظہار مشکل ہے۔''

وہ بولی.....

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

شعر سن کر میں اسے دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا تھا کہ صورت ساری غزالہ کی ہے مگر عادات مختلف ہیں۔ وہ شوخ اور شرارت اس میں نہ تھی جو غزالہ کا خاصا تھی۔ لگ رہا تھا کہ چار سال کی جدائی نے غزالہ کو شوخ سے سنجیدہ کردیا ہے.....

کہنے لگی۔ ''اتنا غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

''تمہارے اندر کچھ تلاش کر رہا تھا۔''

''کس کو.....؟''

''تمہارے اندر تمہی کو ڈھونڈ رہا تھا۔''

''لگتا ہے مجھ میں مجھے نہیں کسی اور کو تلاش کر رہے ہیں۔''

میں سوچنے لگا کہیں میرے دل میں جھانک کر میرا بھید تو نہیں پالیا.....

میں نے پوچھا۔ ''تم ہمیشہ سے اسی طرح سنجیدہ تھیں یا اب بدلی ہو؟''

''آپ کا سوال میں سمجھ نہیں سکی۔ معلوم نہیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''اس عمر کی لڑکیاں بڑی شرارتی ہوتی ہیں۔ جب بولتی ہیں تو رکتی نہیں۔ جہاں بیٹھتی ہیں اکثر اپنی باتوں سے مسکراہٹیں بکھیر دیتی ہیں۔ تم ہر وقت سوچوں میں گم لگتی ہو۔ لگتا ہے کسی نے بولنا نہیں سکھایا۔''

میری بات سن کر ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ کو دبایا تو گالوں کے ڈمپل نمایاں ہو گئے۔ مجھے بتانے لگی.....

''میں شروع سے ایسی ہی ہوں۔ امی کہتی ہیں میرے ایک سال بعد کومل پیدا ہوئی تھی۔ وہ بہت روتی اور امی کو تنگ کرتی تھی۔ لہٰذا وہ ہر وقت اسے سنبھالتی رہتیں... اور میں اکیلی رہنے کی عادی ہوتی چلی گئی۔ اسی لیے میں زیادہ باتیں اپنے آپ سے کرتی ہوں۔ تنہائی اور خاموشی مجھے بہت پسند ہیں۔''

پھر مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کو شوخ لوگ اچھے لگتے ہیں؟''

''جو پسند ہو اس کی ہر عادت سے پیار ہو جاتا ہے۔''

سنا تو ایک لالی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

میں کہہ رہا تھا۔ ''کنول اگر تم خوبصورت نہ بھی ہوتی تب بھی محبت کرنے کے لیے تمہارے اندر ہزار وجوہات ہیں۔ تم سے پیار ہو جانا میری خوش نصیبی ہے۔ دل سے کہہ رہا ہوں تمہارے اس ساتھ نے مجھے باعزت بنا دیا ہے۔''

یہ سن کر وہ مسکرادی۔ میں نے کہا۔ ''تم بھی کچھ کہو یا خاموش رہو گی؟''

وہ جواب میں بولی:

کشش نہیں ہے تمہارے بنا بہاروں میں
یہ آسماں یہ چاند ستارے اداس لگتے ہیں
چمن کا رنگ نسیم سحر گلاب کے پھول
نہ ہو تم تو یہ سارے اداس لگتے ہیں

میں بے خودی میں بولا۔ ''تمہاری محبت مجھے شاعر، مصور، ملنگ اور سنت بنا دے گی۔ مجھے کچھ نہ بناؤ بلکہ اپنا بنا لو۔ تمہارا بن گیا تو سب کچھ بن جاؤں گا۔''

میری ہر بات پر زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیتی۔ خوش ہوتی تو مسکرا دیتی۔ بہت خوش ہوتی تب بھی مسکرا دیتی۔

مجھ سے پوچھا۔ ''میرے والدین، آپ سے بہت متاثر نظر آ رہے ہیں۔ واقعی اتنی خوبیاں ہیں آپ میں؟''

میں نے کہا۔ ''کوئی اپنی خوبیاں اس طرح سے بڑھ چڑھ کر نہیں بتاتا جس طرح سے میں نے بیان کی ہیں۔ اچھی باتیں اندر ہوں تو دیکھنے والے کو خود نظر آ جاتی ہیں۔''

''یہ تو آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں۔'' پھر وہ بنا پوچھے بتانے لگی۔ ''میری امی دیہاتی ماحول میں پلی بڑھیں۔ میٹرک کیا تھا اور پھر شادی ہو گئی۔ وہ سادہ مزاج ہیں۔ جو دل میں ہوتا ہے کہہ دیتی ہیں۔ بابا سے بہت پیار کرتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ بابا اور ہمارے پیچھے ان دیکھے دشمن پڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو ان کی باتیں عجیب لگیں تو صرف یہ دیکھ لیا کریں ان کی نیت کیا ہے۔''

وہ اپنی عمر سے آگے کی باتیں کر رہی تھی۔ میں پہلی بار غور سے کسی کو سن رہا تھا۔ وہ اپنی باتوں کے باعث زیادہ پُر وقار نظر آنے لگی۔ میں بات کرتا تو ہر لفظ بغور سنتی اور جواب تب دیتی جب میں خاموش ہو جاتا۔ بات کس پیرائے میں کی ہے اس کو بھانپ جاتی۔ مذاق کی بات اتنی سنجیدگی میں کہتی کہ خبر بھی نہ ہوتی۔ میرے ساتھ گفتگو میں مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رہتی۔ جب مسکراہٹ دبانا چاہتی تو ہونٹ بھینچ لیتی مگر آنکھوں کی چمک نہ چھپا سکتی۔ مسکراہٹ دباتے ہوئے وہ زیادہ خوبصورت نظر آتی۔ میری خواہش رہتی کہ اپنی مسکراہٹ چھپاتی رہے کیونکہ اس پر ہونٹ بھینچتی تو رخساروں کے ڈمپل نظر آتے تھے... اور آنکھیں چمکنے لگتیں ورنہ آنکھوں میں اداسی ہر وقت بیٹھی رہتی تھی..... بہت خوش ہوتی تو اس کے ہونٹ وا ہو جاتے اور لگتا کہ ہنسی ہے..... میں نے اسے قہقہہ لگاتے کبھی نہیں دیکھا۔

مجھ سے پوچھا۔ ''آپ میں خوبیاں کون کون سی ہیں؟''

میں بولا۔ ''خوبیاں اگر مجھ میں ہیں بھی تو خود سے کیسے بتا سکتا ہوں؟ مگر ایک بات ہے کہ میں قسمت کا بہت دھنی ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''جو آپ جیسی لڑکی کا پیار پا لے تو وہ اور کیا ہو گا؟ مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے کہیں مجھے کسی کی نظر نہ لگ جائے..... مجھے بری نظر کے لیے پیر سائیں سے دم کروانا ہو گا۔''

مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے پہلے دم کروا دیں۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ میں کتنی زیادہ خوش ہوں..... کہیں مجھے اپنی ہی نظر نہ لگ جائے۔'' پھر وہ کچھ سوچنے لگی۔ اچانک پوچھا۔ ''یہ یقین ہے آپ کو کہ مجھے اپنا لیں گے؟''

''کیوں نہیں..... مجھ پر اعتبار تو ہے ناں؟''

''کس بات کا اعتبار؟''

''یہی کہ آپ کو ایک دن اپنا بنا لوں گا۔''

''مگر کیسے؟''

جب ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں تو ہمارے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ایک ہونے میں رکاوٹ کیا ہے؟ میرے پیار میں اتنی شدت ہے کہ اگر یہ سرکش ہوگیا تو طوفان بن جائے گا۔ تمہارا ساتھ ہو تو کوئی مجھے تم سے دور نہیں کرسکتا..... میں تمہیں پانے کی آس پر زندہ رہوں گا۔''

وہ رنجیدہ ہوگئی۔ ''یہ باتیں بعد میں کریں گے۔ آج کچھ اور ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔''

''بولو کیا کہنا ہے؟''

وہ بولی:

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

شعر سن کر میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ میرے یوں دیکھنے پر وہ مسکرا پڑی۔ ''حیران کیوں ہو؟''

''تم کوئی دیوان دماغ میں لیے گھوم رہی ہو؟''

میرے سوال پر وہ مسکرائی تھی۔ جواب کوئی نہ دیا۔ میں نے کہا۔ ''خاموش کیوں ہو؟''

وہ بولی:

ہم لبوں سے کہہ نہ پائے ان سے حال دل کبھی
اور وہ سمجھے نہیں یہ خاموشی کیا چیز ہے

میں نے ہنس کر پوچھا: ''چلو خاموشی کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ لیکن کون سی باتیں کرنا چاہتی ہو؟''

''ایسی باتیں جن سے ہمارے دل دکھی نہ ہوں۔ جب کبھی زندگی میں اداسی آئے تو ان باتوں کو یاد کریں تو بے ساختہ مسکرا دیں۔ وہ باتیں کریں جن سے یادیں حسین ہو جاتی ہیں۔ ایسی باتیں جن کو یاد کر کے سب اچھا لگنے لگتا ہے..... آج میرا دامن پیار سے بھر دیں اور بعد میں بھلے مجھے تنہا کر دیں؟..... وہ فضا میں کہیں دیکھ رہی تھی۔

کنول اپنے اندر کوئی دکھ کا دریا بہائے پھر رہی تھی۔ بقول بابا فرید اس کے اندر درد کا پانی بہہ رہا تھا۔ اس کی روشن اور چمکتی آنکھیں اچانک کسی سوچ میں ڈوب جاتیں۔ معلوم نہ پڑتا آنکھیں کہیں سو گئیں کہ تھک کر کہیں بیٹھ گئی ہیں۔ اس حالت میں اس پر کوئی حزن چھا جاتا اور وہ دیوی لگنے لگتی۔ میں خود کو کمتر سمجھ کر اس کا پجاری بن جاتا۔ اس حقیقت پر یقین نہ آتا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ لگتا میں اس کے در کا کوئی فقیر ہوں۔ میری حالت دیکھ کر وہ مجھے پلکوں پر لا بٹھاتی۔ ہر طرح کے جتن کر کے مجھے اپنی محبت کا یقین دلاتی۔ پہلے ہی دن اس نے مجھے باور کرا دیا کہ وہ غزالہ نہیں کنول ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ محبت کیا ہے؟''

جواب میں محسن نقوی کا یہ شعر پڑھا۔

کون سی بات ہے تم میں ایسی
اتنے اچھے کیوں لگتے ہو

میں نے پوچھا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

بتایا۔ ''یہی محبت ہے۔ کوئی بلا جواز اچھا لگنے لگتا ہے۔ کوئی ساری وجوہات کے باوجود اچھا نہیں لگتا۔ بیچ میں فرق صرف محبت کا ہوتا ہے۔ صرف محبت کا۔''

میں نے کہا۔ ''یہی تو پوچھا ہے کہ آخر محبت ہوتی کیا ہے؟''

''جس طرح تمہارے لیے یہ آس ہے تو میرے لیے یہ آرزو ہے۔''

''دونوں میں فرق کیا ہے؟''

''آس پیاسی رہتی ہے مگر آرزو پوری ہو جاتی ہے جیسے اُمید بر آتی ہے اور آس بھٹکتی رہتی ہے۔''

وہ روانی میں بول رہی تھی۔ الفاظ اس کے لبوں سے ندی کے پانیوں کی طرح بہہ رہے تھے۔

اس سے پھر پوچھا۔ ''اس کے علاوہ بھی کچھ کیا ہے؟''

وہ بولی۔ ''بعد میں پوچھ لینا.....''

''کچھ تو بتا دو؟''

''بچوں کی طرح ضد کرنے لگتے ہو؟''

میں چپ ہو گیا.....

''ناراض ہو گئے؟''

''نہیں تو.....''

''پھر بھی سن لو۔'' یہ کہہ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کسی تپتے صحرا میں محبت اچانک چلنے والی خنک ہوا ہے۔ جھلستے بدن پر پڑتی نرم پھوار ہے۔ کسی مرتے ہوئے کے لیے یہ دم عیسیٰ ہے۔ یہ روح پر لگے گھاؤ کا مرہم ہے۔ یہ اولیاؤں کی دعا کا ثمر ہے۔ نومولود پر پڑی ماں کی پہلی نظر ہے۔ یہ باپ کی شفقت ہے۔ کسی کے درد پر آنکھ سے ٹپکا آنسو ہے۔ یہ ہمارے لیے پیدا کرنے والے کا ایک عظیم تحفہ ہے۔''

''مگر میں ان سارے الفاظوں میں کہاں ہوں؟''

اس کی آنکھیں مزید اداس ہو گئیں۔ ''خود کو استعاروں میں کیوں تلاش کرتے ہو۔ میری آنکھوں میں دیکھو۔ وہاں نہ آئے تو شکایت کرنا۔''

''آخر تم کو مجھ سے محبت کیوں ہوئی؟ بہت سے لڑکے ہوں گے مگر یہ عام انسان کیوں پسند آگیا؟''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

وہ ایسے بتا رہی تھی جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔ ”تم نے مجھے کبھی چبھتی نظروں سے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ متلاشی یا مطمئن نظروں سے دیکھتے تھے۔ ایسے کہ میری تلاش میں ہو یا پھر مجھے دیکھ کر تمہاری تلاش مکمل ہو گئی ہے۔ تمہاری نظروں میں ہوس نہیں حیا ہوتی تھی۔ ایوبیہ میں تم کو کھائی کنارے بیٹھے دیکھا تو بے خود ہو کر تم سے ملنے چلی آئی تھی۔ ایسا لگا تھا ہم دونوں کے اندر ایک ہی روح ہے۔ لگا ہم دونوں کو کسی ایک ہی چیز کی کھوج ہے۔ اسی تلاش میں تم کچھ الگ نظر آئے۔ کبھی کھائی میں اتر گئے۔ کبھی جنگلوں کو تا دیر دیکھتے دکھائی دیے۔ اندھیرے میں نتھیا گلی روڈ پر ٹریکنگ کر رہے ہیں۔ وہ چیزیں جن کے کرنے سے جان جا سکتی ہے تم وہ کرنے پر جوش نظر آتے تھے۔ پھر شملہ پہاڑی پر غروب آفتاب کے منظر میں کھوئے بیٹھے نظر آئے۔ آپ کے سارے دوست ہنسی مذاق میں مصروف ہوتے اور آپ اپنی دنیا سجا کر بیٹھے ہوتے مگر مجھے جب بھی دیکھتے تو سارے منظر بھول جاتے، ایسا محسوس ہوتا کہ مجھ سے بڑھ کر آپ کے لیے کوئی چیز بھی نہیں۔ آپ کی آنکھوں سے چھلکتی محبت، مجھ سے غافل رہ سکتی تھی۔ مجھے لگتا کہ آپ میں کوئی کھوئی ہوئی چیز تھی جو مل گئی۔ چہرہ چمکنے لگتا مجھے دیکھ کر، یہ ڈر بھی آنکھوں سے جھانکنے لگتا کہ میں کہیں گم نہ ہو جاؤں۔ میرا دل کرتا کہ جسے آپ تلاش کر رہے ہو میں بھی اس تلاش میں شامل ہو جاؤں۔ شاید ہم اکٹھے مل کر اسے پالیں جن کی ہم دونوں کو تلاش ہے۔ میری آپ سے محبت آپ کو ایک بار دیکھنے کے بعد نہیں بلکہ بار بار دیکھنے کے بعد ہوئی ہے۔ آپ نے مجھ سے پوچھا کہ محبت کیا ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ محبت آپ ہیں، محبت میں ہوں۔ محبت ہم دونوں ہیں۔“

اس کی باتوں کی کوئی الگ ہی تاثیر تھی۔ آہستگی سے روح میں جذب ہوتے الفاظ..... کسی بیمار کی ڈھارس بڑھاتے الفاظ..... غم کے مارے کو تسلی دیتے الفاظ۔ کسی ہارے کی ہمت بڑھاتے الفاظ۔ کسی مایوس کے لیے اُمید کا دیا جلاتے الفاظ......

وہ عام نہیں بلکہ بہت اہم لڑکی تھی۔ وہ جتنا مجھ سے کچھ کہتی اتنی اس کی منزلت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ عام محبت کی نہیں بلکہ کسی عقیدت کی مستحق نظر آنے لگی۔

وہ بتا رہی تھی۔ ”سوچتی ہوں آپ کو بہت سے خط لکھوں۔ یہ لکھوں کہ ہر مقام پر آپ کس طرح میرے دل میں اترتے گئے۔ میں ہر جگہ پر آپ کے لیے کیا سوچتی تھی۔ کیوں میرے لیے آپ اہم سے اہم ہوتے چلے گئے؟“

ہم دونوں ہولے ہولے چل رہے تھے۔ کبھی اطہر پتھر جمع کرنے رک جاتا اور کہیں میں اسے کسی بہانے روک لیتا۔ ہم رک کر باتیں کرتے۔ باتیں کہاں کر رہے تھے بلکہ میں اس کو سن رہا تھا۔ اس کی باتیں میرے لیے کسی اکسیر کا کام کر رہی تھیں۔ اس کی قربت میں کوئی سحر تھا۔ محبت کے دنوں کی جانی پہچانی خوشبو میرے آس پاس مہک رہی تھی۔

ایک جگہ رک کر مجھ سے پوچھا۔ ”آخر میں آپ کو کیوں پسند آئی؟“

میں سوچنے لگا کہ اس کو کیا بتاؤں؟ یہ کہوں کہ آپ کو دیکھ کر مجھے غزالہ یاد آتی ہے تو یہ بات اسے گراں گزر سکتی ہے۔ کہیں وہ خود کو بے وقعت محسوس نہ کرے۔ اگر کوئی استعمال شدہ پرانی وجہ بتاتا تو وہ اس پر جچتی نہ تھی۔ جیسے وہ خود مختلف تھی تو اس کو پسند کرنے کی وجہ بھی مختلف ہونی چاہیے تھی۔ وہ سوال پوچھ کر مجھے دیکھ رہی تھی اور مجھے کوئی ڈھنگ کا جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ آخر کار وہی رٹی رٹائی بات کہہ ڈالی۔ ”تم اتنی خوبصورت ہو کہ میری نظر تم پر سے نہیں ہٹ رہی تھی۔ تم کو دیکھ کر میں کسی کا بھی نہیں رہا۔ تمہاری یہ ناک، یہ ہونٹوں کے خم، یہ بال اور آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ اپنی آنکھیں کبھی دیکھی ہیں جو کتنی گہری ہیں۔ تمہاری آواز....“

”بس بس..... بہت ہو گیا۔ بہت ہو گیا.....“ یہ کہہ کر مسکرانے لگی۔ پھر اس نے کہا۔ ”صرف ان باتوں پر مر مٹنے والے تو آپ نہیں لگتے.....“

”کیوں نہیں۔ میری طرح کے کسی لڑکے کو تم سے بڑھ کر اور کیا چاہیے؟“

مجھ پر نظریں گاڑ کر پوچھا۔ ”اب کوئی مجھ سے حسین لڑکی میری طرح آپ کو چاہنے لگے تو کیا مجھے چھوڑ دیں گے، اگر نہیں تو کیوں نہیں؟“

”میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ تمہارے ادب کے لگاؤ نے مجھے گھائل کیا ہے کیونکہ یہ خصوصیت تو کچھ دیر پہلے مجھ پر کھلی تھی۔“ میں تذبذب میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ ”تم لوگ امیر بھی تو ہو۔ نئی چمکتی ہوئی گاڑی ہے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں قیام کرتے ہو۔ سب کے کتنے اچھے ملبوسات ہیں.....“

وہ میری باتیں سن کر نفی میں متواتر سر ہلا رہی تھی۔ ”جان نہیں چھوڑوں گی جب تک سچ نہیں بتائیں گے۔“

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

میں نے کہا۔ ''جب لڑکی کی صورت اچھی ہو، دولت مند بھی ہو تو میری طرح ہر لڑکا اپنی قسمت تو ضرور آزمائے گا۔''

وہ اٹل لہجے میں بولی۔ ''جس انداز میں آپ مجھے دیکھتے تھے وہ انداز کوئی اور تھا۔ شکل پر آپ فدا ہو سکتے ہیں مگر دولت پر ہرگز نہیں۔ آپ کی نظریں بتاتی ہیں کہ وجہ کوئی اور ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری تصویر میرے دل پر شروع سے نقش تھی۔ کئی ماہ و سال مجھے تم سے متعارف کراتے رہے، تمہارا چہرہ میرے لیے پرایا نہ تھا۔ تم کو دیکھا تو مجھے میرے خوابوں کے سچے ہونے پر یقین ہو گیا۔''

نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ''ہوٹل میں تو کہا تھا کہ تم کو پہلے سے جانتا ہوں.....''

''ہاں ناں..... کہا تو ہے کہ میرے دل پر تمہاری تصویر پہلے سے چسپاں تھی۔''

وہ اس ادا سے مسکرائی جیسے میری بات پر یقین نہیں کر رہی ہو.....

میں نے کہا.....

اپنے جیسی کوئی تصویر بنانی تھی مجھے
میرے اندر سے سبھی رنگ تمہارے نکلے

اس نے جوابی شعر پڑھا.....

دیکھو یہ کسی اور کی آنکھیں ہیں کہ میری
دیکھوں یہ کسی اور کا چہرہ ہے کہ تم ہو

میں شعر سن کر سٹپٹا گیا.....

وہ بولی۔ ''جب بھی مجھ سے کوئی بات چھپائیں گے تو آپ کی آنکھیں مجھے سچ بتا دیں گی.....''

اس نے شاید میرے چہرے اور میری آنکھوں کو پڑھ لیا تھا کہ میں کسی اور کی تلاش میں ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ چہرے کی زبان سے واقف ہے۔ وہ میری وضاحتوں سے مطمئن نہ ہو سکی تھی۔ واقعی اس میں بہت ذہانت بھری تھی۔

☆☆☆

اسی دوران ہم چلتے ہوئے اس جگہ آ کر کے جہاں دو برف پوش پہاڑوں کے دامن پھیلتے پھیلتے آمنے سامنے ٹھہر گئے تھے۔ اس درے میں گلیشیر بچھا تھا۔ وہاں سے چل کر آتی مرطوب ہوائیں ہم میں تازگی بھر رہی تھیں۔ گلیشیر کی برفیں پگھل کر راستے میں تالاب بناتیں اور تیز بہتے پانیوں کی صورت جھیل میں گر رہی تھیں۔ پانی تالاب میں کسی ساز کی طرح بہتے اور جھنکار کی طرح جھیل میں گر رہے تھے۔

ہواؤں اور پانیوں کے ترنم نے ایک جادو سب پر کر دیا تھا۔ تالاب میں پڑے چھوٹے بڑے پتھر صاف و شفاف نظر آ رہے تھے۔

اس راستے پر چلتے رہنے کے لیے ہمیں اس تالاب سے گزرنا لازمی تھا۔ یا تو جوتے اتار کر ننگے پاؤں چلتے یا بڑے پتھروں کو پھلانگ کر جمناسٹک کرتے ہوئے تالاب کو پار کرتے۔ تالاب میں پانی کی گہرائی ایک فٹ کے قریب تھی مگر ان کی تیز رفتاری نے سب میں ایک خوف بھر دیا تھا۔ سب وہیں رک کے کیمروں سے تصویریں لے رہے تھے۔

جب سب نے پانیوں سے چھیڑ خانی شروع کی تو تالاب میں نظر آتا آسمان اور پہاڑوں کا عکس تھرکنے لگا۔ درے سے آتی ہوائیں جھیل کے پانیوں میں ارتعاش ڈال کر اوپر اٹھ رہی تھیں۔ جب ہوائیں ذرا دیر کو تھمتیں تو جھیل کے پانی پہلے کی طرح ساکت ہو جاتے۔

ہم بھی برفوں سے سجے پہاڑ دیکھتے، بادل دیکھتے اور بادلوں پر چھایا آسمان دیکھتے۔ کبھی جھیل دیکھتے اور کبھی جھیل میں ڈوبے عکس دیکھتے۔ ہمارے شور نے ماحول میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ ہر چہرہ کھلا تھا اور کنول کے لبوں پر ایک مستقل مسکراہٹ ٹھہری تھی۔

میں جوتے موزے اتارے تالاب میں کھڑا ہوا تو یخ پانیوں نے مجھے کاٹ کھایا۔ پل میں پاؤں اور پنڈلیاں فریز ہوتی محسوس ہونے لگیں۔

اس کے والد نے پوچھا۔ ''پانی گہرا تو نہیں لگتا مگر گزرنے میں مشکل ضرور ہوگی؟''

لطیف نے کہا کہ پتھروں کو پھلانگ کر بھی جا سکتے ہیں۔

''نہیں میاں..... کوئی پانی میں گر گیا تو کپڑے گیلے ہو جائیں گے۔ یہاں کہاں سکھاتے پھریں گے؟''

اطہر بولا۔ ''میں نہیں گروں گا۔ ابھی دیکھیں۔'' یہ کہا اور پتھروں کو پھلانگتا دوسری جانب جا کھڑا ہوا۔

طاہرہ نے خوش ہو کر اعلان کیا۔ ''دیکھیں۔ میرے بھائی نے اطہر کو چند باتوں سے بہادر کر دیا ہے۔''

وہ بولے۔ ''بات تو ٹھیک ہے۔''

''انکل۔ آپ میرے بھائی کو یاد رکھیں گے؟''

وہ جیب سے بٹوہ نکالتے ہوئے بولے۔ ''کیوں نہیں بلکہ یہ تو ہمیں ملنے لاہور بھی آیا کرے گا۔'' یہ کہہ کر بٹوے سے اپنا کارڈ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آنا

Nadeem Azeem
www.pakistanipoint.com

تو ساری تصویریں بھی لیتے آنا..... تمہاری فوٹو گرافی بھی دیکھ لیں گے۔''

کومل بولی۔ ''بابا کیا معلوم کیمرے میں فلم ہے کہ نہیں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ ہم پر رعب ڈالنے ..... کے لیے الٹے سیدھے ہو کر تصویریں لیتے رہتے ہیں۔''

''بیٹا ایسے نہیں کہتے؟''

''میں تو سو بار کہوں گی۔ پکا یقین ہے مجھے یہ ہمارے سامنے شو مارتے ہیں..... آپ بھلے ان سے امپریس ہوں میں کبھی نہیں ہوں گی۔'' وہ بات کرتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

''اتاروں جوتی؟'' ذرا دور بیٹھی ماں نے سن لیا تھا۔ ''اللہ والوں کی محفل میں بیٹھتا ہے۔ ذہین اور شریف لڑکا ہے۔ سب باتوں کا علم رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ عزت سے بات کیا کرو۔''

سب ہنسنے لگے.....

کچھ دیر میں ہم سب تالاب پار کر کے کھڑے تھے۔ کنول پھر سے ڈر کا بہانہ کر کے کھڑی تھی۔ کنول کی نظریں بار بار یہی پیغام دے رہی تھیں کہ واپس آؤ اور آ کر میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔

وہاں سے آنا اتنا مشکل نہ تھا کہ اس کو میرے سہارے کی ضرورت ہوتی.. مگر پیار کرنے والے ایک دوسرے سے اسی طرح سہارے مانگتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی ہاتھ پکڑنا چاہتا ہے اور کبھی سر ٹیکنے کو کندھا مانگتا ہے۔ کوئی سہارے کے لیے محبت کے بول سننا چاہتا ہے اور کوئی سہارا پانے کے لیے کچھ بتانا چاہتا ہے۔ محبت میں کوئی عمل بلاوجہ نہیں ہوتا، ہر عمل کے پیچھے سہارا دینا یا سہارا لینا مقصود ہوتا ہے۔

اس کی اماں چلا چلا کر اس سے کہہ رہی تھیں۔ ''ایک بچہ آ گیا ہے اور تو وہیں کھڑی رہنا۔ میری بچی..... میں بھی تو یہاں سے چل کر آئی ہوں۔'' ہاتھ سے میری جانب اشارہ کیا۔ ''ہر بار اب اس لڑکے سے کہوں گی کہ میری بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر لے آؤ؟'' یہ کہہ کر وہ میرے کان میں بولیں۔ ''بہت چھوٹے دل کی ہے۔''

میں نے بھی بلاوجہ شدید حیرت کا اظہار کیا۔

''اچھا؟''

کچھ لمحے مجھے دیکھنے کے بعد بولیں۔ ''تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟''

میں گڑبڑا گیا۔ ''خدانخواستہ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''بہت مانتی ہوں تم ذہین اور سمجھ دار ہو۔ سارے معاملات جانتے ہو مگر یہ نہیں جانتے کہ ہر ماں اپنی بیٹی کی ساری خبریں رکھتی ہے۔'' پھر مجھے حکم دیا۔ ''اب جا کر اسے لے بھی آؤ ورنہ سارا دن کھڑی رہے گی۔''

میں واپس آیا۔ کنول کی جانب ہاتھ بڑھایا تو وہ بولی۔ ''ہم انتظار میں کھڑے ہیں۔ لگتا ہے آپ آنا نہیں چاہتے تھے؟''

وہ شوخ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی اداس آنکھوں سے ہمیشہ محبت چھلکتی نظر آئی اور جب شوخی ہوتی تو محبت بھی شوخ ہو جاتی۔

میں نے ثروت کی موجودگی میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے ہاتھ دونوں کے پکڑے اور دونوں کو پہنے یخ پانیوں میں لے آیا۔ سر جھکا کر دیکھا تو شفاف پانیوں میں اس کے اجلے پاؤں نظر آنے لگے۔

احمد زاہد

شہر کراچی میں پیدا ہونے والے انتہائی برق رفتاری سے اپنی شاعری کی بنیاد پر خود کو منوانے والے احمد زاہد کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے رنج و ملال کے سوائے اور کیا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ بقول مقدمہ نگار مجموعہ کلام زاہد عباس رضوی ''ایسا کہاں سے لائیں کہ زاہد کہیں جسے'' 36 برس کی عمر کالج میں شعر و ادب کی محفلوں میں شرکت، جامعہ کراچی سے ابلاغ عامہ میں ماسٹرز کی ڈگری، اشتہاری ادارے میں کاپی رائٹر کی حیثیت سے اشتہار نویسی، مضافات کی گھریلو نشستوں سے جامعہ کراچی اور شہر کے مشاعروں میں نمائندگی، مختصری عمر میں اپنے ''ہونے کا تماشا'' دکھانے والے باصلاحیت جواں مرگ شاعر محض بیوی اور گھر والوں کو ہی نہیں اپنے سینئر اور معاصرین کو بھی سوگوار کر کے 14 جون 2001ء کراچی کے خفتگان خاک میں جا ملا۔ احمد زاہد یکم نومبر 1965ء کو شاہ فیصل کالونی کراچی میں پیدا ہوئے۔ شعری مجموعہ ''ہونے کا تماشا'' اکادی بازیافت کراچی، مدیر جسارت، کالم نویس سلیم احمد کے داماد شاہ نواز فاروقی کی ذاتی دلچسپی کے باعث شائع ہوا تھا۔ عباس رضوی نے اس کا مقدمہ اور پروفیسر سحر انصاری نے فلیپ لکھا ہے۔

از: سید محمد قاسم / اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں

www.paksociety.com

حسین چمپئی پیروں کو جب سے دیکھا ہے
ندی کی مست ادائیں بلا رہی ہیں تمہیں
میرا کہا نہ سنو ان کی بات تو سن لو.....
ہر ایک دل کی دعائیں بلا رہی ہیں تمہیں

وہ بولی۔ ''چلیں ناں..... میرا ہاتھ پکڑے کیا سوچ رہے ہو؟''

میرا سحر اس نے بول کر توڑ دیا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو اس کا اجلا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ وہیں دل دھڑکا کہ کہیں یہ بھی مجھ سے بچھڑ نہ جائے۔ کہیں نصیب میرے ساتھ دھوکا نہ کر جائے۔ کسی انجانے طوفان کے ڈر نے مجھے دہلا دیا۔ یہ سوچ کر میں نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی..... میرے بجھے چہرے کو دیکھا تو پریشان سی لگنے لگی.....

''کیا ہوا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ کو قوت سے دبایا۔ میرے اندر اس کا پیار ایک شعلے کی طرح ایکدم اٹھا۔ دل نے چاہا کہ اسے اپنے بازوؤں میں لے کر سب سے چھپا لوں۔ وہ میری متغیر حالت کو دیکھ رہی تھی۔ میں فوری طور پر اسے کھینچتا ہوا پانی سے باہر لے آیا۔

سب لوگ وہیں اپنے پاؤں خشک کرنے بیٹھ گئے۔ لطیف کو اس کی والدہ نے اپنے ساتھ روک لیا تھا۔ میں سب سے دور جھیل کے سامنے اپنی حالت پر اداس اور مضمحل بیٹھا تھا۔ گلیشیر سے آتی ہوائیں میرے اندر کی بھڑکی آگ کے شعلے بلند کر رہی تھیں۔ سوچنے لگا جب کنول اور اس کی محبت میرے ساتھ ہے تو اس درد و کرب کے کیا معنی ہیں۔ جب وہ میرے آس پاس ہے تو اس کی جدائی کے غم کو کیوں گلے لگا کر بیٹھا رہوں۔ زندگی سے گو غم و خوشی کا بڑا گہرا تعلق ہے مگر درد کو خوشی کے لمحوں میں اپنے سینے سے کیوں لگائیں۔ ابھی تو میں اپنی قسمت پر نازاں تھا اور اب اپنے نصیب سے خوف کیوں کھا رہا ہوں۔ مسکراہٹ اور مسرت ہماری زندگی میں دونوں بہت اہم ہیں۔ کیوں نا میں مسکرا کر دوسروں میں بھی خوشیاں بانٹوں۔ یہ سوچتا گیا اور من میں جدائی کے خوف کی جگہ اس کی محبت بھری مسکراہٹ نے لے لی۔ سکوت میں ڈوبی جھیل کی سطح پر ہواؤں نے ارتعاش پیدا کر دیا۔ میں تنہا اور دلگیر بیٹھا تھا مگر اب لگا کہ کنول بھی میرے ہمراہ بیٹھی ہے۔ ہم دونوں جھیل کا منظر ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ ہم دونوں چپ ہیں مگر ہم دونوں میں راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں۔

اتنے میں کومل چھلانگیں مارتی آئی اور آ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ سانس ٹھیک کرتی ہوئی بولی۔ ''میں تو ایسے ہی آ گئی تھی۔ اگر ڈسٹرب کیا ہے تو چلی جاتی ہوں۔''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''جانے سے پہلے جو کہنے آئی تھی وہ تو بتاتی جاؤ۔''

''آپ روک رہے ہیں تو رک جاتی ہوں ورنہ اپنے پاس ٹائم نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کچھ سننے آئی ہو کہ کہنے آئی ہو؟''

''اس کے علاوہ سمجھانے بھی آئی ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

میں نے کہا۔ ''سب باتیں ٹھیک ہیں مگر تم پر سنجیدگی اچھی نہیں لگتی۔ شرارتی انداز ہی صرف تم پر جچتا ہے۔ پھر بھی جو کہنا ہے کہو۔''

وہ بولی۔ ''کیا منتر میرے ماں باپ پر پھونک دیا ہے کہ آپ کے قصیدے ہی پڑھے جا رہے ہیں۔''

''تم کیوں جل رہی ہو۔ ہاں اگر تم نے کسی پر جادو ٹونا کرانا ہے تو بتاؤ.....''

وہ پنجابی بولنے لگی۔ ''ہم نے کس پر جادو کرانا ہے سوہنیا۔ اپنی مثال تو یوں ہے کہ چٹکی میں مسل کر بندہ پھڑکا دیتے ہیں۔''

''بڑی خطرناک ہو بھئی۔ تم سے تو ڈر کر رہنا ہوگا.....''

میری بات سن کر اپنی دونوں آنکھیں بھینگی کر لیں۔ ''منڈیا جو نظر آ رہی ہوں اس سے زیادہ خطرناک ہوں۔ نہ تمہارے سائیں سے ڈرتی ہوں اور نہ کسی جن بھوت سے۔ یہ سب تو میرے آگے پیچھے گھومتے رہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے چہرے سے واقعی ڈر لگ رہا ہے۔ شکل تو ٹھیک کر لو۔''

''ڈرنا ہم سے چھوڑ دے سوہنیا۔ بس ہمیں کبھی کبھار کھلا پلا دیا کر۔ پنجابی کڑی ہوں ناں تو لہٰذا کھانے پینے کا چسکا ہے..... اور'' میرے چہرے کے سامنے انگلی لہرائی۔ ''ہم سے پنگا بھی نہیں لینا۔ سارا لاہور ہمیں ماسی مصیبتے کہتا ہے۔''

پھر وہ ہنستے ہنستے پہاڑوں کے اوپر کچھ دیکھنے لگی۔ کچھ دیر چپ بیٹھی رہی۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا..... پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ ''آپ کنول کو کتنا جانتے ہیں؟''

Iftikhar Azeem
www.pakistanipoint.com

''تم یہ پوچھنے آئی تھیں.....؟''

''آپ نہیں جانتے وہ کتنی اچھی ہے۔ وہ بہت معصوم اور بے ضرر ہے.....''

میں اسی کے لہجے کی نقل کرتے بولا۔ ''تم بھی مجھے نہیں جانتیں۔ میں بہت برا اور چالاک لڑکا ہوں.....''

''وہ میری طرح پتھر دل نہیں ہے۔ میں صرف اپنا بھلا دیکھتی ہوں وہ اپنا نہیں بلکہ دوسروں کا پہلے سوچتی ہے۔''

میں اس کی باتوں کو ہنسی میں اڑا رہا تھا۔ ''کومل میں بالکل تمہاری طرح کا ہوں۔ ہماری طبیعت آپس میں بہت ملتی ہیں۔ دعا کرو میں اور کنول ایک ہو جائیں تو تمہاری اور میری بہت بنے گی۔''

''بھائی میں مذاق نہیں کر رہی۔ اسے کبھی کوئی دکھ نہ دینا۔ آپ سے بہت پیار کرتی ہے۔ آپ کی بے وفائی بھی برداشت نہ کر سکے گی۔''

''چلو جی کوئی دکھ نہ دوں گا، اور کوئی حکم ہو تو وہ بھی بتا دو.....''

''وہ بہت حساس اور خوددار ہے۔ آپ نے اسے چھوڑ دیا تو اکیلی آنسو بہاتی رہے گی مگر آپ کی منت کبھی نہیں کرے گی۔''

''کومل مجھے اس کی ساری باتیں ایک چٹھی پر لکھ کر دے دو۔ نہیں تو بھول جاؤں گا۔''

''آپ میری باتوں کو مذاق لے رہے ہیں۔ سچ بتا رہی ہوں، اس سفر میں وہ بدل گئی ہے۔ آپ کی محبت نے اسے تبدیل کر دیا ہے۔ یہ ہر وقت خاموش رہنے والی لڑکی اب مسکرانے لگی ہے۔ امی سمجھتی ہیں کہ سہیلیاں بنی ہیں تو خوش ہے۔ کوئی نہیں سمجھتا وہ کیوں اتنی خوش ہے؟ یہ خوشی آپ کی محبت نے اسے دی ہے۔ آپ جب بھی مل کر اس سے دور چلے جاتے ہیں تو اسے چپ لگ جاتی ہے۔ یہاں ناران میں آپ سے ملی تو خوشی سے خود کو سنبھال نہیں پا رہی ہے۔''

کومل مجھے وہ سب باتیں بتا رہی تھی جو میں جانتا تھا۔ اس چلبلی لڑکی کے منہ سے اتنی سنجیدہ باتیں مجھے عجیب بھی لگ رہی تھیں اسی لیے میں بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

''بھائی۔ وہ ایسی کتاب ہے جس پر لکھا نہ کوئی پڑھ سکتا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ آپ خوش قسمت ہیں جو اس کا پیار آپ کو ملا ہے۔ میں یہ کہہ رہی ہوں آپ بہت زیادہ خوش قسمت ہیں۔ شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ کس قسم کی لڑکی آپ سے پیار کرنے لگی ہے۔''

میں کومل کا چہرہ دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے یہ سب باتیں کیوں بتا رہی ہے۔ کیا وہ یہ سمجھتی ہے کہ میں اس کی بہن کو دھوکا تو نہیں دوں گا یا کہنا چاہتی ہے کہ اس کی محبت میرے لیے آسمانی تحفہ ہے۔ وہ واقعی میرے لیے بہشت کا ایک پھول تھی۔ اس کا پیار پا کر میں سمجھ بیٹھا تھا کہ میرے نصیب بھی کیا اعلیٰ نصیب ہیں۔

وہ اپنی لہر میں بولتی گئی۔ ''کالج کے گیٹ پر کتنے لڑکے اس کے لیے پھیرے لگاتے رہتے ہیں۔ اس نے کسی کو آج تک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں آپ میں کیا پایا کہ اپنا سب ہار بیٹھی ہے۔''

میں کچھ نہ بولا۔ خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

وہ بھیگے لہجے میں بولی۔ ''آپ نے کوئی صدمہ اسے دیا تو بتا رہی ہوں وہ مر جائے گی۔ زندہ نہیں رہے گی.....''

میں نے سنا اور درد کی ایک لہر میرے پاؤں کے تلوؤں سے اٹھی اور میرے پورے وجود میں پھیل گئی۔ میں کرب سے کومل کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کی اپنی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ بے اختیاری میں بولے جا رہی تھی۔ ''آپ نجانے کیوں میری باتوں کو مذاق میں اڑا رہے ہیں۔ میں بتا رہی ہوں وہ چمکتا آئینہ ہے۔ آئینے کو ٹھیس لگے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔''

میرے کانوں میں وہی اجنبی فقرے چیخ رہے تھے۔

''وہ مر جائے گی..... وہ زندہ نہ رہے گی۔''

''بھائی یہی بتانے اور سمجھانے آئی تھی کہ میری باتوں کی طرح کومل کے پیار کو مذاق نہ لینا.....!''

میں کئی پل سر کو جھکائے بیٹھا رہا۔

وہ بولی۔ ''میری بات بری لگی ہے؟''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سر اٹھایا تو وہ چونک پڑی۔ ''آپ رو رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''کومل! یہ کبھی نہ کہنا کہ وہ مر جائے گی۔ وہ زندہ نہیں رہے گی۔ دل کٹ جاتا ہے میرا یہ سن کر۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔''

وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی..... وہ بولی۔ ''خدانخواستہ میرا یہ مطلب تو نہ تھا۔''

''تم یہ کہنے آئی ہو کہ ہمیشہ اس کا خیال رکھوں، بے وفائی نہ کروں..... یہی تم چاہتی ہو ناں۔''

وہ خاموش بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔

''اگر کہوں کہ ہر وقت سایہ بن کر اس کے ساتھ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

رہوں گا۔ اسے کبھی رنجیدہ نہیں کروں گا تو میری بات پر یقین کرلوگی؟''

سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں۔ کرلوں گی۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں جھوٹ بھی بول رہا ہوتا تب بھی تم یقین کرلوگی؟''

''ہاں کرلوں گی۔ کیونکہ آپ جھوٹے نہیں لگتے۔''

''کیوں میں جھوٹ نہیں بول سکتا؟ تم مجھے کب سے جانتی ہو کہ میرا اعتبار کرنے لگو؟ میری نہیں اپنی بہن کا اعتبار کرو۔ تم زندگی بھر میرا جھوٹ نہیں پکڑ سکتیں مگر وہ پکڑ لے گی۔ وہ معصوم ہے مگر لوگوں کی بہت پہچان رکھتی ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''اس کا دل واقعی شفاف اور چمکتا آئینہ ہے۔ وہ کسی کے دل کا عکس اپنے دل کے آئینے پر لے لیتی ہے۔ وہ جان لیتی ہے کہ دوسرے کے دل میں جھوٹ ہے کہ سچ ہے۔ وہ آنکھیں پڑھ لیتی ہے۔ تم اپنی بہن کو نہیں پہچانتی تو مجھے کیسے پہچان سکتی ہو۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا وہ کیا ہے۔''

کومل بولی۔ ''میں نے تو صرف یہ کہا کہ اس سے کبھی بے وفائی نہ کرنا اور آپ تو پریشان ہوگئے۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''کنول نے مجھے آج حیران کردیا۔ وہ مری سے میرے چہرے کو پڑھتی آرہی ہے۔ وہ میری آنکھوں کے راستے میرے دل میں اتر گئی ہے۔ وہ سب جانتی ہے کہ میں اس کو کیوں چاہتا ہوں۔ وہ مجھے وجہ نہیں بتا رہی کیونکہ وہ سب مجھ سے سننا چاہتی ہے۔ وہ آج مجھ سے بولی کہ کبھی میں نے جھوٹ بولا تو میرا چہرہ اس کو سچ بتادے گا۔ میں حیران ہوا کیونکہ وہ سچ بول رہی تھی۔''

میں کچھ لمحے کومل کے متجسس چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''تم بہت بولتی ہو اور سمجھنے لگی ہو کہ ہر بات کی تمہیں خبر ہے۔ تم کو کچھ خبر نہیں کیونکہ تم اپنی بہن کو بھی نہیں سمجھ سکیں۔ تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کنول چہرے اور آنکھوں کی زبان سمجھتی ہے۔ وہ میرے دل کی سچائی جان گئی ہے۔ میں جھوٹا ہوتا تو مجھے وہ دوسروں کی مانند مجھے بھی ٹھوکر مار دیتی۔ وہ معصوم ہے مگر چالاک نہیں۔ مانتا ہوں بہت اچھی ہے مگر کمزور نہیں۔ وہ حساس ہے مگر مضبوط بھی ہے۔ وہ بے خبر نہیں بلکہ آگاہ ہے۔ اس کو فریب دینا بہت مشکل ہے۔ جو سوال مجھ سے پوچھنا چاہتی ہو وہ اپنی بہن سے پوچھو۔ میرے بارے میں شائد تمہیں سچ بتادے۔ میرے بارے میں وہ مجھ سے بہتر جانتی ہے اسی لیے میرا اعتبار نہ کرنا مگر وہ جو کہے آنکھیں بند کرکے مان لینا.....''

''آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ کے دل میں سچائی نہ ہوتی تو جان لیتی؟''

''وہ صرف جان نہ لیتی بلکہ مجھے دھتکار بھی چکی ہوتی۔ میں مطمئن اس لیے ہوں کیونکہ میرے دل کے اندر اس کی بہت بڑی منزلت ہے۔ میرا دل اس کے لیے پاک صاف ہے۔ وہ میرے دل میں بار بار اترے۔ مجھے کوئی فکر نہیں۔ جب بھی وہ میرے دل میں جھانکے گی تو ہمیشہ خود کو ہی موجود پائے گی۔ اسے معلوم ہے کہ جس کی مجھے تلاش تھی وہ وہی ہے۔''

کومل اپنے دماغ میں معلوم نہیں کون سی گتھیاں سلجھا رہی تھی کہ سوچوں میں ڈوب کر بیٹھ گئی۔

جب وہ کچھ نہ بولی تو پوچھا۔ ''ماسی مصیبتے کہاں کھو گئیں؟''

وہ چونک کر بولی۔ ''آپ کی باتیں کنول کو بتاؤں گی تو بہت خوش ہوگی۔''

''نہ اسے کچھ بتانا اور نہ اس سے پوچھنا۔ میرا نام لے کر صرف اس کا چہرہ دیکھنا۔ اگر آنکھیں چمک اٹھیں جو جان لینا کہ مجھے وہ وہی سمجھتی ہے جو تم مجھ سے چاہتی ہو۔''

''ٹھیک ہے نہ کچھ پوچھوں گی اور نہ کچھ بتاؤں گی اور صرف اس کا اور آپ کا چہرہ دیکھوں گی، بلکہ اگر میرا بولنا آپ کو اچھا نہیں لگتا تو زبان سی لوں گی..... اب تو سینے میں ٹھنڈک پڑی؟'' یہ کہنے کے بعد پنجابی بولنے لگی۔ ''اور ذرا آرام سے..... مجھے یہ سمجھ کر ہلکا نہیں لینا کہ مجھے کوئی خبر نہیں ہوتی۔ ایک ایک کی رگ کو پہچانتی ہوں.....''

''کیا پہچانتی ہو؟''

''یہی کہ میری بہن کو تم سے زیادہ کوئی پیار نہیں دے سکتا۔'' اس نے کہا اور کہہ کر ہنستی گنگناتی اور چھلانگیں مارتی چلی گئی۔ میں جھیل کو دیکھنے لگا جس کی سطح پر بدستور سکوت طاری تھا۔

☆☆☆

ہم وہاں سے چلے تو میرے اور لطیف کے ہمراہ اطہر تھا۔ میں اطہر سے اس کی پڑھائی اور مشاغل کی باتیں کرنے لگا۔ وہ ایک ذہین اور فرمانبردار بچہ تھا۔ مگر ہر ماں کی طرح اس کی ماں کو بھی اپنے اکلوتے بیٹے کی بہت فکر تھی۔ اسکول کے گریڈز بھی بہت اچھے تھے اور کھیلوں میں بھی دلچسپی تھی۔ میں اس کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرتا ہوا جا ر

تھا۔اس کے والد ایک پروفیشنل اکاؤنٹنٹ تھے۔اُن کی فرم ملکی اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کو آڈٹ اور اکاؤنٹنگ کی سروس فراہم کرتی تھی۔خوشحال لوگ تھے اور لاہور کے ایک اچھے علاقے میں ان کا گھر تھا۔

لطیف باتوں باتوں میں اس سے گھر کا کلچر معلوم کرنے لگا۔ ”تمہاری امی بتا رہی تھیں تم بہنوں سے بہت لڑتے ہو۔“

وہ کہنے لگا۔ ”میں کہاں لڑتا ہوں۔وہ تو کومل باجی ہیں جو ہر وقت میرے ساتھ لڑتی رہتی ہیں۔“

”اچھا......؟“

”ہاں ناں۔میری پاکٹ منی بھی چھین لیتی ہیں۔امی کہتی ہیں ہر وقت اسے کھانے کا شوق رہتا ہے۔معلوم نہیں موٹی کیوں نہیں ہوتی۔“

”اور کنول......وہ نہیں لڑتی؟“

”نہیں تو۔وہ بہت اچھی ہیں۔کومل باجی ان سے بھی لڑتی ہیں۔“

”کنول باجی کیا کرتی رہتی ہیں؟“

”ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہتی ہیں۔کومل باجی تو ہر وقت فریج کھولے کھڑی ہوتی ہیں۔“

”گھر میں ڈانٹ کس کو زیادہ پڑتی ہے؟“

وہ فٹ سے بولا۔ ”کومل باجی کو کیونکہ وہ گھر کا کام نہیں کرتی۔میں باہر کھیلنے جاتا ہوں تو مجھے بھی پڑتی ہے مگر میں بھی چلا جاتا ہوں......کومل باجی کو بہت پڑتی ہے۔“

”سہیلیاں کس کی زیادہ ہیں؟“

”کومل باجی کی تو اتنی سہیلیاں ہیں کہ گھر پر بھی آجاتی ہیں۔کنول باجی کی اتنی نہیں ہیں۔“

لطیف اسے کریدے جا رہا تھا۔ ”تمہاری کنول باجی ہر وقت کمرے میں بند رہتی ہیں؟“

”بہت کم باہر نکلتی ہیں۔امی کچن کا کام کرنے کے لیے جب بلاتی ہیں تو تب نکلتی ہیں۔مگر ابو جب شام کو آتے ہیں تو باہر آ کر ان سے جڑ کر بیٹھ جاتی ہیں۔مجھے بھی ساتھ نہیں بیٹھنے دیتیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”تمہارے کپڑے بہت اچھے ہیں۔خود پسند کرتے ہو کہ امی؟“

”امی بازار سے لے آتی ہیں۔وہ اور کومل باجی ساتھ جاتی ہیں اور میرے علاوہ کنول باجی کے بھی لے آتی ہیں۔“

حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”کنول اپنے کپڑے خود نہیں لیتی؟“

”وہ کمرے سے نکلے گی تو کہیں جائے گی۔آج جو سوٹ پہنا ہے وہ بھی کومل باجی کا ہے۔اسے کپڑوں کا زیادہ شوق بھی نہیں......مگر کومل باجی بہت تیز ہے۔ہر مہینے نیا سوٹ لیتی ہیں۔“

اطہر سے کوئی بھی سوال پوچھتے تو جواب کے آخر میں کومل کی شکایت ضرور کرتا۔مجھے کنول کے طرز زندگی کے بارے میں آگاہی ہو رہی تھی۔مجھ کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی دنیا میں تنہا رہنے والی لڑکی ہے۔شاید وہ اپنی محفل خود سجا کر اس سے لطف اندوز ہوتی ہے۔

لطیف نے پوچھا۔ ”پڑھائی میں سب سے لائق کون ہے......؟“

اطہر منہ بنا کر بولا۔ ”لائق تو کومل باجی بھی ہیں۔مگر کنول باجی سے زیادہ لائق نہیں۔کنول باجی بہت پڑھتی ہیں، بہت زیادہ۔پڑھتے پڑھتے جب تھک جاتی ہیں تو رونے لگتی ہیں......“

میں نے پوچھا۔ ”پھر چپ کون کراتا ہے؟“

”ابو اس کو کمرے سے باہر لے آتے ہیں۔کہتے بھی ہیں کہ اتنا نہ پڑھا کرو۔بیمار ہو جاؤ گی۔اس کے سر میں درد ہو جاتا ہے۔“

یہ سن کر میں بے چین ہو گیا۔مڑ کر دیکھا تو وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے، طاہرہ سے باتیں کرتی چلی آ رہی تھی۔مجھے دیکھتے پایا تو رک گئی اور معصومیت سے میرا چہرہ تکنے لگی۔لطیف اور اطہر بھی رک گئے تھے۔میں محبت بھری نظروں سے اسے کچھ لمحے دیکھتا رہا اور پھر مڑ کر ہم دوبارہ چل پڑے۔وہ رکتے تو ہم بھی ٹھہر جاتے۔چلتے ہوئے ہمارے قریب آنے لگتے تو ہم بھی چل پڑتے۔

میں نے اطہر سے پوچھا۔ ”اس سے پہلے بھی ٹرپ پر کہیں گئے ہو؟“

سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں......وہ تو کنول باجی نے ٹاپ کیا تو ابو ہمیں لے آئے ہیں۔باجی نے وعدہ کیا ہے کہ ابو سے کہوں گی اور اگلے سال بھی ہمیں لے آئیں گے۔“

”تمہارے ابو اس کا کہنا بہت مانتے ہیں۔“

”مانتے تو میرا بھی ہیں مگر کومل باجی کا نہیں مانتے۔“

☆☆☆

جھیل کے گرد سفر ایک دائرے کا سفر تھا۔اختتام وہیں ہوا جہاں سے آغاز ہوا تھا۔کتنا پیارا سفر تھا جس کے ہر

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

قدم پر خواب اور خوابوں کی تعبیریں تھیں۔ ہر گام سنگ میل تھا اور ہر گام منزل بھی۔ میرا یہ سفر جھیل کے گرد نہیں بلکہ کنول کے گرد تھا۔ کچھ راستہ وہ میرے ساتھ چلی اور باقی کا راستہ وہ...... میری سوچوں میں رہی۔ میں آج اس کے مزاج کی نرمی اور جذبات کی گرمی سے آگاہ ہوا۔ اس نے آج کبھی مجھے اپنی محبت پر مائل کیا اور کبھی مسکرا کر نظروں سے گھائل کیا۔ اس کے لمس سے بھی آشنائی ہوئی اور خوشبو سے بھی۔ سفر بھی خوبصورت تھا اور ہمسفر بھی......

میری باتیں اطہر سے ہو رہی تھیں مگر دھیان میں وہ تھی، میں سب سے غافل مگر مرتکز اسی کی جانب تھا۔

☆☆☆

ہم زیرو پوائنٹ پہنچے اور خالی دری پر بیٹھ گئے۔ ہمارے ساتھ اوپر چھپر ہوٹل پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کے گونجتے قہقہے ہم تک پہنچ رہے تھے۔ جہاں کنول بیٹھی تھی میں اس کے کندھے کے اوپر ملکہ پربت کی برفیلی بلندیاں دیکھ رہا تھا۔ نیلا آسمان اس کے چہرے پر جھکا تھا اور جھیل اس کی آنکھوں میں ڈوبی تھی۔ اس نے اپنی مسکراہٹ کو ہونٹ بھینچ کر دبایا نہ تھا بلکہ ماحول میں وہ اور اس کی مسکراہٹ ایک خوشبو کی مانند پھیلی تھی۔ گالوں کے ڈمپل اور گہرے نظر آنے لگے۔ ہوا سے بچنے کے لیے اپنے گرد شال لپیٹی اور گھٹنوں پر چہرہ سجا کر بیٹھ گئی۔

اطہر اپنی جگہ سے اٹھ کر آیا اور میرے بازو سے لگ کر بیٹھ گیا...... میں اس کی والدہ سے بولا۔ ''آنٹی۔ پلیز اسے ایک گھنٹا کرکٹ کھیلنے کی اجازت دے دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں یہ پہلے سے زیادہ اچھے نمبر لے گا۔''

وہ مجھے سمجھانے لگیں۔ ''یہ کھیلنے نہیں جاتا بلکہ وقت برباد کرنے جاتا ہے۔ بتاؤ کھیلنے سے ملتا کیا ہے؟ الٹا چوٹ لگوا کر واپس آتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی بال گم ہوگئی ہے اور کبھی بلا ٹوٹ گیا ہے۔'' پھر مڑ کر لیٹے خاوند کو دیکھا اور دیکھ کر اپنی خوب تسلی کی۔ اس کے بعد کہا۔ ''جب بھی شام کو تھکے ہارے یہ گھر لوٹتے ہیں تو آگے اس بچے کا رونا دھونا موجود ہوتا ہے۔''

سن کر میں خاموش ہوگیا۔ سب بڑوں کی طرح یہ بھی کھیل کو آوارہ گردی سمجھتی تھیں۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس سے کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا تھا اسی لیے خاموشی میرے لیے غنیمت تھی۔ مگر اطہر بول پڑا۔ ''آپ نے وعدہ بھی کیا تھا، اب امی سے بات تو کریں...؟''

میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ خود مجھ سے پوچھ بیٹھیں۔ ''اللہ نے تم کو کتنا علم دیا ہے۔ کتنی سمجھ دی ہے۔ ہر بات کی تہہ تک پہنچ جاتے ہو مگر یہ سمجھ نہیں کہ کھیل سے وقت کا کتنا زیاں ہوتا ہے؟''

وہ ہر بار مجھے کئی اعزازات دے کر آخر میں ڈانٹ بھی دیتی تھیں۔

''آنٹی...... کھیلنے سے وقت ضایع تو نہیں ہوتا۔''

''کیوں نہیں ہوتا...... مجھے تو نہیں لگتا کہ تم بھی اس طرح سے وقت برباد کرتے ہو گے؟''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مگر وہ وقت میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر گزارتا ہوں۔ اگر اطہر کھیلنے جاتا ہے تو وہ وہی وقت مثبت طریقے سے گزار لیتا ہے۔''

''خود کھیلنے جاتے نہیں اور بچے کو گراؤنڈ میں بھیج رہے ہو۔''

''کھیلنے سے زیادہ میں گیمز دیکھنا زیادہ پسند کرتا ہوں...... کھیلنے میں جلد بور ہو جاتا ہوں۔''

کنول نے پوچھا۔ ''لوگ تو کھیلنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ آپ کیوں بور ہو جاتے ہیں؟''

''کچھ عرصہ ہاکی کھیلی مگر جلد اکتا گیا۔ شاید ایسا ہو کہ مجھ میں اہلیت نہ تھی یا شوق نہ تھا۔ مجھے اکیلے کھیلنے یا اکیلے کام کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔''

''تو آپ ٹیم پلیئر نہیں؟''

''ہوں...... مگر اپنی صلاحیتوں کے بل پر جو چیز ملے اس کا اپنا مزہ ہے...... ایک ٹیم میں کھیلنے سے شاید وہ تسلی نہیں ہوتی جو اپنے زور بازو سے چیز حاصل کر کے ہوتی ہے۔ لہٰذا میں ورزش کے لیے کبھی کبھار تیراکی کرنے چلا جاتا ہوں۔''

اس کی ماں نے پوچھا۔ ''ماں تیرنے سے نہیں روکتیں؟''

''روکتی ہیں مگر میں چوری چھپے چلا جاتا تھا۔ دوسرے دوست جاتے تھے میں چپ چاپ کہیں بیٹھ جاتا۔ ماں سمجھ جاتیں کہ میں اداس ہو جاتا ہوں پھر نہ اجازت دیتی ہیں اور نہ روکتی ہیں۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی...... ''آپ کے روکنے پر وہ رک تو جائے گا مگر اداس رہے گا۔ پڑھائی میں بھی اس کا دل نہیں لگے گا۔ کھیلنا ورزش ہے اور اس سے ذہنی جسمانی نشوونما ہوتی ہے۔ پڑھائی اچھی ہوتی ہے۔ آپ اس کی ایک بات مان لیں اور پھر اپنی ساری باتیں اس سے منوائیں۔''

وہ اپنی جگہ بیٹھیں خلا میں دیکھنے لگیں۔ ساتھ ہلتی بھ

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

جارہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کسی سوچ میں مستغرق ہیں۔ اچانک فیصلہ دیا۔ ''ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں جانے دوں گی۔''

اطہر میرے بازو سے لپٹ گیا۔ کومل بولی۔ ''امی کو سب نے سمجھایا۔ اور تو اور ماموں نے بھی کہا مگر بات آپ کی مانی......''

''اس لیے اس لڑکے کی بات مانی ہے کیونکہ اونچے لوگوں کی صحبت میں رہتا ہے۔ ظاہر ہے کچھ اچھا سیکھتا ہوگا؟'' ... پھر مڑ کے اپنے خاوند کو تنبیہ بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد بولیں۔ ''لوگوں کو کئی بار کہا ہے کہ مجھے بزرگوں کو ملنے سے مت روکا کرو۔ یہ کل کا لڑکا کسی نیک کی صحبت میں دانش کی باتیں کرنے لگا ہے۔''

لطیف نے بھی گرہ لگائی۔ ''بجا فرماتی ہیں...... بجا فرماتی ہیں۔''

پھر میری جانب متوجہ ہوئیں۔ ''باتیں تمہاری عالموں والی مگر یہ حرکتیں کیا کرتے پھر رہے ہو؟''

میں بوکھلا گیا کہ کیا کرتا پھر رہا ہوں۔ کنول اور میں ایک دوسرے کو تشویش بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

انہوں نے طاہرہ کی جانب ہاتھ کا اشارہ کرکے بات آگے بڑھائی۔ ''یہ سوکھی اگر مجھے نہ بتاتی کہ تم کھائی میں چڑیلوں کے پیچھے اتر گئے تھے تو اور کون مجھے بتاتا؟''

میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''پیر سائیں ساتھ تھے تو ڈر نہ لگا.....''

''لیکن بیٹا ان کے اپنے بھی بہت دھندے ہوتے ہوں گے۔ کہاں کہاں تم لوگوں کی رکھوالی کے لیے تمہارے پیچھے بھاگتے رہیں گے؟''

اتنے میں کومل نے طاہرہ کو اپنے ساتھ لپٹایا اور ماں سے کہا۔ ''امی اس کو سوکھی کیوں کہا، کتنی تو اسمارٹ ہے۔''

ماں نے کسی کے جوتے کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ''چپ کرتی ہے کہ اٹھاؤں......؟ ماں کو ٹوکتی ہے...... کم بخت'' اس کے بعد چہرے پر بھرپور محبت لاکر طاہرہ سے بولیں.... ''کتنی سوہنی تیری شکل ہے۔ اپنے آپ کو خالد یاست نہ بنا جو وزن کم کرنے کے چکر میں دیکھنے والی بھی نہیں رہی۔ کچھ کھایا پیا کر کہ کہیں تیری ہڈیوں پر گوشت چڑھے...... ورنہ یہ شکل کیا دیکھنے والی ہے۔'' یہ کہہ کر منہ پھیرے ہلنے لگیں۔

دوسری جانب طاہرہ ہنسے جارہی تھی۔ شکر ہے اس نے بات کا برا نہیں منایا۔

''امی وہ آپ ان سے چڑیلوں کی بات کررہی تھیں۔'' کنول نے ماں کا رخ میری جانب کرنے کی کوشش کی..... مگر سن کر وہ کنول سے کہنے لگیں۔ ''جوان جہان لڑکا ہے۔ کیا اس پر جوتا اٹھالوں؟ سمجھ نہیں رہا میری بات کو۔ ایک جانب اپنے آپ کو ذہین و فطین سمجھتا ہے اور دوسری جانب حرکتیں دیکھو..... لگتا ہے اپنی ماں کی بھی نہیں سنتا تو میری کیا سنے گا۔'' یہ بولنے کے بعد پھر سے فضا میں نظریں جمائے ڈولنے لگیں۔ میں نے کنول کو دیکھا جو ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے بیٹھی تھی۔

اتنے میں جھیل کی جانب سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور طاہرہ کا دوپٹا کندھے سے ڈھلک گیا۔ وہ بولی۔ ''ہائے اللہ کتنے مزے کی ہوا ہے۔ دل کررہا ہے پورا دن یہیں بیٹھی رہوں۔''

لطیف نے کہا۔ ''تم سمجھتی ہو یہ ہوا تھی۔ یہ چاچا شفیع ساتھ سے گزرا ہے۔ تنبیہ کرنے آیا تھا کہ دوپٹا ٹھیک کرکے بیٹھو۔''

اس نے فٹافٹ دوپٹا سر کے گرد لپیٹا اور سہمی نظروں سے چاروں جانب دیکھنے لگی۔ پھر کہا۔ ''ہاں چاچا جی تھے۔ میرے کندھے پر تھپکی بھی دی۔''

لطیف نے کہا۔ ''ہاں یقینی طور پر وہی تھے۔ بھکر کا تیل لگاتے ہیں۔ خوشبو ابھی تک آرہی ہے۔''

یہ سن کے کنول کی والدہ نے سر پر چادر ٹھیک کی اور اس کی بغل مارتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔ ''چاچا یہاں بھی آئے ہوئے ہیں؟''

''بڑے مرشد کا حکم ہے کہ پیر سائیں کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑنا۔ سائیں نے کئی بار برا بھی منایا مگر چاچا شفیع کہتا ہے کہ بڑے مرشد کا کہنا مانوں یا آپ کا۔''

انہوں نے پوچھا۔ ''ہر وقت محترم چاچا جی کے ساتھ رہنے کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ خدانخواستہ، میرے منہ میں خاک: کیا ان کو کہیں سے خطرہ ہے؟''

''آنٹی۔ اس بات کو چھوڑیں۔ اونچے لوگوں کی باتوں میں ہم کیوں پڑیں۔''

''میری عادت نہیں کہ باتیں اِدھر سے اُدھر پہنچاتی پھروں۔ میرا ریکارڈ ہے کبھی دو پیروں کے درمیان میں نے آگ نہیں بھڑکائی۔''

لطیف بولا۔ ''پھر بھی۔''

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''بولا ناں کسی کو نہیں بتاؤں گی..... میرا اعتبار نہیں کر رہا؟''

''وہ..... وہ آنٹی۔''

پھر وہ گرج پڑیں۔ ''بتاتا ہے کہ نہیں! کتنی بار کہوں کسی کو نہیں بتاؤں گی؟''

''بتاتا ہوں بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر لطیف نے مڑ کر اوپر بیٹھے سائیں کو کچھ دیر دیکھا اور پھر نہایت رازداری سے بتانے لگا۔ ''ایک بلا ان پر عاشق ہوگئی تھی۔ انہوں نے کئی بار سمجھایا کہ جنڈی تیرا میرا کوئی میل نہیں ہوسکتا مگر وہ کوئی بات نہیں سنتی تھی، پھر انہیں تنگ کرنے لگی۔ ایک بار بولی اپنا کوئی فوٹو دے دو۔ سائیں نے سمجھایا کہ ہم پیر لوگ فوٹو کو حرام سمجھتے ہیں، نہیں کھنچواتے۔ مگر وہ کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھی۔ آخر سائیں نے اس کو تین دن کے لیے زمین میں گاڑ دیا۔ تین دن بعد سائیں رات کو قبر میں بیٹھے وظیفہ کر رہے تھے کہ وہ آ گئی۔ سائیں کسی مراقبے میں غرق تھے کہ وہ چپکے سے قریب آئی اور دانتوں سے ان کے کندھے کا گوشت ادھیڑ کر بھاگ گئی۔ سائیں کے پیٹ میں ہم نے اکیس ٹیکے لگوائے تب کہیں جا کر افاقہ ہوا۔ اب بھی کبھی کبھار ان کو وہاں سے خارش اٹھتی ہے۔''

چند لمحے تو اس کی والدہ لطیف کو بغور دیکھتی رہیں پھر اس ساری بات پر کچھ غور و خوض بھی کیا۔ آخر کار ہمت ہار کر مرعوب ہوگئیں۔

''ہاں بیٹا پھر تو چاچے کا ساتھ رہنا نہایت ہی ضروری ہے۔''

لطیف نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''آج کل کسی جن کا ساتھ رہنا پیروں میں ایک اسٹیٹس سمبل ہے۔ جن ساتھ نہ ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ ٹلی پیر ہے۔ جتنا بھی جن تگڑا ہوگا علاقے میں قدر و منزلت زیادہ ہوگی۔''

سن کر آنکھیں موندے عقیدت سے سر ہلانے لگیں۔

اس کے بعد لطیف نے بہ آواز بلند بتایا۔ ''گلیشیر میں ابھی ہماری جیپ پھنس گئی تھی۔ ہم اسے باہر نکلنے کے لیے زور لگا رہے تھے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتی تھی پھر اچانک یوں ہوا کہ ہم نے جیپ پر صرف ہاتھ رکھا اور جیپ گولی کی طرح برف سے نکلتی چلی گئی۔ سائیں نے ہمیں یہاں آ کر بتایا کہ وہ سارا زور اجن کا نہیں چاچے شفیع کا تھا۔''

ثروت نے بتایا۔ ''میں بھی سوچ رہی تھی کہ برف میں گھٹنوں گھٹنوں دھنسی جیپ اتنے آرام سے باہر کیسے نکل آئی۔''

اسی دوران ہوا کا ایک اور جھونکا آیا اور طاہرہ کا دوپٹا پھر کھسک گیا..... کومل چلانے لگی۔ ''بھائی بھائی۔ اسے دیکھیں۔ پھر گرا دیا ہے۔''

میں نے زور سے آواز لگائی۔ ''چاچا شفیع۔ طاہرہ کو اپنے..... دوپٹے کا ہوش بھی نہیں۔ اب اسے اچھی طرح سے سمجھا میں۔ یہ کسی کی نہیں سنتی۔''

پھر طاہرہ کی وہی مخصوص باریک آواز اس کے حلق سے نکلی اور وادیوں گھاٹیوں میں پھیل گئی۔ ''نائیں نائیں۔ اس کی مت سننا۔ پلیز..... یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' اور اپنا دوپٹا دوبارہ اوڑھ لیا۔

☆☆☆

اس کی والدہ اپنے کمزور عقیدے اور توہمات کے باعث پیر سائیں کو دل و دماغ سے مرشد قبول کر چکی تھیں۔

میں بڑے غور سے مشاہدہ کر رہا تھا کہ کس طرح کے لوگ جعلی پیروں کے جال میں پھنستے ہیں اور کس طرح سے اپنے ذہن کو گروی رکھ دیتے ہیں۔

جو میں اب تک سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ کچھ چھن جانے کا خوف اور عشق ہم کو تعویذ گنڈوں کی جانب راغب کرتا ہے۔ اتنی روشن خیال گھرانے کی مالکہ اس خوف میں گھری تھیں کہ میرے سارے رشتہ دار میرے گھر کے دشمن ہیں اور اسے تباہ کرنے کے درپے ہیں۔

وہ لطیف سے کچھ اس طرح کی باتیں کر رہی تھیں۔ ''بیٹا۔ اس سفر پر نکلنے سے دو رات پہلے میں نے خواب دیکھا۔ دیکھتی ہوں کہ کنول کے بابا، اللہ انہیں صحت دے، شام کو تھکے ہارے گھر آتے ہیں۔ آ کر صوفے پر ایسے ہی لیٹ جاتے ہیں جیسے اب پڑے ہیں۔ مجھ سے کہتے ہیں چائے بنا دو۔ میں چائے بنا کر سامنے رکھتی ہوں تو کہتے ہیں ادھر میرے ساتھ بیٹھ جاؤ بہت ضروری بات کرنی ہے۔ ان کی آنکھوں میں گہری سوچ بھری ہوتی ہے۔ میں حیران ہو جاتی ہوں کہ کبھی بھی انہوں نے مجھ سے نہیں کہا کہ میرے ساتھ آ بیٹھو۔ میں بیٹھتی ہوں تو بتاتے ہیں کہ رات میں نے بڑا عجیب خواب دیکھا ہے۔ ایک سفید ریش بزرگ رات کو میرے خواب میں آئے تھے۔ پہلے مجھے گلے سے لگایا اور پھر فرمایا کہ اپنی بیوی کو ایک خوش خبری دے دو۔ انہیں بتا دو کہ جس کی اسے سالوں سے تلاش ہے وہ اس سفر میں انھیں ملے گا۔ اس سفر میں وہ اپنی منزل پا لے گی۔

www.pakistanipoint.com

میں پھر سفر کے پہلے دن سے متلاشی تھی کہ میری منزل کہاں ہے۔ لاہور سے اسلام آباد اور پھر مری آ گئے مگر کوئی اشارہ نہ ملا۔ تم لوگوں کو دیکھا مگر لپا اور آوارہ سمجھ کر کوئی توجہ نہ دی۔ نتھیا گلی میں بھی تم لوگ نظر آئے تو، اللہ معاف کرے سوچا کہیں ہمارا یہ لوگ پیچھا تو نہیں کر رہے۔ یہ خیال تک نہ آیا کہ میری مراد انہی لڑکوں کے بیچ میں گھوم پھر رہی ہے۔

پھر ناران آ گیا اور میں اپنی جگہ پریشان کہیں میری منزل کھوئی تو نہیں ہوگئی ہے۔ سفر ختم ہو رہا ہے اور کوئی بھی مجھے نظر نہیں آ رہا تھا' پھر اگلے روز تم لوگ بھی یہاں آ ٹپکے۔ جب ہمارا ہوٹل بھی ایک ہوا تو دل نے کہا کہ جن کو تو آوارہ اور لفنگا سمجھ رہی ہے کہیں تیری منزل ان میں موجود نہ ہو۔''

پھر میری جانب اشارہ کر کے بولیں۔ ''یہ لڑکا ہم سے ملنے آیا اور کنول کے بابا کا دوست بن گیا۔ دعا سلام ہوئی تو میرا شک یقین میں بدلنے لگا۔ مجھے نکتہ سمجھ میں آیا کہ یہ تو نہیں ہے مگر ان میں کوئی نہ کوئی اللہ کا ولی موجود ہے۔ جب رات پیر صاحب کو دیکھا تو ٹھک سے سمجھ گئی کہ یہی تو ہیں جن کی تلاش میں سالوں سے پھر رہی ہوں۔''

میں اس کی والدہ کی زبان سے یہ سن کر ہکا بکا بیٹھا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو خاتون سامنے بیٹھی ہیں وہ اتنی توہم پرست بھی ہو سکتی ہیں۔ وہ اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھیں۔ ''میں اس لڑکے کی اتنی عزت اس لیے بھی کرتی ہوں کہ اس کی وجہ سے مجھے پیر صاحب ملے ہیں۔ اور وہ اس بچے کو پیار سے جنڈری جنڈری بھی کہہ رہے تھے۔ دیکھو کس طرح سے میرا خواب سچا ہوا ہے.....''

یہ ماجرا سن کر ہم دونوں سکتے میں بیٹھے تھے۔ لطیف نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر توجہ سے مخاطب ہوا۔ ''حیرت ہے ایسے سچے خواب اس دور میں بھی لوگوں کو آتے ہیں؟''

تھوڑی سی ناراض ہوگئیں۔ ''ناں بیٹا..... اس عمر میں جھوٹ تو نہیں بولوں گی۔''

''آنٹی۔ میرا مطلب ہے کہ آپ پر اللہ کی خاص عنایت ہے۔ اتنے واضح اشارے اس مادہ پرست دور میں کس کو نظر آتے ہیں۔''

سن کر انہوں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

سر ہلا کر لطیف نے پوچھا۔ ''انکل سے خواب کا ذکر کیا؟''

انہوں نے سر گھما کر لیٹے ہوئے شوہر کو دیکھا اور دوبارہ دیکھ کر اپنی تسلی بھی کی۔

''ان کو اپنے خواب نہیں بتاتی۔ ہنس دیتے ہیں۔ ساری تعبیریں الٹ ہو جاتی ہیں۔''

لطیف لحظہ بھر کچھ سوچتا رہا' پھر ان سے کہا۔ ''میرا خیال ہے انکل کے خواب میں پیر سائیں کے مرشد آئے تھے۔ ان کو اٹھا کر پوچھیں بزرگ کی شکل کیسی تھی؟''

''ابھی پوچھتی ہوں۔'' کہہ کر شوہر کی جانب گھومیں..... پوچھا۔ ''بزرگ کی شکل کیسی تھی.....؟''

وہ ہڑبڑا کر جاگ گئے۔ ''کون سا بزرگ؟''

''جو آپ کے خواب میں آئے تھے۔''

''کون میرے خواب میں آیا تھا۔ بیگم۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟''

بگڑ کر بولیں۔ ''کیوں مجھے سب کے سامنے جھوٹا کر رہے ہیں۔ خود تو بتایا تھا کہ ایک بزرگ میرے خواب میں آئے تھے۔''

''بیگم آپ اچھی طرح جانتی ہیں مجھے خواب دکھائی نہیں دیتے۔ اور میں نے آپ سے کبھی نہیں کہا کہ میں نے کوئی خواب دیکھا۔''

اب وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ کسی نقطے پر غور کرتے کرتے اچانک چونک پڑیں۔ ''بیٹا خواب تو میں نے دیکھا تھا۔ انہوں نے کب دیکھا تھا؟''

لطیف نے اپنے سر کو کھجایا۔ ''ابھی تو آپ نے کہا ہے کہ خواب میں انہوں نے ایک بزرگ کو دیکھا.....''

''بیٹا۔ یہ خواب میں مجھے کہتے ہیں کہ میں نے خواب دیکھا۔ انہوں نے خواب نہیں دیکھا۔ خواب تو میں نے دیکھا تھا۔''

لطیف نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''اگر انہوں نے خواب نہیں دیکھا تو بزرگ کو پھر کہاں دیکھا تھا؟''

''اپنے خواب میں.....''

''ابھی تو آپ کہہ رہی ہیں کہ انہوں نے تو خواب نہیں دیکھا.....''

''کہہ تو رہی ہوں خواب میں نے دیکھا۔''

''تو بزرگ کو بھی آپ نے دیکھا؟''

''میں نے نہیں۔'' وہ جھنجلا گئیں۔ لطیف نے ان کو مکمل گھما دیا تھا۔ وہ بتانے لگیں۔ ''بزرگ کو خواب میں انہوں نے دیکھا.....''

''آنٹی میں کنفیوز ہو رہا ہوں۔ جب انہیں خواب نہیں آتے تو خواب میں بزرگ کیسے آ سکتے ہیں؟''

وہ دانت پیس کر بولیں۔ ''بار بار کہہ رہی ہوں خواب

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

میں نے دیکھا۔انہوں نے نہیں۔ میرے خواب میں آکر یہ کہتے ہیں میں نے خواب دیکھا۔"

یعنی دو دو خواب دیکھے؟ آنٹی میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ پہلے آپ نے کہا کہ انہوں نے خواب دیکھا۔اب کہہ رہی ہیں میں نے دو دو خواب دیکھے......

"کہاں سے آگئے دو خواب؟ خواب ایک ہی تھا جو میں نے دیکھا۔"

"تو بزرگ کو انہوں نے جاگتے ہوئے دیکھا؟"

"نہیں ......" وہ چلّانے لگیں۔"انہوں نے خواب دیکھا اور پھر مجھے خواب میں آکر بتایا کہ میں نے خواب میں بزرگ کو دیکھا ہے...... سمجھے۔"

"جو بتانا تھا خواب میں آکر کیوں بتایا؟ سیدھی طرح صبح کو ناشتے پر آپ کو بتا دیتے؟"

"چپ کر چپ......" بالآخر وہ پھٹ پڑیں۔"میرا دماغ تم نے چاٹ کھایا۔ ایک سیدھی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی۔ معلوم نہیں کس یونیورسٹی نے تم کو داخلہ دیا ہے۔ ساری بات مجھے بھی بھلا دی۔"

پھر کسی سے پانی مانگا اور سارا گلاس پی گئیں۔

میں نے لطیف کو پاؤں سے ٹھوکا لگایا کہ اب بس کر اور وہ ڈانٹ کھا کر معصوم صورت بنائے بیٹھا تھا۔

پانی پی کر ان کے لہجے میں نرمی آئی۔"یہ باریک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ جو بتا رہی تھی صرف اس پر غور کر۔ اِدھر اُدھر کی نہ مار......" یہ کہہ کر خود کلامی کے انداز سے بولیں۔"اس خواب کی تعبیر بھی الٹی ہوگئی......"

لطیف نے خود کو کوستے ہوئے کہا۔"آنٹی۔آپ بجا فرماتی ہیں۔آپ کی باتیں صرف پیر سائیں ہی سمجھ سکتے ہیں۔" پھر ذرا سے توقف کے بعد بولا۔"تو آپ کیا کہہ رہی تھیں؟"

انہوں نے بھی فوراً سے پیشتر اپنی بات بدلی۔"پیر صاحب کے مرید تو بہت ہوں گے؟"

اچھا تھا یہ ساری گفتگو آہستگی سے ہو رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کنول ہمیں سنے۔ وہ کیا سمجھتی کہ اس کی ماں کو ہم دونوں نے ستایا ہوا ہے۔ اچھا تھا میں نے اپنے آپ کو اس پیری فقیری کی باتوں سے دور رکھا ہوا تھا۔

اس کی والدہ کا سوال سن کر لطیف نے جواب دیا۔"مرید تو اتنے ہو گئے ہیں کہ اب گننے بھی نہیں دیتے کہتے ہیں نظر لگ جاتی ہے۔"

"تو بہت مصروف رہتے ہوں گے؟"

"بہت مصروف رہتے ہیں۔ ہم لوگ تو خوش قسمت ہیں کہ پیر سائیں ہمیں یہاں بیکار ملے...ورنہ ان کے پاس اپنے اسائنمنٹ کرنے کا بھی ٹائم نہیں ہوتا۔ اکثر فرماتے ہیں جنڈری تو نہ ہوتا تو تیرا پیپر پہلے سمسٹر سے آگے نہ بڑھتا۔"

"اپنا آستانہ بھی تو ہوگا؟"

"جی کیوں نہیں......"

"بڑی جگہ ہے؟"

"جی بہت بڑی......ہم نے سوچا ہے جب انتقال فرمائیں گے تو نہیں ان کا بہت بڑا مزار بنوائیں گے۔"

وہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں پڑ گئیں، پھر لطیف سے پوچھا۔"آستانے پر کون کون سے دن بیٹھتے ہیں؟"

"وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔۔اور انہوں نے کہاں جانا ہوتا ہے......"

"تمہارا مطلب کہ جب بھی کوئی آئے ملاقات ہوسکتی ہے۔"

"نہیں نہیں ایسی بات نہیں۔ ملنے کا ٹائم مقرر ہوتا ہے۔ ہر وقت عبادت میں غرق رہتے ہیں۔"

"کس دن لوگوں سے ملتے ہیں؟"

"مقامی لوگوں سے جمعہ کے روز اور باہر کے مریدوں سے عصر کے بعد ہر روز ملتے ہیں۔ ہاں کوئی باہر سے اپنی گاڑی پر آئے تو یونیورسٹی ٹائم کے بعد کسی وقت بھی مل سکتا ہے۔ کہتے ہیں آدھی رات بھی ہو تو جگا دیا کرو۔"

"اچھا...... تو ضرورت مند باہر سے بھی آتے ہیں؟"

"ہاں جی۔ مشرق میں جھنگ اور مغرب میں غزنی تک مرید ہیں۔ جنوب میں تونسہ سے پہلے اور شمال میں لکی مروت سے خوشاب تک ان کا سکہ چلتا ہے۔ اندازہ ہے انشاللہ ان کے عرس پر کم از کم تیس ہزار تک لوگ آئیں گے۔ ان کا اپنا اندازہ تو پچاس ہزار کا ہے مگر اللہ کو جان دینی ہے جھوٹ کیوں بولوں یہ کہ میں ہزار سے زیادہ نہیں آئیں گے۔"

لطیف ہر حربہ استعمال کر کے انہیں بدگمان کر رہا تھا مگر وہ اپنے "عقیدے" پر سختی سے جمی ہوئی تھیں۔

انہوں نے پوچھا۔"علاقے میں تو بہت رعب دبدبہ ہوگا؟"

"بہت زیادہ ہے......ہم لوگ ڈاکوؤں کے علاوہ صرف ان سے ڈرتے ہیں۔ بڑا خوف ہے ان کا۔"

"ان کی کرامات تو بہت ہوں گی؟"

Wajid Azeem www.pakistanipoint.com

"بڑی کہانیاں مشہور ہیں۔ سارا علاقہ جانتا ہے۔"

بے چینی تو وہ پہلے سے ہو رہی تھیں اور بالآخر اب بول پڑیں۔ "بیٹا۔ تمہارے الفاظ میں پیر صاحب کے لیے عقیدت جھلکنی چاہیے۔ تم تو یوں باتیں کر رہے ہو جیسے تمہارے کوئی دوست ہوں۔ خیال سے بات کیا کرو۔"

"بات آپ کی بجا ہے۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ ہم کلاس فیلو ہیں۔ سب کو یہی نظر آنا چاہیے کہ ہم آپس میں دوست ہیں۔ مجھے کبھی پروٹوکول مت دینا۔ شہرت سے انہیں چڑ ہے؟"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ ان کے واقعات تو بہت ہوں گے؟"

"بہت واقعات ہیں۔ ارادہ یہ ہے کہ ان کی وفات کے بعد سارے واقعات پر مبنی ایک موٹی کتاب چھپواؤں گا۔ میں تو ابھی چھپوا لیتا مگر دوستوں کا اصرار ہے کہ دو چار سال صبر کر لیتے ہیں، بعد میں چھپوائیں گے۔"

وہ برا مان گئیں۔ "چلو انہیں دوست سمجھو مگر تم نے تو پیر صاحب کے خدانخواستہ مرنے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ان کی درازی عمر کے لیے دعا کرو۔"

لطیف نے بتایا۔ "آپ نے سنا ہوگا کہ نیک لوگوں کو اللہ سے میل کی تڑپ ہوتی ہے۔ وہ زندگی سے محبت نہیں رکھتے سائیں بھی انہی خیالات کے مالک ہیں......"

"چلو......کوئی واقعہ تو سناؤ؟"

لطیف ٹھنڈا سانس بھر کر بولا۔ "کیا سناؤں اور کہاں سے سناؤں۔ سوچتا ہوں تو جسم خوف سے کانپنے لگتا ہے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ جیسے عام بندے کو یہ نظر آتے ہیں یہ وہ نہیں ہیں۔ یہ وہ ہیں جو نظر نہیں آتے۔ ان کے رازوں سے پردہ میں کیسے اٹھاؤں؟"

"بیٹا کچھ نہیں ہوگا۔ میں بھی تو ان کی خاص معتقد ہوں۔ تم بے فکر ہو کر سناؤ۔ باقی کی ذمے داری میں لیتی ہوں۔"

لطیف آنکھیں بند کیے بائیں ہاتھ سے اپنا ماتھا سہلا رہا تھا۔ وہ انتظار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اپنے پاؤں کی ٹھوکر کمر میں لگائی تو بول اٹھا۔ "آدھی راتوں کو قبروں میں بیٹھ کر وظیفہ کرتے ہیں۔ روحوں سے باتیں تو ایسے کرتے ہیں جیسے میں آپ سے کر رہا ہوں۔ جنات سے مخلوق خدا ڈرتی ہے، یہ انہیں ایسے ڈانٹتے ہیں جیسے آپ اطہر کو ڈانٹتی ہیں۔ بکری، بھینس، بندر، کوا اور بگلوں کی زبان فرفر بولتے ہیں۔ کوئی پہچان نہیں سکتا کہ یہ بکرا بات کر رہا ہے کہ سائیں؟ اس کے علاوہ ایک ایسی کرامت ہے کہ بتاتے ہوئے بہت عجیب لگ رہا ہے۔"

"کیا عجیب لگ رہا ہے...... بیٹا؟"

"آنٹی......سائیں ہمارے اڑتے بھی ہیں......"

"ہائیں......" اتنے زور سے کہا کہ ساری لڑکیاں بھی ہماری جانب متوجہ ہوگئیں۔

"آنٹی! پکی خبر دے رہا ہوں۔"

اس کی والدہ پھٹی نظروں سے لطیف کو دیکھ رہی تھیں۔

لطیف بولا۔ "بہت پیر آپ نے دیکھے ہوں گے مگر اڑنے والا کبھی نہیں دیکھا ہوگا......"

انہوں نے اُمید بھرے لہجے میں پوچھا۔ "اڑ کر مریدوں سے ملنے بھی جاتے ہونگے؟"

"نہیں۔ مریدوں سے ملنے اڑ کر جانے لگیں تو دن میں دس دس بار تو ٹیک آف کریں گے۔ صرف مرشد سے ملنے جانا ہو تو اڑ کر جاتے ہیں۔ وہاں کے لیے دیر نہیں کرتے ورنہ وہاں پہنچنے میں دو دن لگ جاتے ہیں۔ ڈیرہ سے ملتان فلائنگ کوچ پر، پھر آگے خیبر میل اور پھر سے نواب شاہ' آگے ڈاٹسن، پھر تانگہ اور آخر میں پیدل......اب تو جہاز کی اسپیڈ سے جاتے ہیں۔"

"پہلے مرشد کے پاس ویگنوں پر جاتے تھے؟"

لطیف نے جواب میں کہا۔ "جی......اڑنا تو اب سیکھا ہے۔ ڈیڑھ دو سال پہلے تک تو ویگنوں پر جاتے رہے ہیں۔"

"گاڑی نہیں رکھتے؟"

"گاڑی کا سفر نہیں کرتے۔ لوگ نئی سے نئی گاڑیاں لے آئے مگر لوٹا دیں۔ ہاں سائیکل لے لیتے ہیں۔ ہمبر سائیکل کے بہت شوقین ہیں۔ کہتے ہیں اس کی چین نہیں اترتی۔"

وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگیں۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ لطیف تعریف کر رہا ہے کہ تکذیب کر رہا ہے۔

لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ "ان کو اڑتے کبھی دیکھا ہے؟"

لطیف حیل و حجت کرنے لگا۔ انہوں نے مکمل یقین دہانی کرائی کہ یہاں کی بات آگے نہیں پہنچے گی... پھر لطیف بہ آواز بلند بتانے لگا۔ "چند روز پہلے کی بات بتاتا ہوں۔ ہم بارہ گلی سے ایبٹ آباد پہنچے تھے۔ گھروں کو واپس جانے کے لیے ہم نے پنڈی کی بس پر سامان بھی چڑھا لیا تھا۔" پھر میری جانب اشارہ کر کے بولا۔ "مگر اس نے کوئی سازش کی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کہ کھڑے کھڑے سب کو ناران کے لیے تیار کر لیا لیکن سائیں سے پروگرام تبدیل کرنے کی اجازت نہ لی۔ سائیں بہت ناراض تھے کیونکہ وہ کہیں بھی جانے سے پہلے اپنے مرشد سے اجازت لیتے ہیں۔ پہلے سارے علاقے کا حفاظتی حلقہ کھنچواتے ہیں۔ اسی دوران ہم ایبٹ آباد کے ہوٹل میں آ ٹھہرے۔ ہم دوپہر کو آرام کر رہے تھے اور سائیں میرے ساتھ والے بستر پر استراحت فرما رہے تھے۔ ان کے خراٹے اچانک بند ہو گئے اور میں نے کوئی توجہ نہ دی پھر ان سے ایسی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آنے لگی جیسے گلیشیر سے آتی ہے۔ میرے دل میں یہ خیال ایسے ہی آ گیا کہ کہیں انتقال تو نہیں فرما گئے؟ آنکھیں گھما کر چوری چوری انہیں دیکھا کہ وہ ساکت لیٹے ہیں اور لگا سانس بھی بند ہے۔ بالکل ایسے پڑے تھے جیسے نہلا دھلا کر تازہ میت پڑی ہوتی ہے۔ پہلے تو ڈرا مگر پھر ہمت کر کے ذرا ہلایا تو ٹس سے مس نہ ہوئے۔ نبض دیکھی تو وہ بھی بند تھی۔ صدمے سے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ بھی فکر کہ اتنی بھاری لاش ڈھو کر ڈیرہ کیسے لے جائیں گے۔ ڈر الگ لگ رہا تھا۔ گلا ایسا خشک ہوا کہ چیخ مارنا چاہتا مگر چیخ بھی نہ نکلتی تھی۔ اب سب دوستوں کو کیسے بتاؤں کہ سائیں اس دنیا سے منہ موڑ گئے ہیں۔ سوچا پہلے گلا پانی سے تر کر لوں اور پھر دوبارہ سے لیٹ کر کوئی بھیانک چیخ ماروں گا جو ان کے مرتبے کے بھی شایان شان ہو۔ میں روتا سسکتا آہستگی سے بستر سے اترا اور جگ سے گلاس میں پانی بھرا۔ ہونٹوں تک گلاس لایا ہی تھا کہ لاش سے آواز آئی......''

''جندڑی ہک گھٹ میکوں وی پلا ویں ......'' (ایک گھونٹ مجھے بھی پلانا......)

لاش کو بولتا سنا تو وہی بھیانک چیخ بغیر گلا تر کیے میرے حلق سے نکلی کہ سارے دوست ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ساتھ کمرے کے دوست بھی بھاگے چلے آئے۔ گلاس فرش پر پڑا تھا اور میں متواتر چیخے جا رہا تھا۔ دیکھا تو لاش بیٹھی مجھے گھورے جا رہی ہے۔ میں اور زور سے چیخنے لگا۔ دوستوں کو بتاتا تھا کہ یہ سائیں نہیں یہ سائیں کا بھوت ہے۔ اصل والے سائیں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ مگر کوئی... دوست بھی میری بات نہیں سن رہا تھا۔ کوئی میری پیٹھ مل رہا ہے' کوئی تلوے سہلا رہا ہے اور کوئی پانی پلا رہا ہے مگر لاش متواتر ایک ہی بات کہے جا رہی ہے......

''زیادہ ٹرٹر نہ کر۔ وہ بھی ایبٹ آباد میں اور دوپہر کے وقت؟''

جب چلّانے سے میں نہیں رکا تو لاش نے سب سے کہا کہ تم لوگ بیٹھو، میں خود بات کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر لاش مسکرانے لگی......

لاش کو مسکراتے دیکھ کر میرا چیخنا رک گیا۔ سوچا لاش سب کچھ کر سکتی مگر مسکرا نہیں سکتی۔ آخر کار مجھے سائیں کی بات سمجھ میں آ گئی۔ وہ بتا رہے تھے کہ جب تم لوگوں نے پروگرام بدلا تو ناران کے علاقے تک حلقہ لگوانے مجھے خود مرشد کے پاس جانا پڑ گیا۔ میں لیٹا اور جسم بستر پر چھوڑ کر روح مرشد سے ملنے گئی تھی' اور طیفے نے سمجھ لیا کہ سائیں پھڑک گیا ہے۔ ناسمجھ ہے تو میرے جسم کو غلطی سے ہاتھ لگا بیٹھا۔ جب روح مرشد کے پاس گئی ہو تو خبردار میرے جسم کو ہاتھ نہیں لگانا۔ مجھے فوراً واپسی کرنی پڑتی ہے۔

کسی نے پوچھا۔ ''فوراً واپسی کیوں کرنی پڑتی ہے؟''

''پتا چل جاتا ہے کہ کوئی ہتھ کھڑاندی (جسم کو ہاتھ لگا) کر رہا ہے۔''

''سائیں ہاتھ لگانے سے کیا ہو جاتا ہے؟''

بولے۔ ''کسی کا کیا اعتبار کہ میں مرشد کے پاس بیٹھا ہوں اور کوئی میرے بدن کو مرا سمجھ کر دفنا دے' پھر قیامت تک میری روح اپنا جسم ڈھونڈتی رہے گی۔ یہی روح ہوتی ہے جو بدن نہ ملنے پر بدروح بن جاتی ہے۔''

پھر ہمیں نصیحت کی کہ میری غیر موجودگی میں آگ لگ جائے تو سب سے پہلے میرے جسم کو بچانا۔ اگر میں جل کر کوئلہ ہو گیا تو سب کو ایک ایک کر کے فنا کر دوں گا۔ خبردار آگ لگتے ہی دڑکی (دوڑ) نہیں لگانی۔

اور یہ بھی بتایا کہ میرے پیچھے میری برائی کوئی نہ کرے سب سن رہا ہوتا ہوں۔

لطیف نے بات مکمل کی تو فضا میں ایک گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ سب اپنی جگہ ساکت بیٹھے تھے۔ اچانک کومل زور سے ہنس کر بولی۔ ''ان کو تو ویزے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ جہاں جانے کا دل کیا وہیں کو نکل لیے۔ کبھی دبئی، کبھی لندن، کبھی امریکا کبھی سعودی عرب......اور کبھی ادھر کبھی ادھر۔'' یہ کہہ کر ایک زوردار تالی بجائی اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

اچانک وہ ہوا جس کی اُمید ہم میں سے کسی کو نہ تھی......

(جاری ہے)

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

زندہ موت

کوثر اسلام

وہ پیدا ہوا تھا ایک شریف گھرانے میں مگر ہوسِ زر نے اسے جرم کا راستہ دکھایا اور وہ اس قابلِ نفرت راستے پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ عالمی پیمانے پر وہ بدنام ترین جرائم پیشہ تھا۔ اس نے دولت کا انبار جمع کرلیا تھا۔ اتنے کرنسی نوٹ تھے کہ چوہے کھاتے، دیمک چاٹتی۔ ایک دن جب وہ سفر میں تھا اور اس کی بیٹی کو سردی لگنے لگی تو اس نے کرنسی نوٹ جلا جلا کر ساری رات اسے گرمی پہنچائی تھی

ایک عالمی پیمانے پر بدنام جرائم پیشہ کی زندگی کا عکس

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

یہ 1949ء کی ٹھٹھرتی ہوئی ایک سرد رات تھی۔ کولمبیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں ریونیگرو کے باسی بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ گھڑی نے بارہ بجائے تو تاریخ کے ساتھ مہینا بھی نومبر سے دسمبر میں تبدیل ہوگیا۔ ایمبل جیسس اسکوبار سگریٹ سلگائے اور کمبل اوڑھے صحن میں بنے ایک چھپر کے نیچے ٹہل رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کمرے کے دروازے کے سامنے ٹھہر جاتا اور چند لمحے سوچ کر آہستہ سے کہتا۔ ''سب خیریت ہے۔''

''ہاں خیریت ہے بے فکر رہیں۔'' اندر سے آواز آتی۔

جیسس اسکوبار ایک چھوٹا سا زمیندار تھا۔ صبح سویرے وہ کھیتوں پر جاتا اور شام ڈھلے واپس آتا۔ کھیت کے راستے سے ہر روز ایک لڑکی گزرتی تھی۔ اس کا نام ..... ہرملڈا

گویا یا تھا وہ اسے پسند آئی۔ ہرملڈا ایک ایلیمنٹری سکول میں ٹیچر تھی۔ وہ ہر صبح جیسس اسکوبار کے کھیت کے راستے سے گزرتی اور دوپہر کے بعد واپس آتی۔ جیسس اسکوبار نے ایک دن جب وہ اسکول سے واپس آرہی تھی اسے روکا۔ اور اپنی محبت کا اظہار کر دیا ہرملڈا نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔

ان کی طویل ملاقاتیں بالآخر شادی پر منتج ہوئیں۔ جیسس اسکوبار کے جھونپڑی نما مکان میں ضروریاتِ زندگی گو بہت کم تھیں لیکن اس کے بے انتہا پیار کی وجہ سے ہرملڈا اس کے ساتھ بہت خوش تھی۔ عورت اپنے مجازی خدا سے محبت کی طالب ہوتی ہے اور جب اسے وہ محبت مل جائے تو پھر وہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتی۔ وہ کانٹوں پر بھی اس کے ساتھ زندگی گزار لیتی ہے۔

ان کی شادی کا یہ تیسرا سال تھا۔ شادی کے دو سالوں میں ہرملڈا کے یکے بعد دیگرے دو بچے پیدا ہوئے۔ شام سے اس کی طبیعت خراب ہوئی تو جیسس اسکوبار ایک دائی اپنے ساتھ لے آیا۔ دائی ہرملڈا کے ساتھ کمرے میں موجود تھی اور جیسس اسکوبار بے چینی سے باہر ٹہل رہا تھا۔ رات کی چادر آہستہ آہستہ سرک رہی تھی اور اس کے نیچے سے صبح صادق جھانکنے کے لیے بے تاب تھا۔ ستارے بھی ٹمٹما کر بجھنے لگے تھے۔ دور کہیں سے مرغ کی آذان نے صبح کی اطلاع دی تو کمرے سے بچے کی چیخ نے اسے خوشخبری سے نوازا۔ وہ کمرے کی طرف دیوانہ وار دوڑا جیسے ہی وہ کمرے کے قریب پہنچا کمرے کا دروازہ کھلا اور دائی نے سر نکال کر کہا۔ ”ابیل جیسس تجھے بیٹا مبارک ہو۔“

ابیل جیسس نے جیب سے چند نوٹ نکالے اس کے ہاتھ خوشی سے کانپ رہے تھے۔ جذبات سے مغلوب آواز میں اس نے کہا۔ ”بہت بہت شکریہ...... تجھے بھی مبارک۔“ نوٹ اس نے دائی کے ہاتھ پر رکھے۔

دائی نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

”تیرا بیٹا بڑا نام کمائے گا۔ مخصوص ساعتوں میں پیدا ہونے والے بچے غیر معمولی ہوتے ہیں اس کا خیال رکھنا۔“ یہ کہہ کر دائی واپس مڑی اور ہرملڈا کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جیسس اسکوبار بھی دیگر انتظامات میں مشغول ہو گیا۔

☆☆☆

بچے کا نام پابلو اسکوبار رکھا گیا۔ وقت کا پہیا گھومتا رہا، پابلو آہستہ آہستہ بڑا ہونے لگا۔ وہ بچپن ہی سے بہت ذہین تھا ہر چیز کا مشاہدہ کرتا اور ذہن کے مطابق اس سے نتائج اخذ کرتا۔

ایک دن کچھ بچوں نے اسے مارا تو وہ روتا ہوا ماں کے پاس آیا ماں نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ”مرد کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے مرد بنو مرد...... آئندہ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں۔“

اور اس کے بعد مرتے دم تک اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ پابلو اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔ ماں کی ہر بات وہ یاد رکھتا اور حتی الوسع اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا۔

پابلو کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ پیسوں سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ دکاندار پیسوں کے بغیر اسے کچھ نہیں دیتا۔ یعنی جتنے زیادہ پیسے ہوں گے اتنی زیادہ چیزیں خریدی جا سکیں گی۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد وہ ہر کام پیسوں کے عوض کرنے لگا یہاں تک کہ گھر کے کام بھی۔ اپنے بھائی اور دوستوں سے بھی وہ پیسے لیتا۔

اسکول میں سالانہ پیپر ہو رہے تھے۔ میتھس کا پرچہ لازمی تھا۔ کلاس کے کچھ لڑکے میتھس میں کمزور تھے وہ پابلو کے پاس آئے اور کہا۔ ”پابلو...... میتھس کا پیپر لازمی ہے اور یہ ہمارے لیے بہت مشکل ہے اگر اس میں ہم فیل ہو گئے تو اس کلاس میں دوبارہ سال گزارنا پڑے گا۔“

”تو......“ پابلو نے کہا۔

”اگر تم یہ پرچہ پاس کرا دو تو تمہارا احسان ہوگا۔“

”میں کیسے پاس کرا سکتا ہوں؟“

”تم ٹیچر کی الماری سے پرچہ نکال کر اس کے سوال ہمیں بتا دو۔ بریک کے دوران وہ چائے پینے کے لیے چلے جاتے ہیں اس دوران تم یہ کام کر سکتے ہو۔“

”کتنے پیسے دو گے.؟“

”کیا تم ہم سے بھی پیسے لو گے، ہم تمہارے دوست ہیں۔“

”دوستی اپنی جگہ...... کاروبار اپنی جگہ۔“

”تو کیا یہ کاروبار ہے۔“

”یہ زندگی ہی ایک کاروبار ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے ہم تمہیں پیسے دے دیں گے۔“

پابلو نے پرچہ نکال کر انہیں دے دیا اور ان سے پیسے لے لیے۔

لڑکے جب پرچہ دینے کے لیے بیٹھ گئے تو وہ پرچہ نہیں تھا جو پابلو نے انہیں دیا تھا۔ استاد کو کسی طریقے سے معلوم ہو گیا تھا اور اس نے وہ پرچہ تبدیل کر دیا تھا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

پابلو اس سے بہت اداس ہوا۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا اس کی ماں اس کے پاس آئی اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے بیٹے کیوں اداس ہو۔''

''بس ایسے ہی'' پابلو نے ٹالنے کی کوشش کی۔

''اپنی مما کو بھی نہیں بتاؤ گے۔'' ماں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا سر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

پابلو نے پوری بات بتائی وہ ماں سے کچھ نہیں چھپاتا تھا۔ یہ سن کر اس کی ماں نے کہا۔ ''بیٹے جس دن تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس پر افسوس کرنے سے بہتر ہے کہ اسے اسی دن سدھار لو۔''

''سمجھ گیا ماں۔'' پابلو نے سعادت مندی سے کہا۔

''اور ایک بات اور یاد رکھو کبھی بھی ایسی بے وقوفی مت کرنا جس سے دوسرے تمہیں پکڑ سکیں۔ یہ دنیا چالاک لوگوں کے لیے ہے بے وقوفوں کے لیے نہیں۔''

''ایک سوال پوچھوں؟''

''ہاں ہاں پوچھو.....''

''کیا ہم ہمیشہ سے زمیندار ہیں اور زمیندار رہیں گے؟''

''نہیں تمہارے دادا زمیندار نہیں تھے۔ وہ بہت ہوشیار اور چالاک تھے۔''

''وہ کیا کرتے تھے۔''

''وہ دوسرے گاؤں میں کم قیمت پر شراب خریدتے اور اسے یہاں لا کر فروخت کرتے۔''

''یہ تو اسمگلنگ ہوئی..... مگر وہ یہ کیسے کرتے تھے۔''

''وہ شراب خرید کر ایک تابوت میں رکھتے تابوت کی تلاشی کوئی نہیں لیتا۔ وہ چند لوگوں کو کرایہ پر حاصل کرتے جو تابوت یہاں لے آتے۔ یہاں پہلے سے تیار شدہ قبر میں تابوت رکھتے رات کو وہ تابوت سے شراب نکالتے اور صبح اسے بیچ دیتے۔''

''تو کیا لوگ اسے خریدتے تھے۔''

''ہاں بیٹے..... یہ نشہ ہے اور نشے کے لیے لوگ کچھ بھی کرتے ہیں اس لیے تمہیں منشیات سے دور رہنا چاہیے۔''

''پینے سے..... لیکن بیچنے سے نہیں۔'' دونوں ماں بیٹے ہنس پڑے۔ تبھی سے یہ بات پابلو کے ذہن میں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

پابلو کے چھ بہن بھائی تھے۔ کم آمدنی اور بڑے کنبے کا اکلوتا کفیل کو خط غربت سے بھی نیچے لا پھینکا۔ پابلو نے جب بھی دیکھا گھر میں غربت کو ناچتے ہوئے دیکھا۔ اس عسرت کدے میں غربت کے رقص کو روکنے کے لیے اس نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ وہ ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار تھا جس سے اسے پیسا ملے۔

اس کے کزن نے اس کی ملاقات ایک شخص سے کروائی یہ شخص نقلی برانڈ کے سگریٹ بناتا تھا۔ اسے سگریٹ فروخت کرنے کے لیے آدمیوں کی ضرورت تھی۔ اس نے پابلو سے کہا۔ ''میں تمہیں سگریٹ کے پیکٹ دوں گا تمہیں اسے مارکیٹ میں بیچنا ہے۔''

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔''

''ضمانت کے طور پر مجھے کچھ رقم دو گے یا تم سگریٹ کے پیکٹس لے کر بھاگ جاؤ۔''

''سر..... پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں اگر پیسے ہوتے تو یہاں نہ آتا۔ دوسری بات اگر میں سگریٹ لے کر بھاگ گیا تو میرے ہاتھ کیا آئے گا پھر شاید مجھے اس کے لیے یہ گاؤں بھی چھوڑنا پڑے' اور آخری بات میں سگریٹ بیچ کر پوری رقم آپ کے پاس لے آؤں گا پھر آپ کی جو مرضی مجھے دینا۔''

پابلو نے اسے مطمئن کر دیا اور اس نے اسے سگریٹ دے دیے۔

پابلو اپنے کزن کے ساتھ مل کر بہت محنت سے سگریٹ بیچا کرتا۔ وہ ہر دکان پر جاتا ہر شخص سے ملتا کم قیمت کی وجہ سے اس کے تمام پیکٹس بک جاتے۔

ایک دن انہوں نے کام جلدی ختم کیا تو اپنے کزن اور چند دوستوں کے ساتھ گھومنے نکل گیا۔ وہ ایک سرسبز ٹیلے پر چڑھ گئے اور وہاں بیٹھ کر حسین مناظر سے لطف لینے لگے۔ دور سامنے ایک ایئر پورٹ تھا جہاں ایک جہاز اتر رہا تھا جہاز کو دیکھ کر پابلو کے ایک دوست نے حسرت سے کہا۔ ''کیا ایسا دن بھی ہوگا جب میں جہاز کو اندر سے دیکھ سکوں اور اس میں بیٹھ کر دوسرے شہر جا سکوں۔''

''دوسرے شہر کیوں.....'' پابلو نے اسے گھور کر کہا ''جب تم جہاز میں بیٹھو گے تو امریکا اور یورپ بھی جا سکو گے۔''

''کم از کم سگریٹ بیچتے ہوئے تو پوری زندگی ایسا نہیں ہو سکتا۔'' اس کے دوست نے ہنس کر کہا۔

''یہ تو صرف شروعات ہیں۔'' پابلو نے کہا، اس کی نظریں خلا میں کسی نقطے پر مرکوز تھیں۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ایسے 5 مقامات جہاں موبائل چارج نہ کریں

جب آپ کے موبائل کی بیٹری کم ہوتی ہے تو آپ اپنے فون کو عام جگہوں پر چارج کرنے لگ جاتے ہیں لیکن کچھ ایسے مقامات بھی ہیں جہاں آپ کو ایسا کرتے ہوئے احتیاط کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی یہ پسند نہیں کرتا ہے کہ جب آپ گھر سے دور ہوں اور آپ کے موبائل کی چارجنگ ختم ہوجائے، اگر ایسا ہوتا ہے تو اس مسئلے کو عام جگہوں پر لگے چارجنگ اسٹیشن حل کردیتے ہیں لیکن ان کا استعمال آپ کو مشکل میں بھی ڈال سکتا ہے۔ ڈریزل یونیورسٹی کے پروفیسر اور فیتھوم سائبر کے سی ای او جیمز گوپیل کہتے ہیں کہ اس طرح کے چارجنگ اسٹیشنوں اور یو ایس بی پورٹ آلات مجرموں کی آپ کے فون تک آسان رسائی فراہم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ پانچ جگہیں ایسی ہیں جہاں آپ کو اپنے فون کو چارج کرنے کے لیے عوامی یو ایس بی پورٹ کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

ائرپورٹ: ائرپورٹس پر بہت سے چارجنگ اسٹیشن موجود ہوتے ہیں جہاں آپ اپنے موبائل کو چارج کرنے کے لیے چھوڑ سکتے ہیں لیکن یہاں کسی نامعلوم شخص پر بھروسا نہیں کرسکتے۔

ٹرین اسٹیشن: ٹرین اسٹیشنز پر بھی چارجنگ پورٹس لگی ہوئی ہوتی ہیں لیکن اس میں ہمارے موبائل کا حساس ڈیٹا چوری ہونے کا خدشہ ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مجرم ایک بس ٹرمینل یا ٹرین اسٹیشن میں مفت چارجنگ اسٹیشن قائم کر

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں اگر پانچ سال بعد میری جیب میں ایک ملین ڈالرز نہ ہوں تو میں خود کو گولی مارلوں گا۔"

"زیادہ جذباتی نہ بنو۔" اس کے دوست نے اسے جھنجوڑا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "چلو واپس چلیں اور کام بھی کرنے ہیں۔"

پابلو نے اس کے بعد سگریٹ کے ساتھ نقلی لاٹری کے ٹکٹس بھی بیچنا شروع کردیے لیکن اس سے اتنی رقم حاصل نہ ہوتی جتنی وہ چاہتا تھا۔

اس دوران اسے پتا چلا کہ ایک بزنس مین جو پس پردہ منشیات کا کاروبار کرتا تھا اس کو باڈی گارڈ کی ضرورت ہے وہ اس کے پاس گیا اور اپنی خدمات پیش کیں۔ پابلو نے اس سے کہا۔ "میں ایک اچھا شوٹر ہوں ہر قسم کا اسلحہ چلانا جانتا ہوں اس کے ساتھ میں صحت مند دماغ کا مالک بھی ہوں ہر کام کے لیے اچھی منصوبہ بندی کرلیتا ہوں۔"

اس نے پابلو کو پرکھا اور اپنے ساتھ رکھ لیا پابلو اس کے لیے ہر کام کرنے لگا اس کا باس اس سے بہت خوش تھا۔ یہاں پابلو کو منشیات اور اسمگلنگ کا اچھا خاصا تجربہ حاصل ہوا۔

پابلو کی عمر اکیس سال ہوچکی تھی وہ اب گاڑیاں چوری کرنے لگا۔ گاڑی چوری کرنے کے بعد وہ دوسرے شہر میں اسے بیچتا۔

پابلو جتنی رقم چاہتا وہ اب بھی اسے حاصل نہیں تھی اس لیے اس نے ایک خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا اور وہ تھا اغواء... برائے تاوان۔

اس نے ایک بڑے بزنس مین کو اغوا کیا اور اس کے بدلے میں اس نے ایک لاکھ ڈالر بطور تاوان حاصل کرلیا۔ اس کے بعد پابلو وقتاً فوقتاً بڑے بڑے لوگوں کو اغوا کرتا رہا اور ان سے بڑی بڑی رقمیں لیتا رہا۔

1970ء کی شروعات میں کولمبیا کوکین کی بہت بڑی مارکیٹ بن گیا۔ کولمبیا میں کوکین بڑی آسانی سے مل جاتی۔ کولمبیا ساؤتھ امریکا کے نارتھ میں واقع ہے۔ یہ ملک پیرو اور بولیویا کے درمیان موجود ہے اور اس کی اسی جغرافیائی لوکیشن کی وجہ سے کولمبیا امریکا کو کوکین فراہم کرنے والا سب سے بڑا ملک تھا۔ ہر مہینے کولمبیا سے امریکا تقریباً 80 ٹن کوکین اسمگل ہوا کرتی۔ امریکا میں کوکین کی بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے کولمبیا میں کوکین بیچنے والوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان لوگوں میں پابلو اسکوبار بھی شامل تھا۔ پابلو شروع شروع میں اکیلے تھوڑی مقدار میں کوکین بیچتا پھر وہ فابیو اسٹریپو کے گروہ میں شامل ہو گیا۔

رسٹریپو کولمبیا کا سب سے بڑا کوکین اسمگلر تھا پابلو نے اس کے ساتھ اتنی محنت اور ذہانت سے کام کیا کہ وہ قلیل عرصے میں اس کا نائب بن گیا۔

1975 میں پابلو نے رسٹریپو کو قتل کردیا اور پھر رسٹریپو

Nadar Azeem www.pakistanipoint.com

سکتا ہے جب لوگ اپنے فون کو یو ایس بی پورٹ میں پلگ کرتے ہیں تو ان کا فون چارج کیا جاتا ہے لیکن ان کے حساس ڈیٹا کا پی ہو سکتا ہے۔

ہوٹلز: ہوٹلز میں بھی سارفین کے لیے موبائل چارج کرنے کے لیے چارجنگ پورٹس لگی ہوتی ہیں، ان پورٹس میں موبائل چارج کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں کیونکہ یہاں بھی آپ کے موبائلز کا ذاتی ڈیٹا چوری ہونے اور آپ کے موبائلز میں خطرناک سافٹ ویئر آپ کو بتائے بغیر انسٹال ہو سکتے ہیں۔

رینٹ اے کار: آپ کو ان دنوں رینٹ اے کاروں میں بھی چارج کرنے کے لیے یو ایس بی پورٹس نظر آتی ہوں گی جہاں سارفین سفر کے دوران موبائل چارج کرتے ہیں لیکن یہاں پر موبائل چارج کرنے سے آپ اپنے موبائل کار میں ہی بھول سکتے ہیں اس کے علاوہ آپ کو پتا ہے کہ موبائل کی پورٹ کار کی بیٹری سے چارج ہوتی ہے یہ آپ کے موبائل کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہیں کیونکہ کار کی بیٹری سے آنے والا پاور موبائل کی بیٹری کے لیے ناکافی ہوتا ہے۔

لائبریریز: لائبریری کو شاید محفوظ جگہ تصور کیا جاتا ہے لیکن آپ اپنے موبائل کو یہاں بھی چارج کرنے سے گریز کریں کیونکہ لائبریری میں آپ کا موبائل آپ کی پہنچ سے دور ہو سکتا ہے اور ادھر بھی آپ کے موبائل کا ڈیٹا محفوظ نہیں۔

مرسلہ: نازنین سید۔ لاہور

کے تمام کارندوں کو جمع کر کے کہا۔ ”میں رسٹر یپو کا نائب تھا اب چونکہ وہ نہیں رہے تو اصولی طور میں آپ سب کا باس بن گیا کیا آپ میرے لیے کام کرو گے؟“

”ہم دل و جان سے تمہارے ساتھ ہیں۔“ سب نے بیک وقت آواز میں کہا۔

پابلو نے باس بننے کے بعد میڈیلین کارٹل کی بنیاد رکھی جو دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی سب سے بڑی ڈرگ آرگنائزیشن بن گئی۔ اس نے ڈرگ سے جڑے تمام کاروباروں پر قبضہ کر لیا اور ڈرگز کی دنیا کا شہنشاہ بن گیا اب وہ ڈرگ لارڈ کہلاتا تھا۔

اس نے بہاماس کے سمندری علاقے میں موجود نارمنز کے (Norman's Cay) نامی جزیرہ خرید لیا۔ یہ جزیرہ امریکی ریاست فلوریڈا سے صرف 350 کلومیٹر دور تھا۔ اس نے اسی جزیرے پر ایک عالیشان محل نما گھر ایک ہوٹل اور کوکین ذخیرہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑا گودام بنایا۔ جہازوں کے لیے اس جزیرے پر ایک کلومیٹر لمبا رن وے تھا جس پر کوکین سے بھرے بڑے بڑے جہاز اترتے پھر یہ کوکین بڑے جہازوں سے چھوٹے جہازوں پر منتقل ہو کر امریکا اسمگل ہوتی۔ پابلو کے پاس دو سب میرین بھی تھے اس میں بھی وہ کوکین اسمگل کرتا۔

اس جزیرے سے ہر روز سات جہاز 15 ٹن کوکین امریکا اسمگل کرتے۔ پابلو پوری دنیا میں 80 فیصد کوکین اسمگل کرتا۔

پابلو کو ایک کلو کوکین بنانے پر ایک ہزار ڈالر خرچ کرنے پڑتے اور پھر اسے امریکا اسمگل کرنے پر چار ہزار خرچ ہوتے یوں ایک کلو پر کل پانچ ہزار ڈالرز لاگت آتی لیکن امریکا پہنچتے ہی یہ ایک کلو کوکین پچاس سے ساٹھ ہزار ڈالر میں فروخت ہوتی۔ پابلو روزانہ پانچ سو ملین ڈالرز کی کوکین امریکا اسمگل کرتا۔ اس کے پاس زیادہ تر پیسا کیش کی صورت میں تھا۔ اسے بنڈلز بنانے کے لیے وہ ہر ہفتے دو ہزار پانچ سو ڈالرز کے ربڑ بینڈ خریدتا۔

پابلو نے بڑے بڑے گودام بنائے تھے جس میں وہ اپنا کیش رکھتا۔ ہر سال اس کے اربوں ڈالر چوہے کھا جاتے یا پانی اور نمی کی وجہ سے پھٹ جاتے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ کل رقم کا دس فیصد حصہ ہوتا۔

بے تحاشا آمدن کی وجہ سے اس کے پاس رقم رکھنے کے لیے جگہ ختم ہو گئی تو اس نے جنگلوں اور ویران عمارتوں میں رقم رکھنا شروع کیا۔ عمارتوں کے مالکوں کو وہ باقاعدہ کرایہ دیتا جن کے گھروں میں اس کی رقم رکھی ہوتی۔ وہ پابلو اسکوبار جس نے زیرو سے زندگی کا سفر شروع کیا تھا اتنی ترقی کر گیا کہ ایک دن اس کی دولت کا حساب لگانے کے لیے مشینیں بھی کم پڑ گئیں۔

پابلو اپنے کالے دھندوں کے ساتھ ساتھ غریبوں کی مدد بھی کرتا رہتا۔ بے گھر لوگوں کے لیے اس نے گھر بنائے اسکول چرچ اور بچوں کے لیے گراؤنڈز تعمیر کیے۔ کئی غریب

www.pakistanipoint.com

سائنس دانوں نے دنیا کو کئی عظیم ایجادات فراہم کیں لیکن کئی نامور موجد ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی ایجاد کردہ چیزوں کے غلط استعمال کے باعث انہیں بنانے پر شدید افسوس کا اظہار بھی کیا۔

رابرٹ اوپن ہائیمر/البرٹ آئن اسٹائن

رابرٹ اوپن ہائیمر دوسری عالمی جنگ کے دوران مین ہیٹن پروجیکٹ کے ڈائریکٹر تھے اور یہیں جوہری بم بنانے کی تیاری کی جارہی تھی۔ اوپن ہائیمر اور آئن اسٹائن کے باعث ہی جوہری تجربہ کامیاب رہا تھا۔ بعدازاں دونوں نے جوہری بم کی ایجاد پر افسوس کا اظہار کیا تھا۔

میخائل کلاشنکوف

اے کے 47 یا کلاشنکوف کو دنیا میں کون نہیں جانتا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران اسے سوویت انجینئر میخائل کلاشنکوف نے تیار کیا تھا۔ انہوں نے بھی اپنی طویل زندگی میں کئی مرتبہ اپنی ایجاد پر افسوس کا اظہار کیا۔ ایک مرتبہ تو انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''ان کا روحانی دکھ ناقابل برداشت ہے۔''

الفریڈ نوبل

نوبل امن انعام شروع کرنے والے الفریڈ نوبل نے دراصل سن 1860ء کی دہائی میں ڈائنامائیٹ ایجاد کی تھی۔ ان

گھرانوں کو باقاعدہ رقم بھیجتا۔ غریب لوگ اس کی پوجا کرنے لگے۔ اپنے اچھے کاموں کی بدولت وہ لوگوں میں رابن ہڈ کے نام سے مشہور ہوا۔

1982ء میں پابلو سیاست میں آیا اور کولمبیا کی کانگریس کا ممبر منتخب ہوگیا۔ اس کا خواب کولمبیا کا صدر بننا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کے کالے دھندوں سے حاصل ہونے والی بے تحاشا دولت کا راز لوگوں پر منکشف ہونا شروع ہوا۔ ایک وزیر نے اس کے خلاف بھرپور تحریک چلائی جس کے نتیجے میں پابلو کو مستعفی ہونا پڑا لیکن ساتھ ساتھ اس نے اس وزیر کو بھی قتل کرادیا۔

صدارتی انتخابات شروع ہوئے تو اس نے تین صدارتی امیدواروں کو قتل کرادیا۔ اٹارنی جنرل سمیت ایک ہزار سے زائد پولیس اہلکاروں کے خون سے ہاتھ رنگ لیے۔ یوں اس کی دہشت پورے کولمبیا میں پھیل گئی۔

جس وقت پابلو اپنے مخالفین کے لیے موت کی علامت بنا ہوا تھا اس وقت اس کے خلاف سپریم کورٹ میں مقدمہ چل رہا تھا۔ اس نے جج کو بہت بڑی مقدار میں رشوت دینے کی کوشش کی لیکن جج نے رشوت لینے سے انکار کردیا۔

بالآخر فیصلے کا دن آپہنچا۔ سیکیورٹی کے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے۔ پولیس اور آرمی نے سپریم کورٹ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ وکلاء دلائل دینے لگے جب دلائل ختم ہوئے تو جج نے فیصلہ سنانا شروع کیا۔

''تمام ثبوتوں اور دلائل کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ عدالت اس نتیجے پر پہنچی...'' ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ایک زوردار دھماکا ہوا عدالت کے در و دیوار لرز گئے۔ عدالت میں موجود لوگ خوفزدہ ہوکر چیخنے لگے۔ سب افراتفری میں دروازے کی طرف بھاگے لیکن شاید ان کی قسمت میں کمرۂ عدالت سے نکلنا نہیں تھا۔ عدالت پر چاروں طرف سے ٹینکوں سے گولے داغے جانے لگے۔ عدالت جج اور وکلاء سمیت اس میں موجود تمام لوگوں کے لیے قبر بن گئی۔ ان میں سے ایک آدمی بھی زندہ نہ بچ سکا۔

پابلو نے بہت بڑی رقم خرچ کرکے گوریلا فورس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اسے جب سپریم کورٹ کی تباہی کی خبر ملی تو اس نے اپنا مشہور جملہ دہرایا۔

''ہر شخص کی ایک قیمت ہوتی ہے، سب سے اہم بات یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ قیمت کیا ہے۔''

کامیاب کارروائی کے بعد پابلو نے گوریلا فورس کے سپاہیوں کی دعوت کی اور اس کے بعد ان سب کو قتل کردیا۔

پابلو امریکا کو کوکین اسمگل کرنے والا سب سے بڑا اسمگلر تھا۔ اس نے پورے امریکا میں اپنا جال بچھایا ہوا تھا۔

www.pakistanipoint.com

کے بھائی کی وفات پر اخبار نے غلطی سے ان کی موت کی خبر شائع کر دی اور عنوان رکھا ''موت کے تاجر کی موت''۔ نوبل اخبار میں اپنی موت کی خبر سے زیادہ یہ سوچ کر پریشان ہوئے کہ کیا انہیں یوں یاد کیا جائے گا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے امن کا نوبل انعام شروع کیا۔

رائٹ برادران

جہاز بنانے والے رائٹ برادران کو کون نہیں جانتا۔ ولبر رائٹ اور اورول رائٹ نے اپنی عمر جہاز بنانے میں صرف کر دی اور انسان کے لیے پرواز کا خواب بھی پورا کر لیا۔ انہوں نے ہوائی جہاز امریکی فوج کو فروخت کیا لیکن پہلی عالمی جنگ میں اپنی ایجاد کی پیدا کردہ تباہی دیکھ کر اورول رائٹ نے بھی دکھ کا اظہار کیا۔

کیمران لوگمان

لوگمان سن اسّی کی دہائی میں ایف بی آئی کے لیے کام کر رہے تھے اور وہیں انہوں نے پیپر اسپرے کو بطور ہتھیار استعمال کرنے میں معاونت کی۔ انہوں نے پولیس کے لیے پیپر اسپرے استعمال کرنے کا ہدایت نامہ بھی لکھا۔ پیپر اسپرے اب دنیا کے کئی ممالک کی پولیس استعمال کرتی ہے لیکن لوگمان کئی مرتبہ اس کیمیائی مادے کے غیر مناسب استعمال پر دکھ کا اظہار کر چکے ہیں۔

امریکی حکام بار بار کولمبین حکومت سے پابلو کو پکڑنے کا مطالبہ کرتے رہتے لیکن پابلو اس قدر طاقتور تھا کہ پورے کولمبیا میں کسی کو بھی اس کے خلاف ایکشن لینے کی ہمت نہیں تھی۔ پابلو یہ بات جانتا تھا لیکن اس کے دل میں یہ خوف بھی تھا کہ کہیں امریکی دباؤ سے مغلوب ہو کر حکومت اسے امریکا کے حوالے نہ کر دے اسی لیے اس نے کولمبین حکومت کو اس کا تمام قرضہ اتارنے کی پیش کش کی۔ تاکہ اس کے بدلے اسے امریکا کے حوالے نہ کیا جائے لیکن حکومت پر امریکی دباؤ بہت زیادہ تھا اسی لیے وہ پابلو کے آفر پر غور نہ کر سکی۔

پابلو کو احساس تھا کہ اسے کسی بھی وقت گرفتار کر کے امریکا کے حوالے کیا جا سکتا ہے اس لیے اس نے حکومت کو چند شرائط کے ساتھ گرفتاری دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے شرائط تھے کہ اسے امریکا کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ اسے کسی جیل میں نہیں بھیجا جائے گا بلکہ وہ اپنی تعمیر کردہ جیل میں رہے گا۔

حکومت نے اس کے شرائط تسلیم کر لیے۔ اس نے اپنی جیل خود بنائی۔ اس جیل کو لا کیتھڈرل کہا جاتا ہے۔ یہ جیل کسی محل سے کم نہیں تھی۔ اس میں کسینو بار، نائٹ کلب اور فٹبال گراؤنڈ تک موجود تھے۔ اس نے دنیا بھر سے قیمتی جانور منگوا کر جیل میں چڑیا گھر بنوایا۔ اس جیل کی حفاظت اس کے اپنے محافظ کرتے تھے۔

اس جیل میں پابلو کے ساتھ اس کا خاص آدمی جان جیرو بھی تھا۔ جیرو آرمی اور نیوی میں رہ چکا تھا اسے ڈبل جے اور پوپائے بھی کہا جاتا تھا۔ پابلو لوگوں کو قتل کروانے اور ٹارچر کروانے کا کام اسے دیتا تھا۔

یہ انتہائی تیز چالاک اور بہترین منصوبہ ساز تھا کہ پابلو جسے قتل کرنے کا کہتا یہ اسی دن اسے قتل کر دیتا۔ اسی بنا پر پابلو اکثر کہا کرتا۔ ''کبھی کبھی میں خود کو خدا کی طرح محسوس کرتا ہوں جس کے قتل کا حکم دیتا ہوں وہ اسی دن مر جاتا ہے۔''

جیل میں ہونے کے باوجود بھی پابلو کی سرگرمیاں ختم نہ ہو سکیں۔ وہ جیل میں بیٹھ کر جان جیرو کے ذریعے لوگوں کو قتل کرتا رہا۔ اس کی کوکین اسمگلنگ بھی جاری و ساری تھی۔

حکومت بے پناہ دباؤ میں آ گئی تو سرکاری طور پر اعلیٰ سطح کا ایک اجلاس بلایا گیا اجلاس میں پابلو اسکوبار کی گرفتاری کا فیصلہ کیا گیا۔ اس اعلیٰ سطحی اجلاس میں پابلو کا آدمی موجود تھا ابھی اجلاس ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے پابلو تک اطلاع پہنچا دی۔

پابلو کو گرفتار کرنے کے لیے ایک خصوصی دستہ تشکیل دیا گیا جب وہ خصوصی دستہ لا کیتھڈرل پہنچا تو پابلو وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔

پابلو کے فرار سے حکومت شدید دباؤ میں آ گئی اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک حکومت پر انگلیاں اٹھائی جانے لگیں۔

امریکی فوجیوں نے کولمبین آرمی کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ ٹیم بنائی اور پابلو اسکوبار کو پکڑنے کے لیے مشن شروع کر دیا۔

پابلو کے کئی ٹھکانے تھے پولیس کے چھاپے سے قبل اسے اطلاع مل جاتی اور وہ وہ جگہ خالی کر دیتا۔

ایک شام وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ایک خفیہ ٹھکانے پر موجود تھا۔ یہ اس کا محفوظ اور خفیہ ٹھکانہ تھا۔ اس کی بیوی ماریہ وکٹوریہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھی تھی۔ پابلو نے 1976ء میں اس سے شادی کی تھی۔ اس وقت پابلو کی عمر 26 سال جب کہ ماریہ 15 سال کی تھی۔ ماریہ نے ہر قدم پر پابلو کا ساتھ دیا اس لیے وہ اس کو بہت چاہتا تھا۔ پابلو کے اس سے دو بچے پیدا ہوئے ایک بیٹا جون پابلو اور ایک بیٹی منویلا۔

منویلا اس وقت پابلو اسکوبار کی گود میں تھی وہ اس سے بہت پیار کرتا تھا وہ ماں پر گئی تھی۔ وہ کسی بات پر ہنس رہے تھے کہ اچانک اس کا ایک آدمی گھبرایا ہوا آیا۔ پابلو نے اس سے پوچھا۔ ''کیوں..... کیا بات ہے..... سب ٹھیک تو ہے نا۔''

''نہیں سر..... ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ اس جگہ کی نشاندہی ہو چکی ہے کسی بھی وقت چھاپہ پڑ سکتا ہے۔''

''اوہ شٹ۔'' پابلو نے بیٹی کو گود سے اتار کر کہا۔ ''تم ایسا کرو تمام آدمیوں کو کہو ہم دس منٹ میں یہ جگہ خالی کر رہے ہیں کیش اسلحہ اور ضروری سامان لے کر فوراً یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔''

''جو حکم سر'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے واپس مڑا۔

ضروری تیاریوں کے بعد وہ وہاں سے نکل پڑے۔ سفر کے لیے انہوں نے جنگل کا راستہ منتخب کیا کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ آرام کے لیے رک گئے۔ منویلا سردی سے کانپ رہی تھی اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''پاپا مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

''فکر نہ کرو گڑیا..... ابھی آگ جلاتے ہیں۔'' پابلو نے اسے سینے سے لپٹا کر کہا۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اندھیری رات میں سوکھی لکڑیوں کا ملنا مشکل تھا اس نے پیسوں کا تھیلا لانے کا حکم دیا تھیلا لایا گیا تو اس نے اس میں سے نوٹ نکالے اور اسے آگ لگا دی۔ وہ برابر اس آگ میں نوٹ ڈالتا رہا۔ آگ جلتی رہی اور اس کی بیٹی اس سے خود کو گرم کرتی رہی۔ اس رات اس نے دو ملین سے زیادہ ڈالر (تقریباً 26 کروڑ پاکستانی روپے) جلائے۔ کافی دیر آرام کرنے کے بعد وہ چل پڑے۔

پولیس نے جب اس کے ٹھکانے پر چھاپہ مارا تو وہ اپنے دوسرے محفوظ پناہ گاہ تک پہنچ چکا تھا۔

مقامی غریب لوگوں کو پابلو کے ساتھ ہمدردی تھی پولیس کی آہٹ سن کر وہ اسے خبردار کر دیتے اور پولیس کو ہر بار ناکام ہونا پڑتا۔

پولیس کولمبین آرمی اور امریکا کی تیز ترین فورس بھی جب پابلو کو پکڑنے میں ناکام رہی تو ایک انوکھا تجربہ کیا گیا۔

پابلو نے جن لوگوں کو قتل کیا تھا ان کے لواحقین اور رشتہ داروں پر مشتمل ایک ٹیم بنائی۔ جسے لوس پیپس کا نام دیا گیا۔ رفتہ رفتہ لوس پیپس میں پابلو کے تمام دشمن شامل ہو گئے۔ ان سب کو خصوصی ٹریننگ کے بعد بھوکے شکاری کتوں کی طرح پابلو کے پیچھے لگایا گیا۔ اس ٹیم نے پابلو کے تین سو ساتھی قتل کر دیئے جن میں اس کا وکیل اور رشتے دار بھی شامل تھے لیکن پابلو ابھی تک ان کے ہاتھ نہ آسکا۔ انہوں نے اپنی کارروائیاں مزید تیز کر دیں اور بالآخر جنگلوں بیابانوں اور ویرانوں کی خاک چھانتے ہوئے سولہ مہینے بعد وہ پابلو اسکوبار تک پہنچ گئے۔

یہ یکم دسمبر 1993ء کا دن تھا۔ پابلو نے اپنی سالگرہ منائی رات کو دیر تک شراب اور کباب کی محفل جمی رہی۔ پابلو صبح دیر تک سوتا رہا۔ اٹھنے کے بعد اس پر کسلمندی طاری تھی۔ وہ غسل خانے میں گیا اور غسل کرنے کے بعد تازہ دم ہو کر نکلا۔ ناشتے کے بعد اس نے اپنے بھائی رابرٹو اسکوبار کو کال ملائی۔ رابرٹو اسکوبار اس کا اکاؤنٹنٹ تھا۔ پابلو نے آج ہونے والی ایک ڈیل کے سلسلے میں اس سے بات کی۔ بدقسمتی سے اس کی یہ کال ٹریس ہو گئی، اور لوس پیپس کی ٹیم آندھی اور طوفان کی طرح اس کے سر پر پہنچ گئی۔ انہوں نے چاروں طرف سے اس عمارت کو گھیرے میں لے لیا۔ پابلو کے گوریلا محافظوں نے خطرے کی بو سونگھی تو انہوں نے بھی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ عمارت کی چھت پر وہ حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ آنے والے بھوکے شیر زیادہ دیر تک شکار کا انتظار نہ کر سکے اور انہوں نے عمارت پر ہلہ بول دیا۔ دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ حملہ آور اندر داخل ہونے کے لیے تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔

گوریلا محافظوں نے پابلو اسکوبار کو پچھلے دروازے سے نکالنا چاہا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ اسے کور دینے والے دو گوریلا محافظ جیسے ہی باہر نکلے وہ گولیوں سے بھون دیئے گئے۔ چھت پر بیٹھے محافظوں نے پورا زور اس طرف ڈال دیا

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

مگر حملہ آوروں کو وہ ایک انچ بھی پیچھے نہ کر سکے۔ پچھلی جانب زیادہ زور ڈالنے کی وجہ سے سامنے کی جانب دفاع کمزور ہو گیا۔ حملہ آور جو فرض سے زیادہ انتقام کے جذبے سے کیس تھے سیلاب کے ریلے کی طرح آئے۔ گیٹ کو بموں سے اڑا دیا گیا۔ پابلو کے گوریلا محافظ ان کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ عمارت کے اگلے حصے پر ان کا قبضہ ہو گیا چھت پر بیٹھے محافظ پابلو کو بچانے کے لیے نیچے اتر آئے۔ محافظوں کو ہٹتے دیکھ کر پچھلی جانب کے حملہ آور جوش اور جذبے کے ساتھ آگے بڑھے اور عمارت کی دیواروں پر چڑھنے لگے۔ سامنے سے آنے والے حملہ آور تیزی سے عمارت پر قبضہ کر رہے تھے، وہ برآمدے تک پہنچ گئے پابلو اب ان کی آوازیں سن رہا تھا۔ وہ پابلو کو تلاش کرنے کے لیے عمارت میں پھیل رہے تھے۔ اکا دکا محافظوں کے سوا پابلو کے تمام محافظ ہلاک ہو چکے تھے۔

خود کو خدا سمجھنے والا جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ موت کو سر پر ناچتے دیکھ کر اداس سا بیٹھا اس نے اپنی پسندیدہ پستول نکالی اس کی نال اپنے کان میں ٹھونسی۔ باہر اس نے قدموں کی آواز سنی حملہ آور اس کے کمرے کی طرف آ رہے تھے۔ اس نے فوراً لبلبی دبا دی۔ فائر کی آواز کے ساتھ حملہ آور کمرے میں داخل ہوئے پابلو صوفے پر ایک طرف لڑھک گیا پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ چار ہزار سے زیادہ لوگوں کو قتل کرنے والا خود اپنے ہاتھوں موت کے گلے لگ گیا۔

پابلو کے بھائی رابرٹو اسکوبار کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے جیل میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ''دی اکاؤنٹنٹ اسٹوری'' ہے۔ اس کتاب میں اس نے پابلو اور مڈیلین کارٹل کے متعلق کئی اہم انکشافات کیے ہیں۔

پابلو کے خاص آدمی جان جیرو نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا اس نے 257 لوگوں کو قتل کرنے کا اعتراف بھی کر لیا تھا اس پر مقدمہ چلا اور اسے 24 سال قید کی سزا ہوئی۔ کولمبیا میں سزائے موت کا قانون نہیں تھا 26 اگست 2014 کو وہ رہا ہوا۔

پابلو اسکوبار کی آخری رسومات میں 2.5 ہزار سے زائد لوگوں نے شرکت کی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی مدد اس نے کی تھی۔

پابلو اسکوبار خالی ہاتھ دنیا سے چلا گیا اب بھی شاید کولمبیا کے ویران عمارتوں کے تہہ خانوں میں چوہے اور دیمک اس کی دولت کو چاٹ رہے ہوں گے۔

++

اصلاح پسند
(Reformist)

اس اصطلاح کا اطلاق ایران میں امریکا کے حامیوں پر ہوتا ہے اور یہ اصطلاح اس وقت سامنے آئی جب 1997ء میں ایران میں انتخابات کا انعقاد عمل میں آیا۔ ایرانی انتخابات سے پہلے سی آئی اے نے کانگریس سے درخواست کی کہ اسے سالانہ بجٹ کے علاوہ 20 ملین ڈالر کی مزید رقم دی جائے تاکہ وہ یہ رقم ایران میں اپنے حامیوں کی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے استعمال کر سکیں۔ امریکی جس ملک میں اور جہاں کچھ خرچ کرتے ہیں ان کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ امریکی مصنوعات کا دائرہ متعلقہ ملک تک بڑھا دیں۔ ایران میں اصلاح پسندوں کے لیے 20 ملین ڈالر کی رقم مختص کرنے کا بھی یہی مقصد اور مدعا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جینز پہننے لگے اور نوجوان لڑکیوں نے حجاب اتار دیے۔ مئی 2004ء میں ایران کے اصلاح پسند ارکان پارلیمنٹ نے عورتوں کو مردوں کے مساوی وراثت دینے کا مسودہ قانون منظور کرا لیا جس کے نتیجے میں دوسرے وارث نہ ہونے کی صورت میں بیوہ اپنے خاوند کی تمام جائیداد کی وارث ہو گی جب کہ 75 سال پہلے منظور ہونے والے قانون کے تحت اس وقت بیوہ کو نصف جائیداد ملتی تھی اور نصف ریاست کے پاس چلی جاتی ہے۔ عورت کی وفات کی صورت میں اس کے خاوند کو اس کی پوری جائیداد مل جاتی مگر اسلامی انقلاب کے بعد اصلاح پسند پوری طرح منظر نامے سے غائب ہو گئے۔

مرسلہ: اقرار الحسن سومرو۔ خیر پور میرس

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

چھٹا حصہ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

روسیاہ

عطر شاہین

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آبپوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

پل پل بدلتے چہروں کی طویل سرگزشت

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

حیدر الماس کے توسط سے علی کی امی کو اسپتال میں داخل کرا دیا گیا اور ان کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ علی کو اسماعیل شاہد نے بتایا کہ انہوں نے چودھری باسط کے ایک ٹھکانے کا سراغ لگا لیا ہے جہاں اس کی بہن کے ہونے کا امکان تھا۔ علی وہاڑی چوک پہنچا تو وہاں اسے پکڑنے کے لیے چار شہدے پہنچ گئے لیکن علی انہیں چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ علی اسماعیل شاہد کے ساتھ مانگا پل سے دور ایک گاؤں میں پہنچا تو اسماعیل شاہد کو کال موصول ہوئی کہ انہیں فیک اطلاع دی گئی ہے۔ واپسی پر ان کی کار پر فائرنگ ہوئی لیکن وہ بچ گئے۔ ادھر کسی نے چودھری باسط کی تصویریں میڈیا کو دے دی تھیں۔ حیدر الماس نے بھی علی کو اپنے گینگ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ علی کو اخبار کے ذریعے معلوم ہوا کہ شانزے چودھری باسط کی بیٹی ہے۔ پھر حیدر الماس پر بھی فائرنگ ہوئی جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہو گئے۔ اسپتال سے واپسی پر علی کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اغوا کار کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک رات علی نے چودھری باسط، شانی اور اسماعیل شاہد کو اکٹھے دیکھ لیا وہ حیران رہ گیا۔ چند روز کے بعد علی کی اسماعیل شاہد سے بات ہوئی تو انہوں نے علی کو فوراً اپنی کوٹھی پہنچنے کی ہدایت کی۔ ادھر حیدر الماس نے علی کو فوراً فاروق پورہ والے مکان سے نکل کر زکریا ٹاؤن پہنچنے کی ہدایت کی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ اسماعیل شاہد سے نہ ملے۔ علی آٹو رکشے میں جا رہا تھا کہ ایک کار آٹو رکشے کے قریب آ گئی اور ایک شہدے نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

(اب آگے پڑھیں)

ریوالور دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ریوالور پر سائیلنسر بھی لگا ہوا تھا یا نہیں۔ مجھے ان چیزوں کا تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کبھی ریوالور کو غور سے دیکھا تھا لیکن جانتا تھا کہ یہ انتہائی مہلک ترین ہتھیار ہے جس کی ایک گولی انسانی زندگی کے لیے جان لیوا ثابت ہوتی ہے... پھر اس سے پہلے کہ ریوالور بردار مجھ پر گولی چلاتا یا مجھے دھمکاتا، اچانک آٹو رکشا ڈرائیور نے یکدم بریک لگا دی اور آٹو رکشا غیر متوازن ہوتا ہوا فٹ پاتھ سے جا ٹکرایا لیکن الٹا نہیں تھا۔

جیسے ہی ڈرائیور نے ایمرجنسی بریک لگائی تھی اس کے ساتھ ہی ہلکی سی ''ٹھک'' کی آواز بھی گونجی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے قریب سے ایک موٹر بائیک کو گزرتے دیکھا تھا جس پر دو نوجوان سوار تھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا نوجوان سڑک پر گر گیا تھا جبکہ موٹر بائیک ڈرائیور توازن بگڑنے پر سامنے سے آتی کار سے ٹکرا گئی۔ میں جلدی سے آٹو رکشے سے نیچے اتر آیا۔ بلیو کار وہاں سے جا چکی تھی ریوالور بردار کی چلائی گولی میری بجائے بائیکر کے ساتھی کی ٹانگ پر لگی تھی جس سے وہ زخمی ہو گیا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ آٹو رکشے کے سامنے یکدم بلی کا ایک بچہ آ گیا تھا جس کی وجہ سے ڈرائیور نے ایمرجنسی بریک لگائی تھی۔ یکدم بریک لگانے سے اس کے رکشے کا نقصان نہیں ہوا تھا اور بلی کا بچہ بھی بچ گیا تھا۔ بائیکر نوجوان کا ساتھی زخمی تھا۔ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ ٹریفک بھی بلاک ہو گیا تھا۔ ایک نوجوان نے فوری طور پر ایمبولینس کو کال کر دی تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہاں لوگوں کا جم غفیر ہو گیا تھا۔ میں بھی ترحم آمیز نگاہوں سے اس زخمی نوجوان کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے آثار موجود تھے۔

اللہ کو میری زندگی مقصود تھی اس لیے بلی کے بچے کے سامنے آنے کی وجہ سے آٹو رکشے کے ڈرائیور نے ایمرجنسی بریک لگائی تھی اور گولی مجھے لگنے کی بجائے بائیک پر بیٹھے نوجوان کی ٹانگ پر لگ گئی تھی۔ میں کف افسوس ملتا ہوا آٹو رکشے کے ڈرائیور کی طرف پلٹا ہی تھا کہ اچانک میری نظر ایک نوجوان پر پڑی جو خونخوار نظروں سے مجھے ہی گھور رہا تھا۔ میں نے نظروں کا رخ پھیر لیا لیکن وقفے وقفے سے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میں حیران بھی تھا کہ میں نے اپنا چہرہ مفلر میں چھپایا ہوا تھا اس کے باوجود اس نے مجھے کیسے پہچان لیا تھا کہ میں ہی اس کا مطلوبہ ''ٹارگٹ'' ہوں۔ یقیناً انہیں میری کوئی ایسی نشانی بتائی گئی ہو گی جس کی بناء پر میں پہچان لیا گیا تھا۔

میرے اعصاب تناؤ کا شکار ہو گئے تھے۔ اس نوجوان کی موجودگی کسی خطرے سے خالی نہیں تھی۔ یقیناً وہ دوبارہ مجھے شکار کرنے آیا تھا۔ اس کے پاس ریوالور تھا اس لیے وہ ''بگڑا'' تھا جبکہ میں اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے ریوالور کی ایک ہی گولی مجھے ابدی نیند سلا سکتی تھی۔ اگر وہ نہتا ہوتا تو پھر مجھے اس سے کچھ خوف نہ ہوتا۔ زندگی کے پیاری نہیں ہوتی۔ مجھے بھی اپنی زندگی سے پیار تھا۔ کوئی کتنا بھی بڑا پہلوان، باکسر یا رسلر ہو مگر آتشیں

ہتھیار کے سامنے وہ کچھ نہیں ہوتا۔ آتشیں ہتھیار سے نکلنے والی ایک گولی اسے ختم کر سکتی ہے۔ میرا دماغ انتہائی برق رفتاری سے سوچ میں مگن تھا کہ اچانک مجھے ایک خیال آیا تو میں نے جیب سے وائلٹ نکالا اور ڈرائیور کو دو سو روپے دے کر مجمع کو چیرتا ہوا ایک طرف بڑھنے لگا۔ ڈرائیور نے مجھے رکنے کا کہا تھا لیکن میں نے اس کی بات ان سنی کر دی تھی۔

چند گز کا فاصلہ عبور کرنے کے بعد میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا تو وہ نوجوان بھی مجمع چیرتا ہوا میرے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ میرا شکار کرنا چاہتا تھا اور میں نے اس کو شکار کرنے کی ٹھان لی تھی۔ میرے پاس موقع تھا کہ میں اسے جھپاک لیتا اور لوگوں کو بتا دیتا کہ اسی نے گولی چلائی ہے تو لوگ پہلے اس کا برا حشر کرتے پھر اسے پولیس کے حوالے کر دیتے مگر میں اس شہدے سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اسے کس نے بھیجا ہے۔ اگر وہ چودھری ساجد کا کارندہ ہے تو پھر میں اس سے چودھری ساجد کے ٹھکانے کے بارے میں اگلوا سکتا ہوں۔ مجھے خود پر یقین تھا اسی لیے میں نے یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دائیں طرف والی سڑک کی طرف مڑ گیا۔ یہ سڑک ریلوے لائن کی طرف جاتی تھی۔ سڑک کے دائیں بائیں ہوٹلوں، پھول فروشوں اور لنڈے کی دکانیں تھیں۔ سڑک کے دائیں طرف ایک پارک تھا البتہ ریلوے لائن کراس کرنے کے لیے باقاعدہ ایک پل بنایا گیا تھا۔ فلائی اوور بننے سے پہلے وہ پل انتہائی خستہ حالی کا شکار تھا لیکن اب اس کی مرمت کر کے اسے دیدہ زیب بنا دیا گیا تھا۔ دائیں طرف چھوٹا سا پارک بھی بنایا گیا تھا جس کے ساتھ گولائی کی صورت میں ون وے سڑک تھی جو اوپر جا کر فلائی اوور سے لنک کرتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ شارٹ کٹ سڑک تھی۔

شام کا اندھیرا پھیل گیا تھا اور سردی بھی اپنے عروج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چائے کے ہوٹل آباد تھے۔ البتہ لائن کے پار لوگوں کا رش قدرے کم تھا۔ میں نے پل کے پاس رک کر دیکھا تو وہ غنڈا ابھی میرے پیچھے آ رہا تھا۔ اُس کا دایاں ہاتھ جیکٹ کی جیب میں تھا۔ میں نے اپنے تاثرات اور کیفیات سے اُسے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ میں اُس سے ڈر گیا ہوں اور کہیں چھپنا چاہتا ہوں پھر میں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ پل پر پہنچتے ہی میں نے دوسری طرف کی سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ پھر دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا میں نیچے پہنچ گیا۔

نیچے پہنچتے ہی میں جلدی سے سیڑھیوں کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس طرف قدرے تاریکی اور سناٹا تھا البتہ بدبو کے بھبکے بھی آ رہے تھے۔ مجھے ابکائی آنے لگی لیکن میں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں نے سر اٹھا کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا تو وہ غنڈا ابھی دو، دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ میں تیار ہو گیا اور پھر وہ جیسے ہی آخری سیڑھی پر پہنچا تو میں جلدی سے تاریک گوشے سے نکل کر اُس پر کسی عقاب کی مانند جھپٹا۔

وہ بوکھلا گیا اور میں نے اُس کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اس کی جیکٹ کے کالر سے پکڑ کر اور اسے کمر پر اٹھا کر پختہ زمین پر پٹخ دیا۔ اس کے حلق سے کربناک چیخ نکلی اور وہ کمر کے بل پٹخنے کی وجہ سے دہرا ہو گیا۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ میں اس کی سوچ کے برعکس ثابت ہوں گا۔ اس نے مجھے ہلکا لیا تھا لیکن وہ بے خبر تھا کہ میں جوڈو کراٹے اور باکسنگ میں مہارت رکھتا ہوں۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک ٹھوکر اس کی پسلیوں میں ماری تو تکلیف کی شدت سے اُس کے حلق سے خرخراہٹ نکل گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کرب میں مبتلا ہونے کے باوجود اپنی جیکٹ کی جیب سے ریوالور نکال رہا تھا۔ میری نظریں اُس کے جیب والے ہاتھ پر مرکوز تھیں۔ پھر جیسے ہی اس نے ریوالور نکالا تو میں نے جلدی سے اس سے جھپٹ لیا اور "انعام" کے طور پر ایک اور ٹھوکر اس کی پسلیوں میں ماردی۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ کر رہ گیا۔

ریلوے لائن کے قرب و جوار میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ سرِشام ہی وہاں سناٹا اور ویرانی پھیل جاتی تھی اس لیے وہاں کسی کے آنے کا امکان کم ہی تھا۔ ایک طرف کچرے کا ڈھیر بھی موجود تھا۔ سامنے ہی عزیز ہوٹل چوک کی طرف جانے والی سڑک تھی لیکن وہ بھی قدرے ویران پڑی تھی۔ میں نے ریوالور اپنی جیکٹ کی جیب میں منتقل کیا اور پھر اس غنڈے کو اس کی جیکٹ کے کالر سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور گھسیٹتا ہوا تاریک گوشے میں لے گیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرے ہوئے تھے۔ میں نے اسے دیوار سے لگا کر بٹھایا تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس پر تابڑ توڑ مکے برسانے شروع کر دیئے۔

میں نے تین چار مکے اس کی ناک پر بھی مارے جس

سے اس کی ناک سے خون نکلنا شروع ہوگیا۔ اس کا نچلا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ وہ تکلیف سے چیخنا چاہتا تھا لیکن میں اسے موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اس کی اچھی خاصی ''خاطر تواضع'' کی جس سے وہ نڈھال ہوگیا۔ اس کے باوجود وہ اٹھ کھڑا ہوا اور فرار ہونے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ میں نے اس کے پیٹ میں لات رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی لگا تھا کہ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر دیوار سے لگایا اور جیب سے ریوالور نکال لیا پھر جیسے ہی اس نے منہ کھولا تو میں نے ریوالور کی نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی۔ وہ غوں غاں کرنے لگا۔

''خاموش ہو جاؤ ورنہ تمہارے ہی ریوالور کی گولی تمہارے حلق میں اتار دوں گا۔'' میں نے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا تو خوف سے اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں پھر اس کی غوں غاں بھی بند ہوگئی۔

میں نے تصدیق چاہی۔ ''کیا اب شور کرو گے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے اگلا سوال کیا۔

''میں جو کچھ پوچھوں اس کا جواب دو گے؟''

وہ اثبات میں ایسے گردن ہلانے لگا جیسے وہ ہامی بھر رہا ہو۔ موت کو سامنے دیکھ کر بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ وہ تو صرف ایک معمولی سا کارندہ تھا۔ اس کی کیا اوقات تھی۔

''اوکے۔ اگر مکاری کرو گے تو اپنی موت کے تم خود ذمے دار ہوگے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ میرے ہاتھ تمہارے خون سے رنگے جائیں۔''

اتنا کہنے کے بعد میں نے اس کے منہ سے ریوالور کی نال نکال لی تو وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا جیسے وہ ریس کا مقابلہ جیت کر آیا ہو۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا جب اس کا سانس اعتدال پر آگیا تو وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''تم..... تم بہت تیز نکلے ہو۔ میں..... میں نے تو تمہیں عام سا نوجوان سمجھا تھا۔''

''تمہارا نام کیا ہے۔'' میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ''اسلم۔''

''ہونہہ۔'' میں نے ہنکارا بھرا۔ ''تو اسلم صاحب، مجھے مارنے کے لیے تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''

میری بات سن کر وہ خاموش رہا حالانکہ اس نے ہامی بھری تھی کہ وہ میرے سوالوں کے جواب دے گا۔ وہ دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھتا رہا جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ مجھے کس کا نام بتائے۔ شاید وہ مجھے گمراہ بھی کر سکتا تھا کیونکہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ تاہم اسے ڈرانے کی خاطر میں نے ریوالور کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی تو وہ خوف سے لرز کر رہ گیا۔

''بتاؤ۔'' میں نے درشتگی سے کہا۔

''وہ..... وہ.....''

''نام بتاؤ.....'' میں نے ریوالور کی لبلبی پر دباؤ بڑھایا۔ ''آخری بار پوچھ رہا ہوں۔''

تو وہ چیخ اٹھا۔ ''رر..... رر..... رک جاؤ۔''

''پھر بتاؤ..... اب نہ بولے تو میں ٹریگر دبا دوں گا۔'' میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ وہ خوف بھرے لہجے میں ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''ب۔ ب۔ ب۔ بتاتا ہوں۔''

''جلدی بتاؤ۔''

وہ نام بتانے کی بجائے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ تمہید کیوں باندھ رہا ہے حالانکہ میں نے ریوالور کی نال بدستور اس کی پیشانی سے لگا رکھی تھی اور انگلی لبلبی پر تھی۔

''اب بتاؤ بھی۔'' میں نے لب بھینچتے ہوئے کہا۔ ''میں تین تک گنتی گنوں گا۔ اگر تم نے تین سے پہلے پہلے نہ بتایا تو میں ٹریگر دبانے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کروں گا۔ یہ بات اپنے دماغ میں بٹھا لو۔''

پھر میں نے گنتی شروع کر دی۔ ایک..... میں نے چند لمحے وقفہ لیا۔ پھر کہا..... دو..... میں نے پھر وقفہ لیا۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر میرے تین کہنے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

''چچ..... چچ..... چودھری..... ساجد نے۔''

''چودھری ساجد نے۔'' میں حیران رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ چودھری باسط کا نام لے گا لیکن اس نے میری سوچ کے برعکس چودھری ساجد کا نام لیا تھا جو حیران کن بات تھی۔

''کہیں تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟'' میں نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں..... میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' اس نے خوف بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''میں کیسے یقین کر لوں؟'' میں نے استفسار کیا۔

Khalid Azeem www.pakistanipoint.com

''مم..... میں قسم کھاتا ہوں۔'' اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''تم جھوٹی قسم بھی تو کھا سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا یقین کرو۔'' اس نے کہا۔ ''ہمیں چودھری ساجد نے ہی تمہیں قتل کرنے کے لیے بھیجا ہے لیکن تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تم بچ گئے ہو۔''

غصے اور نفرت کی لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ یقیناً اس شہدے کو چودھری ساجد کے ٹھکانے کا معلوم ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے پاس اس کی کوئی تصویر بھی ہو۔ میں نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔ ''چودھری ساجد کہاں رہتا ہے۔ اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟''

''مم..... مجھے نہیں معلوم۔'' وہ بولا۔ ''بلکہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔''

میں چونکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا مطلب۔ کیا وہ ملتان میں نہیں رہتا۔''

''رہتا تو ملتان میں ہی ہے لیکن وہ کبھی ہمارے سامنے نہیں آیا۔'' اسلم نے کہا۔ ''وہ جو بھی احکامات دیتا ہے ہمارے باس کو ہی دیتا ہے اور باس ہمیں۔''

اس نے خود کو نارمل کرلیا تھا لیکن میں نے ریوالور کی نال بدستور اس کی پیشانی پر رکھی ہوئی تھی تاکہ وہ خوفزدہ رہے اور کوئی غلط حرکت کرنے سے باز رہے۔ میں نے کہا۔ ''تمہارا باس کون ہے؟ اس کا نام بتاؤ۔''

''باس کا نام..... بدر نواز ہے۔''

''کیا تمہارے باس نے چودھری ساجد کو دیکھا ہے کبھی؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''تمہارے باس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟''

''وہ سورج میانی میں رہتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''سورج میانی میں اس کا چائے کا ہوٹل ہے۔ بدر چائے ہوٹل۔''

''ہمم۔'' میں نے ہنکاری بھری۔

''اب تو مجھے چھوڑ دو۔'' وہ ملتجی لہجے میں بولا۔ ''تم نے جو پوچھنا تھا میں نے بتا دیا۔''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ، تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں فاروق پورہ والے مکان میں موجود ہوں۔''

''حسیب نے بتایا تھا۔'' اسلم نے کہا۔

''حسیب.....'' میں نے نام دہرایا۔ حسیب، حیدر الماس صاحب کا ڈرائیور تھا۔ ''کیسے؟''

''ہم نے اسے لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ دو روز پہلے جب ہم نے تمہارے گھر پر دھاوا بولا تھا تو ہمیں اس گھر کے بارے میں بھی حسیب نے ہی بتایا تھا کہ وہ تمہیں اور تمہاری فیملی کو حیدر الماس کے فاروق پورہ والے گھر میں چھوڑ آیا ہے۔ جب تم گھر سے فرار ہو کر واپس اسی گھر میں چلے گئے تو دو دن ہم تمہیں مختلف جگہوں پر تلاش کرتے رہے پھر ہم نے حسیب سے رابطہ کیا۔ اسی مراد کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا کہ تم اپنی گھر میں چھپے ہوئے ہو اسی لیے چودھری ساجد نے تمہیں قتل کرنے کے لیے ہمیں بھیج دیا۔ ہم پل پر موجود تھے اس لیے ہمیں وہاں آنے میں دیر ہوگئی۔'' اس نے تفصیل بتائی تو میرے دماغ میں غصے سے چنگاریاں بھرنے لگیں۔

میں چند لمحے غائرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے ریوالور کی نال اس کی پیشانی سے ہٹا دی اور دوسرے ہی لمحے میں نے ریوالور کے دستے کا وار اس کے سر پر کر دیا۔ اس کے حلق سے ہلکی سی کراہ نکل گئی۔ وہ سنبھلنے ہی لگا تھا کہ میں نے دوسری بار اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مار دیا۔ شاید اس بار اس کا دماغ جھنجھنا گیا کیونکہ اس کے چہرے پر انتہائی اذیت ناک تاثرات ابھر آئے تھے اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے تھے۔ وہ لڑکھڑایا اور دوسرے ہی لمحے وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گرا اور ہوش و خرد سے بے گانہ ہوگیا۔ میں نے جیب سے ایک رومال نکال کر اسے ریوالور پر پھیر کر اپنی انگلیوں کے نشانات مٹائے اور اسے کچرے میں پھینک کر میں وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

میرا ارادہ بدر نواز کے ہوٹل کی طرف جانے کا تھا لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ مجھے حیدر الماس کی بات یاد آگئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ انہیں چودھری ساجد کے بارے میں معلوم ہوگیا ہے کہ آخر وہ کون سی ''شخصیت'' ہے جو پردہ نشین ہے۔

میں اس بار سیڑھیوں کی بجائے ریلوے لائنیں کراس کر کے چوک پر پہنچا۔ وہاں سے میں ایک اورآٹو رکشے میں سوار ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔ بڑے ماموں وہاں موجود نہیں تھے۔ مرینہ نے بتایا کہ ان کی کوئی ضروری کال آگئی تھی اور وہ یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ وہ کل آئیں گے۔ انہیں ضروری

www.paksociety.com

کام سے کہیں جانا پڑ گیا ہے۔ امی مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔

کچھ دیر کے بعد حیدر الماس صاحب کا ایک آدمی آیا جس نے اپنا نام قیصر بتایا تھا۔ وہ لمبا تڑنگا اور بھاری جثے کا نوجوان تھا۔ اس کی مونچھیں قدرے گھنی تھیں البتہ داڑھی نہیں تھی۔ میں نے اسپتال آنے کے بعد مرینہ کو بتا دیا تھا کہ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ اس نے استفسار نہیں کیا تھا لیکن وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہے پھر مزید کچھ دیر کے بعد ہم ایک کار میں بیٹھے کہکشاں کالونی کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں قیصر کے بقول حیدر صاحب نے ایک مکان کرائے پر لیا تھا۔ امی، مرینہ اور میڈ کو مکان میں پہنچانے کے بعد میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا پھر قیصر کے ساتھ حیدر الماس صاحب کے زکریا ٹاؤن والے ٹھکانے پر آ گیا۔

☆.....☆

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں کمرے میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ مجھے زکریا ٹاؤن والے ٹھکانے پر رہتے ہوئے آج دوسرا روز تھا۔ حیدر الماس ان دو روز میں وہاں نہیں آئے تھے۔ ان کی طبیعت ابھی خراب تھی اس لیے وہ نہیں آ سکے تھے۔ ان کے نہ آنے سے میری بے چینی مزید بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے چودھری ساجد کے حوالے سے کسی سرپرائز کی بات کی تھی اور میں وہ سرپرائز جاننے کے لیے بے چین تھا۔ میں نے حیدر الماس کو چودھری ساجد کے آدمی بدر نواز اور اس کے سورج میانی والے ہوٹل کے بارے میں بتایا تو انہوں نے مجھے وہاں جانے سے منع کر دیا۔ ساتھ ہی کہا کہ جب وہ خود آ کر مجھے چودھری ساجد کے بارے میں بتائیں گے اس لیے پھر میں اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالوں؟

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی گنگنا اٹھی تو میں نے دیکھا۔ میرے باس اسماعیل شاہد کال کر رہے تھے۔ میں نے مؤدبانہ انداز میں انہیں سلام کیا تو وہ جواب دیتے ہوئے پوچھنے لگے۔ ''علی بیٹا! میں کل تمہارا انتظار کرتا رہا، تم آئے ہی نہیں؟''

''سوری سر۔ کل شام مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس لیے میں نہیں آ سکا۔''

''حملہ۔ اوہ، کیا کہہ رہے ہو۔'' ان کی ششدر آواز میری سماعت میں گونجی۔ ''یہ سب کیسے ہوا، تمہیں کچھ ہوا تو نہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔'' میں نے جواب دیا۔

''معلوم ہوا کہ یہ حملہ کس نے کروایا ہے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''یہ حملہ چودھری ساجد نے کروایا ہے۔''

''اوہو.....'' وہ پریشان آواز میں بولے۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ حملہ چودھری ساجد نے کروایا ہے؟''

میں نے اسلم سے ہونے والی بات چیت دوہرا دی تو وہ متفکر لہجے میں بولے۔ ''یہ تو واقعی خطرناک بات ہے۔''

''سر۔ آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے چودھری ساجد کو ٹریس کر لیا ہے۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ بدبخت اور روسیاہ کون ہے؟''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر وہ گمبھیر لہجے میں بولے۔ ''فون پر بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم اسے نہیں جانتے۔ میں نے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی ہیں۔ وہ بہت خطرناک انسان ہے۔ میں نے اس کے ٹھکانے کے بارے میں معلوم کر لیا ہے۔ اگر تم میرے پاس آ جاؤ تو ہم ابھی اس کی سرکوبی کے لیے چلتے ہیں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا اور مجھے حیدر الماس کی نصیحت یاد آ گئی۔ انہوں نے مجھے منع کیا تھا کہ میں اپنے باس اسماعیل شاہد سے نہ ملنے جاؤں۔ کوئی گڑبڑ تھی۔ تاہم میں نے اپنے لہجے میں جوش پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے سر، میں ابھی آ رہا ہوں۔''

''اوکے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ جلد سے جلد میرے پاس پہنچو تاکہ میں اس سے تمہاری بہن کے بارے میں معلوم کروں۔''

میں نے اوکے کہا تو انہوں نے کال منقطع کر دی۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ حیدر الماس آ گئے۔ ان کے بازو اور گردن پر بدستور پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ قدرے کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے ساتھ میرا دوست بابر عرف جوکر بھی تھا جس نے اپنے کاندھے پر ایک بیگ لٹکایا ہوا تھا۔ ہم تینوں ایک دوسرے سے گرمجوشی سے ملے پھر ہم صوفوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ باتوں کے دوران ہی جوکر کی ویڈیو کا ذکر چل پڑا تو بابر عرف جوکر بولا۔ ''آپ جانتے ہیں، اس ویڈیو کو ساڑھے چار سو لائیکس ملے ہیں۔''

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے یہ تمہارے لیے فخر کی

بات ہو۔'' حیدر الماس صاحب نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''کمنٹس پڑھے تھے لڑکیوں کے؟ تمہیں بہت دھو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ کئی لڑکیوں نے تمہیں مختلف القابات سے بھی نوازا ہے۔''

''جی پڑھے تھے۔'' وہ بدستور فخریہ لہجے میں بولا۔

''میرے لیے لڑکیوں کے القابات بھی اعزاز ہیں۔''

''صرف تمغہ امتیاز دینا باقی رہ گیا ہے۔'' میں نے لقمہ لگایا تو جوکر نے مجھے گھورتی نظروں سے نوازا البتہ حیدر الماس مسکرا دیے۔

''ہاں ہاں، تم بھی کہہ لو۔ اڑا لو میرا مذاق۔ میری دعا ہے کہ تم بھی کسی لڑکی کو چھیڑو اور وہ تمہاری مجھ سے بھی زیادہ خاطر تواضع کرے اور موقع پر موجود کوئی اس سین کو کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کر کے سوشل میڈیا پر وائرل کر دے پھر تمہیں بھی میری ویڈیو سے زیادہ لائکس، کمنٹس اور خطابات ملیں گے۔'' جوکر نے برا مناتے ہوئے کہا تو میں مسکرا دیا۔

''بھئی میں تو کسی لڑکی کو نہیں چھیڑتا۔'' میں نے کہا۔

''اور نہ ہی کبھی چھیڑوں گا۔ میرے نزدیک یہ انتہائی گھٹیا حرکت ہے۔'' میں نے کہا۔ شاید میں وہ وقت بھول گیا تھا جب میں چنچی رکشوں میں سوار لڑکیوں کا تعاقب کیا کرتا تھا۔ ان کے سامنے ہیرو بننے کی کوشش کرتا تھا۔

''اچھا۔ تم کب سے شریف بن گئے ہو؟'' جوکر حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب۔ کیا میں شریف نہیں ہوں؟'' میں نے جوکر کو آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

''بہت..... زیادہ شریف ہو۔'' اس نے بہت کو کھینچتے ہوئے کہا۔

''الحمد للہ۔'' میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''کوئی شک۔''

''بالکل۔ جانتا ہوں تم کتنے شریف ہو۔'' جوکر نے پینترا بدلتے ہوئے کہا تو میں چونک پڑا۔

''کیا مطلب۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''کیا وہ دن بھول گئے ہو جب تم کالج سے چھٹی کے بعد موٹر بائیک پر تانگوں اور رکشوں پر گھر جاتی لڑکیوں کا تعاقب کرتے تھے۔ ان کے سامنے ہیرو بننے کی ایکٹنگ کرتے تھے۔ بتاؤ، کیا بھول گئے ہو؟'' جوکر نے مجھے یاد دلایا تو میں نہ صرف گڑبڑا گیا بلکہ میں نے غصے سے جوکر کو گھورا۔ وہ تو میرے کرتوت بے نقاب کرنے پر تل گیا تھا۔

میں نے گڑبڑاتی نظروں سے حیدر الماس کی طرف دیکھا تو وہ زیر لب مسکراتے ہماری نوک جھونک سے محظوظ ہو رہے تھے۔

''کیا بکواس کر رہے ہو جوکر۔'' میں نے نظروں ہی نظروں میں اسے وارن کیا لیکن اس نے میری وارننگ کو ہوا میں اڑا دیا۔

''انکل! آپ اسے نہیں جانتے۔ یہ ایک نمبر کا فلرٹی ہے۔'' جوکر حیدر الماس صاحب سے مخاطب ہوا۔ ''یہ.....''

میں نے جلدی سے جوکر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''حیدر صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بکواس کر رہا ہے۔ میں تو.....'' میں نے کہنا چاہا تو ان کے حلق سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔

''ہاں ہاں بولو۔ میں تو..... میں تو کیا..... بولو۔'' جوکر نے کہا تو میں شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

''میں بتا دوں..... وہ گڑھے میں گرنے والا واقعہ؟'' جوکر نے کہا تو میں ایک بار پھر گڑبڑا گیا۔ وہ واقعہ اس طرح تھا کہ ایک روز میں اور جوکر کالج سے چھٹی کے بعد اپنی اپنی بائیکس پر گھر جا رہے تھے کہ راستے میں ایک تانگہ جا رہا تھا جس پر کالج کی لڑکیاں سوار تھیں۔ میں اور جوکر لڑکیوں کو تاڑتے ہوئے تانگے کے پیچھے جا رہے تھے کہ اچانک سڑک پر ایک گڑھا آ گیا تھا۔ گڑھا کافی گہرا تھا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی تھی لیکن میں بائیک سمیت گڑھے میں گر گیا تھا۔ مجھے گڑھے میں گرتا دیکھ کر لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسی تھیں اور میں شرمندہ ہو کر رہ گیا تھا۔ گڑھے میں گرنے کی بدولت مجھے اچھی خاصی چوٹیں بھی آئی تھیں۔ اب جوکر اسی واقعے کا ذکر کر رہا تھا۔ اس نے میری بات نہیں سنی تھی اور حیدر الماس صاحب کو سارا واقعہ مزے لے لے کر سنا دیا تھا۔ وہ بھی بہت ہنسے تھے۔

''جوکر! تمہیں تو میں بعد میں دیکھ لوں گا۔'' میں نے دبے لہجے میں کہا۔

''اوہو دھمکی.....'' وہ آنکھوں کے دیدے گھماتے ہوئے بولا۔ پھر مسکینی صورت بنا کر حیدر صاحب سے مخاطب ہوا۔ ''انکل! آپ دیکھ رہے ہیں، یہ آپ کے سامنے مجھے دھمکیاں دے رہا ہے۔''

اس بار حیدر الماس صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ چند لمحے وہ ہنستے رہے پھر سنجیدگی سے گویا ہوئے۔ ''اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔''

www.paksociety.com

"جی چھوڑ دیا۔" جوکر نے اپنی عادت کے مطابق کہا۔ "اور کوئی حکم؟"

"بابر! تم جا کر قیصر سے کہو کہ وہ ہمارے لیے چائے بنا دے۔ میں نے علی سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" حیدر الماس صاحب نے کہا تو وہ "جی اچھا" کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ اب کمرے میں، میں اور حیدر الماس تھے۔ مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔ جوکر نے ان کے سامنے میری اچھی خاصی بے عزتی کر دی تھی۔ شاید حیدر الماس بھی میری شرمندگی بھانپ گئے تھے۔ بولے۔

"ارے تم کیوں شرمندہ ہو رہے ہو۔ نوجوانوں سے ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔"

"جی۔" میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ پھر جیسے یاد آنے پر دوبارہ بولا۔ "وہ...... آپ نے مجھے سرپرائز دینے کا کہا تھا؟"

"مجھے یاد ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ "لگتا ہے تم سرپرائز جاننے کے لیے کافی بے چین ہو رہے ہو۔"

"جی ہاں، آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔" میں نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے باس کی کال بھی آئی تھی۔"

"اوہ اچھا۔ کیا کہہ رہے تھے وہ؟"

میں نے ساری بات بتا دی۔ وہ پُرغور انداز میں سنتے رہے پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پُرشفقت لہجے میں بولے۔ "علی! تم نے اچھا کیا کہ اپنے باس کو ٹال دیا اور اس کے پاس نہیں گئے ورنہ تم بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاتے اور شاید میں تمہیں نہ بچا پاتا۔"

اس بار میں چونک پڑا تھا۔ "میں سمجھا نہیں۔ میں یہ بات بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ نے مجھے ان سے ملنے سے کیوں روکا تھا؟" میں نے کہا۔

"میں نے تم سے سرپرائز کی بات کی تھی۔ یاد ہے؟" حیدر الماس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

میں... اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی...... یاد ہے، اور میں سرپرائز جاننے کے لیے کافی بے چین ہوں۔"

"ہمم۔" انہوں نے ہنکاری بھری۔ "گو کہ سرپرائز بہت خطرناک، بلکہ تمہاری سوچ کے برخلاف ہے اور ہوسکتا ہے کہ تمہیں یقین ہی نہ آئے لیکن حقیقت ہے۔ سنو گے تو تم شاکڈ میں رہ جاؤ گے۔"

میں الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ ایسا کیا سرپرائز تھا جس سے میں نے شاکڈ ہو جانا تھا۔ میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "آپ بتائیں سر۔ میں ذہنی طور پر تیار ہوں۔"

"ہونہہ۔" وہ سسپنس پیدا کرتے ہوئے بولے۔ "ویسے جو کچھ میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں...... وہ تمہارے لیے انتہائی اہم انکشاف ہوگا۔"

اس بار میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس پُرتجسس انداز میں منتظر ان کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ ایسا کیا تجسس آمیز انکشاف تھا جسے جاننے کے لیے میں بے چینی کی آخری حد کو چھو رہا تھا۔ حیدر الماس چند لمحے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے رہے پھر گمبھیر لہجے میں بولے۔

"تمہارے باس......" بولتے بولتے وہ رک گئے۔ میں نے کوئی بات نہ کی البتہ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بات پوری کرتے ہوئے دوبارہ بولے۔ "تمہارے باس اسماعیل شاہد ہی دراصل...... چودھری ساجد ہے۔"

"کیا......" مجھے واقعی شاک لگا اور میں ساکت و جامد رہ گیا۔ حیدر الماس صاحب نے صحیح کہا تھا۔ میں "سرپرائز" سن کر واقعی شاکڈ کی حالت میں چلا گیا تھا۔ میں حیرت، غم اور غصے کی ملی جلی کیفیات میں مبتلا ہو گیا۔ میرے حواس بے اعتدال ہو گئے تھے۔ دماغ سن ہو گیا تھا۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔

"علی...... تم ٹھیک تو ہو؟" حیدر الماس صاحب کی آواز مجھے گہرے کنویں سے سنائی دی تھی۔ انہوں نے جب مجھے جھنجھوڑا تو میں یک لخت صدمے کی کیفیت سے باہر نکل آیا لیکن بے یقینی ہنوز برقرار تھی۔ انہوں نے میز پر پڑے جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور گلاس مجھے دیتے ہوئے بولے۔ "پانی۔"

مجھے پیاس تو نہیں لگی تھی لیکن میں جس حالت، کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا میرے لیے پانی پینا ضروری ہو گیا تھا۔ پانی پینے سے ہی میری سکتے کی کیفیت میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ میں نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے بے یقین انداز میں پوچھا۔

"کیا...... آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"مجھے پتا تھا کہ تمہیں شاک لگے گا۔" انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "لیکن یہ سچ ہے۔"

"اوہو...... اتنا بھیانک انکشاف۔" اس بار میں

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ یہ میرے لیے سرپرائز تو تھا لیکن انتہائی بھیانک سرپرائز تھا۔ کئی پل گزر گئے مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میرا باس اسماعیل شاہد ہی دراصل چودھری ساجد ہے۔ مجھے اپنے کانوں میں سائیں سائیں کی آواز گونجتی سنائی دے رہی تھیں۔ یکدم میرے دل میں اسماعیل شاہد کے خلاف نفرت کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ میرے دل سے ان کے لیے عزت، اپنائیت اور احترام نکل گیا اور نفرت نے ڈیرہ ڈال لیا۔ میرے دماغ میں لاوا سا پکنے لگا۔

حیدر الماس میری کیفیت کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ اسماعیل شاہد ہی چودھری ساجد ہے؟'' میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

حیدر الماس ایک طویل سانس لے کر رہ گئے پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ایک بار میں اپنی بیوی نازنین کے ساتھ چودھری باسط کی کوٹھی پر گیا تھا تو میں نے اسماعیل شاہد کو اس کی فیملی سمیت وہاں سے نکلتے دیکھا تھا۔ میرے استفسار پر چودھری باسط نے بتایا تھا کہ اس کا نام چودھری ساجد ہے اور وہ اس کا قریبی رشتے دار ہے۔ کچھ عرصے کے بعد میں اپنے ایک دوست احمد کریم کے بیٹے کی ولیمہ تقریب میں موجود تھا۔ وہاں شہر کی بڑی بڑی ہستیاں آئی ہوئی تھیں۔ سیاست دان آئے ہوئے تھے۔ اچانک مجھے وہاں چودھری ساجد دکھائی دیا۔ باتوں باتوں کے دوران ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس کا نام چودھری ساجد نہیں، اسماعیل شاہد ہے اور اس کی مختلف شہروں میں سرکس چلتا ہے۔ میں حیران ہوا کہ ایک آدمی کے دو نام کیسے ہو سکتے ہیں۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ شاید چودھری ساجد اور اسماعیل شاہد دونوں جڑواں بھائی ہوں لیکن ایسا نہیں تھا۔ احمد کریم نے بتایا تھا کہ اسماعیل شاہد کا کوئی جڑواں بھائی نہیں ہے۔ میرے استفسار پر احمد کریم نے بتایا کہ اس کی دوستی اس سے بزنس ایڈ کے حوالے سے ہوئی تھی کیونکہ احمد کریم ایک نیوز پیپر میں منیجر شعبہ اشتہارات سے منسلک ہے۔ بہرحال میں چودھری ساجد کی دوہری شخصیت پر نہ صرف حیران تھا بلکہ پریشان بھی تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہوا ہے۔ مجھے کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا تھا چنانچہ میں نے اپنے ذرائع سے ایک ایسا شخص تلاش کر لیا جس نے میرے لیے اس کی جاسوسی کی اور مجھ پر پھر انکشاف ہوا کہ چودھری ساجد کا اصل نام اسماعیل شاہد ہے اور وہ کسی عالمی نیٹ ورک سے منسلک ہے اور اس کا پاکستان میں بھی نیٹ ورک پھیلا ہوا ہے۔ پاکستان میں چلنے والے نیٹ ورک کا ہیڈ کوارٹر لاہور میں ہے اور اس کا چیف بھی چودھری ساجد ہے۔ میں نے نیٹ ورک کے بارے میں معلوم کرایا تو پتا چلا کہ وہ لڑکیوں کی اسمگلنگ کے نیٹ ورک سے منسلک ہے اور اندازے کے مطابق اب تک سینکڑوں لڑکیوں کی اسمگلنگ کر چکا ہے۔ بہرحال بعد میں یہ بھی پتا چلا کہ چودھری باسط اور اس کا بیٹا شانی بھی چودھری ساجد کے لیے کام کرتے ہیں اور کوئی ثبوت نہ ہونے کی بناء پر یہ سب بچے ہوئے ہیں۔'' اتنی طویل گفتگو کے بعد حیدر الماس کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ انہوں نے میز پر پڑا شیشے کا جگ اٹھا کر گلاس میں پانی انڈیلا اور جگ رکھ کر گلاس اٹھا لیا۔ انہوں نے ایک ہی سانس میں پانی پی کر گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔

یہ حیرت انگیز انکشافات سن کر میں انگشت بدنداں تھا۔ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اسماعیل شاہد ہی دراصل چودھری ساجد ہے جس کی تلاش میں، میں مارا مارا پھر رہا ہوں اور اس کی ناک کے نیچے ہونے کے باوجود اسے ٹریس نہیں کر سکا۔ اس کا یہ بھی مطلب تھا کہ وہ باڑی چوک پر پہنچنے، مجھے پکڑنے کی کوشش ڈرامائی تھی۔ اور اسماعیل شاہد نے مجھے مانگا پل کی بستی، چودھری باسط کے ٹھکانے پر میری بہن کی موجودگی اور وہاں جانے کا ڈراما کیا تھا۔ ان کی خاموشی، پریشانی اور سنجیدگی بھی ڈراما تھی۔ وہ مجھے یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ وہ میری بہن کے لیے فکرمند ہیں۔

حیدر الماس نے اپنی گفتگو مزید آگے بڑھائی۔ ''جب تم نے اپنی بہن کے اغوا کی کہانی سنائی اور چودھری ساجد کا نام لیا تو میں نے تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد تمہاری ایک ایک ایکٹویٹی سے واقف تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ تمہارے پاس چودھری باسط کی وڈیو موجود ہے اور تم وہ وڈیو میرے حوالے کرنے والے ہو تو اس نے اپنے غنڈوں کو تمہیں اور تمہاری فیملی کو اغوا کرنے کے لیے بھیج دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ باقی کی کہانی تمہارے سامنے ہے۔''

میں نے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ کئی سوالات میرے ذہن میں گونج رہے تھے اور مجھے ان کے جوابات بھی مل رہے تھے۔ حیدر الماس کی بات درست تھی کہ اسماعیل شاہد میری ایک ایک ایکٹویٹی سے واقف تھا لیکن ایک بات سمجھ نہیں

www.pakistanipoint.com

آرہی تھی کہ سب کچھ جاننے کے باوجود اس نے مجھے چودھری باسط کی شرانگیزی سے کیوں بچائے رکھا تھا۔
''ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں؟'' میں نے کہا۔
''ہاں پوچھو۔'' وہ بولے۔
''اسماعیل شاہد......یعنی چودھری ساجد جن لڑکیوں کو اغوا کرتا ہے وہ ان کے ساتھ کیا کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
حیدر الماس حیران ہوئے پھر بولے۔ ''ابھی بتایا تو ہے کہ وہ ان لڑکیوں کی اسمگلنگ کرتا ہے۔''
''جن لڑکیوں کو اسمگل کیا جاتا ہے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟'' میں نے بہ مشکل یہ سوال کیا تو حیدر الماس طویل سانس لے کر رہ گئے۔
''ظاہری سی بات ہے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا ہوگا۔'' حیدر الماس کندھے اچکا کر بولے۔
''مثلاً......؟'' میں نے کہا۔ میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔
''میں سمجھ گیا ہوں تم کیا پوچھنا چاہتے ہو۔'' وہ ناصحانہ انداز میں بولے۔ ''دیکھو علی! عالمی سطح پر برائی کے پھیلے یہ نیٹ ورک اغوا شدہ لڑکیوں کو کال گرل بنا دیتے ہیں یا انہیں پورنوگرافی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مجھے کہتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہے لیکن یہ سچ ہے۔''
مجھے روزینہ کا خیال آیا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اپنی بہن کے بارے میں سوچ کر ہی میں ششدر رہ گیا۔ اس کے باوجود میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے اسی لیے میں نے اس خیال کو فوراً ہی جھٹکنے کی کوشش کی۔
''کیا چودھری باسط کو پتا ہے کہ آپ اسماعیل شاہد کی دوہری شخصیت سے آگاہ ہیں۔'' میں نے پوچھا۔
''نہیں۔'' حیدر الماس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے کبھی چودھری باسط سے اس بارے میں گفتگو ہی نہیں کی۔''
میں نے اثبات میں گردن ہلا دی پھر اچانک میں.... ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تو حیدر الماس ٹھٹک گئے اور وہ بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کہاں جا رہے ہو۔
میں نے کہا۔ ''میں اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد کے پاس جا رہا ہوں۔''
''علی! بے وقوفوں والی حرکت مت کرو۔'' وہ قطعیت سے بولے۔ ''جوش کی بجائے ہوش سے کام لو۔ ہوش کھو دینے والا شخص پاگل پن کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور اس سے وہ کچھ سرزد ہو جاتا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔''
میری آنکھوں میں نمی عود آئی اور میں نے نمناک لہجے میں کہا۔ ''حیدر صاحب! اس نے میری بہن کو اغوا کیا ہے اور وہ جانتا تھا کہ میں اپنی بہن کی تلاش میں گردش زدہ ہوں، میری ماں کی حالت بگڑ چکی ہے لیکن وہ ہماری حالت دیکھ کر محظوظ ہوتا رہا۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی مجھ پر، میری فیملی پر ترس نہیں آیا۔''
''اس نے تمہیں بتا کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی تو نہیں ماری تھی۔'' حیدر الماس ناصحانہ لہجے میں بولے۔ ''بیٹھ جاؤ۔''
''لیکن حیدر صاحب......'' میں نے کہنا چاہا۔
''میں نے کہا نا، بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا تو میں ہونٹ بھینچتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ حیدر الماس صاحب بھی بیٹھ گئے۔ میرے ذہن میں نفرت کا لاوا بدستور پک رہا تھا اور اس کے پکنے میں شدت آتی جا رہی تھی۔ میرا سکون، سکھ اور چین برباد ہو گیا تھا۔ بس یہی تمنا تھی کہ میں جلد سے جلد اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد کے پاس پہنچ جاؤں۔
''دیکھو علی! تم جانتے ہو کہ چودھری باسط اور چودھری ساجد دونوں کے کارندے تمہاری تلاش میں ہیں۔ تم کسی کو بھی کہیں دکھائی دیے تو وہ تمہیں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گولیوں سے بھون ڈالیں گے اس لیے تمہیں ہر قدم اب پھونک پھونک کر رکھنا ہوگا۔'' وہ نصیحت آمیز لہجے میں بولے۔
''آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟'' میں نے بے بس لہجے میں کہا۔ واقعی میں اس وقت بے حد بے بسی محسوس کر رہا تھا۔
''پہلے خود کو سنبھالو۔'' وہ بولے۔
''میں ہر حال میں اسماعیل شاہد تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ میں اس سے اگلوانا چاہتا ہوں کہ اس نے میری بہن کو کہاں اسمگل کیا ہے؟'' میں اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔
''ہونہہ۔'' حیدر الماس نے ہنکارا بھرا... پھر میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ ''انتظار کرو۔ چودھری ساجد کے ہاتھ بے حد لمبے ہیں۔ اہم پوسٹوں پر تعینات ا

اس کی مٹھی میں ہیں۔ اگر ہم نے جلد بازی سے کام لیا تو ہم کسی مصیبت سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں تمہیں لے کر اچانک ہی چودھری ساجد کے پاس پہنچ جاؤں گا لیکن حقیقت جاننے کے بعد میں نے اپنے پلان پر عملدرآمد روک دیا ہے۔ لیکن تم پریشان مت ہو۔ میں چودھری ساجد کے بارے میں آگاہ ہوں جیسے ہی حالات ہمارے حق میں سازگار ہوئے تو ہم اس پر ہاتھ ڈال دیں گے پھر اسے قانون کے شکنجے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔''

''ایسے طاقتور لوگ قانون کی سزا سے بچ نکلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب یہ ہمارے شکنجے میں آئے گا تو پھر اسے کوئی نہیں بچا سکے گا۔'' انہوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی۔

وہ اپنی جگہ ٹھیک سوچ رہے تھے لیکن میرے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''نہیں حیدر صاحب۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو رہا۔ آپ نہیں جانتے کہ میں دہکتے انگاروں پر لوٹ رہا ہوں۔ مجھے ایک پل چین نہیں آ رہا۔ لمحہ لمحہ اذیت و کرب میں گزر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں جلد از جلد چودھری ساجد تک پہنچوں اس لیے آپ مجھے مت روکیں۔ میں آج چودھری ساجد کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

میرے لہجے میں جوش اور ولولہ عود آیا تھا۔ حیدر الماس .... اس بار طنزیہ لہجے میں بولے۔ ''تم کیا سمجھتے ہو چودھری ساجد تمہیں آسانی سے تمہاری بہن کے متعلق بتا دے گا؟''

میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ''میں اس کا ایسا حشر کروں گا کہ وہ بتانے پر مجبور ہو جائے گا۔''

میری بات پر انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور پھر سپاٹ لہجے میں بولے۔ ''اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد بے حد کائیاں، چالباز اور خطرناک انسان ہے۔ وہ خود کوئی کام نہیں کرتا بلکہ اس کے حواری سب کچھ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل رہا۔ اگر تم اس پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو تو تمہیں انتہائی احتیاط اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ تمہاری ذرا سی غلطی تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو جائے گی اس لیے ہوش سے کام لو۔'' وہ بولے تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

ان کی بات درست تھی۔ اس وقت مجھے جوش کی بجائے ہوش سے کام لینا تھا۔ میری ذرا سی غلطی مجھے موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ چودھری ساجد اور چودھری باسط دونوں ہی میرے خون کے پیاسے تھے۔

انہوں نے مزید کہا۔ ''میں اسے گھیرنے کی تیاری کر رہا ہوں...اور مجھے اُمید ہے کہ ہم چند روز میں اسے پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میرے آدمی اس کے خلاف ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جیسے ہی اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت ہمارے ہاتھ لگا تو وہ ہماری کسٹڈی میں ہوگا...پھر میں اس سے تمہاری بہن کے بارے میں معلوم کر لوں گا۔''

''ثبوت کیسے حاصل ہوگا؟''

''ہماری کوشش جاری ہے۔'' وہ بولے۔ ''گو کہ اسماعیل شاہد نے خود کو نیوٹرل رکھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ کوئی انسان کتنا بھی چالاک، عیار اور مکار ہو وہ اپنی کوئی نہ کوئی کمزوری یا ثبوت ضرور چھوڑتا ہے جس سے اس کے گرد گھیرا تنگ کیا جا سکے۔ اسماعیل شاہد بھی بے حد چوکنا اور چالاک انسان ہے۔''

میں نے ہمکاری بھری۔ پھر اس سے پہلے کہ ہمارے درمیان مزید کوئی بات ہوتی، اسی لمحے بابر عرف جوکر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس پر تین کپ پڑے ہوئے تھے اور ان کپوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ماحول میں کبیدگی چھائی ہوئی تھی اس لیے بابر عرف جوکر حیران اور پریشان نگاہوں سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''انکل۔ خیریت تو ہے نا؟'' وہ ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں۔ خیریت ہی ہے۔'' حیدر الماس نے جواب دیا۔

''لیکن مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ دونوں کے چہروں پر بارہ بج رہے ہیں۔'' جوکر نے کہا تو حیدر الماس نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیے۔ لیکن میں سنجیدہ ہی رہا۔

''تم اتنی دیر سے کہاں تھے۔'' حیدر الماس نے کہا۔ ''تمہارے دوست کو تمہاری غیر موجودگی میں بوریت ہو رہی تھی۔''

''میں قیصر کے ساتھ ہی چائے بنانے لگ گیا تھا۔'' جوکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب آ گیا ہوں تو علی کو بور نہیں ہونے دوں گا۔''

''ہمم۔ گڈ۔'' حیدر الماس بولے اور چائے کا کپ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اٹھالیا۔ ''چائے پیئو علی۔''

میں نے بجھے دل کے ساتھ کپ اٹھایا اور چائے سپ کرنے لگا۔ وہ چائے کم اور زہر زیادہ لگ رہی تھی۔ چائے پینے کے بعد حیدر الماس وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوئے تو ہم دونوں بھی کھڑے ہوگئے۔

''تم دونوں آرام کرو۔ اب میں چلتا ہوں۔'' وہ بولے پھر میری طرف دیکھا۔

''میں کیا کروں؟''

''تمہیں فی الحال کچھ کرنے یا کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے چودھری ساجد پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ جیسے ہی کوئی موقع اور ثبوت ملتا ہے تو ہم اس پر ہاتھ ڈال دیں گے۔ اس کے پکڑے جانے کے بعد ہی اس کا پورا گینگ پکڑا جائے گا۔''

''اور اگر اسماعیل شاہد کا فون آگیا تو.....'' ایک خیال کے تحت میں نے پوچھا۔

''تم کال ریسیو ہی نہ کرنا۔'' حیدر الماس نے کہا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ حیدر الماس نے میرے کندھے پر تھپکی دی اور پھر وہ وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد کی کال کا تانتا بندھ گیا لیکن میں نے حیدر الماس کی ہدایت کے مطابق ایک کال بھی ریسیو نہ کی۔ بالآخر انہوں نے کال کرنا ہی بند کر دیا۔ شاید وہ سمجھ گئے تھے کہ میں ان کی کال ہی ریسیو نہیں کرنا چاہتا۔ ایک ایک پل مجھے صدیوں پر محیط محسوس ہو رہا تھا۔ جو کر تو اپنی طرف سے لطیفے اور چٹکلے سنا سنا کر میرا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرے دل میں بے چینی تھی۔ بالآخر رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہی بابر عرف جو کر نے سونے کا اعلان کر دیا۔

''جو کر۔'' وہ کروٹ بدلنے لگا تو میں نے کہا۔

''ہاں بولو۔'' اس نے کہا۔

''کیا تمہارے پاس لیپ ٹاپ ہے؟''

''ہاں ہے۔ تو.....''

''کیا میں تھوڑی دیر کے لیے استعمال کر سکتا ہوں؟'' میں نے اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔'' وہ کھلے دل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ پھر وہ اٹھ کر میز کی طرف گیا جہاں اس کا بیگ پڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے بیگ میں لیپ ٹاپ ہے کیونکہ اس کا لیپ ٹاپ ہر وقت اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ کہیں بھی جاتا تھا تو اسے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس نے بیگ کھول کر لیپ ٹاپ نکالا اور مجھے دے دیا۔

''کیا اس پر نیٹ چل رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نیٹ یوز کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے استفسار کیا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس نے بیگ سے ایک فلیش نما ڈیوائس نکال کر لیپ ٹاپ میں لگائی تو چند لمحوں کے بعد نیٹ آن ہوگیا۔

''کیا ایکشن اور سسپنس فل فلم دیکھنا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں..... کچھ اور کام ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہمم۔ خوبصورت اور حسین ترین لڑکیاں دیکھنا چاہتے ہوگے۔'' اس بار جو کر شرارت آمیز لہجے میں بولا تو مجھے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔

''نہیں یار۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم سوتے ہو یا میں تمہیں زبردستی سلاؤں۔'' میں نے کہا تو اس نے اپنے چہرے پر خوف کے تاثرات پیدا کر لیے۔

''اوکے اوکے۔ تم انجوائے کرو، میں سو رہا ہوں۔ صبح ملاقات ہوگی۔'' وہ بستر پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔ ''شب بخیر۔''

''شب بخیر۔'' میں نے جواب دیا۔

اس کے سوتے ہی میں گوگل پر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ دراصل میں ان لڑکیوں کو سرچ کرنا چاہ رہا تھا جو پورن انڈسٹری سے وابستہ تھیں۔ میرے دماغ میں ایک خدشہ، خوف اور اندیشہ تھا کہ انہی میں شاید روزینہ کی بھی تصویر ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد پورن لڑکیوں کی نازیبا تصاویر اوپن ہو گئیں اور میں ہونٹ بھینچ کر ایک ایک تصویر دیکھنے لگا۔ ہر تصویر کے نیچے لڑکی کا نام، عمر، قد و قامت اور اس کے ملک کا نام بھی درج تھا۔ زیادہ تر لڑکیوں کا تعلق یورپین کنٹریز سے تھا۔

میں نے سب سے پہلے لندن کی گرلز کو سرچ کیا لیکن ان میں روزینہ کی تصویر نہیں تھی... پھر میں نے امریکا کی لڑکیوں کو سرچ کیا تو ان میں بھی تصویر نہیں تھی۔ میرے لیے یہ خوش آئند بات تھی کہ ان لڑکیوں کی تصاویر میں روزینہ کی تصویر نہیں تھی۔

میں تقریباً ایک گھنٹا سرچنگ کرتا رہا تھا لیکن میں

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

روزینہ کو تلاش نہیں کر پایا تھا۔ بالآخر میں نے لیپ ٹاپ بند کر کے سائیڈ پر رکھا اور بابر عرف جوکر پر نظر ڈالی۔ وہ سو رہا تھا۔ میں نے نائٹ بلب جلا کر لائٹ آف کی اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ میرا دل روزینہ کی حفاظت کے لیے دعا گو تھا۔

مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میرے دماغ کے پردے پر اسماعیل شاہد کا نام ابھر آیا تھا۔ میرا دل کر رہا تھا کہ میں ابھی اڑ کر اس تک پہنچ جاؤں اور اس کا حشر نشر کر دوں لیکن پھر مجھے حیدر الماس صاحب کی تنبیہہ یاد آگئی تھی۔ میں نے سونے کی بے حد کوشش کی لیکن نیند گویا آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ساری رات میں نے بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے گزاری تھی۔ میری بے چینی کی وجہ اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد تھا۔

☆......☆

صبح اٹھا تو میں بے حد کسلمندی محسوس کر رہا تھا۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی تھی بلکہ میں نے وہ رات کانٹوں کے بستر پر گزاری تھی۔ بابر عرف جوکر اور میں نے اکٹھے ہی ناشتا کیا تھا پھر بابر عرف جوکر لیپ ٹاپ پر بزی ہو گیا جبکہ میں لان میں ٹہلنے لگا۔ اسی دوران میرے موبائل کی میسج ٹون گنگنائی تو... میں نے میسج لسٹ اوپن کی تو حمیرہ کا میسج آیا ہوا تھا۔ اس نے سلام کے بعد پوچھا تھا۔ ''آپ کیسے ہیں، آپ نے دوبارہ میسج ہی نہیں کیا۔''

میں چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر میں نے اسے جوابی میسج کیا۔ ''الحمدللہ، میں ٹھیک ہوں لیکن کافی بزی ہوں۔''

مجھے میسج سینڈ کیے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کا میسج آگیا۔ ''میں جب بھی آپ سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہوں آپ بزی ہوتے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے دوستی قائم نہیں رکھنا چاہتے تو بتا دیں۔''

شاید حمیرہ کو میرا بزی کہنا برا لگا تھا اسی لیے اس نے ناراضگی بھرا میسج کیا تھا۔ میں سوچتا رہا کہ اسے کیا جواب دوں... پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا تو میں نے میسج ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ ''اچھی دوست! سوری، دراصل میری مصروفیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ میں اپنے گھر والوں کو بھی ٹائم نہیں دے پا رہا۔ ہماری دوستی قائم رہے گی۔''

اس کا جوابی میسج آگیا۔ ''اوکے تھینکس، اچھا اب اپنے بارے میں بتائیں۔ مجھے تو آپ کا نام تک معلوم نہیں۔''

میں نے اسے اپنے بارے میں مختصراً لکھ کر سینڈ کر دیا۔ اسی طرح اس سے میسج پر باتیں ہوتی رہیں پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میرا واٹس ایپ ہے تو میں نے بتایا کہ وہاں ہے لیکن میں کبھی کبھار استعمال کرتا ہوں، پھر اس نے بتایا کہ اس نے مجھے اپنی تصویر واٹس ایپ کی ہے۔ میں دیکھوں اور اپنی تصویر بھی اسے واٹس ایپ کر دوں۔

میں نے واٹس ایپ آن کر کے دیکھا تو واقعی حمیرہ کی تصویر آئی ہوئی تھی۔ میں نے تصویر اوپن کی۔ وہ پُرکشش اور سانولی رنگت کی لڑکی تھی۔ اس کے بال سنہری رنگت کے تھے۔ آنکھیں بڑی اور گول گول تھیں، پلکیں کافی گھنی تھیں۔ اس نے سر پر دوپٹا لیا ہوا تھا اور مسکرا رہی تھی۔ جب میں نے پہلی بار حمیرہ کو دیکھا تھا تو وہ قدرے دور تھی اس لیے اس کی صورت واضح دکھائی نہیں دی تھی۔ اب اس نے اپنی تصویر بھیج دی تھی۔ ساتھ ہی میسج لکھا تھا کہ یہ اس کی آج صبح کی تصویر ہے اور میں اسے اپنی تصویر بھیج دوں۔

میرے سیل فون میں میری اپنی کوئی تصویر نہیں تھی اور نہ ہی کبھی تصویریں بنوانے کا شوق رہا تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے اپنی بھی لائیو تصویر بنا کر حمیرہ کو سینڈ کر دی اور ساتھ ہی لکھا کہ تصویر دیکھنے کے بعد وہ اسے ڈیلیٹ کر دے۔ عین اسی لمحے میرے پاس اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد کی کال آگئی لیکن میں نے ریسیو نہ کی۔ چند ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ دوبارہ کال آگئی۔ جب میں نے ریسیو نہ کی تو ان کا میسج آگیا کہ علی کہاں ہو، میری کال ریسیو کیوں نہیں کر رہے۔ مجھے کال کرو، تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ میں نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔

اس کے بعد دو روز گزر گئے ان کی کوئی کال نہیں آئی اور نہ ہی حیدر الماس وہاں آئے... اور نہ ہی انہوں نے رابطہ کیا تھا۔ نجانے وہ کہاں گئے تھے اور اسماعیل شاہد کے خلاف کیا اقدامات کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے کال کرنے کا کہا تھا لیکن دو روز گزرنے کے باوجود ان کی کال نہیں آئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ انتظار کب ختم ہوگا اور مجھے کب اپنے ہاتھ اسماعیل شاہد کی گردن دبوچنے کا موقع ملے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری الجھن، بے چینی اور بے قراری بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسماعیل شاہد کسی ایسے زہر کی طرح میرے رگ میں دوڑتے خون میں شامل ہو گیا تھا جو ایک دم انسان کی ہلاکت کی بجائے اسے آہستہ آہستہ موت کے دہانے کی طرف لے جاتا ہے۔

اسی طرح تیسرا روز بھی گزر گیا اور کوئی اہم پیش رفت

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نہ ہوسکی۔ اسماعیل شاہد نے بھی دوبارہ کال نہ کی تھی۔ شاید انہیں بھی کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا اور وہ محتاط ہوگئے تھے۔ اُس وقت میں لان میں بیٹھا حیدر الماس کی کال کا انتظار کررہا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے تھے اور میرا یہ وقت انتہائی بے زاری میں کٹ رہا تھا۔ بالآخر میں تھک ہار کر کمرے میں آگیا۔ بابر عرف جوکر لیپ ٹاپ پر بزی تھا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا تب سے میرے ساتھ ہی تھا۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی پھر مسکرا کر دوبارہ لیپ ٹاپ میں بزی ہوگیا۔

''بابر۔'' میں نے کہا تو اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں۔ بولو۔''

''تمہیں پتا ہے حیدر صاحب کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، مجھے نہیں پتا۔'' اُس نے جواباً نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ان کے نمبر پر کال کی تھی لیکن ان کا فون بند ہے۔ انکل اکثر و بیشتر ایسا ہی کرتے ہیں۔ جب وہ کہیں مصروف ہوتے ہیں تو اپنا نمبر بند رکھتے ہیں۔''

''پھر ان سے رابطہ کیسے ہوتا ہے؟''

''وہ خود ہی رابطہ کرتے ہیں۔''

''ہمم۔'' میں نے ہنکاری بھری اور پوچھا۔

''خیریت تو ہے، تم پریشان دکھائی دے رہے ہو؟''

میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ان کا کوئی اور نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟''

''نہیں۔'' اُس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''کیا کوئی مسئلہ ہوگیا ہے؟ مجھے بتاؤ، کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں بس.....'' میں کہتے کہتے رک گیا۔

''پھر تم پریشان، بے چین کیوں دکھائی دے رہے ہو؟'' شاید اس نے میرے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں کس وجہ سے پریشان اور اضطراب میں مبتلا ہوں۔ وہ بہ دستور میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں، تم کام کرو۔'' میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ البتہ مجھے محسوس ہوگیا تھا کہ بابر پُرسوچ نظروں سے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

جب اگلے روز بھی حیدر الماس وہاں نہ آئے اور نہ ہی مجھ سے رابطہ... کیا تو میں نے خود ہی حرکت میں آنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے آن کی آن میں فیصلہ کرلیا کہ میں اسماعیل شاہد کی کوٹھی پہنچ کر اسے اغوا کر کے یہاں لے آؤں گا۔ میں نتیجے سے بے خبر تھا کہ میں نے یہ فیصلہ درست کیا ہے یا صحیح۔ لیکن اب مجھ سے کچھ بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا بلکہ برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔

وہ رات بھی میں نے بے چینی اور اضطراری کیفیت کے ساتھ آنکھوں میں کاٹی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں رات تین بجے ہی بستر سے اٹھ گیا۔ بابر خواب خرگوش کے مزے لینے میں مگن تھا۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹے کمرے کے خاموش ماحول کو مرتعش کررہے تھے۔ تیار ہونے کے بعد میں خاموشی سے حویلی سے نکل کر مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے پروا کیے بغیر دل میں ٹھان لی تھی کہ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ کب تک میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں گا۔ ذیلی دروازے کو باہر سے کنڈی لگانے کے بعد میں مڑ کر شہر کی طرف جانے والی سڑک کی طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ تھوڑی ہی دور جانے کے بعد میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ میرے اندر ولولہ اور جوش سا بھرا ہوا تھا۔

سڑک پر پہنچا تو مجھے کوئی آٹو رکشا یا ٹیکسی دکھائی نہ دی۔ سڑک ویران اور سنسان پڑی تھی۔ چاروں طرف گہرا سناٹا سا پھیلا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی ذی روح بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی سڑک پر دوڑنا شروع کر دیا۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے میں جوگنگ کر رہا ہوں۔ اندھیرا چہار سو پھیلا ہوا تھا اور وقت اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں تھا۔ اسماعیل شاہد کا علاقہ ایک گھنٹے کی لگ بھگ مسافت پر تھا۔ اگر میں پیدل جاتا تو مجھے کم از کم دو گھنٹے لگ سکتے تھے۔ دوڑتے دوڑتے اچانک مجھے دور سے آٹو رکشا کے آنے کی آواز سنائی دی تو میں نے مڑ کر دیکھا۔

دور سے ہی ایک آٹو رکشا آرہا تھا جس کے فرنٹ بلب کی روشنی چھوٹے سے نقطے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ میں رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے دل میں اُمید کی ایک کرن بیدار ہوئی اور میں اس آٹو رکشے کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس روز سخت سردی بھی تھی جو ریڑھ کی ہڈی میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے رگڑتے ہوئے آٹو رکشے کی طرف دیکھا جو قدرے قریب آگیا تھا پھر جیسے ہی وہ مزید قریب آیا تو میں نے ڈرائیور کو رکشا روکنے کا اشارہ کیا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

آٹو رکشے کی رفتار قدرے ہلکی ہوگئی اور وہ میرے قریب پہنچ کر رک گیا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ آٹو رکشا خالی تھا۔ شاید ڈرائیور کہیں سواری اتار کر آرہا تھا اور واپسی پر اسے کوئی سواری نہیں ملی تھی۔ ڈرائیور ادھیڑ عمر تھا۔ اس نے سردی سے بچنے کے لیے خود کو ایک چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ سر پر بڑی سی اونی ٹوپی تھی۔ وہ گانے سننے کا شوقین دکھائی دیتا تھا کیونکہ اس نے لتا منگیشکر کا پرانا گانا لگایا ہوا تھا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر کی آواز ہلکی کی اور میری طرف متوجہ ہوا۔

''کہاں جانا ہے بیٹے؟'' ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا۔

''راوی کالونی جانا ہے۔'' میں نے کہا۔

چند لمحے ڈرائیور سوچتا رہا پھر اس نے ہامی بھرنے کے بعد کہا۔ ''بیٹا! راوی کالونی جا تو سکتا ہوں لیکن وہ کافی دور ہے۔''

میں نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو ڈبل کرایہ دوں گا۔ آپ چلیں۔''

وہ خوش ہوگیا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے آٹو رکشا آگے بڑھا دیا۔ ساتھ ہی اس نے ایک بار پھر ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا اور رکشے میں لتا منگیشکر کا گانا گونجنے لگا۔ مجھے انڈین گانوں سے خاصی چڑ تھی۔ چاہے وہ پرانے گانے ہوں یا نئے۔ ویسے بھی نئے گانے دیکھتے تو دور کی بات سننے کے قابل بھی نہیں تھے۔ ان میں شاعری کی آڑ میں جتنی فحش گوئی کی گئی ہوتی ہے ماضی میں ان کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ میرے گانے نہ سننے کی وجہ مقبوضہ کشمیر میں رہنے والے مسلمان ہیں۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ انڈین حکومتیں، انڈیا اور مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی ہیں اور ہم ان کی فلمیں اور ڈرامے بڑے ذوق وشوق سے دیکھتے ہیں اور گانے سنتے ہیں۔ میرے نظریے کے مطابق ایسے لوگوں کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے۔ ان کی آنکھوں میں انسانیت سے عاری پٹی باندھ دی گئی ہے۔ میرا نظریہ ہے کہ ہمیں کم از کم انڈین فلموں اور گانوں کا بائیکاٹ کر کے کشمیری مسلمانوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کرنا چاہیے۔

میرے پاس اس وقت ڈرائیور سے بحث کرنے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں نے ان سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہر انسان کا اپنا ضمیر تھا وہ اسے جگائے یا مردہ رکھے۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد ڈرائیور نے مجھے راوی کالونی میں داخل ہونے والی سڑک کے کنارے اتار دیا۔

میں نے وعدے کے مطابق انہیں ڈبل کرایہ دیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ گو میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور نہ ہی ایسی کوئی چیز تھی جس سے میں اسماعیل شاہد کو قابو کر سکوں لیکن مجھے ہتھیار کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں باکسر تھا اور مجھے مختلف داؤ آزمانے آتے تھے۔

گلیوں میں مرکری بلب جل رہے تھے مگر میں تاریک گوشوں سے ہوتا ہوا اسماعیل شاہد کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے اور فجر کی اذان ہونے والی تھی۔ گیٹ کے پلر پر لگا بلب جل رہا تھا جس کی نصف روشنی باہر گیٹ کو منور کر رہی تھی اور نصف روشنی اندر کے حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ میں کوٹھی کے اندر کیسے داخل ہوں۔ مجھے ایسی کوئی جگہ بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی کہ جس میں کوٹھی کے اندر داخل ہو سکتا۔ کوٹھی کی دیواریں کافی بلند تھیں اور ان پر خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں۔ ہو سکتا ہے ان میں کرنٹ بھی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ امیر کبیر لوگ رات کو خاردار تاروں میں کرنٹ چھوڑ دیتے ہیں تاکہ کسی چور یا ڈاکو کے داخل ہونے کا احتمال نہ ہو... اور یہ بھی ممکن تھا کہ کیمرا بھی لگا ہوا ہو۔

میں جیسے جیسے سوچتا جا رہا تھا میں الجھن میں مبتلا ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے سر پر خون سوار تھا۔ میری بہن کو اغوا ہوئے کئی مہینے گزر چکے تھے اور میں چودھری ساجد کی تلاش میں مارا مارا پھر تا رہا تھا اب جب مجھے اس کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا تو میں اپنی بہن کی بازیابی میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ چند روز میں نے کس طرح گزارے تھے یہ میں ہی جانتا تھا۔

کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں اور کوٹھی میں کیسے داخل ہوں۔ مزید پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک سڑک سے مڑ کر آنے والی ایک کار کی ہیڈ لائٹس نے گلی روشن کر دی۔ وہ کار اسی طرف آرہی تھی جدھر میں موجود تھا۔ میں جلدی سے ایک کوٹھی کے تاریک گوشے میں ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد کار میرے سامنے سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

میں نے ایک بار پھر اسماعیل شاہد کی کوٹھی کا طائرانہ جائزہ لیا لیکن نتیجہ پہلے جیسا ہی رہا۔ میں خالی ہاتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں کچھ نہ کچھ حاصل کر کے ہی جانا چاہتا تھا۔

www.pakistanipoint.com

کچھ ہی دیر بعد جب قریبی مسجد کے مؤذن نے اذان دی تو میں طویل سانس لیتے ہوئے تاریک گوشے سے نکلا اور مسجد کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے واش روم جانے کی حاجت بھی ہو رہی تھی۔ حاجت سے فراغت پانے کے بعد میں نے وضو کیا اور باجماعت نماز فجر کی ادائیگی کی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں نے سرسری انداز میں لوگوں پر نظر ڈالی تو مجھے اسماعیل شاہد کا چوکیدار دکھائی دیا جو اٹھ کر باہر جا رہا تھا۔ جب میں اسماعیل شاہد سے ملنے آتا تھا تو میری اسی چوکیدار سے ملاقات ہوتی تھی۔

وہ جیسے ہی باہر گیا تو میں بھی جلدی سے اٹھ کر باہر آیا اور جوگر پہن کر مسجد سے نکل کر اس کے پیچھے چل دیا۔ وہ نماز پڑھنے اکیلا ہی آیا تھا۔ اسماعیل شاہد یا اس کے گھر والوں میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ مزید کئی لوگ بھی مسجد سے نکل آئے تھے اور کچھ لوگ مسجد میں ہی بیٹھ گئے تھے۔

ہلکا ہلکا اندھیرا ابھی موجود تھا لیکن اس میں آہستہ آہستہ کمی واقع ہوتی جا رہی تھی۔ میں بھی قرب و جوار کا جائزہ لیتا ہوا چوکیدار کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس دوران میں نے اپنے سیل فون کی آواز میوٹ کر دی تھی۔ پھر جب چوکیدار گیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے لگا تو میں بھی جلدی سے اس کے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے جلدی سے اسے اندر دھکیل دیا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا... پھر وہ سنبھلنے ہی لگا تھا کہ میں نے کراٹے کا ایک مخصوص داؤ اس کی گردن کے پچھلے حصے پر کر دیا۔ چوکیدار کے حلق سے ہلکی سی سسکاری نکلی اور وہ دھپ کی آواز سے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ کراٹے کا یہ مخصوص اور خطرناک داؤ تھا جس سے مدمقابل لمحہ بھر میں نہ صرف بے ہوش ہو جاتا تھا بلکہ بسا اوقات اس سے مخالف کی ڈیتھ بھی ہو جاتی تھی۔ مگر میرا ارادہ چوکیدار کو مارنا نہیں بلکہ صرف بے ہوش کرنا تھا اس لیے میں نے اس پر ہلکے انداز میں وار کیا تھا۔

میں نے چوکیدار کے پاس بیٹھ کر اس کی نبض چیک کی تو وہ زندہ تھا۔ میں نے شکر کا سانس لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بے گناہ میرے ہاتھوں مارا جائے اور میں قاتل بن جاؤں۔ میں تو وہاں اسماعیل شاہد کو بھی قتل کرنے کی نیت سے نہیں آیا تھا صرف اس سے اپنی بہن کی بازیابی چاہتا تھا۔

ایک بات اور بھی اچھی ہو گئی تھی کہ وہاں اسماعیل شاہد کے کارندے موجود نہیں تھے ورنہ اچھی خاصی گڑبڑ ہو جاتی اور میرے پکڑے جانے کا بھی اندیشہ ہوتا۔ ویسے میں یہاں جتنی مرتبہ بھی آیا تھا تو میں نے اس کے کسی کارندے کو وہاں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے دائیں ہاتھ پر ایک کمرے کا دروازہ دکھائی دیا جو یقیناً چوکیدار کا سرونٹ کوارٹر تھا۔ میں نے اس کے دونوں پیر پکڑے اور اسے گھسیٹتا ہوا اسی کمرے میں لے آیا۔ کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ وہاں اکیلا رہتا تھا۔ کمرے میں صرف ایک چارپائی، لوہے کی ایک الماری ، ایک میز اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ میں نے اسے اٹھا کر چارپائی پر لٹایا، اس کے پیروں سے جوتی اتار کر سائیڈ پر پھینکی اور اس پر چادر ڈال دی۔ پھر میں مڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے باہر نکلنے سے پہلے دروازے کی جھری بنا کر دیکھا تو وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ شاید اسماعیل شاہد اور اس کی فیملی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔

اچھی طرح جائزہ لینے اور اطمینان کرنے کے بعد میں کمرے سے باہر نکلا اور راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ پورچ میں نئے ماڈل کی دو کاریں کھڑی تھیں۔ ایک کار کا رنگ آف وائٹ تھا جبکہ دوسری کی رنگت سرمئی تھی۔ چونکہ میں وہاں کئی مرتبہ آ چکا تھا اس لیے مجھے ڈرائنگ روم کا معلوم تھا لیکن اس وقت ڈرائنگ روم کا دروازہ بند تھا۔

میں انتہائی محتاط انداز اور دبے قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں ہر صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس راہداری میں تین کمرے تھے لیکن تینوں کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں مگر جیسے ہی میں دوسری راہداری کی طرف مڑا تو مجھے ایک کمرے کی کھڑکی روشن دکھائی دی۔ شاید اس کمرے میں کوئی موجود تھا۔ راہداری کی دوسری طرف صحن تھا جہاں چند چارپائیاں اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کرسیوں کے درمیان ایک میز بھی پڑی تھی۔ میں دبے قدموں چلتا اس کھڑکی تک پہنچا۔ پہلے میں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا پھر میں نے کھڑکی کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کھڑکی پر موٹی سلاخیں موجود تھیں اور ان کے پیچھے شیشہ تھا۔ اتفاق سے اندر سے پردہ تھوڑا سا سرکا ہوا تھا جس سے ہلکی سی درز بن گئی تھی۔ میں سلاخوں کے ساتھ چہرہ لگا کر اسی درز سے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔

دوسرے ہی لمحے میں بے اختیار چونک پڑا۔

اس ہلکی سی درز سے مجھے عذرا دکھائی دی۔ اسماعیل شاہد کی بیٹی اور چودھری باسط کی بیٹی شانزے کی دوست۔ وہ

Nadar Azeem
www.pakistanipoint.com

اسٹڈی ٹیبل پر کوئی کتاب کھولے اس پر جھکی ہوئی تھی۔ شاید وہ پڑھ رہی تھی۔ میں چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آ گیا۔ میں نے کھڑکی کے شیشے پر ہلکی سی دستک دی تو میں نے دیکھا کہ عذرا چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی تھی لیکن وہ اٹھی نہیں۔ میں نے ایک بار ہلکی سی دستک دی تو اس نے کتاب بند کی اور اٹھ کر دروازے کی طرف آنے لگی۔ میں جلدی سے کھڑکی سے ہٹ کر دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جیسے ہی عذرا نے دروازہ کھولا تو میں بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور اسے دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ سب میں نے اتنی جلدی میں کیا تھا کہ عذرا کو سوچنے، سمجھنے اور سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ جما دیا۔ اس نے مزاحمت کی لیکن میں نے اسے موقع ہی نہ دیا۔

''شش..... اگر چیخنے چلانے کی کوشش کی تو.....'' میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو ان میں خوف کے ساتھ ساتھ حیرانی بھی شامل تھی۔ میں نے دروازے کو ہلکے سے انداز میں لات مار کر بند کر دیا۔ دروازے کا لاک آٹومیٹک تھا اس لیے وہ لاک ہو گیا تھا۔ اب مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔

''بولو..... چیخو گی۔'' میں نے درشت مگر بدھم لہجے میں کہتے ہوئے اس سے تصدیق چاہی تو وہ جلدی جلدی نفی میں سر ہلانے لگی۔

''گڈ۔'' میں نے داد دینے والے انداز میں کہا۔ ''اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو اپنے نقصان کی خود ذمہ دار ہو گی۔ میرے سر پر اس وقت خون سوار ہے اور ایسا نہ ہو کہ تم میری وحشت کی نذر ہو جاؤ۔''

میرے تنبیہہ انداز پر وہ ایسے سر ہلانے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ وعدہ خلافی نہیں کرے گی۔ تاہم میں نے اپنے لہجے میں درشتگی پیدا کر لی تھی اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ خوفزدہ رہے گی اور ایسی ویسی کوئی حرکت نہیں کرے گی جو اس کے لیے نقصان کا باعث بنے۔ میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا تو وہ ایسے لمبے لمبے سانس لینے لگی جیسے وہ میلوں دوڑ کر آ رہی ہو البتہ اس کے خوف و ہراس میں تھوڑی سی بھی کمی نہیں آئی تھی۔ اس کی آنکھیں بدستور پھیلی ہوئی تھیں اور وہ مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ پہلے والی کیفیت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

''یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ.....'' میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کی پیشکش کرتے ہوئے کہا اور وہ چپ چاپ جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تم..... تم وہی ہو نا..... جس نے.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

''ٹھیک پہچانا، میں وہی ہوں۔'' میں نے اس کا نامکمل فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے کہا۔ وہ الجھن میں مبتلا ہو گئی۔

''لیکن.....'' اس کی الجھن بڑھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

''مس عذرا۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر تمہارا پریشان ہونا بنتا ہے لیکن تم پریشان مت ہو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں ہے اس لیے میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

''پھر..... پھر تم یہاں..... چوری چھپے کیوں.....'' وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔

''ایک بہت اہم مقصد کے تحت یہاں چوری چھپے آیا ہوں۔'' میں نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔ ''تم کیا کر رہی تھیں؟''

''ٹیسٹ..... ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھی۔'' وہ بولی تو مجھے مرینہ کی یاد آ گئی۔ وہ بھی ہمیشہ فجر کے وقت ہی ٹیسٹ کی تیاری کرتی تھی، اس کا کہنا تھا کہ صبح کا پڑھا کبھی نہیں بھولا کرتا کیونکہ اُس وقت ذہن تر و تازہ ہوتا ہے۔

''ہونہہ..... آئی ایم سوری، میری وجہ سے تم ڈسٹرب ہوئیں۔'' میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''ٹیسٹ کب ہے؟''

''آج۔'' اس نے مترشح لہجے میں جواب دیا۔

''ہمم۔ کیا آج ٹیسٹ دینا ضروری ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''بٹ آئی ایم سوری، آج تم ٹیسٹ نہیں دے سکو گی۔'' میں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا تو حیرت نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔

''کیا مطلب؟ لل..... لیکن.....'' وہ ہکلائی۔

''میں نے کہا نا، مجبوری ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''میں..... سمجھی نہیں۔'' وہ بدستور حیران تھی۔ ''کیسی

مجبوری؟ اور تم کیا چاہتے ہو؟ کس مقصد کے تحت یہاں آئے ہو؟''

میں جانتا تھا کہ اگر میں عذرا کو اس کے باپ کے بارے میں بتا دوں گا تو لامحالہ اس کے دل میں باپ کے خلاف نفرت بیدار ہوگی لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ کم از کم اسے اپنے باپ کے مکروہ بزنس کا پتا تو چلنا چاہیے۔ ایک ایسا باپ جو دوسروں کی بہن بیٹیوں کو اغوا کرا کے ان کی اسمگلنگ کرتا تھا لیکن جب اسے اپنی بیٹی خطرے میں گھری دکھائی دے گی تو اس کی جان ہی نکل جائے گی۔ میں نے چشمِ تصور میں دیکھا کہ۔۔۔ میں اسے انتہائی بے دردی سے قتل کر رہا ہوں اور وہ تڑپ تڑپ کر مجھ سے التجائیں کر رہا ہے۔

میں نے اپنے ذہن کو جھٹکا اور عذرا کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''یہ بتاؤ...... تمہارا باپ کہاں ہے اس وقت؟'' میں نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولی۔ ''وہ...... وہ شہر سے باہر ہیں۔''

''کہاں گیا ہے وہ؟'' میں نے استفسار کیا۔

''تمیز سے میرے باپ کا نام لو۔'' عذرا ایک دم غصے سے بھڑک اٹھی۔ میرے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''میں تو تمہارے باپ کا نام ایسے ہی شریفانہ طریقے سے لوں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ میں تو اسے خبیث، کمینہ، گھٹیا، بدکردار اور روسیاہ بھی کہوں گا۔''

''شٹ اَپ۔'' وہ دبی دبی آواز میں چیخی۔

''یو شٹ اَپ۔'' میں نے بھی دھیمے لہجے میں جواباً اُسے ڈپٹا۔ مجھے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلتی واضح دکھائی دے رہی تھیں۔ ہوسکتا ہے اس کے وجود میں میرے حوالے سے نفرت کی لہر بھی دوڑ گئی ہو۔

''تم ہوتے کون ہو میرے باپ کو برا بھلا کہنے والے۔'' وہ بولی۔ ''تم احسان فراموش انسان ہو۔ انہوں نے تمہیں جاب دی اور تم...... تم ان کے بارے میں گھٹیا زبان استعمال کر رہے ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔''

''وہ ہے ہی اِسی قابل۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''بلکہ میرا دل تو یہی کر رہا ہے کہ میں تمہارے سامنے تمہارے باپ کا گلا گھونٹ کر اسے ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سلا دوں تاکہ بہت سوں کا فائدہ ہوجائے۔''

عذرا کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے لیکن اس نے کوئی جواب تو نہ دیا البتہ وہ کھا جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس لمحے اس کا ڈر، پریشانی اور خوف بھی غائب ہوگیا تھا اور اب وہ انتہائی بااعتماد اور مضبوط لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ وہ کسی بھی لمحے کچھ کرسکتی ہے۔ شور و واویلا مچا کر کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کرسکتی ہے۔ میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا جس سے میں اسے خوفزدہ رکھ سکتا۔ اسے خوفزدہ رکھنا بھی بے حد ضروری تھا ورنہ میرے لیے مسائل پیدا ہوسکتے تھے۔

چند لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے تو میں نے دوبارہ پوچھا۔ ''بتاؤ، کہاں ہے تمہارا باپ؟''

''آخر میرے باپ نے کیا کیا ہے جو تم بکواس پر بکواس کیے جا رہے ہو۔'' اس نے جواباً پوچھا۔

''بتا دوں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اس نے جواب دیا۔ ''ہاں بتاؤ۔''

''سوچ لو، تم میں سننے کی تاب نہیں ہوگی اور شاید تمہیں اپنے باپ سے نفرت ہوجائے گی۔'' میں نے اسے وارن کیا۔ ''اچھی طرح سوچ لو۔''

''کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔'' وہ اس بار ٹھٹکی۔

''بہت بڑا انکشاف ہوگا تمہارے لیے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ آج پہلی بار میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی حسین اور دلکش تھی۔

''کیسا انکشاف؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے سائے سے لہرائے تھے اور اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ اپنے باپ کے بارے میں انکشاف سننے کے لیے وہ ہمہ تن گوش دکھائی دے رہی تھی۔

''بتاؤ۔ اب خاموش کیوں ہو؟''

''ہم۔ میں بتانا تو نہیں چاہتا کیونکہ یہ تمہارے لیے شاک ہوگا لیکن تم اصرار کر رہی ہو تو بتا دیتا ہوں۔'' میں نے کہنے کے بعد چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔ ''شانزے کو جانتی ہو؟''

وہ چونکی اور جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

''شانزے...... تم۔ تم شانزے کو کیسے جانتے ہو؟''

''جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔'' میں نے اسے ڈپٹا۔

''ہاں۔ وہ میری فرینڈ ہے۔'' اس نے اقرار کیا۔

میں نے کہا۔ ''پھر تو تم اس کے باپ کے کرتوت سے تو واقف ہوگی۔''

''وہ سب جھوٹ ہے، بکواس ہے۔ وہ تصاویر جعلی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

تھیں۔'' وہ بولی تو میں نے گہری سانس لی۔ وہ بھی شانزے کی زبان بول رہی تھی۔

''لیکن یہ سچ ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، جھوٹ اور بکواس ہے۔'' وہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔

''میری بات کا یقین کرو، وہ تصاویر اصلی ہیں اور میں نے بنائی تھیں۔'' میں نے عذرا کو باور کرانے کی کوشش کی۔

وہ ششدر رہ گئی اور سرسراتی آواز میں بولی۔

''تت۔تم نے.....؟''

میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''ہاں۔ لیکن میں نے وہ تصاویر میڈیا کو نہیں دیں۔ نہ جانے وہ کون ہے جس نے وہ تصویریں میڈیا تک پہنچائی ہیں۔ بہرحال سچائی زیادہ دیر تک نہیں چھپی رہ سکتیں۔ اب مزید انکشاف سننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چودھری باسط اور اس کا بیٹا شانی تمہارے باپ کے ساتھ مل کر پاکستان میں ایک عالمی میٹ ورک کے لیے کام کرتے ہیں۔''

اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا اور عذرا کے تاثرات جانچنے لگا۔ عذرا کے چہرے پر ابھرے حیرت اور غیر یقینی کے تاثرات دیدنی تھے۔ وہ ساکت و جامد ہو گئی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح چابی والا کھلونا چابی ختم ہونے پر ساکت ہو جاتا ہے۔

''نیٹ ورک..... کک..... کیسا نیٹ ورک.....'' وہ کھوکھلے لہجے میں بولی تو اس کے لہجے میں ہکلاہٹ تھی۔

میں چند لمحے غور سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''لڑکیوں کی اسمگلنگ کا نیٹ ورک.....''

''کیا.....'' وہ دبی دبی آواز میں چیخی۔

''شاید تمہیں یقین نہیں آیا۔''

''ہاں بالکل مجھے یقین نہیں آیا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم..... تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' وہ غیر یقینی لہجے میں بولی۔

''یہ سچ ہے مس عذرا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''یہ تینوں جس عالمی نیٹ ورک کے لیے کام کرتے ہیں وہ اغوا شدہ لڑکیوں کو پورنوگرافی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان سے ان کے جینے کا مقصد چھین لیتے ہیں، انہیں گندی دلدل میں دھکیل دیتے ہیں جہاں سے نکلنا ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ سوچو، اگر کوئی تمہیں اغوا کر کے پورن گرل بنا دے تو.....''

''نہیں۔'' وہ ششدر ہو کر چیخی۔

''یہی دھندا تمہارا باپ کرتا ہے۔'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم..... تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''ہونہہ۔'' میں نے ہنکارا بھرا۔ ''تمہیں یہ سن کر بھی حیرانی اور پریشانی ہو گی کہ تمہارا باپ دوہری شخصیت کا مالک ہے..... یعنی اس کا اصل نام اسماعیل شاہد ہے لیکن وہ اپنے گروپ میں چودھری ساجد کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ وہ خود تو خفیہ رہتا ہے لیکن اس کے حواری اس کے لیے کام کرتے رہتے ہیں۔''

''نہیں..... ایسا نہیں ہو سکتا..... تت..... تت۔ تم بکواس کر رہے ہو۔ تت..... تت۔'' عذرا کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ متغیر ہو چکا تھا۔

''ایسا ہی ہے۔'' میں نے اس بار ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''چودھری باسط، شانی اور تمہارا باپ، یہ تینوں یہی دھندا کرتے ہیں۔ انہوں نے مل کر میری بہن کو اغوا کیا ہے۔ نجانے میری بہن کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں اپنی بہن کی تلاش میں تین مہینوں سے بھٹک رہا ہوں۔ میں نے ان تینوں کے بارے میں کیسے پتا چلایا ہے یہ الگ داستان ہے اسی لیے یہ تینوں میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اور ان کے کارندے بھوکے کتوں کی طرح مجھے جگہ جگہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ سب کچھ تمہارے باپ کی ناک کے نیچے ہوتا رہا لیکن اس نے مجھے بے خبر رکھا۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے مروانے کے لیے اپنے حواری بھی بھیجے۔''

میں بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ عذرا نے اپنا سر تھام لیا تھا۔ شاید اپنے باپ کی دوہری شخصیت اور عالمی گینگ سے وابستگی نے اسے شاکڈ کر دیا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ مجھے یہ سب نہیں بتانا چاہیے تھا لیکن میں اپنی بہن روزینہ کی وجہ سے مجبور تھا۔ میں جب جب اپنی بہن اور اپنی ماں کے بارے میں سوچتا تھا تو میرا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ میں یہاں اسماعیل شاہد کو اغوا کرنے آیا تھا لیکن وہ یہاں موجود نہیں تھا۔ شومئی قسمت کہ میرا سامنا عذرا سے ہو گیا تھا۔ ہمارے درمیان کافی دیر خاموشی رہی پھر اس خاموشی کو عذرا کی آواز نے توڑا۔

''نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میرے بابا ایسا کام کبھی نہیں کر سکتے۔''

''کاش ایسا ہی ہوتا۔'' میں نے تاسف بھرے لہجے

میں کہا۔ ”میں نے بھی تمہارے باپ کو فرشتہ صفت انسان سمجھا تھا۔ اس کی ہر بات پر یقین کیا تھا۔ اعتماد کیا تھا لیکن جب اس کے کرتوتوں کا پتا چلا تو میں بھی شاکڈ رہ گیا تھا۔ میرے تو تصور میں بھی نہیں تھا کہ جس چودھری ساجد کو میں عرصے سے تلاش کر رہا ہوں وہ تمہارا باپ نکلے گا۔“

”تمہیں غلط بتایا گیا ہوگا۔“ اس نے مجھے بھٹکانے کی کوشش کی۔

میں استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ”تم بیٹی ہو اس لیے اپنے باپ پر یقین کر رہی ہو۔“

عین اسی لمحے ایک نسوانی آواز گونجی۔ وہ شاید گھر کی ملازمہ تھی اور دروازہ بجا رہی تھی۔ ساتھ کہہ بھی رہی تھی۔

”عذرا بی بی! ناشتا تیار ہے۔ آپ آجائیں۔“

میں نے پہلے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا پھر عذرا کی طرف دیکھا۔ عذرا کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات ابھر آئے۔

”اسے کہو، ناشتا یہیں لے آئے۔“ میں نے دبی دبی آواز میں کہا۔ ”اور خبردار، اگر تم نے کوئی اشارہ دینے یا کسی قسم کی کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی ورنہ......“

”میں کچھ نہیں کہوں گی۔“ عذرا نے خوف بھرے لہجے میں کہا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی جبکہ میں دروازے کی دوسری سائیڈ پر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس پر اعتبار تو کر لیا تھا لیکن وہ ناقابل اعتبار ثابت ہوئی تھی۔ دروازہ کھولتے ہی وہ جلدی سے باہر نکلی اور چیخ چیخ کر گارڈ کو بلانے لگی۔ اس صورتِ حال پر میں بھی بوکھلا گیا۔ یہ اس نے نادانستہ کیا تھا یا اسے میری زبانی اپنے باپ کے کرتوت سن کر یقین نہیں آیا تھا یہ الگ بات تھی۔ میں بھی جلدی سے باہر آ گیا۔ راہداری میں عذرا کھڑی مسلسل چیخ چیخ کر گارڈ کو بلا رہی تھی۔ قریب ہی پکی عمر کی ایک عورت آنکھیں پھاڑے کھڑی تھی۔ میں نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے آگے بڑھ کر عذرا کو بازو سے پکڑ کر تیزی سے اپنی طرف گھمایا۔ دوسرے ہی لمحے میرا ہاتھ اٹھا اور بھرپور تھپڑ اس کے رخسار پر لگا۔ ہلکی سی چٹاخ کی آواز ابھری اور وہ لڑکھڑا کر فرش پر گر گئی۔ میں نے گارڈ کو بے ہوش کر دیا تھا لیکن اتنی جلدی وہ ہوش میں آ گیا تھا مجھے یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔ اسی اثناء میں وہی چوکیدار، جسے عذرا گارڈ کہہ کر پکار رہی تھی، دوڑتا ہوا ادھر آ گیا۔ اس نے جب مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھر آئے اور وہ جلدی سے میری طرف آنے لگا۔ میں انتہائی اطمینان سے کھڑا تھا۔

”تم......تم......“ اس نے میرے قریب پہنچ کر زہرخند لہجے میں کہا اور میرے چہرے پر مکا مارنے کے لیے جیسے ہی اپنا بازو بلند کیا تو میں نے فضا میں ہی اس کی کلائی تھام لی.. پھر میں نے اس کے سر پر اپنا سر مارا تو اس کے حلق سے دردناک چیخ نکل گئی۔ شاید اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا تھا اور میرے سر کی ٹکر نے اسے دن میں تارے دکھا دیئے تھے۔ وہ الٹے قدموں لڑکھڑا گیا...پھر اس نے سنبھلتے ہوئے اپنے لباس کی جیب سے ریوالور نکال کر اس کا رخ میری طرف کیا ہی تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اس کی کنپٹی پر مکا جڑ دیا۔ اس کے حلق سے اس بار ”اوغ“ کی آواز نکلی اور وہ اچھل کر فرش پر گرا اور دنیا و مافیہا سے بےگانہ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور بھی نکل کر فرش پر گر گیا تھا جسے میں نے لپک کر اٹھایا اور فرش پر پڑی عذرا کی طرف بڑھا۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا تھا کہ گھر کا کوئی اور مکین باہر نہیں آیا تھا۔ شاید شور کی آواز سوئے ہوئے مکینوں کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ میں نے عذرا کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ اس کی حالت خستہ ہو رہی تھی اور وہ بےحد خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔

”کہا بھی تھا کہ کوئی غلط حرکت مت کرنا لیکن......“ میں نے بھناتے ہوئے کہا۔

شاید اس کی گھگی بندھ گئی تھی اس لیے وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کا سفید رخسار میرے تھپڑ کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس لمحے میں کیا کروں... پھر میری نظر پورچ میں کھڑی کار پر پڑی تو دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا۔

”کار کی چابی کہاں ہے؟“ میں نے درشت لہجے میں پوچھا لیکن وہ خاموش رہی۔

”بتاؤ۔“ میں نے غصے سے ڈپٹا۔

”ڈ......ڈرائنگ روم میں......“ وہ بہ مشکل بولی۔

میں نے گردن موڑ کر خوفزدہ کھڑی ملازمہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

”چابی لے آؤ......اور خبردار، اگر تم نے بھی کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو......تو میں تمہاری عذرا بی بی کو مار ڈالوں گا۔“ میں نے غرانے والے انداز میں کہا تو ملازمہ بھی میرا لہجہ سن کر خوفزدہ ہو گئی۔

”نن......نن......نہیں...... میں...... میں چابی لے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

آتی ہوں۔'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولی اور مڑ کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ عذرا کی خاطر کوئی غلط حرکت نہیں کرے گی... اور میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔

دو منٹ کے اندر اندر ملازمہ کار کی چابی لے کر آ گئی۔ وہ ہنوز خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے چابی میری طرف بڑھائی تو میں نے جھپٹ لی۔

''اب جا کر گیٹ کھولو۔'' میں نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

''جج۔ جج۔ جی۔'' وہ منمنائی مگر میں نے ریوالور کی نال عذرا کے سر سے لگا دی تو وہ بوکھلاتی ہوئی پلٹی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

''چلو۔'' میں نے اس بار عذرا سے کہا۔

''کک۔ کک۔ کہاں؟'' وہ بھی منمنائی۔

''جہاں میں لے جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں، نہیں۔''

''چلو۔'' میں غرّایا اور اسے بازو سے پکڑ کر پورچ کی طرف لے جانے لگا۔

''نہیں، نہیں۔'' وہ منمنانے لگی لیکن میرے سر پر تو جنون طاری ہو چکا تھا۔ گو میں یہاں عذرا کو اغوا کرنے کے مقصد سے نہیں آیا تھا لیکن میں ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میرے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ جب اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد کو اپنی بیٹی کے اغوا کا پتا چلے گا تو وہ تڑپ کر رہ جائے گا اور میرے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا۔

عذرا نے خود کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش رائیگاں گئی کیونکہ میں نے انتہائی سختی سے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا۔ وہ مسلسل منمنا رہی تھی لیکن میں اسے گھسیٹتے ہوئے پورچ میں کار کے پاس لے آیا۔ اس دوران ملازمہ گیٹ تک پہنچ گئی تھی اور اسے کھول رہی تھی۔

''دروازہ کھولو۔'' میں نے چابی عذرا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، تم اچھا نہیں کر رہے۔''

''شٹ اَپ۔'' میں نے اسے ڈپٹا۔ ''جلدی کرو۔''

''بابا تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''تم بہت بولتی ہو۔ چلو دروازہ کھولو۔''

اُس نے اس بار زہر خند نظروں سے مجھے گھورا اور پھر چابی لے کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے گیٹ کی طرف دیکھا تو اب ملازمہ گیٹ کھولے ہماری منتظر تھی۔ میرے اشارے پر عذرا نے کار میں بیٹھنے کے بعد کار اسٹارٹ کر دی۔ اس دوران میں میں بھی سائیڈ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

''چلو۔'' میں نے ریوالور کا رخ عذرا کی طرف کرتے ہوئے کہا تو اس نے دانت پیستے ہوئے کار آگے بڑھائی اور کوٹھی سے نکال کر ہلکی رفتار سے سڑک کی طرف دوڑانے لگی۔

''تم انتہائی خود غرض اور احسان فراموش انسان ہو۔'' عذرا نے یکلخت سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا تو میرے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

''تمہاری باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''لہٰذا فضول میں نصیحتیں مت کرو۔''

''ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ تمہارا ضمیر مر چکا ہے۔'' وہ غصے سے بولی۔

''میرا تو نہیں مرا البتہ تمہارے باپ کا ضمیر ضرور مر چکا ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو وہ ہنکارا بھر کر رہ گئی۔

''میرا باپ تمہاری کھال ادھڑوا دے گا۔'' وہ بولی۔

''ان کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔''

میں استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ پھر بولا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ وہ میری کھال ادھڑوائے..... مگر افسوس، وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

''یہ تو وقت بتائے گا۔''

''صحیح کہہ رہی ہو.....'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''واقعی وقت بتائے گا لیکن فی الحال تم خاموشی اور احتیاط سے ڈرائیونگ کرو۔''

''مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو۔''

''بتاتا رہوں گا، تم ڈرائیونگ کرتی رہو۔''

اُس نے غصے سے ہونٹ بھینچ لیے اور میری ہدایت کے مطابق ڈرائیونگ کرنے لگی۔ وہ خوبصورت اور حسین لڑکی تھی مگر غصے میں تو اور بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی لیکن مجھے اس کے حسن سے کوئی غرض نہ تھی۔ مجھے اپنے مقصد سے سروکار تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے پھر اپنے باپ کے حوالے سے مجھے دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ مجھے اب اس کے بولنے سے اُلجھن ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسی طرح میرا سر کھاتی رہی تو مجھے طیش دلا دے گی اس لیے اسے چپ کرانا ضروری تھا۔

یہ خدشہ بھی مجھے دامن گیر تھا کہ وہ کسی پر ہجوم جگہ کار روک کر شور نہ مچانا شروع کر دے کہ میں اسے اغوا کر کے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

لے جارہا ہوں۔ گو صبح کا وقت تھا اور ابھی چہل پہل زیادہ نہ ہوئی تھی لیکن جو اِکا دُکا افراد دکھائی دے رہے تھے اس کے شور مچانے سے ہماری طرف متوجہ ہو سکتے تھے اور عذرا کا یہ اقدام میرے حق میں بہتر ثابت نہ ہو سکتا تھا۔

میرا دماغ انتہائی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ میری چھٹی حس بیدار ہو کر مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ میں بھی چوکنا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر عذرا نے کوئی شرارت کرنے کی کوشش کی تو میں اس کے سر پر ریوالور کا دستہ مار کر اسے بے ہوش کر دوں گا اور خود کار ڈرائیو کر کے زکریا ٹاؤن کی حویلی میں لے جاؤں گا۔

میں اسی اُدھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ اچانک ہی عذرا نے بریک پیڈل پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا تو کار کے ٹائروں نے ہولناک چیخیں ماریں اور پیچھے سے یوں اچھل کر دھپ سے زمین پر گری جیسے کسی دیو نے کار اٹھانے کی کوشش کی ہو لیکن اس کے ہاتھ سے پھسل گئی ہو۔ کار کے یکدم اچھلنے اور رکنے کی وجہ سے میرا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا تھا جس سے مجھے اپنا دماغ جھنجھناتا ہوا محسوس ہوا۔ ساتھ ہی تاریکی بھی غلبہ پانے لگی۔ تاہم میں نے خود کو سنبھالنے کے لیے اپنے سر کو بار بار جھٹکا اور میں اسی کوشش کے سبب بے ہوش ہونے سے بچ گیا تھا۔ ایسا کرنا مجھے میرے ٹرینر سے سکھایا تھا کہ جب مخالف میرے سر پر اس قدر مکے مارے کہ میں بے ہوش ہونے کی حد تک پہنچ جاؤں تو پھر میں اپنا سر زور زور سے جھٹکوں۔ ایسا کرنے سے میں اپنے ہوش و حواس قابو میں رکھ سکتا تھا۔ اس وقت یہی اقدام میرے کام آ گیا تھا۔

جس انداز میں عذرا نے بریک لگائی تھی اس سے میں اچھل کر ونڈ اسکرین سے بھی ٹکرا کر زخمی ہو سکتا تھا لیکن میری خوش بختی اور میرے سیٹ بیلٹ باندھنے کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلا ہوا تھا جو آہستہ آہستہ چھٹتا جا رہا تھا۔

دو منٹ کے بعد جب میں ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آیا تو میں نے غیر ارادی طور پر عذرا کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے میں بے اختیار چونک گیا۔ عذرا کا سر اسٹیئرنگ پر تھا اور وہ بے ہوش تھی۔ اچانک میری نظر اس کی خوبصورت پیشانی پر پڑی تو میں چونک پڑا۔ اس کی سرخ و سفید پیشانی پر چوٹ لگی تھی اور خون رس رہا تھا جو آہستہ آہستہ لکیر بناتا اس کے رخسار کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''عذرا..... عذرا.....'' میں نے نحیف لہجے میں اسے آواز دی، بازو سے پکڑ کر ہلایا لیکن وہ بے ہوشی کی وادی میں گم تھی۔ میں نے کار کے شیشوں سے دیکھتے ہوئے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو مجھے اطمینان ہوا۔ ہم اس وقت ایک سنسان روڈ پر موجود تھے اور وہاں دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ میرے لیے اچھا ہی ہوا تھا ورنہ میں کسی مصیبت میں پھنس سکتا تھا۔ پھر میں نے کار کا جائزہ لیا تو مجھے پچھلی سیٹ پر براؤن کلر کی ایک چادر پڑی دکھائی دی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر چادر اٹھائی اور دانتوں کی مدد سے اسے کونے سے پھاڑنے لگا۔ میں نے اس کی ایک پٹی بنائی اور اسے عذرا کی پیشانی پر باندھ دیا۔ شکر کی بات یہ تھی کہ عذرا کو زیادہ چوٹیں نہیں لگی تھیں۔ صرف پیشانی پر وہ چوٹ لگی تھی۔

اب میرے لیے مسئلہ اسے اٹھا کر پچھلی سیٹ پر لٹانے کا تھا۔ اسے اٹھانے کا تصور کرنا مجھے عجیب سا لگا لیکن اس وقت مجبوری تھی۔ اسے اپنے ساتھ لے جانا بہت ضروری تھا۔

میں نے کار سے نکل کر جیسے تیسے کر کے اسے اٹھا کر کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا اور اس پر چادر ڈال دی۔ اس کام میں پانچ سے سات منٹ صرف ہوئے تھے... پھر میں نے جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد سیٹ بیلٹ باندھی اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ کار اسٹارٹ ہو گئی تھی ورنہ اس کے اسٹارٹ نہ ہونے سے میرے لیے مشکل پیدا ہو سکتی تھی۔

میری کوشش تھی کہ میں عذرا کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی زکریا ٹاؤن والی حویلی میں پہنچ جاؤں اس لیے میں پر پیچ راستوں پر کار انتہائی تیز رفتاری سے دوڑائے جا رہا تھا۔ مجھے اصل میں عذرا کی طرف سے خدشہ لاحق تھا۔ اگر وہ ہوش میں آ گئی اور اس نے شور مچانا شروع کر دیا تو پھر اسے سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو جائے گا۔ عذرا کے کار کے اچانک روکنے کی وجہ سے میرے ہاتھ سے ریوالور بھی نکل کر کار میں گر گیا تھا جسے اٹھانے کا میرے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔

تقریباً تیس منٹ کی مسافت کے بعد میں زکریا ٹاؤن والی حویلی کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے کار کا ہارن مسلسل دیا تو چار منٹ کے بعد گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا اور قیصر دکھائی دیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی چونکا۔

میں نے کھڑکی سے سر باہر نکالتے ہوئے اسے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

مخاطب کیا۔ ''قیصر! جلدی سے گیٹ کھولو۔''

وہ اثبات میں گردن ہلاتا ہوا واپس ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے گیٹ کھول دیا میں نے کار آگے بڑھائی اور پورچ میں پہنچ کر روک دی۔ وہاں حیدر الماس کی کار بھی موجود تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ بھی وہاں موجود تھے۔ میں کار سے نیچے اترا اور پچھلی سیٹ پر بے ہوشی کے عالم میں پڑی عذرا کو دیکھنے لگا۔

''کہاں چلے گئے تھے تم۔'' گیٹ بند کر کے قیصر نے میرے قریب آ کر پوچھا۔

''ضروری کام سے گیا تھا۔'' میں نے سرسری انداز میں جواب دیا اور عذرا کو کار سے باہر نکالنے لگا۔

''جانتے ہو حیدر صاحب بہت غصے میں ہیں۔'' وہ بولا۔ ''اگر کہیں جانا تھا تو مجھے یا بابر صاحب کو انفارم تو کرتے۔''

میں اسے جواب دہ نہیں تھا اس لیے میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا حیدر صاحب موجود ہیں؟''

''ہاں۔'' اس نے جواباً کہا۔

میں نے عذرا کو کاندھے پر لادا اور اسے اٹھائے اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ تم کسے اٹھا لائے ہو؟'' قیصر نے میرے پیچھے آتے ہوئے پوچھا۔

''کیا اس کا جواب دینا ضروری ہے؟'' میں نے رک کر اس سے پوچھا تو وہ گڑبڑا گیا۔ ''یہ کون ہے اور میں اسے کیوں اغوا کر لایا ہوں تمہارا اس بارے میں جاننا ضروری نہیں ہے۔''

قیصر کا چہرہ فق ہو گیا۔ شاید اسے میری بات بری لگی تھی لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ وہ نہ صرف خاموش ہو گیا تھا بلکہ میرے پیچھے بھی نہیں آیا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں حیدر الماس موجود تھے۔ مجھے اور میرے کاندھے پر لدی عذرا کو دیکھ کر ٹھٹکے پھر بولے۔ ''یہ تم کسے اٹھا لائے ہو؟''

''عذرا کو......'' میں نے جواب دیا۔

''عذرا...... کون عذرا؟'' وہ حیران ہوئے۔

''اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد کی بیٹی۔'' میں نے تفاخر سے جواب دیا اور عذرا کو انتہائی احتیاط سے کرسی پر ڈال دیا۔ حیدر الماس حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''تم اسے کیوں اغوا کر لائے ہو؟'' وہ خفگی سے بولے۔

''مجبوری تھی۔'' میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''لینے تو میں اسماعیل شاہد کو گیا تھا لیکن وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ اس نے شور مچا کر مجھے پکڑوانے کی کوشش کی اس لیے مجبوراً اسے لانا پڑا۔ اب جب اسے اس کی بیٹی کے بارے میں بتاؤں گا تو وہ اڑتا ہوا آئے گا۔''

حیدر الماس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے سکیڑ لیے۔ تاہم وہ چند لمحوں کے بعد پُرسوچ لہجے میں بولے۔ ''علی...... تمہیں اس لڑکی کو اغوا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''میں نے بتایا نا کہ سچویشن ہی ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ مجھے اسے اغوا کرنا پڑا۔'' میں نے کہا۔ میں حیران تھا کہ حیدر الماس ایسا کیوں کہہ رہے تھے۔

''تم نے میرا انتظار بھی نہیں کیا؟'' ان کے لہجے میں خفگی کا عنصر موجود تھا۔ وہ خفا خفا سے تھے۔ میں ان کی خفگی جانتا تھا۔

''مجھ سے انتظار نہیں ہو رہا تھا حیدر صاحب۔'' میں نے وضاحت دی۔ ''آپ کا فون آف تھا اور......''

''تم انتظار بھی کر سکتے تھے۔ میرا گینگ اسماعیل شاہد کو گھیرنے کے لیے کام کر رہا تھا۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولے۔ ''لیکن...... میں نے بتایا تھا نا کہ وہ بے حد کائیاں آدمی ہے، شاید اسے بھنک پڑ گئی تھی اس لیے وہ غائب ہو گیا۔''

''لیکن میری تو پرسوں اس سے بات ہوئی تھی۔''

''ہاں۔ میری اطلاع کے مطابق وہ تمہیں پکڑنا چاہتا تھا۔'' حیدر الماس نے کہا۔ ''اس کا پلان تھا کہ وہ تمہیں اپنے گھر بلا کر اغوا کر کے غائب کر دیتا کیونکہ تم اُن کے لیے دردِ سر بنتے جا رہے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار تمہیں اپنے گھر بلا رہا تھا تاکہ تم جیسے ہی اس کے گھر پہنچو تو وہ تمہیں چھاپ لے۔ اب تمہاری یہ خوش قسمتی ہے کہ وہ گھر پر موجود نہیں تھا ورنہ تمہارے لیے مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''تم عذرا سے کیا کہو گے کہ تم نے اسے کیوں اغوا کیا ہے؟'' حیدر الماس نے کہا۔ ''جانتے ہو، جب تم اِسے اِس کے باپ کے کرتوت کے بارے میں بتاؤ گے تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔''

میں نے رسانیت سے کہا۔ ''میں اسے اس کے باپ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کے کرتوت بتا چکا ہوں۔"

"اوہ......نو......" وہ بھی حیران رہ گئے۔

"اِس نے یقین نہیں کیا۔" میں نے عذرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے......ایک بیٹی اپنے باپ کے متعلق اس کے کرتوت سن کر کیسے یقین کرے گی۔ ہر باپ اپنی اولاد کے لیے آئیڈیل ہوتا ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

میں بھی صوفے پر بیٹھ گیا۔ "ایک نہ ایک دن تو اسے اپنے باپ کے کرتوت کا پتا چلنا ہی تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ یہ یقین کرتی ہے یا نہیں۔ مجھے اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد کی قید سے اپنی بہن بازیاب کرانی ہے اور اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑا تو میں کروں گا۔"

میرا لہجہ ٹھوس تھا۔ کمرے میں یکدم گہری خاموشی اور سناٹا چھا گیا تھا۔ تاہم اس خاموشی کو میں نے ہی توڑا۔ "مجھے رسی چاہیے۔"

حیدر الماس چند لمحے مجھے دیکھتے رہے پھر انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی اور قیصر کو بلا کر اسے رسی لے آنے کو کہا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں نے رسی کا کیا کرنا ہے۔ پانچ منٹ کے بعد قیصر نے مجھے رسی مہیا کر دی جس سے میں نے عذرا کو کرسی سے باندھ دیا۔ حیدر الماس صاحب نے عذرا کے زخمی ہونے کی بابت پوچھا تو میں نے مختصراً عذرا کے اقدام کے بارے میں بتا دیا۔

"اب تم کیا کرو گے؟" جب میں عذرا کو رسی سے باندھ کر فارغ ہوا تو حیدر الماس نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

"اسماعیل شاہد کو یہاں بلاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کیا وہ یہاں آنے پر راضی ہو جائے گا؟"

"جب میں اسے اس کی بیٹی کو مارنے کی دھمکی دوں گا تو میرا خیال ہے وہ دوڑا دوڑا آئے گا۔" میں نے بشاشت بھرے لہجے میں کہا۔ "بس مجھے آپ کے ساتھ اور تعاون کی ضرورت ہے۔"

"میں تو پہلے سے ہی تمہارے ساتھ ہوں۔" حیدر الماس نے اس بار ناراض لہجے میں کہا۔ "لیکن مجھے افسوس ہے کہ میری تنبیہہ کے باوجود تم نے انتہائی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کیا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ تم نے کہیں نہیں جانا لیکن تم نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے انتہائی قدم اٹھایا۔"

میں نے آگے بڑھ کر حیدر الماس کے ہاتھ تھام لیے اور شرمندگی آمیز لہجے میں بولا۔ "حیدر صاحب! میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں لیکن...... مجھے ایک پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ میرا سکون، میرا چین، راتوں کی نیند غارت ہو چکی تھی۔ میری بہن روزینہ کا چہرہ، میری امی کا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔ میں جب اپنی بے بس اور لاچار ماں کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا خون کھول اٹھتا ہے اسی لیے میں یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوا...... آپ خود کو میری جگہ رکھ کر سوچیں، اگر......"

"میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں علی۔" وہ میرے ہاتھ دباتے ہوئے بولے۔ "لیکن یہ بات یاد رکھنا، جلد بازی میں اٹھایا جانے والا قدم ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔"

میں نے اس بار کوئی جواب نہ دیا۔ کئی ساعتیں خاموشی کی نذر ہو گئیں پھر حیدر الماس بولے۔ "اسماعیل شاہد کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ تم چوروں کی طرح اس کے گھر میں گھس کر اس کی بیٹی کو اغوا کر لو گے۔ اس نے تمہیں ہلکا لیا ہو گا لیکن تم اس کی توقع کے برعکس نکلے۔"

اب کی بار حیدر الماس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ میں نے بھی ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "میں تو اسماعیل شاہد کی بدقسمتی کہوں گا۔"

وہ بولے۔ "ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"میرا خیال ہے اسماعیل شاہد کو عذرا کے اغوا کے بارے میں پتا چل چکا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"یقیناً۔" حیدر الماس نے تائید کی۔

"اس کی تو سٹی ہی گم ہو گئی ہو گی۔" میں نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ اچانک مجھے کچھ یاد آیا تو میں نے پوچھا۔ "پتا چلا کہ میڈیا کو چودھری باسط اور آپ کی بیوی کی تصویریں کس نے فراہم کی تھیں؟"

ان کی بیوی کی بات کرتے ہوئے میرے لہجے میں جھجک پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں...... چودھری باسط کے ایک ملازم نے میڈیا کو تصویریں فراہم کی تھیں۔"

"کیا......" میں چونک گیا۔ "یہ کیسے پتا چلا؟"

''مسز باسط نے مجھے فون کر کے بتایا تھا۔'' حیدر الماس نے کہا۔ ''چودھری باسط نے اپنے ایک ملازم کو کسی سے فون پر بات کرتے ہوئے سنا تھا۔ مسز باسط نے بتایا کہ چودھری باسط بہت بیخ پا ہوا تھا۔ ملازم وہاں سے فرار ہو گیا تھا اور اب تک کہیں غائب ہے۔''

پھر اس سے پہلے کہ حیدر الماس اور میرے درمیان مزید بات چیت ہوتی، اسی لمحے ہمیں عذرا کے کراہنے کی آواز سنائی دی تو ہم دونوں ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ دھیرے دھیرے ہوش میں آ رہی تھی اور ساتھ ساتھ کراہ بھی رہی تھی۔ شاید اس کے زخم سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں جن کی وجہ سے وہ کراہنے پر مجبور تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ لاشعور سے شعور کی دنیا میں آئی تو ہم دونوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر نفرت اور ناگواریت پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگ گئے تھے... پھر اس نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی لیکن بندھا ہونے کی وجہ سے وہ کسمسا کر رہ گئی۔

''آرام سے بیٹھی رہو۔'' میں نے کہا۔

''تم نے مجھے اغوا کر کے اچھا نہیں کیا۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ ''تم نے اپنی موت کو آواز دی ہے۔ تم انتہائی احسان فراموش انسان ہو۔''

''بار بار ایک ہی بات دوہرا رہی ہو۔ تمہاری اس بات سے میرا دل ہرگز نرم نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔

اُس نے ایک قہر آلود نظر حیدر الماس پر ڈالی، پھر میری طرف مڑی اور نفرت چبا چبا کر بولی۔ ''میرا باپ..... تم سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔''

''کیا تمہارا باپ قسائی ہے۔'' میں نے پُرمزاح مگر طنزیہ لہجے میں کہا۔

عذرا اپنے دانت کچکچاتے ہوئے مجھے گھور کر رہ گئی۔ میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت، کینہ اور غصہ واضح دیکھ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ مجھے جان سے ہی مار ڈالتی۔

''علی.....'' حیدر الماس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اس لڑکی سے بحث مت کرو۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں اصل مسئلہ اس کے باپ سے ہے۔''

''ہمم۔'' میں نے ہنکاری بھری۔

''میرے باپ کو میرے اغوا کا علم ہو چکا ہوگا اور..... پولیس تمہاری تلاش میں ہوگی۔'' وہ دوبارہ بولی۔

''کرتی رہے۔'' میں نے ناک پر مکھی اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن وہ مجھے تلاش نہیں کر سکے گی۔''

''یہ تمہاری خام خیالی ہے۔'' وہ بولی۔

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''علی! میں نے کہا نا اس لڑکی سے بحث کرنا فضول ہے۔'' حیدر الماس صاحب دوبارہ تنبیہی انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''بحث تو یہ کر رہی ہے۔'' میں نے عذرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ اپنے باپ کا ڈراوا دے کر مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔''

''ڈرا نہیں رہی بلکہ حقیقت بتا رہی ہوں۔'' عذرا نے جواباً کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

''حیدر صاحب۔ بابر کہاں ہے؟'' میں نے حیدر الماس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اپنے گھر گیا ہے۔'' انہوں نے بتایا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے حیدر صاحب سے مشورہ طلب لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کیا کہتے ہیں، کیا اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد سے بات کی جائے؟''

وہ چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔ ''ہاں کرو۔''

حیدر الماس صاحب کی اجازت ملنے کے بعد میں نے عذرا کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنی پتلون کی جیب سے سیل فون نکالا اور اسے آن کیا تو اس پر اسماعیل شاہد کی بارہ کالز آئی ہوئی تھیں۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں نے عذرا کو اغوا کر لیا ہے میرا سیل فون میوٹ تھا اس لیے مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

''لگتا ہے اسماعیل شاہد کو پتا چل گیا ہے۔ بارہ مس کالز آئی ہوئی ہیں۔'' میں نے حیدر الماس کو بتاتے ہوئے کہا اور پھر اسماعیل شاہد کے نمبر پنچ کیے اور اسے کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ میں نے اسپیکر آن کر دیا تا کہ عذرا اور حیدر الماس بھی ہماری گفتگو سن سکیں۔

''علی..... کہاں ہے میری بیٹی؟'' اسماعیل شاہد کی دھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''چوکیدار نے بتایا ہے کہ تم نے میری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

چوکیدار مجھے پہچانتا تھا اس لیے اس نے صحیح کہا تھا۔

''شانت، شانت اسماعیل شاہد عرف.....'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔ میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ میرا باس تھا اور مجھے اس سے ادب سے بات کرنی چاہیے لیکن جس کردار کا وہ مالک تھا اور جو دھندا وہ کرتا تھا اس حیثیت سے تو اس کی عزت دو کوڑی کی تھی۔

''بکواس بند کرو۔ میری بیٹی کہاں ہے؟'' وہ بدستور گرجے۔ میں چشم تصور میں ان کا حال دیکھ سکتا تھا۔

''وہ میرے پاس ہے بلکہ میرے سامنے بیٹھی ہے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''تم نے اسے کیوں اغوا کیا ہے۔ بتاؤ۔'' وہ چلّائے۔

''آپ کے چلّانے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد.....''

دوسری طرف یکدم سناٹا چھا گیا۔ اسماعیل شاہد کو سانپ نے سونگھ گیا تھا۔ اس کی خاموشی معنی خیز تھی۔ یہ سن کر کہ میں نے ان کا نام اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد لیا ہے تو وہ یقیناً سکتے کے عالم میں آگئے ہوں گے۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں ان کی اصلیت سے واقف ہو چکا ہوں۔

''اوہو۔ کہیں آپ خدانخواستہ فوت تو نہیں ہو گئے اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کی خاموشی بتا رہی ہے کہ.....''

وہ میری بات کاٹ کر پھنکارتے ہوئے بولے۔

''کیا بکواس ہے۔ کون چودھری ساجد۔ میرا نام تو اسماعیل شاہد ہے۔''

میں حیران رہ گیا تھا۔ لگتا نہیں تھا کہ یہ وہی میرے باس ہیں جو میرے ساتھ انتہائی شفقت اور نرم خوئی سے پیش آتے تھے۔

''بالکل۔'' میں نے کہا۔ ''بے شک آپ کا اصل نام اسماعیل شاہد ہے لیکن چودھری ساجد آپ کی عرفیت ہے۔ آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔''

''نہیں..... یہ میرا نام نہیں ہے۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ انکار کر رہے ہیں لیکن..... میں آپ کو بتا دوں کہ مجھے آپ کی..... بلکہ تمہاری، یہ کہنا مناسب رہے گا۔ کیونکہ تم عزت کے لائق ہرگز نہیں ہو۔ تمہاری اصلیت معلوم ہو چکی ہے۔'' میرا لہجہ یکلخت سخت اور تحکمانہ ہوگیا۔ میں نے حیدر الماس کی طرف دیکھا تو وہ سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے لیکن عذرا کے چہرے کی رنگت متغیر تھی۔

''یہ..... یہ تم مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔ جانتے نہیں میں کون ہوں؟'' اسماعیل شاہد کی تحکم آمیز آواز گونجی۔

''میں اسی انداز میں بات کر رہا ہوں جس انداز میں مجھے بات کرنی چاہیے۔'' میں نے بھی درشت لہجے میں کہا۔ ''تم انتہائی گھٹیا، رزیل، کمینے، بدکردار اور شیطان صفت انسان ہو۔ تم جیسا گھٹیا اور ضمیر فروش انسان دھرتی پر بوجھ ہوتا ہے اور.....''

''علی.....'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ غصے سے دھاڑے۔ ''میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔ تم نے میری نرمی دیکھی ہے لیکن میرا غصہ نہیں دیکھا۔''

''غصہ.....'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارے چہرے پر غصہ اچھا نہیں لگتا۔ تمہارے چہرے پر تو لعنت برس رہی ہے رزیل انسان اور لعنت ہی اچھی لگتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم گینگسٹر ہو۔ تم معصوم لڑکیوں کو اغوا کر کے پورنوگرافی کے لیے ان کی اسمگلنگ کرتے ہو۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو۔'' وہ چیخے۔ ''میں اور لڑکیوں کا اسمگلر..... تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔''

''تم انکار کر لو لیکن تم زیادہ دیر چھپ کر نہیں رہ سکتے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارا بدنما چہرہ دنیا کے سامنے لاؤں گا اور ضرور لاؤں گا۔ پھر دیکھنا تم خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔''

''مجھے تمہیں صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ درشتگی سے بولا۔ ''میں لڑکیوں کی اسمگلنگ نہیں کرتا۔ یہ بہتان ہے مجھ پر۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ جھوٹ بول کر تم بچ جاؤ گے۔ نہیں، تم اب نہیں بچ سکتے۔'' میں نے بھی درشتگی سے جواب دیا۔ ''گھٹیا انسان! تمہاری اصلیت مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ تم نے چودھری باسط اور اس کے بیٹے شانی کے ساتھ مل کر گینگ بنا رکھا ہے اور تم انٹرنیشنل گینگ کے ساتھ منسلک ہو۔ پاکستان سے لڑکیوں کو اغوا کرا کر انہیں دوسرے ملک اسمگل کر دیتے ہو۔ لڑکیوں کی اسمگلنگ کرتے تمہیں شرم نہیں آتی۔ تمہیں اللہ کا بھی خوف نہیں ہے۔ سوچو، اگر میں تمہاری بیٹی کو فروخت کر دوں اور وہ بھی پورن گرل

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بن جائے تو......'' میری آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

''میں تمہیں...... تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ چیخا۔ ''جانتے نہیں ہو تم نے کس سے پنگا لیا ہے۔''

میں استہزائیہ ہنسی ہنسا اور بولا۔ ''مسٹر ساجد! یہ وقت بتائے گا۔ تم نے مجھے ہلکا لیا اور مجھ سے ڈراما بازی کرتے رہے لیکن اب یہ ڈراما بازی زیادہ دیر نہیں چلے گی۔''

''تم میری بیٹی کو چھوڑ رہے ہو یا نہیں۔'' انہوں نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے عذرا کے بارے میں پوچھا۔

''پہلے تم میری بہن روزینہ کو چھوڑو۔'' میں نے شرط رکھی۔

''کیا؟'' اس نے دریافت کیا۔ ''کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے تمہاری بہن کو اغوا نہیں کرایا۔''

''شانی نے بتایا تھا کہ اس نے میری بہن کو اغوا کر کے اسے تمہارے پاس فروخت کر دیا ہے...... کیا اس نے جھوٹ کہا تھا؟'' میں نے کہا۔

''یہ جھوٹ ہے، بہتان ہے۔'' اسماعیل شاہد نے کہا۔ ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں، میرا کسی گینگ سے واسطہ نہیں ہے اور نہ ہی میں لڑکیوں کی اسمگلنگ میں ملوث ہوں۔''

''غلط فہمی۔ ٹھیک ہے جب تم میری بہن کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جاؤ تو بتا دینا۔ میں فون رکھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''فون بند مت کرنا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''تو میری بہن کو چھوڑ دو۔'' میں نے کہا۔

''بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' اس نے کہا۔ ''کسی نے تمہیں میرے بارے میں غلط انفارمیشن دی ہے۔ ویسے بھی چودھری ساجد نام کے کئی افراد موجود ہیں۔ میرا نام تو اسماعیل شاہد ہے۔ مجھے اگر کسی لڑکی کو اغوا کرانا ہوتا تو تم جانتے ہو کہ میرے سرکس میں کتنی لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ میں ان لڑکیوں کو بھی تو اغوا کرا سکتا ہوں۔''

''یہی تو تمہارا مکر و فریب ہے۔ تم سرکس کی آڑ میں لڑکیوں کی اسمگلنگ کا بزنس کرتے ہو۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ آخری بار کہہ رہا ہوں۔ اگر تم اپنی بیٹی کی زندگی چاہتے ہو تو تمہیں نہ صرف اعتراف کرنا ہوگا بلکہ میری بہن میرے حوالے کرنی ہوگی۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ ''ورنہ......''

اسی لمحے عذرا چیخی۔ ''بابا...... بابا...... مجھے بچا لیں...... بابا...... کیا آپ سن رہے ہیں؟''

اس کی چیخ اسماعیل شاہد کے دل اور دماغ پر لگی ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چیخ پڑے۔ ''علی...... علی...... چھوڑ دو میری بیٹی کو...... چھوڑ دو اسے۔''

''جب تم میری بہن میرے حوالے کرو گے تو میں بھی تمہاری بیٹی تمہارے حوالے کر دوں گا۔ میں تمہیں ایک گھنٹا دے رہا ہوں۔ اس کے بعد اپنی بیٹی کی موت کے تم خود ذمے دار ہو گے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''صرف ایک گھنٹا۔''

''میں تمہیں برباد کر دوں گا۔ میں تمہیں زندہ گاڑ دوں گا۔'' دوسری طرف سے اسماعیل شاہد کی چیختی ہوئی آواز آئی مگر میں نے استہزائیہ قہقہہ لگاتے ہوئے کال کاٹ دی۔

میں نے حیدر الماس کی طرف دیکھا تو انہوں نے اثبات میں گردن ہلا دی البتہ عذرا بہ دستور غصے میں دکھائی دے رہی تھی۔

''میں تمہارا خون پی جاؤں گی گھٹیا انسان۔ چھوڑ دو مجھے۔'' اس نے چیختے ہوئے کہا۔

''تم تو بندھی ہوئی ہو، میرا خون کیسے پیو گی؟'' میں نے اسے چڑانے والے انداز میں کہا تو وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ ظاہر ہے اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اسی لمحے اسماعیل شاہد کی کال دوبارہ آ گئی لیکن میں نے کال ڈس کنکٹ کر کے فون آف کر دیا، پھر حیدر الماس مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے جاتے ہی میں بھی ان کے پیچھے چل دیا۔

پیچھے سے عذرا کی چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''رک جاؤ۔ کہاں جا رہے ہو...... مجھے چھوڑ دو۔ رک جاؤ۔ میری بات سنو۔''

میں نے اس کی بات ان سنی کر دی اور باہر جانے سے پہلے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا جس سے اس کے چیخنے کی آوازیں بھی بند ہو گئیں۔ اس نے مجھے بعد میں کن القاب سے پکارا ہو گا میں نہیں سن سکا تھا۔ حیدر الماس دوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا رہے تھے۔ میں بھی ان کے پیچھے کمرے میں آ گیا۔ حیدر الماس انتہائی سنجیدہ اور گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ صوفوں پر بیٹھنے کے بعد ہم اسماعیل شاہد کے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

بارے میں باتیں کرنے لگے۔ حیدر الماس کا خیال تھا کہ اسماعیل شاہد کبھی بھی یہ اعتراف نہیں کرے گا کہ وہ گینگسٹر ہے لیکن میں پُر اُمید تھا کہ میں اسے ماننے پر مجبور کر دوں گا۔ اس دوران حیدر الماس نے ناشتے کا بھی کہہ دیا تھا۔ عذرا نے بھی ناشتا نہیں کیا تھا اس لیے اسے ناشتا کرانے کی ذمے داری اماں زلیخا کے سپرد کی گئی تھی۔

میرے استفسار پر حیدر الماس نے بتایا تھا کہ اماں زلیخا آج صبح ہی یہاں آئی تھیں۔ انہیں یہاں کے باسیوں کے کھانا بنانے کے لیے بلایا گیا تھا۔ اماں زلیخا نے جب مجھے دیکھا تو وہ سرشار ہوگئیں اور مجھ سے ایسے ملیں جیسے میں ان کا برسوں کا بچھڑا ہوا بیٹا ہوں حالانکہ ہمیں بچھڑے ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے۔ میں بھی اماں زلیخا سے گرم جوشی سے ملا تھا۔ ایک دوسرے کی خیریت پوچھنے کے بعد اماں زلیخا ہمارے لیے ناشتا لے آئیں اور ہم ناشتا کرنے میں مصروف ہوگئے۔

ناشتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ اماں زلیخا آگئیں اور کہنے لگیں۔ ''لڑکی ناشتا نہیں کر رہی اور..... وہ واش روم جانا چاہتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ اسے واش روم لے جائیں اور..... قیصر سے کہیں کہ وہ کمرے کے باہر دروازے پر پہرہ دے۔'' حیدر الماس نے کہا تو اماں زلیخا نے اثبات میں گردن ہلائی اور وہاں سے چلی گئیں۔

دس منٹ ہی گزرے تھے کہ ہمیں عذرا والے کمرے سے چیخ و پکار کی آواز سنائی دی۔ میں اور حیدر الماس جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ قیصر پہلے کمرے کے دروازے پر موجود تھا۔ حیدر الماس نے قیصر سے کوئی بات نہ کی اور ہم کمرے میں آگئے۔ صوفے پر اوندھے منہ پڑی عذرا کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں جبکہ اماں زلیخا ایک طرف کھڑی تھیں۔ میز پر ناشتے کی ٹرے پڑی ہوئی تھی۔ عذرا نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا تھا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' حیدر الماس نے اماں زلیخا سے پوچھا۔

''حیدر بیٹا! اس لڑکی نے مجھ پر حملہ کرنے کے بعد یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی جس کی وجہ سے مجھے اسے تھپڑ مارنا پڑا۔'' اماں زلیخا نے وجہ بتائی۔

میں نے آگے بڑھ کر صوفے پر اوندھے منہ پڑی عذرا کو سیدھا کیا تو چونک پڑا۔ اس کا دایاں رخسار سرخ تھا اور آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اماں زلیخا نے اسے تھپڑ مارا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' حیدر الماس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اس نے اپنی غلطی سے تھپڑ کھایا ہے۔''

میں عذرا سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''دیکھو عذرا! تم فضول میں خود کو ہلکان کر رہی ہو۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ مجھے صرف تمہارے باپ سے مسئلہ ہے۔ جب وہ اعتراف کرے گا کہ وہ لڑکیوں کا اسمگلر ہے اور وہ میری بہن میرے حوالے کر دے گا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔''

عذرا نے میری بات کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ وہ مسلسل سسکیاں لیتی رہی۔ میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے نرم لہجے میں اس سے دوبارہ کہا۔ ''چلو ناشتا کر لو۔''

''مجھے نہیں کرنا ناشتا۔'' اس نے رکھائی سے کہا اور شعلہ بار نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے دنیا جہان کی نفرت بھری ہوئی دکھائی دی تھی۔

''خود کو بھوکا رکھو گی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''تمہیں اس سے مطلب۔'' وہ وزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''پلیز۔ میری بات مان لو۔'' میں نے اصرار کیا۔

''نہیں مانتی۔'' وہ چلّائی۔ ''تم مجھے یہاں سے جانے دو بس۔ میں یہی چاہتی ہوں۔''

''بیٹی! ضد نہ کرو۔'' اس بار حیدر الماس، عذرا سے مخاطب ہوئے۔ ''شاباش۔ ناشتا کر لو۔''

عذرا نے انہیں بھی غصیلی نظروں سے دیکھا۔

''میں نے کہہ دیا ہے کہ میں نے ناشتا نہیں کرنا تو نہیں کرنا۔'' وہ نروٹھے پن سے بولی۔ ''آپ کون ہوتے ہیں مجھے سمجھانے والے؟''

''بہت ضدی ہو۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہوں تو.....'' وہ دوبدو بولی تو میں نے استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگایا۔

''تو اپنی ضد کی وجہ سے بھوکی رہو۔'' میں نے جواب دیا اور پھر اماں زلیخا کی طرف دیکھا۔ ''اماں! آپ ناشتا لے جائیں۔ یہ بھوکی رہنا چاہتی ہے۔''

اماں زلیخا غصے سے عذرا کو دیکھتے ہوئے ٹرے اٹھا کر وہاں سے چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آگئیں

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اور میرے کہنے پر عذرا کو کرسی سے باندھ دیا۔ ہم پھر دوسرے کمرے میں آ گئے۔ دو روز ہو گئے تھے مرینہ سے بات نہیں ہوئی تھی اس لیے میں نے مرینہ کو کال کی۔

''ہیلو۔'' کال اٹینڈ ہوتے ہی مرینہ کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی تو میں چونکتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حیدر الماس صاحب بھی چونک کر مجھے دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہو گیا ہے مرینہ۔''

''بھائی..... بھائی۔''

اس کے لہجے و انداز سے لگتا تھا جیسے کوئی مسئلہ ہو گیا ہو جس سے وہ گھبرا گئی ہو۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''سب خیریت تو ہے نا۔''

''بھائی..... وہ..... وہ امی.....''

''کیا ہو گیا ہے امی کو۔'' میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے پوچھا۔

''امی کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینک رہی ہیں۔ انہوں نے کمرے میں خود کو بند کر لیا ہے۔'' مرینہ نے بتایا۔

''اوہو۔ اچھا تم پریشان مت ہو، میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

میں نے کال منقطع کر کے حیدر الماس کی طرف دیکھا اور انہیں امی کی کنڈیشن کے بارے میں بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔

''ٹھیک ہے تم قیصر کے ساتھ چلے جاؤ۔'' حیدر الماس نے کہا۔ ''لیکن محتاط رہنا۔''

''آپ بے فکر رہیں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اور ہاں، کنڈیشن زیادہ سیریس ہو تو مجھے مطلع کر دینا، میں ڈاکٹر کو بھجوا دوں گا۔''

''جی بہتر۔'' یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ چند لمحوں کے بعد قیصر کے ساتھ کار میں بیٹھ کر کہکشاں کالونی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈرائیونگ قیصر کر رہا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ مفلر سے ڈھانپا ہوا تھا اور سر پر کیپ پہنی ہوئی تھی۔ امی کی کنڈیشن کا سوچ کر مجھے بے حد پریشانی ہو رہی تھی اور میرا دل انجان وسوسوں میں گھرا ہوا تھا۔

جس رفتار سے کار سڑک پر دوڑ رہی تھی اس سے کہیں زیادہ میرا دماغ الجھا ہوا تھا۔ مجھے امی کی فکر ہو رہی تھی اور میں جلد از جلد ان کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔

''قیصر! ذرا گاڑی تیز چلاؤ۔'' میں نے قیصر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ تم پریشان نہ ہو۔'' قیصر نے مجھے تسلی دی۔ اسی اثناء میں میرے سیل فون کی بیل بجی تو میں نے پتلون کی جیب سے سیل فون نکال کر اسکرین کی طرف دیکھا تو مرینہ کال کر رہی تھی۔

''ہاں بولو مرینہ۔''

''بھائی! آپ کتنی دیر میں پہنچیں گے؟''

''بس پہنچنے ہی والے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''بھائی! امی بے حد شور مچا رہی ہیں۔ انہوں نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا ہے۔ محلے کے لوگ بھی جمع ہو گئے ہیں۔ آپ جلدی پہنچیں۔'' مرینہ کی پریشانی میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ اسی لمحے مجھے امی کی چیختی ہوئی آوازیں بھی سنائی دیں تو میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ تاہم میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اچھا میں فون رکھتا ہوں۔''

میں نے کال منقطع کر کے سیل فون پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ مجھے اپنے وجود میں کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور میں ضبط کی انتہا پر تھا۔ بیس پچیس منٹ کے بعد ہم پہنچ گئے۔ میں دوڑتا ہوا مکان میں داخل ہوا۔ اندر سے امی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے گھر میں داخل ہو کر دیکھا تو وہاں چند عورتیں مرینہ کے ساتھ موجود تھیں۔ امی کمرے میں تھیں اور زور زور سے چیخ رہی تھیں۔

''مرینہ۔'' میں نے مرینہ کو آواز دی تو وہ میری آواز سن کر تیزی سے پلٹی اور تیز تیز قدموں سے چلتی میرے پاس آ گئی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔

''بھائی! امی.....''

''پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

مرینہ کو تسلی دینے کے بعد میں جلدی سے امی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ انہوں نے اندر سے کنڈی لگائی ہوئی تھی۔ میں نے ایک نظر محلے کی عورتوں کی طرف دیکھا تو وہ بھی قدرے پریشان دکھائی دے رہی تھیں، پھر میں دروازے کا ہینڈل پکڑ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

''امی..... امی! دروازہ کھولیں۔'' ساتھ ہی میں نے امی سے التجائیہ انداز میں کہا۔

www.pakistanipoint.com

''نہیں۔ میں یہ دروازہ نہیں کھولوں گی۔ تم مجھے مار ڈالو گے۔'' امی چلائیں۔

''امی! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں ہوں آپ کا بیٹا علی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ دروازہ کھولیں۔''

''بیٹا۔ کون بیٹا۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔'' انہوں نے چلّا کر جواب دیا۔ ''نہیں کھولوں گی دروازہ۔ چلے جاؤ..... جاؤ..... جاؤ۔''

میں نے دروازہ کھولنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ میری سمجھ سے یہ باہر تھا کہ امی ایسا کیوں کہہ رہی تھیں۔ انہیں آخر کیا ہوگیا تھا۔ ان کی حالت خراب تھی لیکن اس قدر خراب ہوجائے گی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ قیصر بھی اندر آگیا تھا۔

''تالے کی چابی کہاں ہے؟'' میں نے مرینہ سے دریافت کیا۔

''میرے پاس ہے اور میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی۔'' مرینہ بولی۔ ''لیکن امی نے اندر سے کنڈی لگائی ہوئی ہے اس لیے.....''

''اوہ شٹ۔'' میں جھنجلایا۔ ''اب کیا کریں۔''

مجھے ڈر تھا کہ امی کہیں خود کو کوئی نقصان نہ پہنچادیں اس لیے میں جلد از جلد دروازہ کھول کر انہیں سنبھالنا چاہتا تھا۔ امی بدستور چیخ چیخ کر بول رہی تھیں۔ ان کے چیخنے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''بھائی! دروازہ توڑنے کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔'' اسی لمحے قیصر نے مداخلت کی۔

''ہمم۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ واقعی اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں تھا' پھر میں نے قیصر کے ساتھ مل کر کاندھوں سے دروازے پر زور زور سے ضربیں لگانی شروع کردیں۔ دروازہ قدرے مضبوط تھا لیکن مجھے اُمید تھی کہ ہم اسے توڑنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

''بچاؤ..... بچاؤ..... مجھے مت مارو..... بچاؤ۔'' امی چلّائیں لیکن ہم نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور کئی ضربوں کے بعد دروازے کی کنڈی اکھاڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ جیسے ہی کنڈی اکھڑی دروازہ ایک دھماکے سے کھل کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں، مرینہ اور قیصر جلدی سے اندر داخل ہوئے۔

کمرے کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ فرش پر کانچ کے برتن ٹوٹے پڑے تھے۔ بستر کی چادریں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں اور امی کونے میں ٹھنڈے فرش پر انتہائی سہمے ہوئے انداز میں بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ زخمی تھے اور فرش پر خون کے دھبے پھیلے ہوئے تھے۔ یقیناً وہ کانچ کے برتن توڑتے وقت زخمی ہوگئی تھیں۔ وہ ہمیں ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے ہم سے ڈر رہی ہوں۔ محلے کی عورتیں بھی اندر آگئی تھیں۔ وہ بھی پریشان تھیں۔

''امی!'' میں تیزی سے ان کی طرف بڑھا تو وہ سہم گئیں اور تھر تھر کانپنے لگیں۔

''مجھے..... مت مارو..... مجھے مت مارو۔'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولیں۔ میں نے انہیں تھام لیا۔ مرینہ بھی ہمارے پاس آگئی تھی اور رو رہی تھی۔

''امی! ڈریں نہیں، کوئی آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو آپ کا بیٹا ہوں..... علی۔''

''بیٹے..... نہیں..... میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ تم میرے دشمن ہو۔'' یکبارگی وہ چلائیں اور انہوں نے ایک بار پھر تھر تھر کانپنا شروع کردیا جیسے انہیں جاڑے کا بخار ہوگیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہوگئیں۔

''امی..... امی۔'' مرینہ روتے ہوئے امی کو پکارنے لگی۔ ''بھائی! امی کو کیا ہوگیا ہے۔''

''کچھ نہیں ہوا۔ بے ہوش ہوگئی ہیں۔''

''امی.....'' وہ شدت سے رونے لگی۔

''قیصر! انہیں امی کو اسپتال لے جانا ہے۔ ان کی حالت خراب ہورہی ہے۔'' میں نے قیصر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم کار اسٹارٹ کرو، میں امی کو لے کر آتا ہوں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' قیصر نے جواب دیتے ہوئے کہا اور وہ تیزی سے مڑ کر باہر نکلتا چلا گیا جبکہ میں نے امی کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر لادا اور انہیں اٹھائے باہر نکل آیا۔

''بھائی! میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔'' مرینہ میرے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

''نہیں، تم یہیں رہو۔'' میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''اور امی کی صحت یابی کے لیے دعا کرو۔''

مکان سے نکل کر میں نے امی کو کار کی پچھلی نشست پر لٹایا اور خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا جبکہ میرے بیٹھتے ہی قیصر نے کار آگے بڑھا دی۔ قریب میں ہی ایک پرائیویٹ اسپتال تھا۔ امی کو پہلے ایمرجنسی میں شفٹ کیا گیا، ان کی ہاتھوں کی بینڈیج کی گئی اور پھر انہیں روم میں شفٹ کردیا

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

گیا۔ ایک لیڈی ڈاکٹر ان کی ٹریٹمنٹ کر رہی تھی۔ امی کے ٹیسٹ کیے گئے اور جب ان کے ٹیسٹ آ گئے تو لیڈی ڈاکٹر نے مجھے اپنے آفس میں بلایا۔ ''بیٹھیے۔''

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیڈی ڈاکٹر کے آگے میز پر ایک فائل پڑی ہوئی تھی۔ میں لیڈی ڈاکٹر کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید کوئی اہم بات تھی۔

''مسٹر علی! ٹیسٹ کی رپورٹ کے مطابق آپ کی والدہ پر شیزوفرینیا کا اٹیک ہوا ہے۔'' لیڈی ڈاکٹر بولی تو میں بے اختیار چونک پڑا۔

''شیزوفرینیا۔ مطلب؟'' میں چونکا۔

''یہ ایک شدید دماغی مرض ہے۔'' ڈاکٹر نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ ''تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ دماغ کی ساخت اور اس میں کچھ کیمیائی تبدیلیاں اس مرض کے پیدا ہونے کا سبب بنتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے افراد جو روزمرہ زندگی میں ناموافق حالات کے دباؤ کا شکار ہو جائیں تو وہ بھی اس مرض میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اس مرض کی خاص علامات میں سے چند کی موجودگی سے مرض کی تشخیص کی جاتی ہے۔ پہلی، مثلاً مریض کو غیر حقیقی آوازیں سنائی دیتی ہیں یا اَن دیکھی چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور وہ انہیں حقیقی سمجھتا ہے۔ دوسری، مریض کے ذہن میں غلط اور بے بنیاد خیالات آنے لگتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہیں یا اسے مارنے کے درپے ہیں۔ تیسری، مریض یہ سمجھتا ہے کہ اس کے خیالات کوئی کنٹرول کرتا ہے اور اس پر مختلف کام کرنے کے لیے دباؤ ڈالتا ہے۔ چوتھی، مریض کے موڈ، رویے اور مزاج میں خاصی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ پانچویں، مریض کی گفتگو بے ربط ہو جاتی ہے اور وہ ایک بات کو بار بار دوہراتا ہے۔ چھٹی، مریض الگ تھلگ رہنا چاہتا ہے۔ جارحانہ رویہ، توڑ پھوڑ کرنا وغیرہ۔ ساتویں، ضروریات کے برعکس کپڑے پہننا، کوڑا کرکٹ جمع کرنا، ہفتہ ہفتہ نہ نہانا، کپڑے اتار دینا وغیرہ۔ مریض جو کچھ کر رہا ہوتا ہے وہ اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ وہ رفتہ رفتہ علاج معالجے اور دیکھ بھال سے دوبارہ آپ کے قریب آ سکتا ہے۔''

میں پریشان ہو گیا۔ ڈاکٹر نے جو جو باتیں بتائی تھیں ان میں سے چند ایک امی میں پائی گئی تھیں۔ جس روز سے روزینہ اغوا ہوئی تھی اسی روز سے ہی امی ذہنی دباؤ کا شکار تھیں۔ کچھ روز سے میں ان کی حرکات و سکنات نوٹ کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ان پر شیزوفرینیا کا اٹیک ہوتا تھا لیکن آج یہ اٹیک شدت سے ہوا تھا کیونکہ امی نے نہ صرف توڑ پھوڑ کی تھی بلکہ مجھے بھی کہا تھا کہ میں ان کا بیٹا نہیں ہوں اور انہیں مارنا چاہتا ہوں۔

''کیا اس مرض کا علاج نہیں ہے؟'' تاہم میں نے کہا۔

''علاج ہے اور علاج کے ساتھ ساتھ مریض کی کیئرنگ بھی بہت ضروری ہے۔'' ڈاکٹر نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو کچھ دوائیاں لکھ کر دے رہی ہوں۔ آپ انہیں متواتر استعمال کرائیں لیکن یہ بات ذہن میں رکھیں، شیزوفرینیا زندگی بھر کی بیماری بھی ہو سکتی ہے اس کے علاج کے لیے جو ادویات استعمال ہوتی ہیں اکثر اوقات وہ مرض کی علامات کو کنٹرول تو کر لیتی ہیں لیکن علامات کو ختم نہیں کرتیں۔''

پھر لیڈی ڈاکٹر نے اپنے لیٹر پیڈ پر کچھ دوائیاں لکھ کر مجھے دے دیں اور بولیں۔ ''ادویات کے ساتھ ساتھ مریض کی بحالی کے لیے نفسیاتی طریقہ علاج بھی بے حد ضروری اور اہم ہے۔ اگر مرض شدت اختیار کر جائے تو آپ انہیں فوری طور پر اسپتال میں ایڈمٹ کرا دیجیے گا۔ آخری بات، انہیں ورزش کرائیں اور ان کے لیے ایسی سرگرمیاں تلاش کریں جنہیں کرنے سے ان کا دل لگا رہے اس سے ان کا ذہنی دباؤ کم ہوگا۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''کیا میں اب امی کو لے جا سکتا ہوں؟''

''ابھی نہیں۔ انہیں ڈرپ لگی ہوئی ہے۔'' لیڈی ڈاکٹر بولی۔ ''ڈرپ کے مکمل ہوتے ہی آپ انہیں لے جا سکتے ہیں۔''

میں نے کاغذ جیب میں ڈالا اور باہر آ کر قیصر سے کچھ فاصلے پر بینچ پر بیٹھ گیا۔ قیصر کے پوچھنے پر میں نے اسے مختصراً بتایا تو وہ بھی نہ صرف پریشان ہو گیا بلکہ اس نے امی کے دعائیہ کلمات بھی ادا کیے۔ میں نے حیدر الماس کو خود ہی کال کر کے ساری حقیقت بتا دی۔ وہ بھی پریشان ہوئے تھے، پھر انہوں نے خلوص سے امی کی صحت یابی کے لیے دعا کی تھی۔ ان سے بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ اسماعیل شاہد عرف چوہدری ساجد کی کال آ گئی لیکن میں نے اس سے بات کرنے کی بجائے کال ڈسکنکٹ کر دی۔ میں اس سے بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے متعدد بار کالز کی

www.paksociety.com

تھیں لیکن میں نے ڈسکنکٹ کردی تھیں اور بالآخر اس نے کال کرنا ہی بند کردیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ مرینہ کی کال آگئی۔ وہ بھی امی کے بارے میں بے حد پریشان تھی۔ بولی۔ ''امی کی طبیعت کیسی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ ٹھیک ہے۔ باقی باتیں گھر آکر بتاؤں گا۔''

''آپ کب تک آئیں گے؟''

''امی کو ڈرپ لگی ہوئی ہے۔ جیسے ہی ڈرپ ختم ہوگی میں انہیں لے کر آجاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے بھائی۔''

میں نے سیل فون جیب میں رکھ کر ایک طویل سانس لیتے ہوئے بینچ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ امی کی طرف سے میں واقعی بے حد پریشان ہوگیا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے شیزوفرینیا کی جو علامات بتائی تھیں وہ واقعی خطرناک تھیں۔ میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ ہم کیسی ہنسی خوشی، آسودہ حال اور خوشگوار زندگی گزار رہے تھے۔ نہ شانی میری زندگی میں آتا اور نہ ہی میں مشکلات و مصائب کا شکار ہوتا۔ میری ان مشکلات و مصائب کا ذمے دار صرف اور صرف شانی تھا۔

دو گھنٹے کے بعد ڈرپ ختم ہوگئی اور ہم امی کو لے کر گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ امی خاموش اور کھوئی کھوئی سی تھیں۔ میں ان کا دل بہلانے کی حتی المقدور کوشش کررہا تھا۔ انہیں مٹھائی میں لڈو..... بے حد پسند تھے۔ اس لیے یہ خیال آتے ہی میں نے پوچھا۔

''امی۔ لڈو کھائیں گی؟''

''نہیں علی۔ دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولیں۔

''پھر کیا کھانا چاہتی ہیں؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ بولیں۔ ''بس گھر چلو۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

''ہمم۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

آدھے گھنٹے کے بعد ہم گھر پہنچ گئے۔ راستے میں، میں نے ایک میڈیکل اسٹور سے امی کے لیے دوائیاں لے لی تھیں۔ گھر پر مرینہ کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت بھی موجود تھی۔ مرینہ نے بتایا کہ وہ میڈ ہے۔ ہم امی کو ان کے کمرے میں لے گئے۔ میڈ نے کمرے کی صفائی کردی تھی۔ امی کو ان کے بستر پر لٹانے کے بعد میں اور مرینہ کمرے سے باہر آگئے۔ قیصر صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ شریف نوجوان تھا۔ اس نے ایک بار بھی مرینہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

مرینہ کے پوچھنے پر میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ بھی پریشان ہوگئی۔ تاہم میں نے اسے تسلی دی اور امی کا خیال رکھنے کی ہدایت کرکے قیصر کے ساتھ واپس حویلی کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب ہم پہنچے تو دوپہر کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ عذرا بہ دستور کرسی سے بندھی ہوئی تھی اور بے ہوش تھی۔ حیدر الماس البتہ کسی ضروری کام کے سلسلے میں کہیں چلے گئے تھے اور اماں زلیخا، عذرا کی نگرانی پر مامور تھیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ عذرا نے بہت شور مچایا تھا جس کی وجہ سے حیدر الماس کے حکم پر اسے بے ہوش کرنا پڑا تھا۔

''حیدر صاحب بتا کر نہیں گئے کہ وہ کہاں جارہے ہیں؟'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' اماں زلیخا بولیں۔ ''بس یہی کہہ کر گئے تھے کہ وہ تھوڑی دیر تک آجائیں گے۔''

''ہمم۔'' میں نے جواب دیا اور صوفے پر بیٹھ کر ان کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ حیدر الماس نے یہاں سے جانے سے پہلے مجھے آگاہ کرنا کیوں ضروری نہیں سمجھا تھا۔ بہرحال میں ان کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔

اماں زلیخا میرے لیے کھانا لینے چلی گئی تھیں۔ دس منٹ ہی گزرے تھے کہ عذرا ہوش میں آگئی۔ ہوش میں آتے ہی وہ کسمسائی اور کرسی سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کے حسین بشرے پر نفرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے۔

''یاد رکھو میرے بابا تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' وہ نخوت سے بولی۔ ''وہ جلد ہی تمہیں ڈھونڈ لیں گے۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرے خیال میں اس سے بحث کرنا فضول تھا اس لیے میں نے چپ میں ہی عافیت جانی۔

''البتہ اگر تم میری بات مان لو تو میں بابا سے کہہ کر تمہاری جان بخشی کرادوں گی۔'' وہ دوبارہ بولی تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمہاری کیا بات مان لوں؟'' میں نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے چھوڑ دو۔'' وہ بولی۔ ''میں بابا سے کہہ دوں گی کہ وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ میرے بابا بہت رحمدل

انسان ہیں۔ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔''

''رحمدل۔'' میں طنزیہ انداز میں ہنسا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ پھر یکدم میں نے ہنسی کو بریک لگائی اور عذرا کی طرف دیکھا تو وہ غصیلی نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔

''جانتی ہو رحمدل کا کیا مطلب ہوتا ہے؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا لیکن اس نے جب کوئی جواب نہ دیا تو میں نے کہا۔ ''رحمدل کا مطلب ہوتا ہے مہربان، ہمدرد، دردمند..... لیکن تمہارا باپ اسماعیل شاہد عرف چوہدری ساجد میری نظر میں دنیا کا بدترین، بے رحم، سفاک، شیطان صفت اور روسیاہ انسان ہے۔''

''شٹ اَپ۔'' عذرا چیخی۔ ''تم بار بار میرے بابا کی شان میں گستاخی کر رہے ہو۔''

اس لمحے وہ بپھری ہوئی شیرنی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے دکھائی دے رہے تھے لیکن میں نے ذرا بھی پروانہ کی اور بولا۔ ''سچ کڑوا ہوتا ہے مس عذرا۔ میری تو دعا ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کا سیاہ چہرہ دیکھو، پھر شاید تمہیں میری بات کا یقین ہو جائے گا، پھر تم کیا کرو گی؟ کیا اپنے باپ سے نفرت کرو گی؟''

وہ خاموش سے دانت پیستی اور غصیلی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں بہ دستور نفرت کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''تم نے جواب نہیں دیا؟''

''میرے بابا ایسے نہیں ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن تم صرف شک کی بنیاد پر انہیں مجرم بنانے پر تلے ہو۔ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''میں شک کی بنیاد پر نہیں، پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''تم میرے سوال کا جواب دو، جب تم اپنے باپ کا سیاہ چہرہ دیکھو گی تو کیا تم اس سے نفرت کرو گی؟''

''کوئی بیٹی اپنے باپ سے کیسے نفرت کر سکتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''چاہے اس کا باپ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو۔ ہے تو باپ ہی نا۔''

''ہمم۔'' میں نے ہنکاری بھری اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ ''واقعی باپ سے نفرت نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے برے کام میں اس کا ساتھ بھی تو نہیں دیا جا سکتا نا۔ اگر مجرم کی مدد کی جائے اور اس کا ساتھ دیا جائے تو ساتھ دینے والا بھی مجرم ہی کہلائے گا۔''

''میرے بابا برا کام نہیں کرتے۔'' وہ ڈٹی ہوئی تھی۔

''فرض کرو، اگر تمہارا بابا مکروہ کاروبار سے منسلک ہوا تو.....'' میں نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے استفسار کیا۔ اس بار اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور کئی گزرے لیکن وہ خاموش رہی۔ تبھی دروازہ کھلا اور اماں زلیخا ایک بڑی سی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے ٹرے میز پر رکھی اور عذرا کو گھورتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ دو منٹ بعد وہ واپس آئیں تو ان کے ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا شیشے کا جگ تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں ایک گلاس تھا۔ اس بار بھی وہ جگ اور گلاس رکھنے کے بعد عذرا کو گھورتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

میں نے اٹھ کر میز گھسیٹ کر عذرا کے قریب کی پھر دوسری کرسی بھی گھسیٹ کر قریب کی اور اس پر بیٹھنے کے بعد ڈونگے کا ڈھکن اٹھایا تو اشتہا انگیز خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ آلو گوشت پکا ہوا تھا۔ میں نے رومال کھول کر ایک چپاتی نکالی اور اس کا ایک لقمہ بنا کر عذرا کے منہ کی طرف بڑھایا۔

''منہ کھولو، میں تمہیں کھانا کھلاتا ہوں۔''

وہ حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھنے لگی۔ پھر دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''مجھے نہیں کھانا.....اور تمہارے ہاتھ سے تو بالکل بھی نہیں کھانا۔''

''کیوں..... کیا میرے ہاتھ گندے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''تم میرے لیے نامحرم ہو اس لیے میں کیوں تمہارے ہاتھ سے کھانا کھاؤں؟'' وہ تلخی سے بولی تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تمہارا ایک ہاتھ کھول رہا ہوں تم اپنے ہاتھ سے کھانا کھا لو۔'' میں نے کہا۔

''مجھے نہیں کھانا۔'' وہ بدستور ضد پر اڑی ہوئی تھی۔

''ضد کر کے خود کو کیوں بھوکا پیاسا رکھنا چاہتی ہو؟'' میں نے ناصحانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے سوال کیا۔

''مجھے..... نہیں..... کھانا۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی۔ ''اپنی ہمدردی اپنے پاس ہی رکھو۔''

میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر میں نے اس کے دائیں بازو کی رسی کھولتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارا ہاتھ کھول رہا ہوں۔ تمہاری مرضی تم کھانا کھاؤ یا نہیں۔''

وہ غصے سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اس کے بائیں

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بازو کے گرد بندھی رسی کھول دی اور اسے کھانا کھانے کا اشارہ کرتے ہوئے خود کھانے میں مگن ہوگیا لیکن اس نے نہ کھانا کھانا تھا اور نہ ہی کھایا۔ میں کھانے میں مگن تھا کہ اچانک عذرا نے سالن سے بھرا ڈونگا اٹھا کر شور با میرے چہرے پر پھینک دیا۔ اس کی یہ حرکت میرے لیے غیر متوقع تھی۔ دل تو کیا تھا عذرا کو اس حرکت پر تھپڑ ماروں لیکن میں نے خود پر ضبط کیا تھا۔ شور با میری بائیں گال اور کپڑوں پر گرا تھا۔ جس کی وجہ سے شوربے کے چند قطرے میری بائیں آنکھ میں چلے گئے تھے جس پر میں نہ صرف اس اچانک افتاد پر بوکھلا گیا بلکہ میرے حلق سے سسکاری نکل گئی۔ عذرا نے یہ عمل اس قدر جلدی سے کیا تھا کہ میں سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔ آنکھ میں شوربے کے قطرے جانے سے مجھے آنکھ میں جلن ہو رہی تھی اس لیے میں جلدی سے واش روم میں چلا گیا۔

واش بیسن کی ٹونٹی کھول کر میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے آنکھ پر مارنے لگا۔ اس عمل سے آنکھ میں جلن تو قدرے کم ہوتی جا رہی تھی لیکن مکمل ختم نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے عذرا پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عذرا ایسا کرے گی۔ میں نے تو اس کے ساتھ ہمدردی کی تھی لیکن اس نے مجھے یہ صلہ دیا تھا۔

میں دو منٹ تک آنکھ میں پانی کے چھینٹے مارتا رہا پھر میں نے سامنے لگے آئینے میں دیکھا تو میری آنکھ لال انگارہ ہوگئی تھی اور پلک جھپکنے میں بہ دستور دقت ہو رہی تھی اور ہلکی ہلکی جلن بہ دستور موجود تھی۔ پانچ منٹ کے بعد میں واش روم سے باہر نکل آیا تو بے اختیار چونک پڑا۔ عذرا اپنی کرسی پر موجود نہیں تھی اور رسی قالین پر پڑی ہوئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میرے وجود میں سرد سی لہر دوڑتی چلی گئی۔ میرے دماغ پر وسوسوں نے ڈیرا ڈالنا چاہا لیکن میں نے جھٹک دیا۔ میں نے ایک طائرانہ نظر کمرے میں دوڑائی۔ کھانا بھی میز پر موجود تھا۔

''اوہو۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میں جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھول کر میں راہداری سے ہوتا ہوا صحن کی طرف بڑھا تو مجھے قیصر دکھائی دیا جو عذرا کو بازو سے پکڑے گھسیٹتا ہوا آ رہا تھا۔ عذرا اپنا بازو چھڑانے کے ساتھ ساتھ چیخ بھی رہی تھی۔

''چھوڑو مجھے۔ جانے دو مجھے ذلیل انسان۔'' عذرا چیختی ہوئی قیصر سے کہہ رہی تھی۔

''خاموش رہو۔'' قیصر بھی گرج رہا تھا۔

''نہیں خاموش رہوں گی۔ کیا کر لو گے میرا۔ چھوڑو میرا بازو۔'' عذرا بھی ضدی تھی۔

قیصر نے ایک نظر شعلہ برستی آنکھوں سے دیکھا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے، پھر چیختی رہو، یہاں تمہاری چیخیں سننے والا کوئی نہیں ہے۔ تجربہ کر کے دیکھ لو۔''

عذرا نے شاید قیصر کی بات پر یقین نہیں کیا تھا اس لیے اس نے کسی قسم کی پرواہ کیے بغیر ایک بار پھر چیخنی۔ ''کوئی ہے جو مجھے بچائے۔ کوئی ہے۔''

میرے قدم وہیں تھم گئے اور غصے کی شدید لہر میرے وجود میں دوڑ گئی لیکن پھر میں نے خود کو نارمل کرتے ہوئے گہری سانس لی۔ عذرا میری سوچ سے بڑھ کر چالاک، تیز طرار اور پھرتیلی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے فرار ہونے کے لیے ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں کی تھی۔ اگر قیصر باہر موجود نہ ہوتا تو شاید عذرا اب تک نجانے کہاں جا چکی ہوتی اور میرا منصوبہ ملیامیٹ ہو جاتا۔ قیصر اور عذرا نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔

''اگر میں باہر موجود نہ ہوتا تو اس نے فرار ہو جانا تھا۔'' میرے قریب پہنچتے ہی قیصر نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا، پھر میری لال انگارہ آنکھ اور کپڑوں پر شوربے کے چھینٹے دیکھ کر چونک پڑا۔ ''یہ تمہاری آنکھ کو کیا ہوا ہے۔ کافی لال ہو رہی ہے۔ اور تمہارا لباس.....؟''

میں نے خونخوار نظر عذرا پر ڈالی۔ اس کے حسین بشرے پر خوف کا ایک بھی تاثر موجود نہیں تھا بلکہ مجھے فتح کے تاثرات... دکھائی دیئے تھے۔ جیسے اس نے میری آنکھ میں شوربہ پھینک کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو یا جیسے کوئی فاتح قلعہ فتح کر کے آتا ہے۔ اس لمحے وہ مجھے گرگٹ لگی۔ گرگٹ بھی رنگ بدلنے میں ایک لمحہ لگاتی ہے اسی طرح عذرا نے بھی ایک لمحہ لگایا تھا۔ ابھی اس کے چہرے پر غصہ تھا اور اب وہ فتح مندی کے تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔

''کچھ نہیں ہوا۔'' میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

''بزدل کہیں کے۔ اسے بتاؤ نا، میں نے تمہارے چہرے پر شوربہ پھینک دیا تھا۔'' عذرا طنزیہ لہجے میں بولی تو قیصر نے حیرت بھری نظروں سے پہلے مجھے پھر عذرا کو دیکھا۔ مجھے کوئی شرمندگی نہیں تھی اور نہ ہی عذرا کے اکسانے پر غصہ آیا تھا۔ ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات تو ہوتے رہتے

ہیں۔ گو میرے لیے یہ چھوٹا واقعہ ہے لیکن عذرا اسے بہت بڑا کارنامہ سمجھ رہی تھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر عذرا پھر بولی۔ ''اب بولو نا، خاموش کیوں ہو بزدل انسان۔ ایک لڑکی کو قید کر کے تم کیا سمجھتے ہو کہ تم بہت بہادر انسان ہو۔ ہنہ۔ خود غرض کہیں کے۔''

میں نے بات بدلتے ہوئے قیصر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تمہارا شکریہ کہ تم نے اسے فرار نہیں ہونے دیا۔ میری ہی غلطی تھی کہ میں نے اس پر اعتبار کر لیا تھا۔ اسے میرے حوالے کرو اور مجھے دوسرا لباس لا دو۔''

''ہمم۔'' قیصر نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں آگے بڑھ کر عذرا کا بازو پکڑنے ہی لگا تھا کہ اچانک اس نے دوسرے ہاتھ کے ناخن قیصر کی کلائی پر چبھو دیئے تو وہ سسکاری مار کر رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے بائیں ہاتھ کا جھانپڑ اس کے گال پر مار دیا تو عذرا کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

''کیا کر رہے ہو۔ اسے مارو مت۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''اس نے میری کلائی پر ناخن مارے ہیں۔'' قیصر نے کہا۔ ''یہ دیکھو۔''

اس نے اپنی کلائی مجھے دکھائی۔ اس کی کلائی پر زخم کا ایک لمبا سا نشان تھا اور اسے خون رس رہا تھا۔ شاید عذرا کے ناخن نوکیلے تھے۔

''یہ تو خونخوار بلی ہے۔'' قیصر نے عذرا کو نیا نام دیا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس خونخوار بلی کو میرے حوالے کرو۔'' میں نے کہا اور آگے بڑھ کر عذرا کی دوسری کلائی تھام لی۔ قیصر نے عذرا کی کلائی چھوڑ دی اور میں عذرا کو گھسیٹنے والے انداز میں لے کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ عذرا سسکیوں سے رو رہی تھی۔ قیصر کے تھپڑ نے اس کا رخسار سرخ کر دیا تھا۔ میرے دل میں عذرا کے لیے ہمدردی بیدار ہوئی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اس سے ہمدردی کی اور اپنے دل میں نرماہٹ پیدا کی تو پھر میں کبھی بھی اپنی بہن بازیاب نہیں کرا سکوں گا۔ مجھے چٹان کی مانند ٹھوس بننا تھا اس لیے میں نے اپنے دل میں ابھرنے والے ہمدردی کے جذبات کو فراموش کر دیا۔

''میں تم دونوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' عذرا سسکیاں لیتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔ ''تم سب ظالم، گھٹیا اور احسان فراموش ہو۔''

''مجھے غصہ مت دلاؤ۔'' میں نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

''تو کیا کر لو گے؟ مارو گے مجھے؟ بولو۔'' وہ دوبدو بولی اور پھر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اسے لیے راہداری میں پہنچا اور کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے ہاتھ کی گرفت اس کی کلائی پر بے حد سخت تھی اور وہ دوسرے ہاتھ سے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس نے میری کلائی پر ناخن مارنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

''ظالم انسان۔ میری کلائی میں درد ہو رہا ہے۔ چھوڑو میری کلائی۔'' وہ چیختے ہوئے بولی۔ ''تمہارے ہاتھ بہت سخت ہیں۔''

اس کے شور پر اماں زلیخا بھی کچن سے نکل کر باہر آ گئی تھیں۔ انہوں نے جب میرے لباس پر شوربے کے چھینٹے دیکھے تو وہ حیران رہ گئیں۔

''کیا ہوا ہے علی بیٹا؟'' انہوں نے حیرت میں ڈوبے لہجے میں استفسار کیا۔

''کچھ نہیں ہوا اماں۔'' میں نے گردن موڑ کر جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔''

''اوہو۔ تمہارا لباس؟'' وہ فکرمند ہوئیں۔

''اس نے شوربہ پھینک دیا تھا۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''اوہ۔ کیا یہ فرار ہو رہی تھی؟'' وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولیں۔

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسے فرار ہو رہی تھی، یہ تو بندھی ہوئی تھی۔'' اماں زلیخا کے لہجے میں حیرت اور تجسس کے ملے جلے تاثرات تھے۔

''میں نے اس کے ساتھ ہمدردی کی تھی لیکن اس نے میری ہمدردی کا ناجائز فائدہ اٹھا لیا۔'' میں نے کہا اور پھر عذرا کو لے کر کمرے میں آ گیا۔ اماں زلیخا بھی ہمارے پیچھے تھیں۔ میں نے عذرا کو کرسی پر بٹھایا اور قالین پر بیٹھ کر اس کے دونوں بازو کرسی کے ساتھ باندھ دیئے۔ میری سخت گرفت کی وجہ سے اس کی کلائی کی رنگت بھی سرخ ہو رہی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے دوبارہ مزاحمت کی کوشش نہیں کی تھی اور چپ چاپ خود کو بندھوا لیا تھا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''اماں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے اماں زلیخا کی طرف دیکھا۔ ''میں نے تو اسے کھانا کھلانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے نہیں کھایا۔ اگر آپ اسے کھلا دیں تو.....''

''اچھا۔'' اماں زلیخا نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا اور میز پر بکھرے برتن اٹھائے اور واپس چلی گئیں۔ میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد قیصر لباس لے آیا تھا۔ میں نے واش روم میں جا کر لباس بدلا اور آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس دوران اماں زلیخا نے نہ صرف میز اور قالین صاف کر دیا تھا بلکہ عذرا کے لیے دوبارہ کھانا بھی لے آئی تھیں۔ اماں زلیخا نے روٹی کا نوالہ بنا کر عذرا کے منہ کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''منہ کھولو۔''

''میں نے نہیں کھانا۔'' عذرا نے اپنے چہرے کا رخ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ابھی کے ابھی یہاں سے جانا ہے۔''

اماں زلیخا نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ''اماں! یہ نوالہ مجھے کھلا دیں۔ مجھے تو بے حد بھوک لگ رہی ہے۔ اس کی خاطر میں کیوں بھوکا رہوں۔''

پھر میں نے منہ کھولا تو اماں نے نوالہ میرے منہ میں ڈال دیا۔ میں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ ''اماں! آپ جائیں۔ یہ کھانا نہیں کھانا چاہتی تو اس کی مرضی ہے۔ میں تو کھاؤں گا۔''

اماں زلیخا کے جانے کے بعد میں کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران میں نے کئی بار عذرا کو کھانا کھانے کی پیشکش کی لیکن وہ ہر بار نخوت سے چہرہ موڑ لیتی۔ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ میری آنکھ میں ابھی تک جلن ہو رہی تھی لیکن میں برداشت کر رہا تھا۔ بڑے بڑے غم سہتے ہوئے اب یہ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں مجھے معمولی سی لگنے لگی تھیں۔

اپنے حصے کا کھانا کھانے کے بعد میں نے ٹشو سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے حصے کا کھانا پڑا ہے۔ جب موڈ بنے اور دماغ ٹھکانے پر آئے تو بتا دینا۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گا۔''

اس نے نفرت اور شعلہ اگلتی نظر مجھ پر ڈالی اور بولی۔ ''میں زہر کھانا تو پسند کر لوں گی لیکن تمہارے ہاتھ سے کھانا نہیں کھاؤں گی۔''

''زہر کھانے سے مر جاؤ گی۔'' میں نے برجستہ اور متبسم لہجے میں کہا تو وہ بھنا کر رہ گئی۔ ''کیا مرنا چاہتی ہو؟''

''مجھے یقین ہے میرے بابا مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔'' وہ پھنکارتی ہوئی بولی۔ ''پھر دیکھنا وہ تمہارا کیا حشر کرتے ہیں۔''

''اچھا۔'' میں استہزائیہ ہنسی ہنسا پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کے بابا کب تک یہاں پہنچ جائیں گے؟''

عذرا غصے سے مجھے گھور کر رہ گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ ہمارے درمیان مزید کوئی نوک جھونک ہوتی اسی لمحے میرے سیل فون کی بیل بج اٹھی۔ میں نے سیل فون کی اسکرین پر دیکھا تو اسماعیل شاہد کا نمبر ڈسپلے ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے، شیطان کا نام لیا اور اس کی کال بھی آ گئی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شٹ اپ۔'' عذرا نے غصے سے مجھے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میرے بابا کو شیطان مت کہو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''ارے میں نے تو تمہارے باپ کا نام نہیں لیا لیکن اگر تم تصدیق کر رہی ہو تو مان لیتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تم ہی بتاؤ، میں شیطان کو شیطان نہ کہوں تو کیا کہوں۔ ویسے شیطان کا دوسرا نام ابلیس بھی تو ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔'' وہ خونخوار بلی کی طرح غرائی۔

''ہاہاہا۔'' میں طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ''میں تو محاورتاً اس کی بات کر رہا ہوں اور اگر تم یہ بھی ہو کہ میں نے تمہارے باپ کو شیطان کہا ہے۔ خیر تم نے تصدیق بھی کر دی ہے تو تمہارا خیال بالکل درست ہے۔ ویسے تمہارا باپ شیطان سے کم نہیں ہے یا شاید اس کا جڑواں بھائی ہے۔''

میری استہزائیہ ہنسی پر عذرا پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ وہ اس وقت خونخوار بلی کی طرح دکھائی دے رہی تھی جو حملہ کرنا چاہتی ہے لیکن بے بس ہے۔ ویسے وہ اس وقت خونخوار بلی ہی لگ رہی تھی اور قیصر نے اس کا نام بھی صحیح رکھا تھا میں نے دیکھا اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور اس کی کلائی بدستور سرخ تھی۔

''شٹ اپ گھٹیا انسان۔'' وہ نخوت سے بولی۔

''ہاہاہاہا۔'' میں پھر ہنسا۔ یہ مثل کافی مشہور ہے کہ ہنسی علاج غم ہے۔ میں بھی اپنا غم غلط کرنے کے لیے ہنس رہا تھا۔ فون کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کال اٹینڈ کی اور اسپیکر بھی آن کر دیا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''ہیلو علی۔'' اسماعیل شاہد کی آواز گونجی۔

''فرمایئے اسماعیل شاہد عرف چوہدری ساجد صاحب۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟''

''علی! میرے بیٹے۔ میری بات سنو..... تم جتنا چاہو گے میں تمہیں پیسا دوں گا مگر..... مگر میری بیٹی کو چھوڑ دو۔'' اسماعیل شاہد نے بے بس لہجے میں کہا تو میں نے عذرا کی طرف دیکھا۔

''مجھے پیسا نہیں چاہیے۔'' میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے میری بہن چاہیے۔ بس۔''

''تم میرا یقین کرو، میں نے اسے اغوا نہیں کرایا اور نہ ہی اس معاملے سے میرا کوئی تعلق ہے۔ تم سمجھتے.....'' اس نے پھر صفائی دینے کی کوشش کی۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''مطلب، تم ابھی تک ڈھیٹ پن کی انتہا پر ہو۔''

''تم مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ تم جانتے ہو، میں نے تمہارے ساتھ کتنی بھلائیاں کی ہیں اور..... تم مجھے ہی قصوروار سمجھ رہے ہو۔'' وہ نرم لہجے میں بولا۔

''سمجھ نہیں رہا، تم قصوروار ہو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم نے چوہدری باسط، شانی اور نجانے کیسے کیسے لوگوں کے ساتھ مل کر گینگ بنایا ہوا ہے۔ لڑکیوں کی اسمگلنگ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ تم بے قصور ہو۔ شرم نہیں آتی ایسی بات کہتے ہوئے۔''

''علی.....'' اسماعیل شاہد بولنے ہی لگا تھا کہ اسی لمحے عذرا نے چیختے ہوئے اسماعیل شاہد کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

''بابا..... بابا..... مجھے بچا لیں..... بابا۔ کیا آپ مجھے سن رہے ہیں؟''

''عذرا..... میری بیٹی..... میری جان..... تم..... تم ٹھیک تو ہو نا۔'' اسماعیل شاہد کی بے چینی سے بھرپور آواز سنائی دی۔

''بابا..... بابا..... میں ٹھیک نہیں ہوں۔ یہ بہت ظالم ہیں۔'' عذرا نے بہ دستور چیختے ہوئے کہا۔ ''اس کے ساتھی نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔''

''علی..... کس نے میری بیٹی کو تھپڑ مارا ہے۔'' اسماعیل شاہد کی اس بار درشتگی سے بھرپور آواز سنائی دی۔

''تمہاری بیٹی نے غلطی کی تھی اس لیے اسے تھپڑ پڑا۔ جو غلطی کرتا ہے اسے سزا تو ملتی ہے نا۔ تم ان باتوں کو چھوڑو، میری بات غور سے سنو۔ اگر تم نے میری بہن میرے حوالے نہ کی تو تمہاری بیٹی کے ساتھ کچھ بھی برا ہو سکتا ہے۔'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' اسماعیل شاہد کی کھنکتی آواز گونجی۔

''میں اسے تمہارے ہی گینگ کے کسی رکن کو فروخت کر دوں گا۔'' میں نے ہوا میں تیر چھوڑا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' وہ گرجا۔ ''تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔''

''لیکن تم مجھے مجبور کر رہے ہو مسٹر چوہدری ساجد۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جب تم میری بہن میرے حوالے نہیں کرو گے تو مجبوراً مجھے ایسا کرنا پڑے گا۔''

''اف۔'' وہ اف کو لمبا کھینچتے ہوئے بولا۔ ''تم میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میرا کسی گینگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تم ایک مکار، چالاک اور شاطر انسان ہو چوہدری ساجد۔ تم کچھ بھی کر لو میں تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔'' میں نے تڑخ کر کہا۔ ''یا شاید تمہیں اپنی بیٹی سے محبت نہیں ہے۔ اس لیے تم میری بہن میرے حوالے کرنے سے گریز کر رہے ہو۔''

''مجھے اپنی بیٹی اپنی جان سے بھی پیاری ہے۔'' میری بات مکمل ہوتے ہی وہ بولا۔

''ارے واہ، تمہاری بیٹی تمہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور دوسروں کی بیٹیوں کی تمہاری نظر میں کوئی حیثیت نہیں ہے رزیل انسان۔'' میں نے یکدم چیختے ہوئے اور انتہائی کرخت لہجے میں کہا۔ اس کی اس بات نے میرا پارہ ہائی کر دیا تھا۔

''دیکھو علی.....'' اس نے کہنا چاہا۔

''شٹ اَپ۔'' میں نے اس کی بات قطع کر دی۔ ''میں اب تمہاری کوئی بات نہیں سننے والا۔ میں تمہیں مزید آدھا گھنٹا دے رہا ہوں اور یہ تمہارے لیے آخری چانس ہو گا۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں بھی تمہاری بات نہیں سنوں گا، نہ ہی تمہاری کال اٹینڈ کروں گا اور نہ ہی تم کبھی اپنی بیٹی کی شکل دیکھ سکو گے اس لیے..... جلدی فیصلہ کرو۔''

''سنو، سنو..... فون بند.....'' اسماعیل شاہد کی آواز وہیں دب گئی کیونکہ میں نے کال کاٹ دی تھی۔

(لمحہ بہ لمحہ بدلتے واقعات پر مشتمل داستان جاری ہے)

www.pakistanipoint.com

گریہ چہرہ

محترم مدیر
السلام علیکم!
ایک اور سچ بیانی ارسال کررہی ہوں۔ انسان اپنے ملمّع زدہ چہرے کے پیچھے ایک اور کریہہ چہرہ رکھتا ہے۔ سائرہ کی داستان گواہ ہے۔ اس نے کس طرح اپنی ٹوٹتی بکھرتی زندگی کو سنبھالا۔ کس طرح طوفان میں گھری زندگی کو نکالا۔ اُمید ہے قارئین کو بھی یہ کاوش پسند آئے گی

کنیز زہرہ
(لاہور)

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا گھر کا عجیب سا ماحول دیکھا۔ شروع سے میں نے یہ ہی دیکھا کہ جب ابا گھر میں ہوتے تو اماں راشدہ ماتھے پہ پٹی باندھے دنیا مافیہا سے بے خبر پڑی ہائے ہائے کرتی رہتیں مگر جیسے ہی ابا گھر سے نکلتے وہ پھر سے بھلی چنگی ہو جاتیں۔ حالانکہ وہ بیمار نہیں تھیں صحت اتنی اچھی تھی کہ وہ کئی بچوں کی ماں بھی نہیں لگتی تھیں۔ میری ماں کے انتقال کے چھ ماہ بعد ہی یہ میری ماں بن کر آ گئی تھی۔ وہ نہا دھو کے کھنگر دوالا پراندہ پہنتیں اور کاجل سے کٹورا سی آنکھوں کو لبالب بھر لیتیں، تب وہ کسی الہڑ مٹیار سے کم نہیں لگتی تھیں مگر پتا نہیں کیوں ان کی شہابی رنگت تیکھے نقوش ابا کو دیکھتے ہی دہک اٹھتے تھے۔

ابا بھی کوئی بہت پڑھے لکھے افسر نہیں تھے۔ وہ کئی سال سے ایک آفس میں پیون کی جاب کر رہے تھے۔ وہ بہت زیادہ نہیں کماتے تھے مگر جتنا کماتے تھے لا کے ان کے ہاتھ پہ رکھ دیتے اور پلٹ کے بھی نہیں پوچھتے تھے۔ راوی بظاہر چین ہی چین لکھتا تھا مگر بہت سی گتھیاں تھیں جن کے سرے کھو گئے تھے۔ بارہ سال کی اس چھوٹی سی عمر میں، میں نے اپنی ایک الجھن کا سرا پا لیا تھا۔ اماں راشدہ اپنے غیر معمولی حسن کی وجہ سے واجبی صورت کے ابا سے نفرت کرتیں تھی مگر ابا اس انتہا درجے کی نفرت پہ خاموش کیوں تھے یہ معما ابھی بھی حل طلب تھا۔ ابھی بھی منے ناصر کو کھچڑی کھلا کے جھولے میں ڈالتی میں جیسے ہی پلٹی ساگ اٹھائے کھلے دروازے سے اندر آتے شخص کو دیکھ کے نفرت کی ایک لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔ پتا نہیں اماں کو عامر میں ایسی کیا بات نظر آتی تھی کہ وہ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھتی تھیں۔ ابا کے جاتے ہی اماں نک سک سے تیار ہو کر انتظار میں بیٹھ جاتیں اور جیسے ہی دروازے پر دستک ہوتی وہ لپک کے دروازے کی جانب بڑھ جاتیں۔

''آ گئی تجھے میری یاد، کتنے دن بعد شکل دکھائی تو نے۔ اگر میں انتظار کرتے کرتے مر جاتی تو۔'' سرخ رنگ کا نیا سوٹ، پہنے دانتوں پہ دنداسہ ملے شیشوں جڑے پراندے میں وہ کہیں سے بھی بچوں کی ماں نہیں لگتی تھیں۔

''یہ لے تجھے ساگ بہت پسند ہے نا... اور جس دن پکاؤ مجھے ضرور بلانا، تیرے ہاتھ کے کھانے کی تو بات ہی الگ ہے۔ کسی بڑے ہوٹل میں بھی کھالوں تو تیرے ہاتھ کے کھانے کا سواد نہیں بھولتا۔'' ملتفت انداز میں کہتا عامر اب ان کے ساتھ ساتھ چلتا صحن کی میٹھی دھوپ میں بچھی چارپائی پہ آ بیٹھا۔

''جانے دے مت کر جھوٹی تعریف۔ ایسا تو میرے کھانے کا دیوانہ ہوتا تو یوں ہفتوں غائب نہ رہتا۔ نی گڈی! ادھر آ یہ ساگ لے جا کچن میں رکھ جا کے۔'' دلبرانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے اماں راشدہ نے مجھے آواز دی۔ میں جو اس ناقابل برداشت منظر سے ہٹ جانا چاہتی تھی ان کی آواز پہ بے بسی سے ہونٹ کاٹتی آ گئی۔ ساگ تھامے میں اب عامر کو کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھی۔

''ایک دو میں جتنے عرصے بعد بھی آؤں تیری یہ لڑکی مجھے ایسے گھورتی ہے جیسے سالم ہی نگل جائے گی۔'' عامر بظاہر

Nagar Azeem
www.pakistanipoint.com

Waqar Azeem
www.pakistanipoint

مسکراتے ہوئے مگر نفرت انگیز نظر ڈال کے گویا ہوا۔

"کیوں رنی کیوں گھور رہی ہے تو اسے۔ آئندہ ایسے گھورا تو تیرے یہ ڈیلے نکال کے تیری ہتھیلی پہ رکھ دوں گی مجھی تو۔" یکلخت راشدہ نے اٹھ کے میرے کان کو اتنی شدت سے مروڑا کہ میں بلبلا کے رہ گئی۔

"ارے چھوڑ دے جھلی، کیا کو رہی ہے، بچی ہی تو ہے۔ اب اسے کیا پتا میں تجھے کتنا عزیز ہوں۔ یہ تو اس لنگور کو ہی اچھا سمجھے گی اس کی بیٹی جو ہے۔" عامر نے آنکھ دبا کے لوفرانہ انداز میں کہا تو میرا دل چاہا کہ عامر کے چہرے پہ تھوک دوں مگر اتنی جرأت کہاں سے لاتی۔

"چل دفع ہو منے کو سنبھال۔ اٹھ گیا ہے میری جان کا عذاب۔ اب رو رو کے سارا گھر سر پہ اٹھا لے گا۔" ایک جھٹکے سے میرا کان چھوڑتے ہوئے راشدہ نے مجھے اندر کی طرف دھکا دیا تھا اور لڑکھڑاتی ہوئی میں دروازے سے ٹکرائی تھی۔ دانت سے زخمی ہوئے ہونٹ سے خون نکلنے لگا۔ خون پہ انگلی جمائے میں سرعت سے اٹھ کے اندر کی طرف بڑھی۔

"اری چھوڑ غصہ ادھر آ کے بیٹھ دیکھ میں تیرے لیے کیا لایا ہوں۔" عامر اب جیب سے سرخ چوڑیاں نکال رہا تھا۔ پھر جب ہاتھ پکڑ کے پہنانے لگا تو راشدہ شرم سے سرخ پڑ گئی۔

"عامر! جب تو اس محبت اور چاہت سے میرے لیے کوئی چیز لاتا ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ سارے زمانے کے دکھ بھول جاتی ہوں میں۔" سرخ چوڑیوں سے بھری کلائی پہ فرط مسرت سے ہاتھ پھیرتی راشدہ.... عامر کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"اری تو جان ہے اپنی۔ میں تیرے لیے ہی تو کماتا ہوں۔ میرا بس چلے تو میں چاند ستارے توڑ کر تیرے قدموں میں ڈال دوں۔ پھر تیرا شرم سے سرخ پڑتا یہ قندھاری انار جیسا چہرہ اپنی آنکھوں میں سموتا رہوں۔" یہ مکروہ آواز سماعت سے ٹکرائی۔ اس وقت میں کھڑکی کے پٹ پہ ہاتھ جمائے باہر دیکھ رہی تھی۔

"تیری یہ ہی ادائیں تو مجھے دیوانہ بنائے رکھتی ہیں ورنہ اس مطلبی دنیا میں رکھا ہی کیا ہے۔" عامر نے راشدہ کے مخملیں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"سچ تو یہ ہے عامر کہ جب تم یہاں آتے ہو تو میں جی اٹھتی ہوں، نہیں تو میری زندگی موت سے بدتر ہے یہاں۔" چالیس سالہ دھان پان سی راشدہ سامنے بیٹھے پچیس سالہ عامر کو اپنا اسیر بنا چکی تھی۔ عشق واقعی اندھا ہوتا ہے انہیں دیکھ کے یہ محاورہ سچ ثابت ہوتا تھا۔

"اب یہیں بٹھائے رکھے گی یا اندر کمرے میں بھی لے جائے گی سچ اتنے لمبے سفر سے بہت تھک گیا ہوں میں۔" عامر کی آواز سنائی دی۔ پھر ان کے کھڑے ہونے اور کمرے کی طرف بڑھتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"سن عامر کے لیے چائے بنا لے۔ بن جائے تو مجھے آواز دینا میں لے جاؤں گی آ کے۔ اپنی یہ منحوس صورت لے کر وہاں نہ آ جانا، نفرت ہے اسے تیری شکل سے، اور ہاں خبردار جو تو نے اپنے منحوس باپ کو کچھ بتایا تو کھال کھینچ لوں گی تیری۔"

منے کو دوبارہ تھپک کے سلانے میں کامیاب ہو کر کھڑکی پر آئی تھی کہ اماں آ کے ہدایت دینے لگی مگر جاتے جاتے حسب معمول دھمکانا بھی نہ بھولی۔ میں ان کے غصے سے بہت ڈرتی تھی۔ کچھ دن پہلے میں نے عامر کے بارے میں ابا کو بتانے کی سعی کی تھی جس پر اماں نے میرا بازو جلتے انگارے سے داغ دیا تھا۔ میرے نفرت کے گہرے احساس سے مغلوب ہوتے اعصاب گویا چیخ کے رہ گئے تھے۔ کوئی ماں اپنی... اولاد کے ساتھ بھی ایسا سلوک کر سکتی ہے بھلا مگر ان کو تو عامر کے عشق نے اندھا کر رکھا تھا۔ سرد آہ بھرتی میں کچن کی طرف چل دی۔

☆......☆

دھوپ صدیوں کی پیلاہٹ اوڑھے یخ بستہ زمین پہ اتر کے شاید خود ساکت رہ گئی تھی کہ اس کے اندر کی اداسی سارے ماحول میں رچی محسوس ہوتی تھی۔ میں بابا کی لاڈلی تھی شاید یہ ہی وجہ تھی کہ اماں کو مجھ سے نفرت تھی۔ وہی نفرت جس کا زہر روح تک کو نیل و نیل کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور یہ ہی نفرت میرے دل میں کسی سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی تھی اور لمحہ لمحہ دل میں موجود ماں کی محبت کو چاٹ رہی تھی۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ وہ بہت عام سا دن تھا میرے لیے مگر کچھ دیر بعد بدترین ثابت ہوا۔ عامر ہاتھ میں شاپنگ بیگز پکڑے ہمارے گھر میں داخل ہوا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میری روح تک جھلس گئی۔ میں ناگواری سے زرد دھوپ کے پس منظر میں بیٹھے دو قابل نفرت لوگوں کو شوخ جملے بول کے ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرتے دیکھ رہی تھی۔ جب برداشت نے جواب دے دیا تو نفرت بھری نگاہ ڈال کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ میں خون کے گھونٹ پیتی چارپائی پہ لیٹے منے کو بہلا رہی تھی کہ اماں چلی آئی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''سارا دن منے کا بہانہ بنا کے کمرے میں گھسی رہا کر کہ کہیں کام نہ کرنا پڑے۔ ایک سارے زمانے کا نکھٹو تیرا باپ کہ جو دو پیسے لا کے میری ہتھیلی پہ رکھتا ہے تو مزید پوچھتا تک نہیں کہ کچھ چاہیے بھی یا نہیں۔ ویسی ہی تو ہے، سارا دن کمرے میں پڑی رہتی ہے۔ میں کہتی ہوں اس دن کے لیے تیری پڑھائی چھڑائی تھی کہ تو آرام فرمائے اور میں کام کروں۔'' نخوت سے کہتی اماں نے مجھے دو ہتھڑ جڑے تھے۔

''اماں! کتنی بار کہا ہے میرے سامنے ابا کو کچھ مت کہا کرو۔ جو کام ہے وہ بتائیں میں کر دیتی ہوں۔'' میں نے بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے بمشکل لہجے کو معتدل بنا کے دھیمی آواز میں کہا۔

''واہ جی وا بولی ابا کی چمچی۔ کام کرو گی تو کوئی احسان نہیں کرو گی۔ میں ذرا نہانے جا رہی ہوں، عامر کو کھانا دے دینا اسے بہت بھوک لگی ہے۔ آج میں نے بنائے بھی تو اس کی پسند کے ٹینڈے ہیں، صبر کہاں ہوگا اسے۔'' عامر کے نام پہ راشدہ کے لبوں سے پھسلتی شیرینی گویا مجھ کو سرتاپا زہر میں بھگو گئی تھی۔

اماں مجھے حکم دیتی ہوئی نہانے گھس گئی تھی۔ میں ناچار کچن میں آ گئی۔ کھانا گرم کر کے اماں کے کمرے میں چلی آئی جہاں بیڈ پہ نیم دراز عامر ٹی وی پہ چل رہی نیوز میں مگن تھا۔ مجھے دیکھ کے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ مجھ کو اس کی آنکھوں سے کراہیت محسوس ہوئی۔ چھوٹا سا ٹیبل بیڈ کے پاس گھسیٹتے ہوئے میں نے اس پہ کھانے کی ٹرے رکھ دی۔

''ارے بھاگ کہاں رہی ہو، یہاں بیٹھو نا مل کے کھانا کھاتے ہیں۔'' اس کے اس جملے نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ میں اس کے سامنے ٹرے تقریباً پھینکتے ہوئے دروازے کی طرف بھاگی تھی جو معمولی نقص کی وجہ سے خود بخود بند ہو جاتا تھا۔ دروازہ پر پہنچ کر میں نے پلٹ کے ایک نفرت انگیز نظر اس پہ ڈالی اور تیز آواز میں بولی۔

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس سے پہلے کہ میں اس گھٹن زدہ کمرے سے نجات پاتی کہ عامر پھر پکار اٹھا۔

''ارے تم نے کھانے کے ساتھ پانی تو رکھا ہی نہیں جا پانی لا دے۔'' میں نے اس کے لہجے پہ غور کیے بنا مڑ کے دیکھا واقعی ٹرے میں پانی نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر میں میں نے پانی لا کے ٹرے میں رکھا تو عامر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے چھوڑو میرا ہاتھ۔'' قہر بار نظروں سے اسے گھور کر میں نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور اس سے پہلے

دانش عظیم آبادی

(1916ء...1988ء)

سید غضنفر نواب دانش عظیم آبادی 10 دسمبر 1916ء عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ 30 جنوری 1988ء کو کراچی میں وفات پائی۔ تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان گئے۔ سقوط ڈھاکا کے بعد کراچی میں قیام رہا۔ اس شاعر کو مشاہیر بہار میں شمار کیا گیا ہے۔ شعری مجموعہ یا کلام کی عدم دستیابی سد راہ ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مسلم شعرائے بہار بھی دانش عظیم آبادی کے ذکر جمیل سے خالی ہے۔

رئیس امروہوی

(1914ء...1988ء)

سید محمد مہدی رئیس امروہوی کا پورا گھرانا چشم بددور شعر و سخن اور صحافت پر مامور چار دانگ عالم میں مشہور رہا۔ سید محمد تقی جنگ کے مدیر، رئیس امروہوی جنگ کے قطعہ نگار، سید محمد عباس عالمی ڈائجسٹ، انشاء کے منتظم اشاعت، سید محمد اصغر جون ایلیا سسپنس ڈائجسٹ کے کالم نگار، بطور شاعر چار مجموعوں کی شہرت۔

چالیس برس کا عرصہ روزانہ قطعہ لکھنے والے ''الف'' سے شعری مجموعہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ ''بحضرت زواں''، ''پس غبار''، ''ملبوس بہار''، ''انجم آرا''، ''قطعات رئیس امروہوی''، ''ضمیر خانہ'' اور ''حکایات نے'' (غزلیں) تک کا سفر شعری سرمایہ دے گیا۔ جنگ میں جنسیات، نفسیات پر مبنی کالموں کے مجموعے ''عالم ارواح''، ''عجائب نفسیں''، ''مظاہر نفس''، ''ٹیلی پیتھی''، ''ہپناٹزم'' کون سا موضوع ان کی گرفت میں آ کے کتاب نہ بنا؟ اچھے مرزا ڈائجسٹوں میں قسط وار، کتاب ''المیہ مشرقی پاکستان'' (دو حصے) لکھ گئے۔ صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی کے حامل رئیس امروہوی 12 ستمبر 1914ء امروہہ ضلع مراد آباد میں علامہ سید شفیق حسن ایلیا کے گھر پیدا ہوئے اور 22 ستمبر 1988ء کو حادثے میں وفات پا گئے۔ سخی حسن قبرستان میں تمام برادران و خویش ایک ہی احاطے میں مدفون ہیں۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کہ باہر کی جانب بھاگتی عامر نے پھر جھپٹتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بٹھالیا۔

''بیٹھ جانا کیوں ڈرتی ہے مجھ سے، کھا تھوڑا ہی جاؤں گا تجھے۔'' نازک کلائی پہ اپنی آہنی انگلیاں گاڑے وہ خباثت سے مسکرا رہا تھا۔ٹھیک اسی وقت ابا کمرے میں داخل ہوا اور اندر کا منظر دیکھ کے ان کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ وہ وہیں سے دھاڑتے ہوئے اماں کو آواز دینے لگا۔ میں فوراً سنبھل کے کھڑی ہوئی تھی۔ باپ کی آنکھوں میں شک کے پھن پھیلائے کھڑے ناگ دیکھ کے گویا میری ساری ہمت ٹوٹ گئی۔ عامر بھی متوحش سا اٹھ کے کھڑا ہوگیا تھا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے' مگر اسے اماں کی عیاری پہ پورا بھروسا تھا کہ اب بھی وہ معاملہ کسی نا کسی طرح سنبھال لے گی۔ کھلے دروازے سے اندر آتی اماں گویا شمشاد سے زیادہ متعجب تھی۔

''تو شمشاد علی! آج کھل ہی گئے تم پہ تمہاری اولاد کے کرتوت۔ دیکھ لو اپنی آنکھوں سے بڑا مان تھا نا تجھے اپنے خون پہ۔ لوگوں کی سنی سنائی پہ مجھے الزام دینے لگتے تھے۔'' اماں نے گویا مجھے زندہ درگور کردیا تھا۔ مجھ کو لگا یہ سیاہ ترین دن اپنی تمام حولناکی سمیت مجھے نگلنے کو تیار ہے۔

''ایسا کچھ نہیں ہے ابا! میں تو اسے کھانا دینے آئی تھی۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو اماں کے کہنے پہ.....'' لرزتے کانپتے ہونٹ تب ساکت ہوئے جب اماں نے آگے بڑھ کے میرے گال پہ تمانچا مارا۔

''بکواس کرتی ہے آوارہ لڑکی! اپنا جرم میرے سر منڈھ رہی ہے جبکہ میں تو خود تجھے کتنی بار منع کرچکی ہوں کہ ہمارے سروں پہ خاک مت ڈال... پھر بھی تو اسے بلاتی رہی۔'' ماں کے تھپڑ نے میرا منہ گھما کے رکھ دیا تھا۔

بے یقینی سے ماں کو دیکھتی میں اپنے الفاظ بھول گئی تھی، یاد تھا تو بس یہ کہ میرے دل میں جمی نفرت کی دیمک آج میرے دل میں موجود راشدہ کی محبت کو مکمل نگل چکی تھی۔ میں نے نفرت انگیز نگاہ ماں پہ ڈال کے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ جبکہ شمشاد علی جو لوگوں کی باتوں میں آکر دل ہی دل میں راشدہ کے لیے کینہ پال بیٹھا تھا۔ آج خود اپنے خون کو قصوروار دیکھ کے ڈھے سا گیا تھا۔

''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کہنے کو اب کچھ باقی ہے بھی نہیں۔ گڈی آج تو نے مجھے میری ہی نظروں میں شرمندہ کردیا۔ میں آج ہی تیرا نکاح کرکے اس غلاظت سے اپنا گھر پاک کرلوں گا۔''

میں نے آگے بڑھ کے کچھ کہنا چاہا تھا جس پہ ہاتھ اٹھا کے روکتے ہوئے ابا پہلے مجھ سے پھر سر جھکائے کھڑے عامر سے مخاطب ہوتے ہوئے تیز قدموں سے گھر سے نکلتے چلے گئے۔

''دفع ہو جاؤ اب تم بھی یہاں سے، بڑی آئی مجھ پہ الزام لگانے والی۔ کہا تھا نا مجھے الزام دوگی تو کہیں کا نہیں رہنے دوں گی۔'' فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھتی ہوئی راشدہ بولی جبکہ قسمت پہ ماتم کرتی میں اٹھ کے شکستہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی دی۔

اسی شام سادگی سے عامر سے نکاح کردیا گیا تھا۔ وہ جس کے جہیز کے نام پر ابا آئے روز کوئی نہ کوئی چیز لیے گھر آتے تھے۔ اسے دو کپڑوں میں ایسے شخص کے سنگ رخصت کردیا گیا تھا جسے میں ٹھیک سے جانتی بھی نہیں تھی۔ صرف اتنا جانتی تھی کہ عامر نامی یہ شخص فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بچوں کے سستے کھلونے بیچا کرتا ہے، سوئف چھالیا بیچتا ہے۔

وہ کیسی رخصتی تھی جس میں دعائیں اور آنسو نہیں تھے بلکہ فاتحانہ مسکراہٹ، شرمندگی اور نفرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں اس دہلیز سے یوں بے دخل ہوئی تھی جیسے کوئی بے خطا مجرم بنا کوئی اپیل سنے زندہ درگور کردیا گیا ہو۔

☆.....☆

میری میکے سے جیسی عجیب رخصتی ہوئی تھی اسی طرح سسرال میں سواگت بھی عجیب تر تھا۔ عامر ہاتھ تھامے گاؤں گلیوں سے گزرتا جس دروازے کے سامنے رکا تھا وہ ہزار دستک کے بعد بھی کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دستک اتنی بلند تھی کہ رات کے سناٹے میں کونجی کی لوگوں کو گھر سے نکل کے تماشا دیکھنے لے آئی مگر اندر بیٹھے افراد کے کان پہ جوں تک نہ رینگی۔

''اے باؤ لے کہاں سے آرہا ہے تو اس وقت اور یہ کون ہے تیرے ساتھ۔'' ایک عورت نے افتاں وخیزاں اپنے گھر سے نکلتے ہوئے ملگجے سے سیاہ سوٹ میں ملبوس سراسیمگی کے عالم میں کھڑی نوخیز چہرے والی لڑکی کو دیکھ کے اس سے پوچھا تھا۔

''ماسی! شہر سے آرہا ہوں۔ بیوی ہے یہ میری، شادی کرلی ہے میں نے اس سے۔ تو یہ بتا یہ لوگ دروازہ کیوں نہیں کھول رہے۔'' پیشانی مسلتے ہوئے وہ آس پاس جمع ہوتے مجمعے کو متفکر نگاہوں سے دیکھتا ایک بار پھر لکڑی کے ختہ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

دروازے پہ لٹکی زنجیر بجانے لگا۔ جبکہ اس کی بات پہ حاضرین میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

''ہاہا شادی کر آیا۔ دفع، اس نکمے کو دے کس نے دی اپنی حور جیسی بیٹی۔ کوئی عقل کا اندھا ہی ہوگا۔'' کسی نے بلند آواز میں تبصرہ کرتے ہوئے اپنے گھر کی راہ لی تھی۔ باقی سب کے تبصرے بھی اس سے چنداں مختلف نہ تھے۔ میں نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

''ماسی! اس حرام خور سے بول دفع ہو جائے یہاں سے۔ بہت بڑی ریاست کا شہزادہ ہے نا جو شادی کر کے ایک اور مفت خوری لے کے ہمارے سروں پہ آسوار ہوا ہے۔ نہیں کھلے گا دروازہ چاہے قیامت تک کھڑا رہے تو۔'' دروازے کے پار سے چنگھاڑتی آواز آئی تھی جس پہ متوحش ہو کے میں نے عامر کی طرف دیکھا تھا۔

''دیکھ بھرجائی! تجھے مجھ سے جتنے بھی گلے ہیں میں سب دور کر دوں گا۔ اب سے جو بھی کماؤں گا تیرے ہاتھ پہ رکھوں گا۔ یہ میری بیوی بھی تیری نوکرانی بن کے رہے گی۔ خدا کے واسطے اب چھوڑ ناراضگی بس کھول دے دروازہ۔'' وہ اب دروازے کے قریب ہوتے ہوئے تقریباً گڑگڑایا تھا۔

میں نے حیرت سے اپنے مالک ومختار کو دیکھا جو مجھے بے قیمت لونڈی کی طرح کسی اور کی خدمت میں دینے کے وعدے وعید کر رہا تھا۔

''نہیں کھولوں گی دفع ہو جا۔ لے جا اپنی ہوتی سوتی کو بھی۔ پتا نہیں کن لچھنوں کی ہے جو ماں باپ نے بنا کوئی چھان پھٹک کیے تجھ نکھٹو کے پلے باندھ دیا۔'' اندر سے آتے دل خراش جملے جیسے میری روح تک کو زخمی کر رہے تھے۔ یوں جیسے میں مجمع میں بے ردا کھڑی ہوں اور دنیا دامن بھر بھر خاک میرے سر میں ڈال رہی ہو۔

''دروازہ تو کھول جو تو کہے گی میں کروں گا۔'' وہ شخص اب دروازے سے سر ٹکراتے ہوئے بولا تھا۔

''کھول دے دروازہ! اتنی سنگدل مت بن دیکھ، یہ نمانی کیا سوچے گی کہ سسرال میں کیسا سواگت ہوا اس کا۔'' اس بار ماسی عنایتاں نے آگے بڑھ کے دروازہ بجایا تھا۔

''اچھا جو کہوں گی کرے گا تو یوں کر میرے پیروں کو ہاتھ لگا کے مجھ سے معافی مانگ اور یہ عہد کر کہ آج کے بعد جو بھی کمائے گا مجھے دے گا... اور تیری وہ بہن میری خادمہ بن کے رہے گی۔'' دروازہ کھولتی بھرجائی نے نخوت سے کہا تو میں نے اپنی لبالب پانیوں سے بھری کٹورا سی آنکھیں سامنے کھڑی گہری سانولی رنگت کی عام سے نقوش کی مالک عورت پہ ٹکا دیں۔

جب نصیب میں کجی ہو تو انسان پہ مصائب کے گدھ مسلط ہو جاتے ہیں جو اس کے دل و دماغ سے سکون نوچ کھاتے ہیں۔ کبھی کی پڑھی بات سوچتے ہوئے کرب سے جھنجھناتے اعصاب شل ہو گئے۔ میں نے متورم آنکھوں سے اس عورت کے پیروں کو چھو کے روتے ہوئے وعدے وعید کرتے اپنے شوہر کو دیکھا۔ میرے پیچھے دبی دبی سی مسکراہٹیں گونجی تھیں۔

''چل ٹھیک ہے آجا اندر مگر یہ مت سمجھنا کہ اس گھر میں تمہیں مفت میں ٹھونسنے کو ایک دانہ بھی ملے گا۔ یہاں تم کماؤ گے تب ہی کھانا ملے گا ورنہ نہیں۔'' کمرے کی طرف بڑھتی عورت نے پلٹ کے تنفر سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے بھرجائی! ٹھیک ہے۔ کہہ جو دیا آج کے بعد وہ ہی ہوگا جو تیرا حکم ہوگا۔ تو اسے کمرے میں لے کے چل میں ذرا بھاسے مل لوں۔'' خوشامدی انداز میں کہتا وہ ایک جانب بڑھ گیا تھا۔ جبکہ وہ عورت مجھے کمرے میں چھوڑ گئی۔

میں اس وقت چھوٹے سے کمرے میں بیٹھی تھی۔ جو بغیر کسی پلستر بغیر کسی رنگ وروغن کے پیلے بلب کی ملگجی سی روشنی میں کسی قدیم کھنڈر سے مشابہہ لگ رہا تھا۔ وہ شاید اسٹور کے طور پہ استعمال ہوتا تھا۔ ہر فالتو چیز وہاں بے ترتیبی سے بکھری تھی۔ دائیں جانب زنک آلود ٹرنک تھے۔ جن پہ کٹے پھٹے مٹیالی سی رنگت کے غلاف تھے جو شاید اتنا ڈھل چکے تھے کہ اس کا ڈیزائن تک غائب ہو گیا تھا۔ بائیں جانب گھر کی پرانی اور خراب چیزیں مٹی میں اٹی رکھی تھیں جیسے سلائی مشین، ٹوٹی پھوٹی بالٹی، ٹوٹے سلیپر وغیرہ۔ میری چارپائی پہ بھی ڈھیروں لایعنی چیزیں تھیں جیسے پرانا کنگھا۔ دو حصے میں بٹا شیشہ جسے ٹیپ سے جوڑنے کی ناکام کوشش کے بعد یہاں پھینک دیا گیا تھا۔ کمرے میں بچھی واحد چارپائی پہ بدبو لٹاتے بستروں کا ڈھیر تھا جسے سمیٹ کے میں ٹانگیں لٹکا کے بیٹھی تھی۔ میری نگاہ جالے لگی دیواروں اور ٹی آر گارڈر سے بنی چھت سے ہوتی مٹی سے اٹے فرش پہ پڑی۔ یکدم کوئی چیز ٹرنک کے نیچے سے نکلتی ہوئی باہر کی طرف بھاگی تھی۔ میں نے غور کیا اور میری سانس خشک ہو گئی۔ بلی کے بچے کے سائز کا چوہا ٹرنک کے نیچے چھپا بیٹھا تھا۔ میں نے یکلخت اپنی ٹانگیں اوپر کر کے گھٹنوں میں سر دے دیا تھا۔ شل ہوتے اعصاب پہ قابو پاتے ہوئے میں نے خود کو پُرسکون کرنا چاہا۔ تب ہی ایک چھپکلی

میرے سر پہ گری اور عجلت میں رینگتی ہوئی وہیں کہیں غائب ہو گئی۔ میری چیخ جیسے حلق میں کہیں گھٹ کر رہ گئی۔ میں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پاس ہی پڑے بستروں کے ڈھیر سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔ اکڑی ہوئی کمر کو کچھ سکون ملا تھا۔

''واہ شہزادی صاحبہ! کیا مسند لگا کے بیٹھی ہیں۔ اگر دلہناپے کا شوق پورا ہو گیا ہو تو اٹھ کے اپنے اور اس کمینے کے لیے روٹیاں بنا لو کہ ان نازنخروں سے تو پیٹ بھرنے والا نہیں۔'' بھرجائی استہزائیہ انداز میں کہتی پلٹی تھی میں بنا ایک لفظ کہے اٹھ کے باہر آ گئی۔

صحن کے ہی ایک کونے میں مٹی کا چولہا تھا۔ جسے اوپلوں سے جلانا تھا۔ یہ کام میں نے زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ آدھے گھنٹے میں' میں نے چولہا جلایا تھا۔ چولہا ابھی بھی ٹھیک سے نہیں جلا تھا، سارے صحن میں دھواں پھیل چکا تھا۔

''تیرا بیڑا غرق یہ کیا کر رہی ہے ابھی تک ایک روٹی نہیں بنائی۔ چل ہٹ یہاں سے میں آگ جلاتی ہوں۔ بدبخت اپنے جیسی نکمی بیاہ لایا ہے۔'' عورت نے بری طرح کھا جتی مجھ کو پاؤں کی ٹھوکر سے دور ہٹایا اور دیور کو کوسنے لگی۔ مجھ کو جیسے وہ ٹھوکر دل پہ لگی تھی۔ آنسو بھری آنکھیں ہاتھ کی پشت سے بری طرح رگڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''لے جل گئی ہے آگ۔ اب روٹیاں بھی بنانی آتی ہیں یا وہ بھی نہیں سکھائیں تمہاری ماں نے۔ ماں ہے بھی تمہاری یا لاوارث ہے تو۔ کیوں کہ ماں ہوتی تو یوں تجھے اندھے کنویں میں نہ پھینکتی۔'' بھابی نے منٹوں میں مہارت سے آگ جلائی تھی۔ میں اس کی بات کو نظر انداز کرتی اس کی جگہ پیڑھی پہ بیٹھ کے پاس رکھے آٹے کے پیڑے بنانے لگی۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کے بھابی بل کھاتی پلٹی تھی۔

''بڑا غرور ہے بھئی مگر جانتی نہیں کہ پالہ کس سے پڑا ہے۔ دو دن میں ساری ہیکڑی نکال نہ دی تو میرا نام نہیں۔'' بڑبڑاتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں گھسی تھی۔

اس رات میں نے دس روٹیاں بنائی تھیں۔ میری باری آنے پہ گندھا ہوا آٹا ختم ہو گیا۔ صبح سے حلق سے ایک کھیل نہیں گزری تھی۔ بل کھاتی انتڑیوں کو صبر کا جام پلاتی میں اٹھ کے اس تاریک غار نما کوٹھری میں آ گئی۔

دوسرے دن میں نے کمرے کی صفائی کی تھی۔ چونکہ کمرے میں خالی اینٹیں جڑی تھیں سو مجھے ہمت کرنی پڑی۔ صحن میں پڑی مٹی کا گاڑھا آمیزہ بنا کے میں نے کمرے کی سب درزیں بھر دیں تھی۔ کاٹھ کباڑ ایک طرف لگاتے ہوئے میں نے اسٹور کو کمرے کی شکل دے ہی دی تھی۔

وقت گویا پر لگا کے گزرا تھا۔ بھابی نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا۔ زندگی میرے لیے موت سے بدتر کر دی تھی۔ مگر میں تو جیسے حرف شکایت لب پہ لانا ہی بھول گئی تھی۔ خدا نے مجھ کو ایک بیٹے سے نوازہ تھا۔ شوہر اب بھی اپنی فطرت پہ قائم تھا۔ کبھی ہفتوں شہر سے نہ پلٹتا اور کبھی انواع واقسام کی اشیا تھیلوں میں بھرے بھرجائی کے پاس حاضر ہو جاتا۔ مگر میرے لیے حرف تسلی کے سوا کچھ نہ لاتا۔

زندگی میرے لیے تب تک کٹھن تھی جب تک میرے پاس روحان کی صورت سہارا موجود نہیں تھے۔ میں بھوک بھی تب تک کاٹ لیتی تھی جب تک اکیلی تھی۔ حالات اور بچے نے مجھے بہت مضبوط بنا دیا تھا۔ جب عامر ہفتوں گھر سے غائب رہتا تو بھابی مجھ پر رزق اور زندگی تنگ کر دیتی۔ تب ہی میں نے ہمت کی اور کاٹھ کباڑ سمجھ کے اس کمرے میں پھینکی ہوئی ساس کی پرانی سلائی مشین میں نے اپنی بالیاں بیچ کے ٹھیک کروائی اور محلے کے لوگوں کے کپڑے کم اجرت پہ سینے لگی۔ یوں میں چاہے بھوکی رہتی مگر اپنے بچوں کا پیٹ بھرتی اور بیماری اور تکلیف میں دوادارو بھی کرتی۔

☆.....☆

شادی کا چوتھا سال تھا۔ بھرجائی کا رویہ کافی بدل گیا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ میں اس سے کچھ نہیں لیتی بلکہ دیتی ہوں۔ شاید اسی لیے اس نے کہا تھا۔ ''میں نے تیرے سے ضروری بات کرنی ہے یہاں بیٹھ۔'' میرے ہاتھ سے چائے کا پیالا تھامتی بھرجائی نے قدرے نرم لہجے میں کہتے ہوئے ہاتھ پکڑ کر اپنے مقابل بٹھایا۔

''جی بھرجائی بولیں پھر میں نے عامر کو چائے دینی ہے۔'' قدرے عجلت میں کہتی میں حیرت سے بھرجائی کو دیکھنے لگی۔

''کب تک خود کو فراموش کر کے ان بے فیضوں کی خدمت کرتی رہے گی۔ کچھ عقل کے ناخن لے۔ اپنا نہیں سوچتی کم سے کم اپنے بچوں کا سوچ۔ کیا تجھے نہیں لگتا کہ تیری یہ خاموشی تیرے بچوں کی حق تلفی کا سبب بن رہی ہے۔'' بھرجائی کی پُرسوچ نگاہیں میرے چہرے پر تھیں۔

''میں سمجھی نہیں بھرجائی! آپ کھل کر کہیں کیا کہنا چاہتی ہیں۔'' میری نظریں شرمساری سے جھکی تھیں۔

''کبوتر کی طرح نظریں جھکا لینے سے حقیقت نہیں بدلا کرتی سارو! دیکھ ان سالوں میں تو نے میری بڑی خدمت کی

ہے۔ اتنا ساتھ تو سگی بہن نہ دیتی میرا جتنا تو نے دیا ہے۔ یوں سمجھ مجھے ترس آتا ہے تجھ پہ، تیرے سر کا سائیں دوسری عورتوں پہ پیسے لٹاتا ہے اور تو اس بے فیض کی اولاد کے پیچھے جان مار کے بھی ان کے فرائض پورے نہیں کر پا رہی۔ تیرا بیٹا بڑا ہو رہا ہے اس کے بارے میں سوچ۔'' بھرجائی اسے شروع سے سارو بلاتی تھیں۔ اسے شاید میرا نام مشکل لگتا تھا۔ مگر وہ اس وقت مجھ پہ سوچ کے کئی در وا کر گئی تھی۔

''آپ سچ کہتی ہیں بھرجائی! مگر میں بھی کیا کروں۔'' عالم اضطراب میں اپنے لب کاٹتی میں نے بے بسی سے کہا۔

''تو ماں ہے سارو! تو چاہے تو بہت کچھ کر سکتی ہے۔ میری مرحومہ ماں کہتی تھی پتھر بھی اپنی جگہ پہ بھاری ہوتا ہے تو اپنی جگہ چھوڑ چکی ہے پھر لوگ تجھے ٹھوکوں میں کیوں نہ اڑائیں۔ تجھے ہمت پکڑنی ہوگی ورنہ تیرے بچے کا حق غیروں کے نازنخروں میں اڑتا رہے گا۔ تو ہی ہے جو عامر کو احساس دلا سکتی ہے۔'' بھرجائی دور کی کوڑی لائی تھی مگر میرے گلے میں جیسے آنسوؤں کا گولا پھنسا۔

''میں نے بہت بار احساس دلانے کی کوشش کی ہے مگر عامر ہر بار بھڑک کر مجھے دھنک کے رکھ دیتا ہے۔ اب تو اس کی مار کی عادت سی ہوگئی ہے، بنا قصور بھی پڑ جائے تو درد نہیں ہوتا۔ مگر اس پتھر پہ کسی بات کا اثر بھی تو ہو۔'' گلوگیر لہجے میں کہہ کر میں نے بے بسی سے بھرجائی کو دیکھا۔

''وہ ہے ہی کتے کی دم یوں سدھرنے والا نہیں۔ تم بس حوصلے اور ہمت سے حالات کو اپنے حق میں کرو، کیسے یہ میں تمہیں بتاؤں گی۔ یہ بتاؤ عامر شہر کب جا رہا ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ ہی شہر جانا ہوگا تاکہ اسے اندازہ ہو کہ تم اور بچہ اس کی ذمے داری ہو۔'' بھرجائی کی بات میں وزن تھا اور چاہتی تو میں بھی یہ ہی تھی۔

''آج شام کو مگر عامر مجھے نہیں لے جائے گا بھرجائی! میں ہزاروں بار کہہ کے چار چوٹ کی مار کھا چکی ہوں۔ اب تو میری ہمت بھی نہیں ہوتی۔'' خوں رنگ آنکھوں سے کہتی میں پھر مایوسی سے سر نفی میں ہلا گئی تھی۔

''تم فکر مت کرو۔ بس تیاری کرو آج تمہیں کچھ کہنے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آج تم اس کے ساتھ جاؤ گی اور میں بھیجوں گی تمہیں اس کے ساتھ۔'' بھرجائی مصمم ارادہ کرتی وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ پھر اس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔

شام ڈھلے جب وہ کھانا کھا کے نکلنے کے لیے تیار ہوا تو بھرجائی مجھے بازو سے پکڑ کے گھسیٹتی لے آئی۔

''بہت ہو گیا عامر! لے کے جا اپنے بیوی بچوں کو ساتھ ہم نے کوئی ساری زندگی کا ٹھیکا نہیں اٹھا رکھا۔'' عامر کے قریب لاتے ہی جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑتی بھرجائی غضبناک انداز میں بولی۔

''اب کیا ہو گیا بھرجائی! اتنی تو تیری خدمت کرتی ہے۔ رہنے دے اسے یہیں، خدمت کروا اس سے۔ ویسے بھی میں شہر میں کون سا گورنر لگ گیا ہوں جو اسے اپنے ساتھ رکھتا پھروں۔'' حقارت سے کہتے عامر نے مجھے کینہ توز نظروں سے گھورا تھا۔

''نا بھرا! میں باز آئی ایسی خدمت سے۔ آدھے دل سے تو یہ سارا کام کرتی ہے۔ اس کے بگڑے کام سنوارنے میں میرا دن گزرتا ہے۔ آج بھی کھانے میں سے بال نکلا ہے، میں الٹی کر کے آئی ہوں۔ تو ساتھ ہی لے جا اس پھوہڑ کو اور اپنی خدمت کروا جا کے۔ میں نے کہہ دیا میں اب نہیں رکھنے کی اسے، چاہے تو ناک ہی کیوں نا رگڑ لے۔'' حتمی انداز میں کہتی بھرجائی اندر سے اس کا بیگ چادر اور بچے لا کے اس کے حوالے کرتے ہوئے بولی اور مجھے گھورا تاکہ میں خاموش رہوں۔

وہ خاموش تھی۔ ذلت کی تو میں جیسے عادی سی ہوگئی تھی۔ عامر کے ساتھ گھر سے نکلتے ہوئے میں نے مڑ کے پیچھے دیکھا تھا۔ بھرجائی کی آنکھیں نم تھیں مگر ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ اس نے مجھ سے نظر ملتے ہی دو انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا تھا۔ میں ممنون نگاہوں سے انہیں دیکھتی دہلیز پھلانگ گئی۔

☆.....☆

عامر مجھے میرے میکے ہی لے آیا تھا کیونکہ وہ ایک ہوٹل میں ٹیبل صاف کرنے کی نوکری کر رہا تھا اور اس معمولی نوکری میں بقول اس کے وہ رینٹ پہ الگ گھر افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں کچھ دن رہ کے ہی مجھ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شادی کے بعد عامر جتنا عرصہ بھی شہر رہا اسی گھر میں داماد کی حیثیت اور پروٹوکول سے رہا۔ یعنی وہ یہاں مرضی کی زندگی گزارتا رہا اور میں گاؤں میں پیسے پیسے کے لیے ترستی رہی۔ یہ ادراک ہوتے ہی گویا میں انگاروں پہ لوٹنے لگی۔ عامر ہر ماہ اپنی کمائی راشدہ کی ہتھیلی پہ رکھتا تھا جسے وہ ناز و نخرے دکھا کے رکھتی۔ گو یہاں آ کے بھی میرے حالات جوں کے توں رہے مگر میں اب خود میں ہمت جٹا رہی تھی۔ میں نے جب بھی عامر سے پیسوں کا تقاضا کیا جواب میں چار چوٹ کی مار ہی کھائی۔ تب میں نے حالات کو بدلنے کی ٹھانی تھی جس کی شروعات میں نے عامر

www.pakistanipoint.com

سے ہی کی تھی کہ بہر حال شوہر ساتھ ہو تو کئی مصائب راحتوں میں ڈھل جاتے ہیں۔

"عامر! روحان تین سال کا ہو گیا ہے دیکھوں نا ہم اسے اسکول داخل کروا دیں۔ دیکھ بچے پڑھ لکھ جائیں گے تو ان کی زندگی سنور جائے گی۔" آج راشدہ گھر میں نہیں تھی سو عامر کو کھانا وہ خود دے رہی تھی۔۔ورنہ راشدہ عامر کے آگے پیچھے پھرتی رہتی اور عامر اسے نگاہ بھر کے بھی نہ دیکھتا۔

"ہاں اسے اسکول میں داخل کروا دوں قارون کا خزانہ جو ہاتھ لگ گیا ہے میرے۔ گورنر جرنل نہیں لگا میں جو یوں اپنی محنت کی کمائی ان اللوں تللوں میں لٹاتا پھروں۔ ان کا باپ ان پڑھ ہے یہ بھی ان پڑھ ہی رہیں گے بس بات ختم۔" گرم خستہ روٹی ماش کی دال کے ساتھ رغبت سے کھاتے ہوئے۔۔۔۔ وہ حتمی لہجہ اختیار کر گیا۔

"دیکھ رہی ہوں میں کہ تو اپنی محنت کی کمائی کن نیک کاموں میں لگاتا ہے۔ آج اپنے بچوں کی حق تلفی کرے گا تو کل کو رب کے حضور میں جوابدہ ہو گا۔ سنبھل جاؤ ابھی بھی وقت ہے۔" زہر خند لہجے میں، میں نے اسے رب سے ڈرایا تھا۔

"تو مجھے رب سے ڈراتی ہے نانجار عورت خود کیا کر رہی ہے۔ شوہر تھکا ہوا آیا ہے، دو نوالے تک حلق سے نہیں اترنے دیئے اور شروع ہو گئی۔ رک تیری ٹر ٹر ابھی بند کرتا ہوں۔" لمحوں میں سامنے پڑے برتن ہٹا تا وہ میری چٹیا دبوچ چکا تھا۔ دوسرے ہی پل وہ تھپڑوں سے میرے رخسار سرخ کرتا صحن کے بیچوں بیچ لے آیا تھا۔ تب ہی نازک پرس تھامے ماں اندر داخل ہوئی۔

"راشدہ! سنبھال اپنی بیٹی کو، مت منہ لگا کرے میرے ورنہ اس کا حشر کر کے رکھ دوں گا۔" عامر کے منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ مجھے ماں کے پیروں میں دھکیل کر من و عن ساری بات ماں کو بتانے لگا۔

"کم بخت کتنی بار سمجھایا ہے کہ شوہر کے منہ کو مت آیا کر۔ تیری ان ہی حرکتوں کی وجہ سے سہاگن ہوتے ہوئے بھی رل رہی ہے تو۔ ابھی تک شوہر کے مزاج کو نہ سمجھی تو۔" اماں راشدہ نے کاندھوں سے اٹھا کے دو تھو جڑے۔

"تم تو رہنے ہی دو۔ میرے اتنے برے دن نہیں آئے کہ ایک ایسی عورت سے گھر ستی سمجھوں جو تجھ جیسی خائن ہو۔ جو خود عورت کے نام پہ دھبا ہو۔ تو میرا منہ نہ ہی کھلوائے تو تیرے لیے اچھا ہو گا۔" میں ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی

اماں پھر مجھ کو مارنے کے لیے لپکی تھی مگر میں سرعت سے مڑ کے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر گئی تھی۔ میں نے عامر کو سمجھانے کی آخری کوشش کر کے دیکھ لی تھی۔ اب مجھے خود ہمت کرنی تھی اور خود اپنے بدترین حالات کا رخ موڑنا تھا۔

دوسرے دن میں ایک پرانی سہیلی کے بتانے پہ قریبی اسکول چلی آئی تھی۔ جہاں مجھے بہ آسانی آیا کی جاب مل گئی تھی۔ ٹوٹے دل سے کی گئی کوشش کے بار آور آنے پہ میرا حوصلہ ساتویں آسمان تک پہنچا تھا۔ میں روز صبح بچوں کو ناشتا کروا کے نکل جاتی اور دوپہر تک گھر آ جاتی۔ جاب کا نہ میں نے کسی کو بتایا نہ کسی نے مجھ سے پوچھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ باہر سے پتا لگنے پہ عامر نے ایک بار پھر میری ہڈیاں سینک کے رکھ دی تھیں مگر میں بے حس ہو چکی تھی۔ مجھے اب جنون تھا تو بس ایک کہ مجھے اب عامر کی آس پہ نہیں بیٹھنا تھا۔ میری ہر آس خدا کے در سے جڑ گئی تھی۔۔۔اور وہی تو تھا جو سب کی امیدوں پہ پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ سو اس نے میرے دل سے تمام خوف نکال باہر کیے۔ ان ہی دنوں میرے مٹی کے مادھو باپ میں بھی جنبش ہوئی تھی۔ انہوں نے میرے چہرے پہ پڑے نیل دیکھ کے عامر سے سخت لہجے میں جواب مانگا تھا۔ جس پہ لڑ جھگڑ کے عامر مجھے لیے کرائے کے گھر پہ اٹھ آیا۔

نوکری کے دوسرے ہی ماہ میں نے بیٹے کو اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ میں اب اپنا اور بچے کا خرچ اٹھاتی تھی۔ عامر کے ہزار کہنے پر بھی میں نے جاب نہیں چھوڑی تھی۔ بلکہ میٹرک کے امتحان کی پرائیویٹ تیاری کرنے لگی۔ میری نوکری پہ خار کھائے بیٹھا عامر بات بے بات مجھ پہ ہاتھ اٹھاتا۔ اس پہ بھی دل نہ بھرا تو جگہ جگہ سے قرض لے کر پیسے اڑا کے وہ لوگوں کو گھر کا راستہ دکھانے لگا۔ عامر کا عیاشی میں لٹایا ہوا پیسا کیسے واپس کر سکتی تھی۔ میں نے پھر عامر سے بات کرنے کی ٹھانی۔

"ہاں تو دو نا انہیں پیسے تم تو کماتی ہو، دے سکتی ہو۔ بلکہ اگر تمہیں کمانے کی لت لگ ہی گئی ہے تو میں بتاتا ہوں نا تمہیں کمائی کا ذریعہ۔ جس سے نا صرف تم میرا قرض اتارو گی بلکہ بہت سا پیسا بھی بنا سکتی ہو۔" میرے شکایت کرنے پہ لوفرانہ انداز میں آنکھ مارتے عامر نے اس انداز میں کہا کہ میں زمین میں گڑھ کے رہ گئی۔

عامر کی یہ حرکت میرے صبر کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی تھی۔ میں اسی رات بچے لے کر اپنے بابا کے گھر آ گئی اور زار و قطار روتے ہوئے اوّل دن سے آج تک کے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

حالات کہہ سنائے۔ اباچونکہ برابر والی ثریا کی زبانی بھی یہ جان چکے تھے کہ مجھ پر لگا الزام جھوٹا ہے سو مجھے بے قصور مان کے میری ہر بات پہ ایمان لے آئے۔ دراصل اس سب میں ثریا کی جاسوس فطرت کا ہاتھ تھا اس نے ایک دفعہ راشدہ اور عامر کی باتیں سن لیں تھیں۔

ابا نے مجھے بھرپور یقین دلایا تھا کہ مجھے اب عامر کی طرف سے کوئی تکلیف نہیں ملے گی۔ کیونکہ اب اس کا باپ ڈھال کی صورت اس کے سامنے کھڑا ہے۔ میں مطمئن ہو گئی۔۔۔ پھر بہت سا وقت گزر گیا۔ میں نے میٹرک کلیئر کر کے پرائیویٹ ایف اے کر لیا۔ میں اب اسی اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے جاب کر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ بی اے کی تیاری بھی کر رہی تھی۔

عامر کا اس گھر میں داخلہ ممنوع ہو گیا۔ ابا بھی بیمار رہنے لگے تھے۔ بیماری کی حالت میں جب اماں ان کے سامنے رات کی بچی باسی روٹی اور کئی دن پرانا سالن جان بوجھ کے رکھتی تو میں خون کے گھونٹ پی کے رہ جاتی۔ میرے صلح جو باپ نے زندگی صبر کا امرت پی کے ہی تو گزاری تھی۔ اس دن بھی میں ان ہی سوچوں میں غلطاں اسٹاف روم میں بیٹھی تھی کہ پیون بھاگا آیا۔

''میڈم! جلدی آیئے حاشر نے عاطر کو دھکا دیا ہے اور اس کا بازو ٹوٹ گیا ہے۔ وہ چلّائے جا رہا ہے شاید اسے اسپتال لے جانا پڑے۔'' پیون کے تیز لہجے پر میں گھبرا کے بھاگی تھی کہ دونوں میری ہی کلاس کے بچے تھے سو میری ذمے داری تھی۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی میں۔۔۔ ننھے عاطر کو گود میں بھر کے باہر بھاگی تھی۔ پیون رکشا روک چکا تھا۔۔۔ موٹر سائیکل پہ عاطر کو لینے آئے حکیم اخلاق احمد عاطر کے بے ہوش وجود کو ایک اجنبی مگر حواس باختہ عورت کی گود میں دیکھ کے متعجب ہو گئے۔

عاطر حکیم اخلاق احمد کا بھتیجا تھا۔ وہ چونکہ اپنے گھر میں ہی حکمت کی دکان چلاتے تھے سو کبھی کبھی وہ عاطر کو اسکول لینے آ جاتے تھے۔ اس حادثے کے بعد میں روز عاطر کو دیکھنے اسپتال آنے لگی۔ حکمت کے ساتھ ساتھ اخلاق نے ایم اے اردو اور کئی کورسز بھی کر رکھے تھے۔ ماں باپ کے بعد انہوں نے خود کو پڑھائی میں اتنا گم کر لیا تھا کہ عملی زندگی میں آ کر بھی شادی جیسی حقیقی خوشی سے دور تھے۔ مگر اسپتال میں گزرے یہ کچھ دن مجھ سے شناسائی اور پھر دلی وابستگی کا باعث بنے تھے۔ عاطر کے مکمل ٹھیک ہونے پہ وہ روز عاطر کو اسکول سے پک کرنے آنے لگے۔

ان ہی دنوں انہوں نے سب ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے مجھ سے پسند کا اظہار کر دیا اور بھائی بھابی کو رشتے کے لیے بھیجنے کی خواہش بھی ظاہر کر دی۔ جس پہ افسردہ سی میں نے گلوگیر لہجے میں اپنے پہ بیتی سب قیامتیں اخلاق کے گوش گزار کر دیں کہ بہر حال مجھ کو جھکی نظر والے اس قابل ترین شخص سے انسیت سی ہو چلی تھی۔ اخلاق میرے حالات سن کے افسردہ ضرور ہوئے تھے مگر قدم پیچھے نہیں ہٹائے تھے۔ ان کی اسی اعلیٰ ظرفی نے میرے۔۔۔ دل میں ان کی محبت کی بنیاد رکھی تھی۔ اخلاق کے مشورے اور ابا کی بھرپور حمایت پہ میں نے عامر کو خلع کا نوٹس بھجوا دیا تھا۔

☆.....☆

جب سے میں نے خلع لی تھی۔ عامر نے ان گنت بار بچوں سے ملنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اسے اب پچھتاوے کے ناگ ڈس رہے تھے۔ مگر ابا ہر بار اسے دھکے دے کے نکال دیتے۔ ان ہی دنوں حکیم اخلاق کے بھائی بھابی آ کے رشتہ ڈال گئے تھے۔ ابا کو یہ فیملی خاص کر اخلاق صاحب کی شرافت بہت بھائی تھی۔ انہوں نے ہاں کرنے میں دیر نہ کی۔ وہ پہلے ہی میرے ساتھ بڑی ناانصافی کر بیٹھے تھے اب مزید کچھ بھی میری مرضی کے خلاف نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہاں کرنے سے پہلے میری رائے لی تھی جس پہ میں مسکرا اٹھی تھی میری مطمئن مسکراہٹ پہ وہ میرے سر پہ دست شفقت رکھتے اٹھ کے اپنے کمرے میں چلے آئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اماں کے غصے اور زبان درازی میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اماں کا اب ایک ہی کام تھا گھر سے نکل کر عامر کے پاس پہنچ جاتی جو انہیں دروازے سے ہی لوٹا دیتا۔ راشدہ کا اگر ڈھلتی عمر میں عامر کا عشق دیوانہ کیے دے رہا تو عامر کا بسا بسایا گھر اجڑنے کا پچھتاوا بھی اس کی شہ رگ کاٹے دے رہا تھا۔

وہ دونوں ہی زندگی کے ایسے موڑ پہ کھڑے تھے کہ جہاں نارسائی کسی خون آشام بلا کی مانند ان کا کلیجہ نوچ چکی تھی۔ ان کے مقدر کی ٹوٹ پھوٹ ان کی ذات کے حصے بخرے کر کے انہیں اس مقام تک لے آئی تھی۔ یہ وہ مقام تھا جس کے آگے دور اہا تھا۔ یہ ہی وہ کیفیت تھی جس میں انسان یا سنور جاتا ہے یا بھٹک جاتا ہے۔ عامر کو سچی خوشی کے کھو جانے نے سنوار دیا تھا۔ جبکہ اماں اپنے خود ساختہ عشق کے بت کی پرستش میں آج بھی بھٹک رہی تھی۔ میری شادی کی تاریخ ٹھہرا

دی گئی تھی۔ ابا نے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔

وہ میری شادی اپنی بساط کے مطابق دھوم دھام سے کرنا چاہتے تھے۔ شادی میں سارا خاندان مدعو تھا۔ وہ بہت دیر اپنے کمرے میں آرام کرنے کے بعد اٹھ کے میرے کمرے میں چلے آئے جہاں روحان اور شانا گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ آج میں نے بی اے کلیئر کر لیا تھا۔ سو میں آج بہت خوش تھی۔ مگر بابا کے انداز پہ ٹھٹک گئی تھی۔

''بھئی بچو! ذرا دیکھو تو تمہاری امی کیا کر رہی ہے۔ مجھے تمہاری امی سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' پرشفقت انداز سے انہیں مخاطب کرتے ابا بیڈ کے پاس رکھی کرسی پہ براجمان ہوتے ہوئے بولے تو بچے سر ہلاتے کمرے سے نکل گئے۔

''خوش رہو ہمیشہ اللہ میری بیٹی کو ہمیشہ خوش رکھے۔ اچھا کیا جاب سے ریزائن کر دیا تم نے۔'' نرم لہجے میں تمہید باندھتے ابا نے دعا دی تھی۔

''جی بابا! ریزائن لیٹر تو کل سمرین کو دے دیا تھا۔ آپ کو بھوک لگی ہوگی کھانا لاؤں آپ کے لیے۔'' اپنی کولیگ کا نام لے کر میں نے بابا کو مطمئن کیا پھر یکلخت کچھ خیال آنے پہ ان سے پوچھتی میں اٹھنے لگی تھی جب ابا نے پھر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ بچوں کا کیا سوچا تم نے۔ کل الحمدللہ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ گی تو بچوں کے بارے میں کیا فیصلہ کیا تم نے۔'' قدرے سنجیدہ لہجے میں شمشاد صاحب نے استفسار کیا۔

''بچوں کا کیا سوچنا ہے بابا! ظاہر ہے وہ میرے ساتھ ہی جائیں گے۔ بھلا وہ میرے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں۔ ویسے بھی اس سلسلے میں میری بات ہوگئی تھی اخلاق صاحب سے، وہ بچوں کو رکھنے پہ آمادہ ہیں۔'' میں نے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ جس پہ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبا ابا کا چہرہ پریشانی سے اٹ گیا۔

''اگر میں تمہیں کہوں کہ بچوں کو یہیں میرے پاس چھوڑ جاؤ تب کیا تم میری بات مان لو گی۔'' ابا نے بغور میرا سنجیدہ پڑتا چہرہ دیکھ کے سوال کیا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے بابا! میں خود بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی پھر بچے یہاں کس کے پاس چھوڑ جاؤں۔ اماں کی ذہنی حالت سے تو آپ واقف ہیں۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں اپنے فیصلے کے محرکات سے آگاہ کیا۔

''سائرہ بیٹی! کچھ رشتے مکڑی کے جال کی مانند نازک ہوتے ہیں جہاں گرفت سخت ہوئی وہیں اپنی ہیئت کھو دیتے ہیں۔ انہیں ان کی سکت سے زیادہ نہیں آزمانا چاہیے۔ ورنہ وہ پہلے بدصورت اور پھر کمزور ہو کے ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں نے دنیا دیکھ رکھی ہے بیٹی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بچوں کو یہیں چھوڑ دو۔ باقی رہ گئی بات سنبھالنے کی تو میں ہوں نا میں ان کی ذمے داری لیتا ہوں۔ ویسے بھی روحان ماشاءاللہ سے چودہ سال کا ہو رہا ہے۔ اور شانا بارہ سال کی اب وہ بچے کہاں رہے ہیں۔'' اپنے خدشات پوری جذبات سے گوش گزار کرتے ابا کے جھریوں زدہ بوڑھے چہرے پہ شفیق مسکراہٹ ابھری تھی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں بابا! شاید یہ ہی ٹھیک رہے گا۔ باقی میں آپ کو ہر ماہ خرچ بھجواتی رہوں گی۔'' آنکھوں میں در آئی نمی واپس دھکیلتی ہوئی بولی۔

''میں ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا سائرہ کہ دو معصوم بچوں کو پیٹ بھر روٹی نہ کھلا سکوں۔ جب میں مر جاؤں تب جو دل کرے کرنا۔'' انہوں نے قدرے ناگواری سے ٹوکا تھا۔

''میرا وہ مطلب نہیں تھا بابا! اللہ آپ کو زندگی دے آپ تو ہمارا سائبان ہیں۔'' بے اختیار روتے ہوئے میں نے بات مکمل کی جس پر وہ اس کے سر پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

پھر میری شادی اخلاق سے ہوگئی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد میں اخلاق کے بے حد اسرار پہ بچوں کو اپنے پاس لے آئی مگر اسکول کھلنے پہ پھر واپس بھجوا دیا... کیونکہ یہ ہی مناسب تھا۔ پھر بچے مجھ سے ملنے آتے جاتے رہتے تھے۔ بلاشبہ اخلاق ایک بہت اچھے شوہر تھے میرے سارے غم گویا انہوں نے پلکوں سے چن لیے۔ خدا نے ہمیں چاندسی بیٹی دی۔ شادی کے بعد ہی میں نے ایم اے انگلش کیا... اور اسی ڈگری کی بنیاد پہ مجھے اس اسکول میں جاب بھی مل گئی تھی۔ جہاں آج پرنسپل ہوں۔

وقت رفتہ نے بہت کچھ بدل دیا۔ میرے شفیق بابا اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ بچوں کو عامر پاؤں میں گر کے لے گیا تھا۔ وہ اب اچھا کمانے لگا تھا اس نے بچوں کو اچھے اسکولوں میں تعلیم دلوانا شروع کر دی تھی۔ روحان اب آرمی جوائن کرنے والا ہے۔ عامر نے دوبارہ شادی نہیں کی شاید رشتوں کو اپنی ناعاقبت اندیشی سے اپنے ہی ہاتھوں کھو دینے والے یوں ہی تنہا رہ جاتے ہیں۔ اماں آج بھی عشق کے سراب کے تعاقب میں ہیں شاید یوں بھٹکنا ان کے نصیب میں لکھا ہے۔ پھر بھی کہوں گی خدا انہیں معاف کرے۔

++

www.paksociety.com

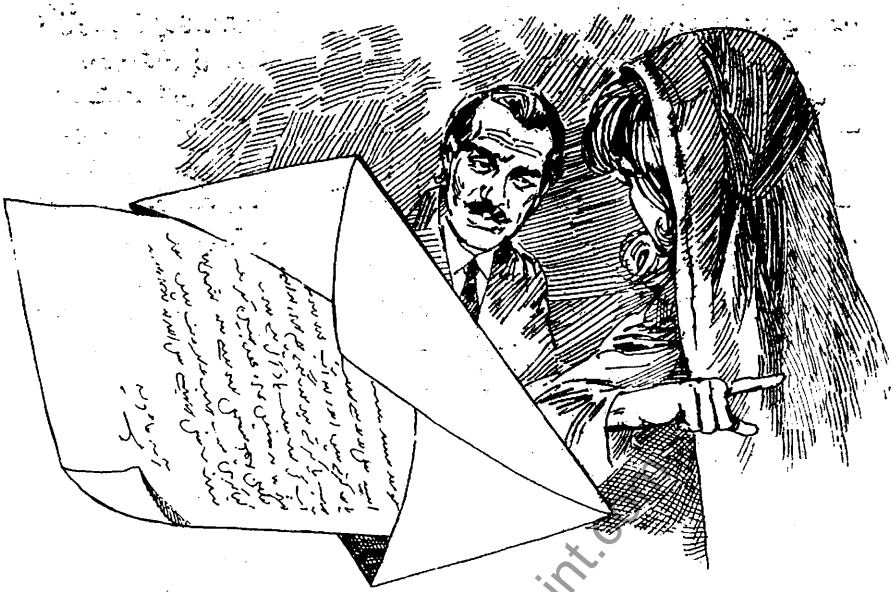

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

آپ کیلئے

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
ایک سچ بیانی ارسال کررہی ہوں. یہ سچ بیانی آئینہ ہے ہمارے بگڑتے معاشرے کا، معاشرے میں چھپے شیطان کا، ہم سب کو اپنی آنکھیں کھلی رکھنی چاہیں کہ کون کس نیت سے کیسے دیکھ رہا ہے یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اللہ دل سے پکارنے والوں کی پکار ضرور سنتا ہے۔

سنبل
(کراچی)

اور اچھا بھلا سارا پروگرام سیٹ تھا مگر آخری لمحات میں اماں نے فساد برپا...کردیا۔ ضامن کو اسلام آباد میں آفس کے کسی کام سے جانا تھا۔ ریما کے ماموں اسلام آباد میں رہتے تھے شادی کے بعد سے وہ ان سے نہیں ملی تھی۔

اس نے ضامن سے کہا تو وہ مان گئے ان دونوں نے سوچا کہ بچوں کو بھی ساتھ لے جائیں گے رہ گئیں اماں تو وہ ان کو بھی ساتھ لے جائیں گے...مگر عائشہ نے سنا تو قطعی انکار کردیا۔

"نہیں مما! میرا تو سیکنڈ سمسٹر ہورہا ہوگا ان دنوں،

امین کو لے جائیں اس کی چھٹیاں ہوں گی سردیوں کی'' عائشہ نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے تم اپنی خالہ کی طرف رک جانا۔ وہاں سے فہد کے ساتھ یونیورسٹی چلی جایا کرنا۔'' ریما نے فوراً حل پیش کردیا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' وہ فوراً مان گئی مگر اماں نے ساتھ قطعیت سے انکار کردیا۔ ''نہیں عائشہ کو کسی کے گھر چھوڑ کر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سمسٹر ڈراپ کروادو۔'' ان کا لہجہ قطعی تھا۔

''کوئی ایسی بھی Emergency نہیں ہے کہ بچی کا سمسٹر ہی ڈراپ کروادیا جائے۔ میں اکیلے میں چلا جاتا ہوں۔'' ضامن نے دوسرا حل پیش کیا۔ ''تمہیں بعد میں ملوالاؤں گا تمہارے ماموں سے۔'' ضامن نے بیوی کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر کہا۔

''ہاں ویسے ہی جیسے پچھلے بائیس سالوں سے ملوا رہے ہیں۔'' وہ فوراً غصے میں آگئی تھی اور ریما کے تاثرات چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ سسرال تو ہے ہی عذاب حالانکہ اماں کبھی بھی روایتی ساس نہیں بنی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ... ریما کو اپنی بیٹی ہی سمجھا تھا مگر ریما اکثر و بیشتر روایتی بہو کا ہی کردار ادا کرتی تھی۔

''نہیں، نہیں تم لوگ پروگرام خراب مت کرو۔ میں رک جاتی ہوں عائشہ میرے ساتھ رہے گی۔'' انہوں نے فوراً ہی دوسرا حل پیش کیا۔

''یہ تو اور اچھی بات ہے اپنے گھر کا سکون و آرام ہی اور ہوتا ہے۔'' عائشہ نے فوراً کہا۔

''نہیں اماں! بہت مسئلہ ہوجائے گا کھانے پینے کا مسئلہ، گھر کی صفائی، کپڑے برتن کون کرے گا یہ سب۔'' ریما کے ماتھے کے بل ہی نہیں جارہے تھے۔

''ماسی کرتی ہے وہی کرے گی۔'' انہوں نے کہا۔

''مگر ماسی کے سر پر کھڑے ہو کر سب کروانا پڑتا ہے۔'' ریما نے نخوت سے کہا۔

''میں کرواؤں گی اور ریما بیٹا! معاف کرنا اگر مائشہ کو انڈا بھی نہیں ابالنا آتا تو یہ عائشہ کی نہیں تمہاری خامی ہے کہ ایک 20 سال کی بچی کو کھانا پکانا نہیں آتا۔ بہرحال کھانا بھی میں دیکھ لوں گی۔'' ان کا لہجہ اب دوٹوک ہوگیا تھا۔

''لیکن اس کے خالہ کے ہاں رکنے میں کیا خامی ہے، کیا میرے خاندان والے قابل اعتبار لوگ نہیں ہیں۔'' وہ اصل معنوں میں اب بھڑکی تھیں۔

''بات اعتبار کی نہیں ہے، اس کا سگا چچا بھی ہوتا تو میں اس کے پاس بھی عائشہ کو نہ چھوڑتی۔'' انہوں نے کہہ کر گویا بات ہی ختم کردی، وہاں سے تو وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئیں مگر اندر جا کر وہ پھٹ پڑیں.....

''دیکھ لیا اپنی ماں کو۔'' وہ باقاعدہ پھٹی تھیں۔

''دیکھ لیا انہیں بھی اور تمہیں بھی، اگر وہ اتنی قطعیت سے منع کررہی ہیں تو یقیناً اس کے پیچھے... کوئی ٹھوس وجہ ہوگی اور مجھے تو تمہارا مسئلہ نہیں سمجھ آرہا۔ وہ ہر معاملے میں تمہیں ریلیف دینے کی کوشش کررہی ہیں، خود نہیں جارہیں، کھانا پکانے کو تیار ہیں گھر کے کام کرنے کو تیار ہیں مگر تم ہو کہ اکڑے چلی جارہی ہو۔'' ضامن نے برہمی سے کہا تو ریما نے پینترا بدلا۔

''اسی وجہ سے تو کہ وہ کہاں اس عمر میں گھر کے بکھیڑوں میں پڑیں گی، ان کی اب آرام اور اللہ اللہ کرنے کی عمر ہے۔'' ریما نے بات گھمائی حالانکہ اس کی شدید خواہش تھی کہ فہد اور عائشہ قریب آئیں تاکہ وہ آپا کے گھر میں اپنی بیٹی کا رشتہ کرسکیں۔

''بڑی بات ہے کہ 22 سال بعد اچانک تمہیں ساس سے اس قدر محبت ہوگئی۔'' بیوی کی فطرت سے واقف ضامن نے کہا تو وہ بلبلا کر رہ گئیں۔

''ہاں میں تو ہوں ہی بری۔ کسی کے بارے میں اچھا سوچ ہی نہیں سکتی۔'' وہ چڑ گئیں۔

''تم خود سمجھو۔'' کہہ کر ضامن باہر نکل گئے اور وہ غصے میں کھولتی ہوئی چیزیں اٹھا پٹخ کرتے ہوئے بڑبڑانے لگیں۔

پھر یہ اٹھا پٹخ طویل ہوگئی اور ساتھ ہی بڑبڑاہٹ بھی..... یہ بات عائشہ نے بھی محسوس کی۔

''کیا بات ہے مما! آپ کا مزاج بہت برہم ہے آج کل۔'' اس نے سلاد بناتے ہوئے کھیرا منہ میں رکھا۔

''تمہاری دادی نے ہی زندگی عذاب کررکھی ہے۔'' انہوں نے غصے سے برتن پٹخے۔

''مما! کیا واقعی؟'' عائشہ کے لہجے میں طنز تھا۔

''دادی تو اتنی سویٹ ہیں آپ تو ایسے ٹریٹ کرتی ہیں جیسے پھپھو کو ورنہ میں نے اپنی دوستوں کے گھروں میں بھی دادیاں اور پھپھیاں دیکھی ہیں۔'' اس نے آرام سے سارا

WaqarAzeem www.pakistanipoint.com

تجزیہ بیان کیا۔

''ہاں میں تو ہوں ہی بری۔'' انہوں نے سالن میں دھنیا ایسے کاٹ کر ڈالا گویا ان کی چھری کے نیچے دھنیا نہ ہو کوئی سالم انسان ہو۔

''مما! آپ کو اعتراض کیا ہے میرے اور دادی کے گھر پر رہنے پر، اس طرح گھر کی بھی حفاظت ہو جائے گی۔ یاد ہے پچھلی بار انکل کاشان اور ان کے گھر والے سردیوں میں شمالی علاقہ جات گئے تھے تو کسی نے ان کے گھر کی گرل کاٹ کر ڈکیتی کر ڈالی تھی۔'' اس نے یاد دلایا۔

''اوہ! تو تم نے اپنی دادی کے کان بھرے ہیں۔'' انہوں نے نقطہ نکالا۔

''نہیں مما! میں نے دادی سے کچھ نہیں کہا، میں خالہ کے ہاں رہنے پر بادل نخواستہ راضی ہوئی تھی جبکہ میں وہاں رہنا نہیں چاہتی۔ مگر میں نے دادی سے کچھ نہیں کہا تھا دادی کا لہجہ جتنا قطعی ہے اس کے پیچھے کوئی ٹھوس وجہ موجود ہے۔'' اس نے بھی باپ والی بات کی۔

''اور تم کیوں اپنی خالہ کے ہاں رہنے پر راضی نہیں ہو؟'' انہوں نے پُرسوچ نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔

''شاید مما! آپ کو برا لگے مگر مجھے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ خالو اور فہد کی نظروں میں وہ پاکیزگی نہیں ہے جو اپنی بیوی کی بھانجی اور کزن کو دیکھتے ہوئے نظروں میں ہونی چاہیے۔''

عائشہ نے کہا اور ریما نے جھرجھری لی۔ فہد تو بھانجا تھا ہاں مگر رؤف بھائی کی نظروں سے ریما کو خود بھی کراہیت آتی تھی اور اب اسے پتا چلا تھا کہ ان دونوں کی نظروں سے عائشہ بھی خود کو غیر محفوظ تصور کرتی تھی۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' انہوں نے کہا۔

''مما! اب آپ وہ بات بتا دیں جس کی وجہ سے آپ ڈسٹرب ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں کوئی خاص وجہ نہیں ہے کہیں گھر اکیلے ہونے کی وجہ سے تمہاری دادی تمہاری پھپو کو نہ بلالیں اور میرے آنے تک کہیں گھر کی ایسی تیسی نہ ہو جائے۔'' انہوں نے تنفر سے کہا۔

''مما! آپ کو پتا ہے پھپو چھٹیوں تک میں رہنے نہیں آتیں اپنی ساس کی علالت کی وجہ سے اور اگر آ بھی جائیں تو ان کی ماں کا گھر ہے۔ آپ خوش نہیں ہوتی ہیں کیا نانی کے گھر جا کر اور ماما! اریش اور ماہم سے زیادہ تمیز دار بچے میں نے نہیں دیکھے۔ گھر الٹا ہونے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔'' اور آج انہیں احساس ہوا تھا کہ ان کے شوہر اور بچے گھریلو حالات سے اتنے بھی بے خبر نہیں ہیں جتنا وہ انہیں گردانتی تھیں۔

مگر اس سب کے باوجود بھی ان کی برہمی برقرار تھی۔

اور ایک دن اماں نے انہیں پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

''میری بیٹی مجھ سے ناراض ہے۔'' انہوں نے کہا تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''آج میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں کیوں نہیں چاہتی کہ عائشہ کسی اور کے گھر رکے بھلے مجھے اور عائشہ کو کتنا ہی کیوں سفر نہ کرنا پڑے۔'' اماں نے کہا تو انہوں نے چونک کر ساس کو دیکھا۔

☆☆☆

گڑیا بالکل گڑیا کی مانند دکھتی تھی اور اسی وجہ سے کسی کو بھی اس کا اصل نام یاد نہیں تھا سب اسے گڑیا ہی کہتے تھے۔ وہ گھر بھر ہی نہیں خاندان بھر کی لاڈلی تھی اس کا خاندان بہت پڑھا لکھا تھا اور اس نے بھی بچپن سے اپنا Aim سیٹ کر رکھا تھا۔ اسے سب بچوں کی طرح ڈاکٹر، انجینئر یا ٹیچر نہیں بننا تھا۔ وہ بچپن سے ہی اپنے پھوپا کو آئیڈیالائز کرتی تھی جو کہ سی ایس ایس آفیسر تھے اور پولیس ڈپارٹمنٹ میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے.... اسے بھی سی ایس ایس کرنا تھا... وہ کسٹم میں جانا چاہتی تھی۔ دوران کسٹم ملنے والی عجیب و غریب چیزیں اس نے پہلے سی این این پر دیکھی تھیں اور بعد میں ڈش انٹینا کے آنے کے بعد اسے اکثر ڈاکومینٹریز میں دیکھی تھیں ... یہ چیزیں اسے بہت متاثر کرتی تھیں کہ لوگ ہیرا پھیری کر کے کیسی کیسی چیزیں، جانور اور انسان تک اسمگل کرنے کی کوشش کرتے ہیں .... ان میں سے اکثریت پکڑی جاتی ہے۔

بہر حال ان دنوں وہ انٹر فرسٹ ایئر میں تھی جب اس کے ابو کو دوبئی میں جاب مل گئی ... وہ اپنے ساتھ اپنی فیملی کو بھی لے جانا چاہتے تھے مگر ابھی تو گڑیا کا انٹر کا مسئلہ تھا اور وہ اس کا سال ضائع نہیں کروانا چاہتے تھے باقی تینوں بہن بھائی ان سے چھوٹے تھے۔ ان کا سال ضائع ہونے کا مسئلہ نہیں تھا۔

ایسی صورت میں اب گڑیا کو کسی نہ کسی کے گھر چھوڑنے کا مسئلہ تھا قرعۂ فال خالہ اور پھپو کے گھر کا نکلا۔ گڑیا کو اپنے خالو بھی پسند نہیں تھے۔ سب پر غصہ کرتے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ہوئے سب کی صفیں درست کروا کر امامت کے شوق میں مبتلا خالو نے بقول گڑیا کے گھر کو لاک اپ بنا رکھا تھا جبکہ پھوپا تو اس کی پسندیدہ شخصیت تھے۔ دھیمے لہجے میں بات کرتے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے اس کی دلچسپیوں پر بات کرتے اور اس نے جھٹ پھپھو کا نام لے لیا۔

اور یوں وہ پھپھو کے گھر آ کر رہنے لگی۔ پھپھو کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا حارث تھے۔ دونوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی اور حارث ماسٹرز کے آخری سال میں تھے۔ یہاں اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ پھپھی کی لاڈلی بھتیجی تھی تو پھپا بھی اس کے کم لاڈ نہیں اٹھاتے تھے کبھی کبھی پھپھو کے اصرار پر خالہ کے گھر جاتی تو ایک دو دن میں ہی بھاگ آتی تھی۔ پھپھو کے گھر میں بڑا سکون تھا اور گھر بھی بہت بڑا اور پُرتعیش تھا جبکہ ان کے مقابلے میں خالہ کا گھر چھوٹا تھا اور لوگ زیادہ تھے ۔ پھپھو کے گھر میں لوگ بھی کم تھے سو گڑیا کا دل پھپھو کے گھر پر ہی لگتا تھا اور وہ بہت خوش تھی یہاں پر۔

انہی دنوں پھپھو کی بڑی بیٹی ارما آپی کے گھر بیٹے کی ولادت ہوئی ۔ ارما آپی کی شادی اندرون سندھ بہت بڑے جاگیرداروں میں ہوئی تھی۔ وہ بہت رکھ رکھاؤ والے لوگ تھے۔ وہاں جانا بھی ضروری تھا اور پھپھو اس کے اکیلے سن کی وجہ سے جانے سے بھی خائف تھیں کیونکہ وہ اکیلی تو جا نہیں سکتی تھیں تو حارث کو ان کے ساتھ جانا تھا اور پھپا اپنی جاب کی وجہ سے پورا دن گھر پر اور اکثر اوقات رات میں بھی نہیں ہوتے تھے .... تب پھپھو نے اس سے بات کی تھی۔

''گڑیا! اگر برا نہ مانو تو تین دن اپنی خالہ کے گھر چلی جاؤ مجھے ارما کے بچے کو دیکھنے جانا ہے۔'' ان کے لہجے میں نانیوں والا اشتیاق موجود تھا..... اسے اچھا محسوس نہیں ہوا کہ وہ انہیں جانے سے روک دے مگر اس کا مسئلہ بھی بہت اہم تھا۔

''پھپھو! آپ جائیں میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں گھر پر ہی رہ لوں گی۔ وہ پھپھو! اصل میں بات یہ ہے کہ میری ایگزام کی ڈیٹ شیٹ آ گئی ہے۔ غالباً میں آپ کو بتانا بھول گئی اگلے ہفتے سے میرے ایگزام ہیں اور خالہ کے گھر میں پڑھائی بالکل نہیں ہو پاتی ہے، ہر وقت کچر کچر ہوتی رہتی ہے۔'' اس نے اپنا مسئلہ بتایا اور پھپھو نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

''مگر تم اکیلی کیسے رہو گی؟'' انہوں نے نیم رضامندی سے کہا۔

''اکیلی کہاں ہوں گی ملازمین تو ہوں گے ناں!'' اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں وہ تو ہوں گے۔'' انہوں نے پُرسوچ لہجے میں کہا ''چلو پھر ٹھیک ہے۔'' اور یوں پھپھو تین دن کے لیے روانہ ہو گئیں۔

وہ پورا دن گھر میں بولائی بولائی پھرتی رہی پتا نہیں کیا بات تھی تمام ملازمین صبح ہی سارے کام کر کے جا چکے تھے۔ اس نے سوچا کہ واقعی ان ملازمین کے سروں پر ڈنڈا ہی درست رہتا ہے ورنہ یہ سب اپنی من مانی کرنے لگ جاتے ہیں۔ اکیلے گھر میں اس سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا، دوپہر کا اس نے زہر مار کیا اور رات کا گول کر دیا۔

اب اسے پھپا کا انتظار تھا، ان سے ملازمین کی شکایت بھی کرنی تھی۔ اور ان کو کھانا بھی گرم کر کے دینا تھا۔ پھپا اس دن رات دس بجے آئے تھے ۔ اس نے ان سے کھانے کا پوچھا۔

''تم نے کھا لیا؟'' انہوں نے اس سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے کھانا گرم کر کے میرے کمرے میں لے آؤ کھانا بھی کھا لیں گے اور تھوڑی بہت گپ شپ بھی کر لیں گے۔'' انہوں نے کہا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے پھپا آپ کے لیے لے آتی ہوں اور پھر آپ کو آپ کے ملازمین کی حرام خوریاں بتاتی ہوں۔'' وہ لگن سے انداز سے بات کرتی ہوئی کھانا گرم کرنے لگی۔ کھانا گرم کر کے وہ پھپھو کے کمرے میں چلی آئی اور کھانا بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا تبھی اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ چونک کر مڑی تو .... اس نے اس وقت اپنے آئیڈیل پھپا کو ایک بالکل نئے روپ میں دیکھا تھا۔

''وہ کیا ہے کہ تمہیں بھوک نہیں لگ رہی ہے اور تمہارے ہوشربا روپ نے میری بھی بھوک اڑا دی ہے۔'' وہ بڑی حریصانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''پھپا!'' وہ صدمے سے گنگ ہو گئی۔

''کیا پھپا! اور ہاں میرے ملازمین حرام خور و بدحرام نہیں میرے وفادار ہیں۔'' وہ خباثت سے ہنسے تھے گویا، ملازمین بھی ان کی ہی ایما پر غائب تھے..... اب وہ اس کی طرف بڑھے تھے۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

”نہیں پھپا! میرے پاس مت آئیے گا...... ورنہ میں پھپھو کو خالہ خالو کو امی ابو کو سب کو بتادوں گی۔“ وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

”چلو اچھا ہوا تم نے اپنے عزائم سے آگاہ کردیا۔ اب تم زندہ بچوگی تو کسی کو بتاؤ گی۔ ابھی یہ تین راتیں ہیں میرے پاس، تیسری رات تم اس دنیا میں نہیں رہوگی اور میری پوسٹ جانتی ہو ناں! لاش غائب کروانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور میں سب میں مشہور کردوں گا کہ تم بھاگ گئیں اپنے کسی آشنا کے ساتھ، اسی لیے اپنی خالہ کے گھر جانے پر راضی نہیں تھیں۔“ اس نے شدت غم سے آنکھیں بھینچ لیں۔ ہم خود ہی تو دوسروں کو مواقع فراہم کرتے ہیں کیا ضرورت ہوتی ہے کسی کے نفس کا امتحان لینے کی.... ہر شخص شریف ہوتا ہے موقع نہ ملنے تک۔ موقع ملنے پر پتا چلتا ہے کہ کون شریف ہے اور کون کمین۔

☆☆☆

اس نے صدق دل سے اپنے رب کو پکارا لیکن اس وقت تو پھپا پر شیطان سوار تھا۔ اس کے چہرے پر کئی جانے پڑے وہ بچنے کی کوشش کررہی تھی مگر جسم کے آدھے کپڑے پھٹ چکے تھے پھر بھی وہ اللہ کو پکار رہی تھی۔ شاید اس کی پکار کا نتیجہ تھا کہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف کوئی ان سے بھی بڑا افسر تھا کیونکہ ان کا لہجہ مؤدبانہ تھا شاید کوئی بہت بڑی بات تھی کہ وہ ”یس سر ابھی آیا“ کہتے ہوئے اپنی وردی پہننے لگے ساتھ ہی ساتھ بول رہے تھے ”یہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔ میرے نوکر تمہیں باہر نکلنے نہیں دیں گے۔“ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئے اور وہ بند کمرے میں اِدھر سے اُدھر چکراتی ہوئی صدق دل سے دعا کررہی تھی۔ اپنے رب سے اس غلطی کی معافی مانگ رہی تھی جو اس نے اکیلے گھر میں پھپا کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرکے کی تھی اپنے آرام اور آسائش کے لیے اس نے سوئے ہوئے شیطان کو جگادیا تھا۔

پھپا دروازہ باہر سے لاک کرکے گئے تھے کہ تھوڑی ہی دیر میں باہر زندگی جاگ اٹھی، ملازمین کام پر آچکے تھے وہ دروازہ بجا بجا کر مدد کی درخواست کررہی تھی مگر وہاں انسان نہیں پیسے سے چلنے والے روبوٹس تھے ان میں جو فیڈ کیا گیا تھا وہ اس سے آگے پیچھے چلنے کو تیار نہیں اور یقیناً اس کے غائب ہونے کی جو کہانی پھپا ان کو دیتے وہ من وعن آگے بڑھا دیتے۔ وہ رب کی رحمت سے مایوس نہیں تھی مگر بھوک و پیاس اور خود پر مستقل ہونے والے ظلم سے تھک کر

ارسطو

(ارسطو 384-322 قبل مسیح) تھریس کے ایک شہر استاجرہ میں پیدا ہوا اور کلکس میں فوت ہوا۔ اس کا باپ نکومیکس، اسکندر اعظم کے دادا امنطاس کا جو مقدونیا کی ریاست کا ایک طاقت ور حکمران تھا، دوست اور درباری طبیب تھا۔ ارسطو کی پرورش جب ادویات اور امراض کے تذکروں میں ہوئی تو اس کا رجحان طبع کا علوم طبیعی کی طرف ہوجانا ایک فطری عمل تھا۔ 367ق م میں اثنیا میں اس کی تعلیم شروع ہوئی۔ اس کے عہد شباب کی کئی ایک کہانیاں مشہور ہیں۔ ایک کہانی کے مطابق اس نے اپنی تمام آبائی جائداد جوانی کی سرمستیوں میں برباد کرڈالی اور جب قلاش ہوکر بھوکوں مرنے لگا تو فوج میں بھرتی ہوگیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ملازمت چھوڑ کر اپنے آبائی شہر استاجرہ میں لوٹ آیا اور طبابت کرنے لگا۔ تیس برس کی عمر میں اسے علم وحکمت سیکھنے کا شوق ہوا اور وہ افلاطون کے حلقہ تلمذ میں شریک ہونے کے لیے ایتھنز چلا گیا۔ اس سے زیادہ مستند روایت کی رو سے اس نے اٹھارہ برس کی عمر میں افلاطون کی شاگردی اختیار کی تھی۔ اس کے شباب کی سرمستیوں کا اس روایت میں بھی ذکر ملتا ہے، اس نے افلاطون سے ایک روایت کے مطابق آٹھ اور دوسری روایت کی رو سے بیس برس تعلیم حاصل کی۔

مرسلہ: زویا خان، شیخوپورہ

وہیں دروازے کے پاس آکر بیٹھ گئی اس نے اس عرصے میں خودکشی کا سوچا بھی نہیں۔ وہ پھپا کے جھوٹ کو زندگی نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ اپنی سچائی سب کو بتانا چاہتی تھی۔

تبھی ایک معجزہ سا ہوا۔ باہر اسے خالہ کی آواز سنائی دی وہ رشیدہ سے اسی کے بارے میں سوال کررہی تھیں اور وہ ان سے جھوٹ بول رہی تھی۔

”بی بی جی! وہ تو بڑی بی بی کے ساتھ ارمابی بی کے سسرال گئی ہیں۔“

”اچھا، مجھ سے تو بات ہوئی تھی اس کی کہ وہ نہیں جارہی، اس کے Papers ہو رہے ہیں۔“ خالہ کی آواز آئی۔

”ہمیں کیا پتا بی بی جی! ہم تو ملازم ہیں۔“ رشیدہ کی آواز آئی اور اس میں فوراً زندگی دوڑی تھی اسے خالہ کے جانے سے پہلے ہی کرنا تھا جو بھی کرنا تھا ورنہ تو سب خسارہ تھا

اوراس نے اٹھ کر پوری شدت سے دروازہ بجا کر کہا تھا۔

''خالہ! میں یہاں ہوں۔''

''محسن صاحب! میں نے کہا تھا نا میری بچی کسی بڑی مصیبت میں ہے اسے باہر نکالیں۔'' خالہ نے ہذیانی آواز میں کہا۔

''چابی لا کر دو کہاں ہے اس کمرے کی۔'' خالو نے ذرا سختی سے کہا۔

''وہ تو جی بڑے صاحب ساتھ لے کر گئے ہیں۔'' رشیدہ نے سر جھکا کر کہا۔

''کوئی ہتھوڑا لے کر آؤ جلدی سے اور ہاں کہیں ادھر ادھر اطلاع دینے کی کوشش کی تو اس بچی کو حبس بے جا میں رکھنے اور ڈکیتی کے الزام میں اندر کروادوں گا۔'' خالو نے ساتھ ہی دھمکی بھی دی ساتھ ہی خالہ سے کہا۔ ''یہ میرے دوست ڈی آئی جی کا فون نمبر ہے یہ ملا کر مجھ سے بات کرواؤ۔''

ان دنوں تو صرف لینڈ لائنز ہوتی تھیں۔ خالہ جلدی سے نمبر ملانے لگیں۔ رشیدہ اور دہشت میں آگئی اور تیزی سے ہتھوڑا لا کر ان کو دیا حالانکہ اس کے نکلتے ہی انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے تھے۔

''تم گڑیا کی پھپو کو فون کر کے فوراً بلاؤ۔'' انہوں نے کہا تھا اور ہتھوڑا آنے پر لاک توڑ دیا۔ دروازہ کھولنے پر جسم سے روح تک زخمی گڑیا ان کے سامنے تھی۔ خالہ کو دیکھ کر وہ بکھر گئی اور اس پر جو بیتی تھی سب بتاتی چلی گئی۔ سب سن کر خالہ ہی نہیں خالو بھی سکتے میں آگئے تھے۔

''لاحول ولاقوۃ! اگر اس جگہ حارث ہوتا تو مجھے شاید اتنی تکلیف نہ ہوتی مگر اس شیطان نے بیٹیوں کو نہیں چھوڑا۔'' وہ تاسف سے ہاتھ مل رہے، اور اس دن اس نے جانا کہ ضروری نہیں جو زبان کے کڑوے ہوں وہ دل کے بھی برے ہوں اور جو زبان کے میٹھے ہوں وہ دل کے بھی اچھے ہوں۔

''میری بچی تم ہمارے گھر کیوں نہ آگئیں۔ وہاں تمہارے بہن بھائی موجود تھے۔ ان کے ساتھ رہ لیتیں۔ دو تین دن کی ہی تو بات تھی۔'' وہ بولے تو وہ شرمندگی سے سر جھکا گئی۔

تین گھنٹے میں بھاگم بھاگ پھپو کی بھی واپسی ہوگئی اور یہاں جو قیامت بیتی تھی اس کو سن کر وہ تو سکتے میں آگئیں، حارث سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ ابھی تک خالو نے کسی ملازم کو گھر نہیں جانے دیا تھا اور سب ملازمین سے سچ جان کر ان کو جانے کی اجازت ملی۔ جب پھپا خوش و مگن سے اندر داخل ہوئے تو... وہاں گڑیا اور حارث کا نکاح ہو رہا تھا کیونکہ حارث نے شاک سے باہر آتے ہی اس سے نکاح کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔'' وہ چیخے تھے۔

''آپ کے گناہ کو دھونے کی کوشش ہو رہی ہے۔'' حارث کا لہجہ سرد تھا کیونکہ ان دنوں رابطے اتنے آسان نہیں تھے کہ فوری طور پر گڑیا کے امی ابو کو مطلع کیا جاتا سو خالہ و خالو نے اس کا سرپرست اور ولی بن کر ہاں کر دی تھی۔

''میں تمہیں عاق کر دوں گا۔'' وہ غصے سے بولے۔

''آپ سے جو کرتے بنے کریں میرا فیصلہ نہیں بدلے گا اور آپ کو کیا لگتا ہے میں آپ کے کارناموں سے بے خبر ہوں، یہ آپ کی بھول ہے اپنے سارے دوستوں میں ذلیل و خوار ہوں میں آپ کی وجہ سے مگر اس بار نقب آپ اپنے ہی گھر میں لگائیں گے یہ معلوم نہیں تھا مجھے۔ باقی کسی کے لیے تو میں کچھ نہیں کر سکا مگر جسے میں بچا سکتا ہوں اسے ضرور بچاؤں گا۔ وہ بہت بے لچک لہجے میں بول رہا تھا۔

پھپا بکتے جھکتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ خالہ اور خالو نے درمیان میں بولنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ جو طمانچہ بلکہ جوتا ان کے بیٹے نے ان کے منہ پر مارا تھا وہ ساری زندگی ان کو بلبلائے رکھنے کے لیے کافی تھا کہ جس لڑکی کو انہوں نے برباد کرنا چاہا تھا اور جان سے مارنا چاہا تھا اسے ان کے بیٹے نے اپنی عزت بنا لیا تھا... اس کی جان بچالی تھی کیونکہ اس نے مدد ہی اپنے یکتا رب سے مانگی تھی۔

نکاح کے بعد حارث نے ساڑھے تین مہینے کا وقت مانگا تھا اپنے لاسٹ سمسٹر اور کوئی ڈھنگ کی جاب کے لیے..... یوں گڑیا اپنے خالہ خالو کے ساتھ چلی آئی۔ خالہ خالو نے اس کے ساتھ گزرنے والے حادثے کو سب کے سامنے ایکسیڈنٹ کہا کیونکہ گڑیا اچھی زخمی تھی۔ گھر لا کر انہوں نے دوبئی فون کر دیا۔ امی ابو اگلی ہی فلائٹ سے پاکستان آگئے اور اس سے اصرار کرنے لگے کہ وہ حارث سے طلاق لے لے مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔

''امی ابو! میں آپ کی ذمے داری تھی مگر آپ مجھے بیکار سامان کی مانند یہاں چھوڑ کر اپنی زندگی بنانے نکل گئے اور پھر جب بیکار سامان کی مانند ہی میرے ساتھ برتاؤ ہوا تو ایسے وقت میں جس شخص نے مجھے تحفظ کی، عزت کی چادر پہنائی میں اسے چھوڑ دوں اور آپ کے ساتھ چل پڑوں قطعی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

Waqar Azeem
www.Paksociety.com

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

نہیں۔ میں حارث کو کبھی نہیں چھوڑوں گی سنا آپ دونوں نے۔ جس وقت مجھے ہر طرف تاریکی نظر آرہی تھی اس وقت وہ مجھے پکڑ کر روشنی میں لائے تھے۔ وہ میرے مسیحا ہیں میرے سچے ہمدرد۔'' وہ دو دن میں بہت بڑی ہو چکی تھی بچپن کہیں پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

''ہمارا مطلب یہ ہے کہ وہاں وہ شیطان بھی تو رہتا ہے اور ایسے گھر میں.....'' امی جھجکی تھیں۔

''یہی اس شیطان کی سزا ہے۔'' اس کا لہجہ دوٹوک اور بے لچک تھا۔ امی ابو پھپھو کے گھر بھی گئے تھے اسے ساتھ دوبئی لے جانا چاہا تھا مگر اس نے منع کر دیا۔ اس نے Papers بھی نہیں دیئے تھے پڑھائی کیا دنیا کی ہر چیز سے اس کا دل نکل چکا تھا۔

خالہ نے اسے بتایا تھا جس دن وہ پھپھو کے گھر آئی تھیں اس دن انہیں عجیب سی گھبراہٹ اور بے چینی ہو رہی تھی اس سے ملنے کی اور خالو ان کی حالت دیکھ کر انہیں پھپھو کے گھر لے کر گئے تھے۔ اسے اپنے اللہ پر پیار آ گیا۔

☆☆☆

''تمہیں، پتا ہے ریما! وہ گڑیا کون تھی۔'' انہوں نے نم آنکھوں سے ریما کو دیکھا۔

''آپ اماں!'' ریما نے روتے ہوئے انہیں دیکھا ان کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔ اور اماں نے سر ہلایا۔

''پھپھو نے ہر ممکن کوشش کر لی کہ ہماری رخصتی نہ ہو مگر حارث بھی انہی کے بیٹے تھے وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی نہ ہلے اور جس دن ہماری رخصتی ہوئی اس کے اگلے دن انہوں نے خودکشی کر لی۔ وہ شخص جو مجھے قتل کی دھمکیاں دیتا تھا اس نے حرام موت کو خود گلے لگایا۔ شادی والی رات میں نے حارث کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں اس معاملے میں بے قصور تھی تو انہوں نے میرے ہاتھ تھام کر کہا۔ ''مجھے کسی جسٹی فیکشن کی ضرورت نہیں ہے! جو لڑکی اپنے اتنے ہینڈسم کزن جس پر یونی کی لڑکیاں پٹ پٹ گرتی ہوں اس پر ایک نگاہ غلط نہ ڈالتی ہو وہ اپنی باپ سے بھی بڑی عمر کے مرد کے لیے کیسے غلط سوچ سکتی ہے۔''

حارث نے مجھے بڑا مان اور محبت دی بلکہ وہ اپنے باپ کے عمل پر ساری زندگی مجھ سے شرمندہ رہے۔ مگر مجھے تکلیف وہاں سے دی گئی جہاں میری سوچ بھی نہیں جاتی تھی۔ پھپھو نے پھپا کی خودکشی کا ذمے دار بھی مجھے ٹھہرایا اور باقاعدہ مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔ وہ میرا اپنے گھر میں آنا ہی منحوس سمجھنے لگیں کہ نہ میں ان کے گھر آتی نہ ان کا گھر اجڑتا۔ وہ واشگاف میں مجھے بدکردار کہتی تھیں کہ میں جان بوجھ کر اپنی خالہ کے گھر نہیں گئی تھی اور میں نے خود یہ راستہ پھپا کو دکھایا تھا... مگر میں انہیں کوئی جواب نہیں دیتی تھی ہاں روتی ضرور تھی... اور تب حارث اپنی محبت کا پھایا ضرور میرے دل پر رکھتے تھے اور اکثر کہتے۔ ''میری ماں کو بددعا مت دینا وہ ابو کے غم میں اپنے حواس کھو بیٹھی ہیں۔''

اور میں ان سے کہتی۔ ''نہیں حارث! وہ میری پھپھو ہیں میں انہیں بددعا کیسے دے سکتی ہوں....'' پھپھی کے ساتھ ساتھ مجھے ارما آپی اور روما آپی کی نفرتیں بھی سہنی پڑیں۔ وہ دونوں باپ کی لاڈلی تھیں اور یقین ہی نہیں کرتی تھیں کہ ان کا باپ ایسا ہو سکتا ہے وہ اس سارے معاملے کو میری اور خالہ کی سازش قرار دیتی تھیں تاکہ میں ان کے بڑے اور عالیشان گھر میں کھپ سکوں۔ بہرحال میں نے بھی پھپھو اور اپنی دونوں نندوں کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور پھپھو نے بھی زندگی کے آخری لمحے تک بڑی وفاداری کے ساتھ مجھ سے نفرت نبھائی تھی۔

مگر روما اور ارما آپی ماں کے مرتے ہی سنبھل گئیں گو کہ انہوں نے بھی مجھ سے نفرت کرنا تو نہ چھوڑا مگر اب وہ نفرت انگیز رویے بدل دیے کہ وہ اپنا میکا نہیں کھونا چاہتی تھیں۔

ریما حارث نے بہت چاہا کہ میں آگے پڑھ لوں مگر میری زندگی منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اس کے بعد جوان نہیں ہوئی بوڑھی ہو گئی میں نے ڈائریکٹ 18 سے 88 سال میں قدم رکھ دیا۔ اس کا خوف بھی میرے دل سے نہیں نکلا۔ وہ دو راتیں جن میں مجھے اپنی موت سے خوف محسوس نہیں ہوتا تھا اس چیز کی اذیت ہوتی تھی کہ مجھے مار کر میرا کردار مسخ کیا جائے گا میرے ماں باپ کا کیا ہوگا اور تب مجھے پتا چلا کہ وہ جو شہ رگ سے زیادہ قریب ہے اسے دل سے پکارو تو وہ جواب ضرور دیتا ہے۔

''مجھ پر میری اپنی ہی پھوپی اور کزنز نے ساس اور نندیں بن کر ظلم ڈھائے سو میری کوشش رہی کہ بیٹی تو پرائی ہے جو میرے گھر آئے وہ میرے لیے بیٹی جیسی ہی ہو اس لیے ہمیشہ تمہیں بیٹی سمجھا۔'' وہ رو رہی تھیں اور ساتھ ہی ریما خود بھی کہ واقعی اماں نے کبھی انہیں بیٹی سے کم درجہ نہیں دیا تھا مگر انہوں نے کبھی انہیں ماں نہیں سمجھا تھا۔ مگر وہ آج سے اس عظیم عورت کو ماں کا ہی درجہ دیں گی وہ خود سے عہد کر رہی تھیں۔

++

بڑے گھر کی بیٹی

مکرمی مدیر
السلام علیکم!
یہ سچ بیانی میرے دوست انعام الدین کے چچا کی ہے۔ ایک زردار نے کیسے انہیں ان کی لالچ کا سبق سیکھایا لیکن آخری سطور دل کو موہ لینے والے ہیں

محمد جمشید
(فیصل آباد)

جواد گھر ہی پر تھا جب سلمیٰ نے بتایا کہ ڈیزائنر کو فون کر دیا ہے۔

''کون ڈیزائنر؟'' جواد نے حیرت سے پوچھا۔

''انٹیریر ڈیزائنر۔'' سلمیٰ نے بتایا۔ ''میں نے فون کر کے بلوایا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''یہ لو بھول بھی گئے۔ ارے ہمارے فرخ کی شادی ہو رہی ہے۔ لڑکی والے امیر ہیں۔ بہت سا جہیز دیں گے۔

طرح طرح کے فرنیچر ہوں گے۔ تو اس کی سجاوٹ بھی سلیقے کی ہونی چاہیے نا۔ یہ نہیں کہ سارا سامان کباڑ خانے میں لاکر ڈال دیا۔''

''تمہیں کیسے معلوم کہ بہت سا جہیز ملے گا؟''

''یہ لیں اس میں معلوم ہونے والی کون سی بات ہے۔ کل میں نے خود دیکھا تھا۔''

''کیا دیکھ لیا تھا جو اتنی Excited ہو رہی ہو؟''

''میں کل اپنی سہیلی کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی۔ وہاں میں نے لڑکی کی ماں کو دیکھا جو بہت قیمتی قیمتی جوڑے خرید رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اپنی بیٹی ہی کے لیے خرید رہی ہوں گی، اور جب اتنے قیمتی جوڑے دے سکتی ہیں تو فرنیچر کتنا اعلیٰ ہوگا۔''

جواد کو بھی یہ بات معلوم تھی کہ لڑکی والے واقعی پیسے والے ہیں۔ نہ جانے کس طرح ان کے بھولو بیٹے فرخ نے اس لڑکی کو اپنے دام میں پھانس لیا تھا۔ بہرحال فرخ کی قسمت اچھی تھی۔ جواد جانتا تھا کہ لڑکی کے باپ کی ایک چھوٹی سی فیکٹری بھی ہے۔ اس فیکٹری میں فرخ کی کھپت ہوسکتی تھی۔ یعنی اس کا مستقبل بھی محفوظ ہونے والا تھا۔ سودا گھاٹے کا نہیں تھا۔

جب فرخ نے جواد کو بتایا تھا کہ وہ ایک لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے تو جواد نے حیرت سے پوچھا تھا۔ ''ابے وہ کون ہے جو تجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔''

''ابو وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت پیسے والی ہے۔ اس کے باپ کی ایک فیکٹری ہے۔''

''کمال ہے، اور ایسی لڑکی تجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔''

''ہاں ابو۔ میں نے تو اس کے لیے کئی گانے بھی یاد کر لیے ہیں۔ روز ایک نیا گانا سنایا کروں گا۔''

جواد نے اپنا سر تھام لیا تھا۔

''خدا کے بندے، کیا تم نے اس لڑکی کو اپنا گانا سنایا تھا؟''

''نہیں ابو۔ ابھی تک تو نہیں سنایا۔ آپ ہی بتا دیں۔ کون سا گانا سناؤں؟ ویسے تو سات آٹھ گانے پکے یاد ہیں۔''

''کوئی گانا مت سنانا۔ ورنہ رشتہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔'' جواد نے کہا۔ ''اتنی مشکلوں سے تو تیرے مستقبل کے بہتر ہونے کا امکان ہو چلا ہے۔ اب اس موقعے کو ہاتھ سے مت جانے دینا۔''

''جیسا کہیں گے ابو۔ ویسا ہی ہوگا۔''

ایک دن فرخ نے بتایا۔ ''ابو فرزانہ کے ابو نے آپ لوگوں کو رات کے کھانے پر بلایا ہے۔''

اس خبر کو سن کر جواد نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اس نے سلمیٰ سے مشاورت کی۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔''

''آخر آپ کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہیں؟'' سلمیٰ نے کہا۔

''میں اس لیے پریشان ہوں کہ فرخ جیسے بے تکے لڑکے سے کون شادی کرے گی۔ اور کس لیے کر رہی ہے؟''

''دیکھیں اوپر والے کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔'' سلمیٰ نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ قدرت کی طرف سے اس کی قسمت بدلنے کا سامان ہو رہا ہو۔''

''وہ تو ہے۔'' جواد نے گردن ہلائی۔ ''پھر بھی بات ہضم نہیں ہو رہی۔''

''آپ یہ سب چھوڑیں۔ دعوت کی تیاری کریں۔ جا کر مٹھائی لے آئیں۔ پہلی بار لڑکی کو دیکھنے جا رہے ہیں۔ خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا... اور ہاں لڑکی کو ہزار روپے بھی دے دیجیے گا۔''

''وہ کیوں؟''

''کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ پہلی بار اپنی ہونے والی بہو کو دیکھیں گے... تو کیا اس کے ہاتھ میں ہزار کا نوٹ بھی نہیں رکھیں گے۔''

''چلو۔ اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔'' جواد نے کہا۔

''ذرا، اپنے کپڑے نکال لیجیے گا۔'' سلمیٰ نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ ڈھنگ کے ہوں۔''

''اس کی تو فکر ہی مت کرو۔ میں نے شادی پر جو شیروانی پہنی تھی۔ وہ آج تک رکھی ہوئی ہے۔''

''کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ برسوں پرانی شیروانی پہن کر جائیں گے؟''

''کوئی دوسرا کرتا شلوار کا سوٹ نکال لیں۔''

''ہاں وہ تو ہو جائے گا۔ تم بھی اپنا خیال رکھنا۔ پتا چلے کہ لڑکے کی ماں آئی ہے... اور ہاں... اپنے لاڈلے کو سمجھا دینا کہ وہاں جا کر کوئی بے وقوفی نہ کرے۔''

''میرا بیٹا بے وقوف نہیں ہے۔'' سلمیٰ نے فخر سے

www.pakistanipoint.com

کہا۔ ''اگر بے وقوف ہوتا تو فرزانہ جیسی لڑکی اس کے ہاتھ کہاں سے لگتی۔''

''یہ بات تو ہے۔'' جواد نے گردن ہلائی۔

شام کے وقت وہ تینوں گھر سے چل دیے۔ راستے سے جواد نے تین کلو مٹھائی لے لی تھی۔ ایڈریس فرخ کو معلوم تھا۔ انہوں نے اوبر کی گاڑی منگوالی تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی فرخ نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے پر رکھ لیا تھا۔

''یہ کیا کر رہا ہے بے وقوف؟'' جواد نے پوچھا۔

''ابو دلہا اسی طرح جاتا ہے نا؟''

''اوہو۔ تیری برات نہیں جا رہی ہے، اور نہ ہی آج کل کوئی رومال منہ پر رکھتا ہے۔ ہٹا رومال۔''

فرخ نے رومال ہٹا لیا۔ لڑکی کا گھر بہت شاندار تھا۔ جواد کا تو دل ہی خوش ہو گیا تھا۔ ''ابے یہی مکان ہے نا؟'' جواد نے پوچھا۔ ''کہیں اور تو نہیں لے آیا؟''

''نہیں ابو۔ یہی مکان ہے۔ میں کئی بار آ چکا ہوں۔''

انہوں نے گاڑی گیٹ کے باہر ہی رکوا دی تھی۔ گیٹ پر چوکیدار بھی تھا۔ جس نے فرخ کو پہچان کر گیٹ کھول دیا تھا۔ ''دیکھ لیا ابو۔ سب جانتے ہیں مجھے۔''

''کیوں نہیں جانیں گے بیٹا۔'' سلمیٰ پیار سے بولی۔ ''تو اس گھر کا داماد بننے والا ہے۔ یہ اب تیرا ہی گھر ہونے والا ہے۔''

جواد نے گیٹ کے اندر تین تین قیمتی گاڑیاں کھڑی دیکھیں تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ ''ابے یہ ساری گاڑیاں تیرے ہونے والے سسر ہی کی ہیں نا۔'' اس نے پوچھا۔

''جی ابو۔'' فرخ نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ ''ایک بار میرے سامنے ساڑھے سات سو کی نہاری منگوائی تھی۔''

جواد نے ایک بار پھر سر پیٹ لینے کا سوچا لیکن اس دوران گھر کا ایک ملازم استقبال کے لیے باہر آ چکا تھا۔ اس نے بڑے ادب سے فرخ کو سلام کیا تھا۔ وہ ان سبھوں کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

جواد اور سلمیٰ سب کچھ دیکھ دیکھ کر حیران ہوئے جا رہے تھے۔ ''واہ۔ کیا سجاوٹ ہے۔'' سلمیٰ نے کہا۔ ''لگتا ہے لاکھوں روپے اسی میں لگ گئے ہوں گے۔''

''ظاہر ہے۔'' جواد نے ہنکاری لی۔ ''یہی تو پیسے کا کمال ہے۔''

''اماں۔'' فرخ بھی بول پڑا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ اتنے پیسے والے لوگ ہیں۔''

''لیکن بیٹا۔ ایک بات تو سن۔ اتنے پیسے والے گھر کی لڑکی ہم جیسوں کو خاطر میں کہاں لائے گی؟''

''لائے گی اماں۔ میں نے اس کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔''

''خدا اس کو خوش رکھے... ورنہ آج کل کی لڑکیاں ایسی کہاں ہوتی ہیں۔''

کچھ دیر بعد ایک بارعب سا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ جواد بوکھلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ سلمیٰ بھی کھڑی ہو گئی تھی۔

فرخ نے اس آدمی کا تعارف کروایا۔ ''ابو یہ ہیں شاہد صاحب، فرزانہ کے ڈیڈی۔'' پھر اس نے شاہد کو مخاطب کیا ''انکل یہ میرے ابو ہیں۔ مسٹر جواد اینڈ کمپنی۔'' شاہد ہولے سے مسکرا دیا۔

"Nice to meet you" شاہد نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے جواد کی طرف بڑھا دیا۔

جواد اس وقت بری طرح سٹ پٹایا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس انگریزی کا کیا جواب دے۔ اس نے شاہد کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''ویل کم۔ ویل کم۔''

''تشریف رکھیں آپ لوگ۔'' شاہد نے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

سب بیٹھ گئے۔ ''میں یہ چاہتا ہوں کہ فرزانہ کی شادی اسی مہینے میں ہو جائے، کیوں کہ میں اپنی مسز کے ساتھ یورپ جا رہا ہوں۔'' شاہد نے کہا۔

''اتنی جلدی؟'' جواد حیرت سے بولا۔

''ہاں۔ اس میں کیا پرابلم ہے۔ فرزانہ کا سب کچھ تیار ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ لوگ بھی تیار ہوں گے۔''

''جی ہاں بھائی صاحب۔ بالکل تیار ہیں۔'' اس بار سلمیٰ بول پڑی۔ ''بس ان کے پیسے نکل آئیں تو انتظام کرنے میں دیر کیا لگتی ہے۔''

جواد کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ سلمیٰ نے کس پیسے کی کہانی چھیڑ دی تھی۔

''چلیں جو بھی ہو لیکن دیر نہیں ہونی چاہیے۔'' شاہد نے کہا۔

''بھائی صاحب۔ بیٹی کہاں ہے۔'' سلمیٰ نے پوچھا۔

Nagar Azeem www.pakistanipoint.com

''وہ اندر ہے۔ ابھی آ رہی ہے۔''

''بھائی صاحب۔ میرا بیٹا بہت سیدھا سادا ہے۔''
جواد نے کہا۔ ''بہت سعادت مند بھی ہے۔''

''جی ہاں۔ وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔''

اس دوران ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اچھی خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔

جواد اور سلمیٰ دونوں ہی اسے دیکھ کر خوش ہو گئے تھے۔ جواد دل میں سوچ رہا تھا کہ اس کے بھوندو بیٹے نے کیا ہاتھ مارا ہے۔

''آؤ بیٹا۔'' سلمیٰ نے فرزانہ سے کہا۔ ''میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔''

فرزانہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھی۔ سلمیٰ نے جواد کو اشارہ کیا۔ جواد نے اپنی جیب سے ہزار کا نوٹ نکال کر سلمیٰ کی طرف بڑھا دیا۔

سلمیٰ نے نوٹ فرزانہ کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ لو بیٹا۔ آج پہلی بار تمہیں دیکھ رہے ہیں۔''

''ارے اس کی کیا ضرورت ہے؟'' فرزانہ نے کہا۔

''بیٹا یہ رسم ہے۔'' سلمیٰ ہنس کر بولی۔ ''انکار نہیں کرتے۔''

فرزانہ نے نوٹ لے کر ادب سے سلام کیا تھا۔ سلمیٰ نے کئی بلائیں لے لیں۔

شاہد نے جواد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ دو تین دنوں میں تاریخ Decide کر کے مجھے بتا دیں۔ تاکہ میں اپنی سیٹ کنفرم کروا لوں۔''

اس دوران ایک ملازم ناشتے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بڑے سلیقے سے ٹرالی ایک طرف کھڑی کر دی تھی۔ اس میں بہت کچھ تھا۔ ڈرائی فروٹ سے لے کر تازہ پھلوں تک۔ ان کے علاوہ کیک، بسکٹ، اور نہ جانے کیا کیا۔

ان چیزوں کو دیکھ کر جواد کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ جب یہ لوگ اس کے گھر آئیں گے تو کیا اتنی تواضع ہو سکے گی۔

''بھائی صاحب۔ آپ کی مسز دکھائی نہیں دے رہی ہیں؟'' سلمیٰ نے پوچھا۔

''وہ اس وقت جم میں ہوتی ہیں۔'' شاہد نے کہا۔ ''ایک گھنٹے میں واپس آ جائیں گی۔ یہ ان کا روٹین ہے۔ اگر جم نہ جائیں تو بیمار پڑ جاتی ہیں۔''

سلمیٰ اس وقت بہت مرعوب ہو رہی تھی۔ اس کو محلے والیوں کا خیال آ رہا تھا کہ جب وہ سنیں گی کہ فرخ کی ساس جم جایا کرتی ہے تو ان کے سینوں پر کتنی چھریاں چل جائیں گی۔

فرزانہ نے بڑے سلیقے سے ٹرے سے چیزیں نکال نکال کر ان کی طرف بڑھانا شروع کر دیا۔

اس وقت جواد نے پوچھا۔ ''بیٹا تمہاری تعلیم کتنی ہے۔ میرا مطلب ہے کیا پڑھ رہی ہو؟''

''میں بی اے کر رہی ہوں انکل۔'' فرزانہ نے بتایا۔

سلمیٰ کو محلے والیوں کو جلانے کا ایک اور پوائنٹ مل گیا تھا۔ اس کی بہو بی اے کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد شاہد نے فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اوکے بے بی۔ میں اب چلتا ہوں۔ تم اپنے مہمانوں کے پاس رہو۔'' پھر اس نے جواد کی طرف دیکھا۔ ''مجھے اجازت دیں۔ مجھے ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔''

''ضرور۔'' جواد نے ہاتھ بڑھایا۔

شاہد کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد جواد نے دو تین بسکٹ اور لے لیے۔

''بیٹی تمہیں کوکنگ بھی آتی ہے؟'' سلمیٰ نے پوچھا۔ اس نے کوکنگ کا لفظ محلے کی ایک لڑکی سے سنا ہوا تھا۔ اس کے استعمال کا یہ بہترین موقع تھا۔

''بہت کچھ آتا ہے آنٹی۔'' فرزانہ نے بتایا۔ ''میں نے کوکنگ کی کلاسیں لی ہیں۔ پاکستانی اور چائنیز دونوں کھانے بنا لیتی ہوں۔''

سلمیٰ کے لیے یہ ایک موقع تھا۔ محلے والیوں کو جلانے کا۔ پورے محلے میں کوئی ایسی نہیں ہو گی جس کو چائنیز بھی آتا ہو۔

''ارے خدا خوش رکھے۔ پھر تم ہم لوگوں کو چائنیز ہی کھلایا کرنا۔''

''کیوں نہیں؟'' فرزانہ مسکرا دی۔

گھر واپس آنے کے بعد بھی وہ سب فرزانہ کے گھر کی ہی باتیں کرتے رہے۔ کیا گھر تھا؟ کیا شان و شوکت ہے۔ کیا فرنیچر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

''آپ خود سوچیں، جن کے گھر کے ڈرائنگ روم کا فرنیچر اتنا شاندار ہو۔ وہ اپنی بیٹی کے جہیز میں کیسا فرنیچر دیں گے؟'' سلمیٰ نے کہا۔

''بھئی، میں تو قائل ہو گئی۔'' جواد نے کہا۔ ''وہ لوگ

تو رئیسوں کے رئیس ہیں۔''

''اب آپ کیا کہیں گے؟ آپ تو کہتے تھے کہ ہمارا بیٹا بالکل ناکارہ ہے۔''

''چلیں اب شادی کی تیاریاں شروع کریں۔'' سلمٰی نے کہا۔ ''ہم ان ہی کے پیسوں کے بھروسے پر تو نہیں بیٹھے رہیں گے نا؟''

''ارے نہیں خود ہم کو بھی بہت کچھ کرنا ہوگا۔'' جواد نے کہا۔

دوسرے ہی دن سے جواد نے پیسوں کی بھاگ دوڑ شروع کردی۔ جہاں سے بھی ممکن تھا، اس نے پیسے اکٹھے کر لیے۔

شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے لڑکی کے باپ شاہد نے جواد کے گھر والوں کو پانچ لاکھ روپے بھجوا دیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فون کر کے کہا بھی تھا۔ ''جواد صاحب یہ پانچ لاکھ روپے ہیں۔ اگر مزید کی ضرورت ہو تو مزید بھی بھیجے جاسکتے ہیں۔''

''شاہد صاحب۔ آپ تو ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں۔'' جواد نے کہا۔

''اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔''

سلمٰی نے انٹیریر ڈیزائنر کو گھر بلا لیا تھا۔

اس نے پورے گھر کی پیمائش کی تھی۔ پورا جائزہ لیا تھا کہ کہاں پر کون سا فرنیچر مناسب ہوسکتا ہے۔ پھر وہ تخمینہ دے کر چلا گیا تھا۔

''ارے تو کیا ہوا۔ وہ اپنی سروس بھی تو دے رہا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کی فیس ایک ایک لاکھ ہوتی ہے۔ بے چارہ پھر بھی دس ہزار ہی مانگ رہا ہے۔ پھر یہ بھی تو سوچیں کہ فرنیچر ہی لاکھوں کا ہوگا۔''

شادی کی تاریخ طے ہوچکی تھی۔ اب صرف اس تاریخ کا انتظار تھا۔ جب شادی ہونی تھی۔

شادی سے ایک دن پہلے فرنیچر اور جہیز کا سامان آگیا تھا۔

اس مبارک اور تاریخی موقع پر جواد اور فرخ دونوں گھر پر تھے۔ صرف ایک سوزوکی میں سارا جہیز آگیا۔ فرنیچر کے نام پر صرف ایک مسہری تھی۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔

''یہ کیسا مذاق ہے سلمٰی؟'' جواد نے کہا۔ ''ان لوگوں

حمیرا راحت

شاعری ایک خداداد ملکہ ہے یہ جس فہم و ذکا کو ودیعت ہوتا ہے وہ اپنے فکر و فن کی بدولت گلشن شعر کو رنگا رنگ پھولوں سے سجا دیتا ہے اور گونا گوں خوشبوؤں سے مہکا دیتا ہے عصرِ حاضر میں بہت سے شعراء اور شاعرات نے اپنی عرق ریزیوں سے اقلیم سخن کو مالا مال کر رکھا ہے ایسے ہی اصحابِ کمال میں حمیرا راحت کا نام آتا ہے ان کے جذبات و احساسات ندرت سے لبریز ہیں انہوں نے فکر کے فرسودہ طرز کو منتخب نہیں کیا بلکہ نئے خیالات کو جادۂ منزل بنایا اُن کے ہاں فکری اعتبار سے وہ جولانی اور تابانی پائی جاتی ہے جو قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے ان کا کلام از آغاز تا اختتام دولت تخیر سے معمور ہے مصرع در مصرع شعر در شعر غزل در غزل نظم در نظم بین السطور ان کے افکار ضوفشانی کر رہے ہیں ان کی شاعری میں نسائی احساسات کا رنگ بھی چوکھا ہے اسی حوالے سے وہ خواتین کی نمائندہ شاعرہ بھی کہلانے کا استحقاق رکھتی ہیں۔

☆☆☆

ہیت کے اعتبار سے شاعری کی دو اصناف ہیں۔ غزل اور نظم، نظم کی کئی ہیتیں ہیں، جن میں مثنوی، ثلاثی قطعہ بند، مخمس، مسدس، مثمن، مستزاد، نظم معریٰ، آزاد نظم اور نثری نظم شامل ہیں۔ آزاد نظم کی کامیابی کے بعد نثری نظم کے امکانات روشن ہونے لگے۔ نثری نظم میں وزن، قافیہ، ردیف اور مصرعوں کے چھوٹا یا بڑا ہونے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ آزاد نظم میں ارکان کی کمی بیشی روا ہوتی ہے، لیکن نثری نظم میں ارکان سرے سے معدوم ہوتے ہیں۔ بلکہ سطور چھوٹی اور بڑی ہوتی ہیں، جس طرح غزل اور نظم میں ہیت کے اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے، اسی طرح ان اصناف کے فکری مزاج میں بھی مغائرت پائی جاتی ہے۔ نظم میں فکری اعتبار سے وسعت پائی جاتی ہے اس لیے زیادہ تصریح و توضیح کی گنجائش ہوتی ہے، جس کے باعث منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور محاکات نگاری بخوبی کی جاسکتی ہے۔ تسلسل نظم کا تلازمہ ہے۔ خیالات زنجیر کی کڑیوں کی صورت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ نثری نظم بطورِ خاص سلاست کا مظہر ہوتی ہے۔ نثری نظم میں فنی حوالے سے بہت گنجائش پائی جاتی ہے۔ تاہم فکری اعتبار سے کسی قسم کا سمجھوتا روا نہیں ہے۔

اقتباس: شاعرات ارض پاک
از شمیر نا قد

www.pakistanipoint.com

نے کیسا جہیز بھیجا ہے؟''

''یہ تو ہمارے ساتھ مذاق کیا گیا ہے۔'' سلمٰی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''میں تو جا کر ہنگامہ کروں گا۔'' جواد نے کہا۔

''نہیں ابھی نہیں۔'' سلمٰی نے سمجھایا۔ ''پہلے شادی خیر وخوبی کے ساتھ ہو جانے دیں۔ اس کے بعد ان سے نمٹیں گے۔ واہ اونچی دکان پھیکا پکوان، میں نے بھی کیا کیا سوچ رکھا تھا کہ پورے محلے میں ہلچل مچ جائے گی۔ لیکن جو جہیز آیا ہے اس سے اچھا تو عام لڑکیوں کا جہیز ہوا کرتا ہے۔''

''تو تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں ابھی کچھ نہ کہوں۔''

''ہاں، ابھی خاموش رہیں۔ جب لڑکی گھر آ جائے تو پھر وہ ہمارے قابو میں ہوگی نا۔ اس وقت جا کر جو کہنا چاہیں کہہ دینا۔''

شادی ہوگئی۔ شادی ایک عام سے ہال میں ہوئی تھی۔ ستم یہ تھا کہ اس شادی میں شاہد بھی شریک نہیں ہوا تھا۔ وہ کسی کام سے ہنگامی طور پر برطانیہ چلا گیا تھا۔ سلمٰی اور جواد دونوں ہی بھنائے ہوئے تھے۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ لڑکی کا باپ ہی شادی میں شریک نہیں ہو رہا ہے۔''

''اور یہ بھی تو دیکھو کہ شادی کیسے ہال میں ہو رہی ہے۔ عام سا ہال ہے۔ غریب غربا کی شادی بھی اس سے اچھے ہال میں ہوتی ہے، اور کمال یہ ہے کہ شادی کا کھانا بھی کیسا دیا ہے۔ وہی بریانی قورمہ جو عام طور پر دیا جاتا ہے۔''

''میں تو کل ہی جا کر ہنگامہ کروں گا۔'' جواد نے کہا۔

''اب تم مجھے منع مت کرنا۔''

''نہیں۔ میں تو خود چاہتی ہوں کہ ان لوگوں کو ذرا بتایا تو جائے کہ یہ سب کیا ڈھونگ ہے۔ یہ کیسی شان وشوکت ہے۔''

جواد دوسری صبح اس گھر میں پہنچ گیا۔ اب گیٹ پر کھڑے گارڈ وغیرہ اسے پہچاننے لگے تھے... اسی لیے اسے عزت کے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ اس نے اپنے غصے کی کیفیت کو برقرار رکھا تھا۔ اس کی اچھی خاصی بے عزتی ہوگئی تھی۔ برادری والے اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

شاہد اور اس کی بیوی دونوں کچھ دیر بعد ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تھے۔

''شاہد صاحب۔ میں آپ لوگوں سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ ہمارے ساتھ کیسا مذاق کیا گیا ہے؟''

''مذاق؟ کیسا مذاق؟''

''آپ نے اپنی بیٹی کے لیے کیسا جہیز بھیجا ہے؟''

''اوہ تو یہ بات ہے۔'' شاہد ہنسنے لگا۔ ''بات یہ ہے مسٹر جواد کہ جیسا آپ کا بیٹا ویسا ہی جہیز دیا ہے۔ اگر وہ کوئی شاندار انسان ہوتا تو جہیز بھی شاندار ہوتا۔''

جواد بھنّا کر رہ گیا۔ سراسر توہین ہو رہی تھی۔

''ہاں ایک بات اور سن لیں۔'' شاہد کی بیوی نے مخاطب کیا۔ ''فرزانہ ہماری بیٹی نہیں ہے۔''

''کیا؟'' جواد حیران رہ گیا تھا۔

''جی ہاں۔ ہمارے گھر میں ایک غریب بوا تھیں۔ بیوہ ہونے کے بعد وہ اسی گھر میں اپنی بچی فرزانہ کے ساتھ رہ گئیں۔ یہ سمجھیں کہ فرزانہ نے اسی گھر میں پرورش پائی ہے۔ ہم نے اس کو تعلیم دلوائی، اور جب وہ آپ کے بیٹے جیسے بے وقوف نوجوان سے محبت کرنے لگی تو ہم نے اس کی شادی بھی کر دی۔ خس کم جہاں پاک۔ کب تک اسے سنبھال کر رکھتے۔''

جواد کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا۔ ان لوگوں کا روکھا پن۔ ایک عام سے ہال میں شادی اور معمولی سا فرنیچر۔ سب کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔

''مسٹر اب آپ کی مرضی۔ اسے رکھیں یا گھر سے نکال دیں۔'' شاہد نے کہا۔ ''لیکن اس سے کہہ دیجیے گا کہ آپ کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ یہاں نہ آئے۔ اپنے کسی رشتے دار کے پاس چلی جائے۔''

''مسٹر شاہد'' جواد بول پڑا۔ ''یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ ہم اسے گھر سے نکال رہے ہیں؟''

''اوہ تو اسے اپنی بہو بنا کر رکھ رہے ہیں؟''

''جی ہاں۔ جب تک زندگی ہے۔'' جواد نے کہا۔ ''ہمارے یہاں بہو گھر کی عزت ہوتی ہے، مان ہوتی ہے، اب ایک بات اور کہ اب اس بچی کی عزت یہ سب جان لینے کے بعد اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔ اسی کے نصیب سے ہمارے بیٹے کے دن بدل جائیں گے۔ شکریہ اس بات کا کہ آپ نے بہت دنوں تک اس لڑکی کو اپنے گھر میں سنبھال کر رکھا جس کو قدرت نے ہمارے گھر کے لیے پیدا کیا تھا۔''

++

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

تھپڑ

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
زیرِ نظر سچ بیانی میرے برادر نسبتی کی ہے کسی نے سچ کہا ہے انسان سنبھلنا چاہے تو منٹوں میں سنبھل جائے۔ یہی کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے۔ اسے اس کے دوست نے الفاظ کا ایک ایسا تھپڑ مارا کہ اس کے بہکے قدم سنبھل گئے

ایم زید انصاری
(لاہور)

''نوشین، وہ لڑکا تمہارے لائق نہیں ہے۔'' میری بیوی نے اپنی چھوٹی بہن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''باجی۔ تم اس معاملے میں نہ بولو۔ زندگی مجھے گزارنی ہے اور میں اپنا برا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔''

''کیسے نہ بولوں۔'' میری بیوی نے تنک کر کہا۔ ''تم میری چھوٹی بہن ہو۔ میں تمہیں گڑھے میں گرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔''

''جب اماں کو کوئی اعتراض نہیں تو تم کیوں میرے غم

مین ہلکان ہورہی ہو۔''

''اماں کو تو رہنے ہی دو۔ وہ بیٹیوں کو بوجھ سمجھتی ہیں۔ ان کا بس چلے تو وہ ایک ایک کرکے سب کو راہ چلتے لوگوں کے حوالے کردیں۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ سکندر میں برائی کیا ہے جو تم اس کی اتنی مخالفت کررہی ہو؟''

''میں اس کی شخصیت کی بات نہیں کرتی۔ شکل و صورت تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے لیکن بندے کو پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تو ہونا چاہیے اس کا حلیہ بالکل گنواروں جیسا ہے۔ مجھے سب سے بڑا اعتراض ہے اس کی تعلیم پر۔ وہ صرف میٹرک پاس ہے جبکہ تم نے ماسٹرز کر رکھا ہے پھر وہ کوئی کام بھی نہیں کرتا۔ باپ کے پیسے پر عیش کررہا ہے۔''

''آج کل تعلیم سے زیادہ پیسے کی اہمیت ہے۔'' نوشین نے تیز لہجے میں کہا۔ ''آدمی کی جیب میں پیسا ہو تو وہ دنیا کی ہر آسائش خرید سکتا ہے۔ صرف ڈگری سے پیٹ نہیں بھرتا۔ میرے کئی کلاس فیلوز سال بھر سے مارے مارے پھر رہے ہیں لیکن ابھی تک انہیں معمولی نوکری بھی نہیں ملی۔''

''اگر ڈگری اتنی ہی فضول چیز ہے تو تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں کو بند کردینا چاہیے تاکہ کسی کا دھیان پڑھائی کی طرف نہ جائے۔''

''تم کچھ بھی کہو لیکن میں اپنا برا بھلا اچھی طرح سمجھتی ہوں اور میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میری شادی سکندر سے ہی ہوگی۔''

''مشکل تو یہی ہے کہ تمہیں برے بھلے کی تمیز نہیں ہے۔'' میری بیوی بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ ''لیکن سکندر سے شادی کی صورت میں مجھے تمہارا مستقبل بہت بھیانک نظر آرہا ہے۔ جس شخص کی اپنی کوئی حیثیت نہ ہو اور وہ اپنی ضرورتوں کے لیے باپ کا محتاج ہو وہ تمہیں کس طرح خوش رکھ سکتا ہے۔''

''یہ تم نے کیسے کہہ دیا کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' نوشین نے تڑخ کر جواب دیا۔ ''خالو کے پاس بہت پیسا ہے۔ وہ پراپرٹی کا کام کرتے ہیں۔ ایک سودے میں انہیں ہزاروں بلکہ لاکھوں کی بچت ہوجاتی ہے پھر کارخانہ کی آمدنی الگ، ان کے گھر میں خوش حالی ہے۔ اس کی بہنیں کتنے ٹھاٹ سے رہتی ہیں۔ میں نے ہمیشہ انہیں نئے اور قیمتی کپڑوں میں دیکھا ہے۔''

''یہ خوش حالی اس کے باپ کی وجہ سے ہے اور کارخانہ کا انتظام اس کے چھوٹے بھائی فہیم کے ہاتھ میں ہے۔ سکندر تو وہاں کبھی جاکر جھانکتا بھی نہیں، اسے دوستوں سے فرصت ملے تو وہ کسی کام پر توجہ دے۔''

''اسے کارخانہ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہاں کا انتظام سنبھالنے کے لیے فہیم ہی کافی ہے۔ سکندر اپنا کام شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اس کا ارادہ بار بی کیو کھولنے کا ہے۔'' نوشین نے فخریہ انداز میں بتایا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ وہ سنجیدگی سے کوئی کام کرسکتا ہے۔'' میری بیوی فرحین نے طنزاً کہا۔ ''اس سے پہلے بھی اس نے آٹو پارٹس کی دکان کی تھی لیکن تین مہینے بعد ہی بند کرنی پڑگئی اور جو نقصان ہوا وہ الگ۔ دراصل یہ کاروبار توجہ اور محنت مانگتا ہے جبکہ سکندر کی صبح ہی بارہ بجے ہوتی ہے، جب دکان نوکروں پر چھوڑی جائے گی تو اس کا یہی انجام ہونا ہے۔''

''اب ایسا نہیں ہوگا۔'' نوشین نے بڑے یقین سے بولا۔ ''اسے تجربہ ہوگیا ہے اور وہ خود اپنے کام کی نگرانی کرے گا۔''

''اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔'' فرحین نے یہ کہہ کر بات ختم کردی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا بے کار ہے۔ اب اسے کسی اور طرح سمجھانا پڑے گا۔

مجھے نوشین اور سکندر کی پریم کہانی کا بخوبی علم تھا لیکن یہ میں نے جان بوجھ کر اس بارے میں فرحین سے کوئی بات نہیں کی لیکن میں اس کی پریشانی سمجھ رہا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی سکندر ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ شکل صورت، تعلیم، خاندان، طرز زندگی غرض کسی بھی اعتبار سے نوشین کے ہم پلہ نہیں تھا۔ اس میں صرف ایک ہی خوبی تھی اور وہ یہ کہ اس کا بٹوہ ہمیشہ نوٹوں سے بھرا رہتا تھا جو وہ کسی نہ کسی بہانے اپنے باپ سے اینٹھ لیا کرتا تھا۔ اس نے انہی نوٹوں کی جھلک دکھا کر نوشین اور اس کی ماں کو اپنا گرویدہ بنایا تھا۔ وہ آئے دن نوشین کو تحفے دیتا اور ان کے گھر کے لیے مٹھائی، پھل، جام، جیلی و شربت کی بوتلیں اور نہ جانے کیا کچھ لاتا رہتا۔ وہ ہفتہ میں ایک دن نوشین اور اس کی ماں بہنوں کو کہیں باہر کھانا کھلانے بھی لے جاتا۔

میں سب کچھ جاننے کے باوجود انجان بنا ہوا تھا۔ اس کی ایک سے زائد وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ میں کسی کے معاملہ میں دخل دینے کا قائل نہیں ہوں۔ میں اچھی طرح

Nazar Azeem
www.pakistanipoint.com

جانتا تھا کہ میرے بولنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہونا وہی ہے جو نوشین اور میری ساس نے سوچ رکھا ہے۔ دوسری اہم ترین وجہ یہ بھی کہ سسرال میں میرے نمبر کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے اور مجھے صرف داماد ہونے کی وجہ سے برداشت کیا جارہا تھا۔ میں اپنی ساس کی نظر میں انتہائی ظالم اور سخت گیر شوہر تھا جس نے ان کی بیٹی پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے، گو کہ انہوں نے میرے سامنے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا لیکن مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ میرے اور میری ماں بہنوں کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے جبکہ میری بیوی فرحین کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں تھی اور ہماری ازدواجی زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔

دراصل میں تھوڑا سا اصول پسند واقع ہوا ہوں اور میری ساس کو یہی بات پسند نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں ان کے خاندان کے لاابالی مردوں کی طرح رات کو دیر تک جاگتا رہوں۔ تاش کھیلوں، شعروشاعری کی محفلوں میں حصہ لوں، نہاری پائے کی دعوت اڑاؤں۔ میری صبح گیارہ بجے ہو، حلوا پوری کا ناشتا کروں اور اپنے دھندے پر نکل جاؤں جبکہ یہ سب میرے مزاج کے خلاف تھا۔

میری تربیت بالکل مختلف ماحول میں ہوئی تھی۔ والد صاحب ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھے اور ہمارا زیادہ وقت فوجی چھاؤنیوں میں گزرا جس کی وجہ سے ہم بھی ڈسپلن کے عادی ہوگئے۔ رات جلدی سونا، صبح فجر کے وقت اٹھنا، شام کو مغرب کے بعد گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ عادتیں پختہ ہوتی چلی گئیں اور شادی کے بعد میری زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں ایک نیم سرکاری ادارے میں ملازم تھا اور دفتر جانے کے لیے مجھے ہر حال میں صبح چھ بجے اٹھنا ہوتا تھا کیونکہ سات بجے گاڑی آجاتی تھی۔ میری ساس کی نظر میں یہ بھی ان کی بیٹی پر ایک ظلم تھا کیونکہ اسے صبح اٹھ کر میرے لیے ناشتا بنانا ہوتا تھا اور اس کی نیند پوری نہیں ہو پاتی تھی۔

ہم جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے تھے جبکہ میری سسرال میں یہ عام رواج تھا کہ لڑکے شادی کے بعد اپنے ماں باپ سے الگ ہوجاتے تھے۔ میری ساس بھی شاید مجھ سے یہی توقع کررہی تھیں۔ انہوں نے ایک دو بار باتوں باتوں میں اس جانب اشارہ بھی کیا لیکن میرے لیے الگ گھر لینا ممکن نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت یا وجہ نہیں تھی۔ میری بیوی آزاد اور خودمختار زندگی گزار رہی تھی اور اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ میری والدہ عملاً اپنی ذمے داریوں سے دستبردار ہوچکی تھیں اور ان کا زیادہ وقت عبادت یا رسالے پڑھنے میں گزرتا۔ بہنیں اپنی پڑھائی میں مگن تھیں لیکن شام میں وہ بھی کچن کے کاموں میں میری بیوی کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔

میری ساس کو سب سے زیادہ تکلیف اس بات کی تھی کہ میں اپنا اور بیوی کا جیب خرچ الگ کرکے بقیہ تنخواہ والدہ کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا جس سے وہ گھر کا خرچ چلاتی تھیں۔ اس میں میرا چھوٹا بھائی بھی اپنا حصہ ڈالتا تھا جبکہ میری ساس سمجھتی تھیں کہ اگر میں الگ ہوجاؤں تو ساری تنخواہ فرحین کے ہاتھ میں آئے گی اور وہ اس پر عیش کرے گی۔ ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ الگ ہونے کی صورت میں مجھے دوسرا مکان لینا پڑے گا جس کا کرایہ ادا کرنے کے بعد شاید اتنے پیسے بھی نہ بچیں کہ ہمارے کچن کا خرچ پورا ہوسکے۔

میں اس معاملے میں اپنی بیوی کو دوش نہیں دوں گا۔ اس نے کبھی بھی مجھ سے الگ گھر لینے کے لیے نہیں کہا۔ وہ پڑھی لکھی تھی اور میری پوزیشن کو سمجھتی تھی۔ ویسے بھی اسے میری والدہ اور بہنوں سے کوئی شکایت نہیں تھی اور وہ ان میں اچھی طرح گھل مل گئی تھی اور وہ اکثر مجھ سے کہا کرتی کہ مجھے اپنی بہنوں کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے اور اگر میری طرف سے کوتاہی ہوتی تو وہ خود ہی کمیٹی ڈال کر ان کے لیے جوڑے اور جوتے وغیرہ خریدتی۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ سسرال میں میری پوزیشن کیا ہے اور اگر میں نے نوشین کے معاملہ میں دخل اندازی کی تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ ساس صاحبہ یہی سمجھیں گی کہ میں سکندر سے حسد کرنے لگا ہوں اور نہیں چاہتا کہ نوشین ایک خوش حال زندگی بسر کرے اس لیے میں نے اس بارے میں سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی لیکن ایک دن فرحین نے خود ہی یہ ذکر چھیڑ دیا۔ میرا یہ روز کا معمول ہے کہ دفتر سے آنے کے بعد میں چائے پینے کے ساتھ اخبار کا مطالعہ بھی کرتا ہوں۔ اس دوران فرحین مجھے بالکل ڈسٹرب نہیں کرتی لیکن اس روز وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور جیسے ہی میں نے چائے ختم کی۔ وہ آہستہ سے بولی ”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“

”ہاں بولو“ میں نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

''دراصل میں نوشین اور سکندر کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''خیریت تو ہے۔'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا ''کیا کوئی نیا مسئلہ ہوگیا؟''

''جی ہاں اور میں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔''

''کھل کر بات کرو۔'' میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے سکندر کو دیکھا ہے اور اس کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے بھی ہیں، آپ ہی بتائیں کیا وہ لڑکا کسی بھی اعتبار سے مناسب ہے لیکن نہ جانے اس نے نوشین پر کیا جادو کردیا ہے کہ وہ اسی کا دم بھر رہی ہے اور اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے وہ سکندر سے ہی شادی کرے گی اور امی بھی اس کی حمایت کررہی ہیں۔''

''یہ تو سیدھا سادا کیس ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میاں بیوی راضی ہیں اور ظالم سماج کا بھی ڈر نہیں پھر تم کیوں پریشان ہورہی ہو؟''

''اس لیے کہ نوشین ناسمجھ ہے لیکن میں اسے گڑھے میں گرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی جبکہ ہم سب بہن بھائی اس رشتہ کے خلاف ہیں۔''

''تمہاری امی تو سمجھ دار ہیں جب وہی نوشین کی حمایت کررہی ہیں تو تم لوگوں کی مخالفت سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''میں کہہ رہی تھی کہ آپ امی کو سمجھائیں۔ ہوسکتا ہے کہ.....''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم جانتی ہو کہ میں دوسروں کے معاملہ میں ٹانگ نہیں اڑاتا البتہ اگر انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں بلاتکلف اپنی رائے کا اظہار کردوں گا۔''

میں جانتا تھا کہ وہ کبھی مجھ سے مشورہ نہیں کریں گی کیونکہ انہیں اندازہ ہوگا کہ میں اس رشتہ کی مخالفت کروں گا اور وہی ہوا۔ چند روز بعد ہی انہوں نے فون کرکے فرحین کو بتایا کہ آنے والے اتوار کو سکندر کے والدین رشتہ لے کر آرہے ہیں۔ انہوں نے سکندر کو بھی بلایا ہے تاکہ سب لوگ اسے دیکھ لیں۔

یہ پیغام سن کر فرحین کا خون کھول گیا۔ اس نے ماں سے تو کچھ نہیں کہا لیکن شام کو میرے سامنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے بولی۔ ''آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔''

''میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ''دیکھو فرحین جو ہورہا ہے یا جو بعد میں ہوگا اس پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں۔ دعا کرو کہ نوشین جو خواب دیکھ رہی ہے۔ اسے ان کی من چاہی تعبیر مل جائے۔''

''میں اپنی بہن کے لیے اچھا ہی سوچوں گی لیکن ایسا ہونا مشکل لگ رہا ہے۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

اتوار کے روز ہم لوگ معمول کے مطابق نوشین کے گھر گئے خلاف توقع میری ساس نے اچھا خاصا مجمع اکٹھا کرلیا تھا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے تمام بھائیوں بہنوں اور جیٹھ کے علاوہ میری والدہ کو بھی مدعو کیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ سکندر کے گھر والے صرف رشتہ کی بات کرنے آرہے ہیں تو اس کے لیے تمام رشتے داروں کو جمع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تھوڑی دیر بعد اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب منظر دیکھنے کو ملے گا۔

کافی دیر ہوگئی لیکن مہمانوں کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ساس صاحبہ بے چینی سے ان کا انتظار کررہی تھیں۔ بالآخر ان سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے سے کہا کہ وہ فون کرکے معلوم کرے کہ وہ لوگ اب تک کیوں نہیں آئے۔ وہاں سے جواب آیا کہ صاحبزادے فیشل کروانے ہیئر ڈریسر کے پاس گئے ہوئے تھے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے واپس آئے ہیں۔

تقریباً ایک گھنٹا بعد کاروں اور موٹر سائیکلوں کا ایک قافلہ وہاں پہنچا۔ کاروں کے ڈرائیور زور زور سے ہارن بجا کر اپنی آمد کا اعلان کررہے تھے جسے سن کر محلے پڑوس کے لوگ گھروں سے باہر آگئے۔ ایسا لگا جیسے یہ کوئی سیاسی جماعت کی ریلی ہو خیر ایک ایک کرکے مہمان کاروں سے باہر آئے۔ سکندر نے بروکیڈ کا بھڑک دار کرتا اور سبز رنگ کا پاجامہ پہن رکھا تھا اور پیروں میں سلیم شاہی کھسے تھے۔ اس نے پرانے زمانے کے دولہوں کی طرح منہ پر رومال رکھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو بہنیں اس کے بازو پکڑے ہوئے کھڑی تھیں اور اس کے سامنے رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس پانچ چھ لڑکے بھنگڑا ڈال رہے تھے اور بے سری آواز میں دلہنیا لے جائیں گے والا گانا گارہے تھے۔

یہ نظارہ دیکھ کر میری طبیعت اتنی مکدر ہوئی کہ دل چاہا اسی وقت وہاں سے چل دوں لیکن سسرال کا معاملہ تھا۔ اس لیے دل پر جبر کرکے بیٹھنا پڑا۔ خدا خدا کرکے یہ اودھم بازی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ختم ہوئی اور مہمان گھر میں داخل ہوئے۔ ان میں سکندر کے والدین کے علاوہ اس کی بہنیں، چھوٹا بھائی اور چند رشتہ دار عورتیں تھیں جن کا تعارف پھوپی، ممانی اور خالہ کے طور پر کرایا گیا۔ وہ ناچنے گانے والے لڑکے سکندر کے دوست تھے۔

خالہ یعنی میری ساس نے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا، وہ لوگ بھی اپنے ساتھ مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے لے کر آئے تھے۔ اس کے علاوہ ایک تھال میں نوشین کے لیے بے حد قیمتی سوٹ، سینڈل، کئی طرح کے چوڑیوں کے سیٹ پھولوں کے ہار اور گجرے وغیرہ بھی تھے۔ مجھے یہ تام جھام دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کیونکہ یہ چیزیں تو منگنی کے موقع پر لائی جاتی ہیں۔ بس ایک انگوٹھی کی کمی رہ گئی تھی لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ تھوڑی دیر بعد اس کی رونمائی بھی ہونے والی ہے۔

تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد سکندر کی والدہ نے حرف مدعا بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''آج میں آپ سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔ مجھے آپ کی بیٹی نوشین بہت پسند ہے اور میں اپنے بیٹے سکندر سے اس کا رشتہ طے کرنا چاہتی ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔''

ایسے موقع پر لڑکی والے فوراً ہی ہاں یا نہ میں جواب نہیں دیتے بلکہ سوچنے اور گھر میں مشورہ کرنے کے لیے مہلت مانگ لیتے ہیں لیکن میری ساس نے ایسا کوئی تکلف نہیں کیا اور سکندر کی ماں کا ہاتھ تھامتے ہوئے انتہائی لجاجت سے بولیں۔ ''یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ ہمیں اس قابل سمجھا۔ سچ پوچھیں تو سکندر مجھے بھی پسند ہے۔ اسے داماد بنا کر مجھے بہت خوشی ہوگی۔''

''بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میرا مان رکھ لیا۔'' سکندر کی ماں نے کہا۔ ''نوشین بیٹی کو بلائیں تاکہ لگے ہاتھوں رسم بھی ادا ہو جائے۔''

خالہ نے ایک لڑکی کو اشارہ کیا اور چند لمحوں بعد نوشین سر پر سرخ دوپٹا ڈالے کمرے میں داخل ہوئی۔ سکندر کی ماں نے اسے اپنے برابر میں بٹھایا اور پرس سے ایک قیمتی انگوٹھی نکال کر اسے پہنا دی۔ یہ دیکھ کر خالہ کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا اور وہ جھینپتے ہوئے بولیں ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ انگوٹھی پہنانے آرہی ہیں تو میں سکندر کے لیے بھی منگوا لیتی۔''

''کوئی بات نہیں۔ سکندر کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ آپ اگلے ہفتے ہمارے گھر آئیں تو اسے انگوٹھی پہنا دیں۔''

مجھ سمیت خالہ کے سبھی رشتہ دار حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے کیونکہ ہمیں یہی بتایا گیا تھا کہ سکندر کے گھر والے رشتہ لے کر آرہے ہیں لیکن انگوٹھی پہنانے کا منظر دیکھ کر اس تاثر کو تقویت ملی کہ سب کچھ پہلے سے طے تھا اور سکندر کے گھر والے صرف رسم پوری کرنے آئے تھے حالانکہ یہ بات نہیں تھی۔ خالہ کو خود بھی یقین نہیں تھا کہ سکندر کی ماں اتنی تیزی دکھائیں گی۔ ویسے بھی وہ ان لوگوں کی امارت سے اتنی مرعوب تھیں کہ ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا ورنہ اتنا تو کہہ سکتی تھیں کہ اگر باقاعدہ منگنی کرنی تھی تو پہلے بتا دیا ہوتا تاکہ ہم بھی اپنے مہمانوں کو بلا لیتے۔

اس رسم سے فارغ ہونے کے بعد چائے اور ناشتے کا دور چلا۔ خالہ نے چائے کے ساتھ چھولے، دہی بڑے، سموسے، گلاب جامن، کھیر اور بسکٹ وغیرہ کا اہتمام کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے لیے کولڈ ڈرنکس بھی منگوائی تھیں جو چائے نہیں پیتے۔ میرے حساب سے وہ سامان پچاس افراد کے لیے کافی تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے سب چیزیں صاف ہوگئیں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد خالہ کے رشتہ دار بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے۔ میں نے بھی فرحین کو اٹھنے کا اشارہ کیا لیکن خالہ نے اصرار کر کے ہمیں کھانے پر روک لیا انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''منیر تم نے سکندر کو دیکھا۔ تمہیں کیسا لگا؟''

میرے پاس اس فضول سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لیے ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا۔ ''جی اچھا ہے۔''

وہ میری بات پر خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ''مجھے یقین تھا کہ تمہیں سکندر پسند آئے گا۔ سچ پوچھو تو میں نے صرف لڑکا دیکھا ہے اور کچھ نہیں۔ ہمیں اس کے خاندان یا مال و دولت سے کوئی غرض نہیں۔ ہمارے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ لڑکا شریف ہے اور وہ ہماری نوشین کو خوش رکھے گا۔''

''خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ اس دوران فرحین مجھے مسلسل گھورتی رہی۔ غالباً وہ چاہتی تھی کہ میں سکندر کی شخصیت، اس کے خاندان، تعلیم، لائف اسٹائل اور سب سے بڑھ کر اس کے نکھٹے پن کے بارے میں کھل کر اپنی رائے کا اظہار کروں لیکن میرے خیال میں اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا اگر رشتہ منظور کرنے

سے پہلے مجھ سے پوچھا جاتا تو میں خالہ سے کہہ سکتا تھا کہ نوشین اور سکندر کا کوئی جوڑ نہیں، اس لیے وہ اچھی طرح سوچ کر کوئی فیصلہ کریں۔ اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ نوشین کی منگنی ہوچکی تھی اس لیے یہی بہتر تھا کہ میں خاموشی اختیار کرلوں۔

گھر آنے کے بعد فرحین نے پھر وہی قصہ چھیڑ دیا اور کہنے لگی۔ ''جب امی نے آپ سے سکندر کے بارے میں پوچھا تھا تو منہ بند کیے کیوں بیٹھے رہے۔ صاف کہہ دیتے کہ یہ لڑکا کسی طرح بھی نوشین کے قابل نہیں۔''

''تو کیا میرے کہنے سے وہ منگنی ختم کر دیتیں۔'' میں نے جل کر کہا۔

''یہ میں نہیں جانتی لیکن انہیں کم از کم یہ معلوم تو ہونا چاہیے کہ وہ ایک غلط فیصلہ کر رہی ہیں۔''

''یہ فیصلہ ان کا نہیں بلکہ نوشین کا ہے۔ وہی اس کی جھوٹی شان وشوکت اور دولت سے مرعوب ہوگئی ہے۔''

''اس کم عقل کو یہ اندازہ بھی نہیں کہ سکندر اپنے باپ کے پیسوں پر عیش کر رہا ہے۔ اس کے پاس اپنا تو کچھ بھی نہیں۔''

''معلوم نہیں کہ سکندر نے اسے کیا سبز باغ دکھائے ہیں جو وہ اس کی باتوں میں آگئی۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب تو یہی دعا کرنی چاہیے کہ نوشین کو اس کے خواب کی تعبیر مل جائے۔''

''مجھے تو نوشین کے مستقبل کی فکر ہے۔ سکندر کے یہ سارے ٹھاٹ باٹ اس کے باپ کی وجہ سے ہیں۔ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی وہ آسمان سے زمین پر آن گرے گا؟''

''انسان کو ہمیشہ اچھا سوچنا چاہیے۔'' میں نے فرحین کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ شادی کے بعد سکندر کو اپنی ذمے داریوں کا احساس ہوجائے اور وہ سنجیدگی سے کوئی کام کرنے لگے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہوگا۔'' فرحین منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''اسے اپنے دوستوں سے فرصت ملے تو وہ کسی کام کے بارے میں سنجیدہ ہو۔''

اس کے بعد میرے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے میں کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ ویسے بھی مجھے نیند آرہی تھی۔ فرحین سمجھ گئی کہ میں اس موضوع پر مزید بات کرنا نہیں چاہتا اس لیے اس نے بھی آنکھیں بند کرلیں۔

اگلے ہفتے ہم لوگوں کو سکندر کے گھر جانا تھا۔ خالہ نے اس موقع کے لیے غیر معمولی تیاری کی۔ انہوں نے سکندر کے لیے انگوٹھی، جوڑے اور جوتوں کے علاوہ رومال، پرفیوم اور شیونگ کٹ بھی خریدی تھی جبکہ مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے اس کے علاوہ تھے۔ شاید وہ اپنے رشتہ داروں کو سکندر کے گھر نہیں لے جانا چاہتی تھیں اس لیے انہوں نے کسی سے بھی وہاں چلنے کے لیے نہیں کہا صرف گھر کے لوگ ہی وہاں گئے جن میں مجھ سمیت نوشین کے بہن بھائی شامل تھے۔ وہاں جا کر اندازہ ہوا کہ خالہ نے ایک طرح سے ٹھیک ہی کیا ورنہ رشتہ داروں کے سامنے ان کی بڑی سبکی ہوتی۔

سکندر کے گھر والوں نے ہمارا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ خالہ تو اپنے ساتھ کسی رشتہ دار کو لے کر نہیں گئیں لیکن سکندر کی ماں نے پورے خاندان کو جمع کر رکھا تھا سکندر کے دوست اس کے علاوہ تھے۔ مہمانوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انہیں گھر میں نہیں بٹھایا جاسکتا تھا۔ اس کے لیے باہر سڑک پر شامیانہ لگانا پڑا۔ اس کے چاروں طرف قنات لگادی گئی۔ درمیان میں پارٹیشن کر کے ایک طرف کرسیاں اور دوسری جانب کھانے کا انتظام تھا۔

پنڈال کے داخلی دروازوں پر لڑکیاں پھولوں کے ہار اور گجرے لیے ہوئے کھڑی تھیں انہوں نے سب مہمانوں کے گلے میں ہار ڈالے اور خواتین کو گجرے پیش کیے۔ ان لڑکیوں کا لباس، میک اپ، اور بناؤ سنگھار دیکھ کر میرے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ شکل وصورت تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے لیکن اسے مزید بگاڑنے میں انہوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو کسی ہیروئن سے کم نہیں سمجھ رہی تھی۔

مہمانوں کے بیٹھتے ہی رقص وموسیقی کا پروگرام شروع ہوگیا سکندر کے دوستوں نے ڈیک کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس پر جیسے ہی تیز دھنوں میں گانے شروع ہوئے تو ایک لڑکی نے اس پر رقص شروع کر دیا۔ وہ کسی ماہر رقاصہ کی طرح ڈانس کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس نے اس فن کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ وہ جس بے باکی سے اپنے جسمانی خطوط کی نمائش کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کم از کم میں کسی شریف لڑکی سے اس بے باکی کی توقع نہیں کرسکتا تھا لیکن وہاں پر موجود سکندر کے رشتہ دار اور دوست اس کے فن سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے اور تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔

وہ لڑکی دوڑتی ہوئی گئی اور اس نے ایک دوسری لڑکی

Naqar Azeem www.pakistanipoint.com

کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ وقفہ وقفہ سے ایک نئی لڑکی اس ڈانس میں شامل ہوتی رہی۔ اس ڈراما میں نیا موڑ اس وقت آیا جب سکندر کے دوست بھی اس پروگرام میں شامل ہوگئے۔ اب محفل پوری طرح جوبن پر آگئی تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں جوڑی بنا کر ناچ رہے تھے۔ اس طرح کے مناظر ہم نے فلموں میں دیکھے تھے اس روز زندہ ناچ گانا بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

اچانک ہی میری نظر خالہ پر گئی۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ پروگرام انہیں پسند نہیں آیا۔ ان کے برابر میں بیٹھی فرحین کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ سکندر کی ماں نے بھی ان دونوں کی کیفیت کو محسوس کرلیا۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کو بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا اور اس کے فوراً بعد ڈیک بند ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی لڑکوں اور لڑکیوں کے تھرکتے قدم بھی رک گئے۔

اس کے بعد تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ سکندر کو اسٹیج پر رکھے ہوئے صوفے پر بٹھایا گیا پھر خالہ نے اسے انگوٹھی پہنائی اور منہ میٹھا کرایا۔ اس دوران ویڈیو اور تصویریں بنتی رہیں۔ سکندر کی ایک بہن مائیک کے ذریعے اس کے رشتہ داروں کو ویڈیو بنوانے کے لیے باری باری اسٹیج پر بلا رہی تھی۔ سکندر کو انگوٹھی پہنانے میں پانچ منٹ لگے لیکن ویڈیو اور تصویریں بنانے کا سلسلہ ایک گھنٹا تک چلتا رہا۔ اس کے بعد کھانے کا دور شروع ہوا اور رات تقریباً ایک بجے ہماری واپسی ہوئی۔

اگلے ہی ہفتے سکندر کی ماں کا فون آگیا۔ وہ شادی کی تاریخ طے کرنا چاہ رہی تھیں ان کی یہ انوکھی فرمائش سن کر خالہ پریشان ہوگئیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سکندر کے گھر والے اتنی جلدی شادی کی تاریخ مانگ لیں گے اور ابھی تک انہوں نے کوئی تیاری بھی نہیں کی تھی، اس لیے انہوں نے وقتی طور پر ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ وہ اپنے بیٹوں سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی جواب دیں گی۔ سکندر کی ماں بھی اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ مشورہ کرلیں ہم آپ کو زیادہ سے زیادہ چھ مہینے کا وقت دے سکتے ہیں۔

یہ سنتے ہی خالہ کے ہوش اڑ گئے۔ شادی کی تیاری کے لیے چھ مہینے بہت کم تھے کیونکہ ان کے پاس جہیز کے نام پر ایک تنکا بھی نہیں تھا۔ شوہر کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ وہ سرکاری ملازم تھے۔ ان کے انتقال پر جو گریجویٹی اور فنڈ

درد کاکوروی

(1891ء...1972ء)

علامہ میر نذر علی کا اصلی نام مکرم احمد اور تخلص درد تھا۔ حکیم سید حبیب علی کاکوروی کے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے درد کاکوروی کہلائے۔ ان کی پیدائش اٹاوہ میں 1891ء میں ہوئی۔ درد کاکوروی کو شعرائے قدیم کی طرح نظم نگاری سے رغبت رہی۔ غزلیہ انداز میں حمد و نعت لکھتے۔ صوفیانہ نظمیں کہیں تو مجموعہ کا نام یہی رکھا۔ نعتیہ صنف میں ''جامِ کوثر'' اور ''درد و درماں'' نامی دو عدد مجموعے درد کاکوروی کی یاد ہمیشہ پڑھنے لکھنے والے نعت نگار اور اس کی تحقیق کے جویا حضرات کو دلاتے رہیں گے۔ 26 جون 1972ء کو آپ کا وصال ہوا۔ عزیز آباد قبرستان میں قبر بنی ہے۔

سعید الدین فاروقی

(1875ء...1989ء)

قاضی امین الدین فاروقی کے صاحبزادے سعید الدین فاروقی منصب قضا کے وارث چاروں سلسلوں سے وابستہ نقشبندی کہلائے۔ ''مناجاتِ سعید''، ''حیات السعید'' اور ''گوہرِ عقیدت'' منقبتی کلام کے مجموعے ان کی یادگار ہیں۔ 3 ستمبر 1875ء (گزشتہ سے پیوستہ صدی) کو کانپور کے مقام گھاٹم پور میں پیدا ہوئے۔ کراچی میں مجاز شیخ طریقت کہلانے والے 16 اکتوبر 1959ء کو وصال کے بعد پاپوش نگر قبرستان میں ''گلزار سعیدیہ'' نامی حجرے میں دفن کیے گئے۔ ہر سال عرس ہوتا ہے۔

www.pakistanipoint.com

کے پیسے ملے وہ خالہ نے قومی بچت میں انویسٹ کر دیے تھے۔ وہاں سے ہر مہینے منافع کی شکل میں کچھ رقم مل جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے دو بیٹے برسرروزگار تھے۔ وہ بھی گھر کے خرچ میں تھوڑا بہت حصہ ڈالتے تھے لیکن ان کی مالی حیثیت ایسی نہ تھی کہ وہ اتنے کم وقت میں شادی کی تیاری کر سکتے۔

شام کو انہوں نے دونوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ وہ بھی یہ سن کر پریشان ہو گئے۔ بڑا بیٹا اسد غصے کا تیز اور تھوڑا سا جذباتی تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا ''اتنے کم وقت میں شادی کی تیاری نہیں ہو سکتی۔ انہیں کہہ دیں کہ ہم ایک سال بعد شادی کریں گے۔''

''بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' چھوٹے بیٹے اشرف نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہمارے پاس کوئی خزانہ تو ہے نہیں۔ ظاہر ہے کہ کہیں نہ کہیں سے انتظام کرنا ہوگا اور اس کے لیے وقت چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' خالہ مطمئن ہوتے ہوئے بولیں۔ ''میں ان سے کہہ دیتی ہوں کہ ہمیں تیاری کے لیے کچھ وقت چاہیے اس لیے ایک سال بعد شادی ہوگی۔''

خالہ کا خیال تھا کہ سکندر کی ماں ان کی بات مان جائیں گی لیکن وہ بھی اپنی ضد کی پکی تھیں۔ انہوں نے اپنی بات اوپر رکھتے ہوئے کہا ''آج کل تیاری میں کیا دیر لگتی ہے۔ بازار میں سب کچھ بنا بنایا مل جاتا ہے۔ ویسے بھی آپ کو زیادہ چیزیں دینے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ آپ اپنی خوشی سے لڑکی کو چند جوڑے اور تھوڑا بہت زیور دے دیں۔ وہی کافی ہے۔''

''سب یہی کہتے ہیں۔'' خالہ نے جل کر کہا۔ ''لیکن اگر توقع کے مطابق لڑکی جہیز لے کر نہ آئے تو ساری عمر اسے طعنے سننا پڑتے ہیں۔''

''معاف کیجیے ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہیں جہیز کا لالچ ہوتا ہے۔ آپ ایک شربت کے پیالہ پر بھی رخصتی دیں گی تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں آپ کو اپنا سمجھ کر کہہ رہی ہوں کہ زیادہ زیر بار ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس آپ ہمیں شادی کی تاریخ دے دیں۔''

اس کے بعد خالہ کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا انہیں خاموش ہونا پڑا اور چھ ماہ بعد کی تاریخ دے دی گئی۔ خالہ کے خاندان میں ایک اچھا رواج یہ ہے کہ لڑکی کی شادی کے موقع پر تمام قریبی رشتہ دار جہیز میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں اور پہلے سے بتا دیا جاتا ہے کہ کون کیا دے گا۔ نوشین کی شادی پر بھی یہی ہوا۔ خالہ کے بھائیوں، بہنوں، جیٹھ اور بھتیجوں نے مل کر تمام سامان پورا کر دیا جس میں فرنیچر، ٹی وی، فریج، ڈنر سیٹ اور کراکری وغیرہ شامل تھی۔ کچھ لوگوں نے نقد رقم دینے کا وعدہ کیا۔ میں نے بھی فرحین سے مشورہ کر کے برات کے کھانے کا ذمہ لے لیا۔ اس طرح اب خالہ کو صرف کپڑوں اور زیور کا انتظام کرنا تھا۔

الغرض یہ کہ نوشین کی شادی بڑے اچھے طریقہ سے انجام پائی۔ کسی چیز میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اس موقع پر بھی سکندر کے دوستوں نے اسی بے ہودگی اور چھچھورپن کا مظاہرہ کیا جو وہ منگنی پر کر چکے تھے۔ اس مرتبہ ان کا ساتھ دینے کے لیے سکندر کے کزنز اور دوسرے رشتہ دار بھی موجود تھے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ شادی میں نہیں بلکہ کوئی قلعہ فتح کرنے آئے ہیں۔ سکندر کے ساتھ آنے والے براتیوں کو دیکھ کر مجھے بہت مایوسی ہوئی وہ لوگ کسی لحاظ سے بھی ہمارے ہم پلہ نہیں تھے۔ میں سوچنے لگا کہ نوشین کن لوگوں میں پھنس گئی۔

شادی کے ابتدائی چند ماہ بہت اچھے گزرے۔ بظاہر نوشین بڑی خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ سکندر اسے شمالی علاقوں کی سیر کروانے بھی لے گیا تھا۔ وہ لوگ پندرہ دن بعد واپس آئے۔ نوشین اپنی ماں اور بہنوں کے لیے بہت سی چیزیں لے کر آئی تھی۔ اس نے فرحین کو بھی ایک کشمیری شال تحفہ میں دی۔ اسے خوش دیکھ کر ہم بھی مطمئن ہو گئے۔

نوشین ہر دوسرے تیسرے دن سکندر کے ساتھ میکے کا چکر لگاتی لیکن ہمیشہ سکندر کا کوئی دوست اس کے ساتھ ہوتا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی لیکن بہت جلد اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ دراصل سکندر کے پاس اپنی گاڑی نہیں تھی اس لیے کہیں آنے جانے کے لیے اسے اپنے کسی دوست سے گاڑی مانگنا پڑتی تھی کیونکہ اسے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی۔ اس لیے وہ کہیں آنے جانے کے لیے دوستوں کا محتاج تھا۔

نوشین کو یہ بات اچھی نہ لگی اور ایک دن اس نے سکندر سے کہہ ہی دیا کہ وہ اپنی گاڑی کیوں نہیں خرید لیتا۔ اس پر سکندر نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ''پاگل ہو گئی ہو۔ کار کہاں سے خریدوں۔ ابا سے جو جیب خرچ ملتا ہے، اس میں اپنا ہی گزارہ نہیں ہوتا۔''

''آپ اپنا کام کیوں نہیں کرتے تاکہ یہ محتاجی ختم ہو۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ ہم کہیں آنے جانے کے لیے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

دوسرے لوگوں سے گاڑی مانگیں۔"
"وہ دوسرے لوگ نہیں، میرے جگری یار ہیں۔ رات کے دو بجے بھی بلاؤں گا تو دوڑے ہوئے چلے آئیں گے۔ جہاں تک کام شروع کرنے کا تعلق ہے تو میں خود بھی کوشش میں لگا ہوا ہوں لیکن کوئی ڈھنگ کی جگہ نہیں مل رہی۔"

اسی طرح ایک سال گزر گیا لیکن سکندر کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اسی طرح صبح دیر سے سو کر اٹھتا اور بارہ ایک بجے ناشتا کرنے کے بعد دوستوں سے ملنے چلا جاتا۔ اس کی واپسی رات ڈیڑھ دو بجے تک ہوتی۔ نوشین بے چاری اس کے انتظار میں جاگتی رہتی کہ وہ آئے تو اسے کھانا گرم کرکے دے لیکن اکثر وہ دوستوں کے ساتھ باہر ہی کھانا کھالیتا پھر ایک دن اس نے نوشین سے کہہ ہی دیا کہ وہ اس کا انتظار نہ کیا کرے اگر اسے بھوک ہوگی تو وہ خود ہی کھانا گرم کرلے گا۔

اس دوران دو اہم واقعات ہوئے۔ نوشین ایک بیٹی کی ماں بن گئی اور سکندر کے والد کا انتقال ہوگیا۔ سکندر نے بیٹی کی پیدائش پر بڑی خوشی منائی اور دھوم دھام سے اس کا عقیقہ کیا لیکن باپ کے مرنے کے بعد اس کا ہاتھ تنگ ہوگیا۔ کیونکہ پراپرٹی کے کاروبار سے ہونے والی آمدنی ختم ہوگئی اور کارخانہ سے جو ملتا اس سے گھر کا خرچ چل رہا تھا۔ اب اسے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے ماں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑ رہا تھا۔ ویسے تو اس کا کوئی ذاتی خرچ نہیں تھا۔ البتہ وہ بے تحاشا سگریٹ پیتا تھا جس کے لیے اسے پیسوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ اسے اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ اس پر بیوی اور بیٹی کی ذمّے داری بھی ہے۔ نوشین کی شادی کو ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا تھا لیکن اس دوران اس نے بھی نیا جوڑا نہیں بنایا تھا اور وہ گھر میں بھی شادی کے جوڑے پہن کر ہی گزارہ کررہی تھی۔

بچی کی بھی دس ضرورتیں تھیں۔ اس کے لیے دودھ، پیمپر اور کپڑوں کے لیے رقم درکار تھی۔ خالہ نے یہ صورت حال دیکھی تو انہوں نے بیٹوں سے کہا کہ وہ اس مشکل وقت میں نوشین کی مدد کریں چنانچہ دونوں بیٹے اپنی استطاعت کے مطابق اس کے ہاتھ پر کچھ نہ کچھ رکھنے لگے۔ فرحین بھی جب کبھی اس کے گھر جاتی تو کسی نہ کسی بہانے اس کی مدد کردیتی۔ ہم سب کو یہی اُمید تھی کہ جب سکندر اپنا کام شروع کردے گا تو نوشین کے حالات بھی بہتر ہوجائیں گے لیکن وہ وقت کبھی نہیں آیا۔

سکندر کی ماں بھی اس صورت حال سے بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے کئی مرتبہ سکندر کو اس کی ذمّے داریوں کا احساس دلانے کی کوشش کی لیکن اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی بلکہ اس نے یہ کہہ کر ماں کو لاجواب کردیا کہ کارخانہ دونوں بھائیوں کی مشترکہ ملکیت ہے اس لیے وہاں سے ہونے والی آمدنی پر اس کا بھی حق ہے۔ سکندر کی ماں وقتی طور پر خاموش ہوگئیں کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ دونوں بھائیوں میں اس معاملہ پر کوئی جھگڑا ہو لیکن انہوں نے اتنا ضرور کہا کہ فہیم ہر مہینے جو پیسے دیتا ہے، ان سے صرف کچن کا خرچ چل رہا ہے اس لیے سکندر کو چاہیے کہ وہ اپنی فیملی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کوئی کام شروع کرے۔

انہی دنوں فہیم کا اپنے ایک دوست کی بہن پر دل آگیا اور اس نے ماں سے کہا کہ وہ ثمینہ سے اس کا رشتہ طے کردیں۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھیں کیونکہ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ فہیم کی شادی اپنی بھانجی سے کریں گی اور انہوں نے یہ بات فہیم کو بھی بتادی۔ اس پر دونوں میں خوب بحث ہوئی اور فہیم نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ثمینہ سے ہی شادی کرے گا چاہے اس کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنا پڑے۔ سکندر کی ماں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ فہیم کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ کرتیں۔ لہٰذا انہیں مجبوراً ثمینہ کے گھر رشتہ مانگنے کے لیے جانا پڑا۔ بظاہر یہ ایک رسمی کارروائی تھی کیونکہ فہیم اور ثمینہ کے درمیان تمام معاملات پہلے ہی طے پاچکے تھے۔

فہیم کی شادی انتہائی سادگی سے ہوئی۔ وہ پیسے کو دانتوں سے پکڑنے والا شخص تھا اس لیے اس نے موقع پر بھی کوئی فضول خرچی نہیں کی۔ مہندی، بری، ولیمہ سب میں اس نے کفایت شعاری دکھائی۔ وہ شادی کے بعد بیوی کو لے کر کہیں سیروتفریح کے لیے بھی نہیں گیا بلکہ اس نے کارخانہ سے صرف تین دن چھٹی کی اور چوتھے روز کام پر چلا گیا کیونکہ وہاں ایک آرڈر کا کام چل رہا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس میں کوئی تاخیر ہو۔

فہیم کی بیوی ثمینہ بہت تیز اور چالاک عورت تھی۔ اس نے چند ہی دنوں میں اندازہ لگالیا کہ ساری ذمّے داری فہیم کی ہے اور وہی کارخانہ میں دن رات محنت کرکے یہ گھر چلا رہا ہے چنانچہ اس نے بھی حاکمانہ انداز اختیار کیا۔ ساس اور نندوں کو تو وہ کسی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ البتہ نوشین کے

WaqarAzeem www.pakistanipoint.com

ساتھ اس کا رویہ قدرے بہتر تھا وہ جب اسے اپنی ضرورتوں کے لیے پریشان دیکھتی تو اسے نوشین سے ہمدردی محسوس ہونے لگتی۔ اسے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ پڑھی لکھی لڑکی ایک نکھٹو کے پلے بندھ گئی ہے۔

ایک دن موقع دیکھ کر اس نے نوشین سے کہا کہ وہ کوئی ملازمت کرے تاکہ اس کی تنگی دور ہو اور وہ کم از کم اپنی بچی کی ضرورتیں پوری کر سکے۔ نوشین نے ابھی تک اس بارے میں نہیں سوچا تھا اس لیے وہ ثمینہ کا مشورہ سن کر حیران رہ گئی اور بولی ”میں ملازمت کیسے کر سکتی ہوں۔ مجھے گھر کے کام کے ساتھ بچی کو بھی دیکھنا ہوتا ہے۔ سکندر کو دیر سے اٹھنے کی عادت ہے اس لیے انہیں ناشتا دینا اور کپڑے استری کرنا بھی میرے فرائض میں شامل ہے۔“

”بہت خوب“ ثمینہ طنزیہ انداز میں بولی ”اور ان خدمات کا آپ کو کیا صلہ ملتا ہے۔ یہی کہ آپ اپنی ضرورتوں کے لیے پریشان رہتی ہیں۔ اگر آپ کی امی اور بھائی مدد نہ کریں تو بچی کو دودھ بھی نہ ملے۔“

”کہتی تو تم ٹھیک ہو لیکن اگر میں نے ملازمت کر لی تو گھر کا کام کون کرے گا اور بچی کا بھی مسئلہ ہے۔“

”معاف کرنا بھابی۔ گھر کا کام صرف تمہاری ذمے داری نہیں۔ تمہاری شادی سے پہلے بھی یہ گھر چل رہا تھا اور جہاں تک بچی کا تعلق ہے تو اس کی دیکھ بھال کے لیے کوئی لڑکی رکھ لینا جو تمہاری غیر موجودگی میں اس کا خیال رکھے۔“

”ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔“ نوشین کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”لیکن کیا یہ لوگ مجھے ملازمت کرنے دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ سکندر اسے پسند نہ کریں۔“

”وہ کس منہ سے آپ کو منع کریں گے۔“ ثمینہ نے منہ بناتے ہوئے کہا ”انہوں نے آج تک آپ کے لیے کیا کیا ہے۔ اپنی سگریٹ کے لیے تو وہ ماں سے پیسے مانگتے ہیں۔“

”اچھا۔ میں بات کر کے دیکھتی ہوں۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو اگلا مرحلہ تلاش کرنے کا ہوگا۔“

”وہ بھی مل ہی جائے گی۔“ ثمینہ نے بڑے وثوق سے کہا۔ ”آپ نے ماسٹر کر رکھا ہے اگر سرکاری نہیں تو کسی پرائیویٹ کالج میں لیکچرار کی جاب مل ہی جائے گی ورنہ کسی بڑے اسکول میں کوشش کریں۔ سنا ہے کہ وہ بھی اچھی تنخواہ دیتے ہیں۔“

نوشین کی سمجھ میں بات آ گئی اور اس نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر ملازمت کے لیے تیار کر لیا دوسرے دن جب سکندر ناشتا کرنے کے بعد باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو نوشین نے اچانک ہی ملازمت کا ذکر چھیڑ دیا۔ ”سکندر۔ میں سوچ رہی ہوں کہ کوئی ملازمت کر لوں۔“

سکندر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے تیکھے لہجہ میں کہا ”تمہیں ملازمت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟“

”دیکھو سکندر۔ گھر کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ فہیم جو کچھ امی کو دیتا ہے اس سے گھر کا خرچ ہی بمشکل پورا ہو رہا ہے۔ مجھے اپنی اور بچی کی ضرورتوں کے لیے بھائیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ وہ بھی کب تک مجھے سپورٹ کریں گے اسی لیے میں نے ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ مجھے کسی کی محتاجی نہ رہے۔“

سکندر سر کھجاتے ہوئے بولا ”دیکھ لو تم گھر کی ذمے داریوں کے ساتھ جاب کر سکو گی؟“

”میرا مسئلہ ہے، کوئی نہ کوئی بندوبست کر لوں گی۔ میری کوشش ہوگی کہ کسی اسکول یا کالج میں ملازمت مل جائے تاکہ میں ایک ڈیڑھ بجے تک گھر واپس آ جاؤں۔“

اس کے بعد سکندر کچھ نہیں بولا اور معمول کے مطابق دوستوں سے ملنے چلا گیا جبکہ نوشین یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ اسے سختی سے منع کر دے گا اور یہی کہے گا کہ وہ بہت جلد اپنا کام شروع کرنے والا ہے پھر اسے ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ لگتا تھا کہ سکندر کو اپنی ذمے داریوں کا بالکل بھی احساس نہیں تھا۔

سکندر کی ماں کو جب نوشین کے ارادے کا علم ہوا تو وہ بھی پریشان ہو گئیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں ”میں تمہیں روکوں گی نہیں جب اپنا ہی کھونٹا مضبوط نہ ہو تو کسی دوسرے کو کیا دوش دینا۔ اس بے غیرت کو یہ بھی احساس نہیں کہ اس کی دو بہنیں بن بیاہی بیٹھی ہیں۔ ان کی بھی شادی کرنی ہے۔“

نوشین نے ساس اور شوہر کی طرف سے گرین سگنل ملنے کے بعد ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ وہ کئی کالجوں اور اسکولوں میں گئی لیکن کہیں سے بھی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔ اس کے باوجود نوشین نے ہمت نہ ہاری اور کوشش جاری رکھی۔ اس نے اپنے یونیورسٹی کے کلاس فیلوز سے بھی رابطہ کیا کہ وہ اس کے لیے کوئی ٹیچنگ جاب دیکھیں۔ بالآخر اس کی کوشش رنگ لائیں اور دو ماہ کی تگ و دو کے بعد اسے ایک پرائیویٹ کالج میں لیکچرار کی ملازمت مل گئی۔ گو کہ تنخواہ سرکاری کالج کے مقابلہ میں بہت کم تھی لیکن نوشین کے لیے

www.paksociety.com

کچھ نہ ہونے سے بہتر تھا۔ اس تنخواہ سے اس کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری ہوسکتی تھیں۔

اب اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اسے صبح آٹھ بجے کالج پہنچنا ہوتا۔ اس کے لیے وہ ایک گھنٹا پہلے گھر سے نکلتی کیونکہ اسے دو بسیں بدلنا ہوتی تھیں۔ سکندر کی ماں نے کہہ دیا تھا کہ جب تک کسی لڑکی کا بندوبست نہیں ہوتا وہ بچی کو دیکھ لیا کریں گی جبکہ سکندر کو ناشتا دینے کی ذمّے داری اس کی بہنوں پر آگئی اور پہلے دن ہی سکندر کو فرق محسوس ہوگیا۔ نوشین اسے ناشتے میں پراٹھا، آملیٹ اور تازہ چائے بنا کر دیتی تھی جبکہ اس کی غیر موجودگی میں اسے دو جلے ہوئے توس اور صبح کی بنی ہوئی چائے ملی جب سکندر نے احتجاج کیا تو ماں نے کہا۔ ''بار بار چائے نہیں بن سکتی اگر ڈھنگ سے ناشتا کرنا ہے تو صبح جلدی اٹھا کرو۔''

نوشین کی چھٹی ایک بجے ہوتی تھی لیکن گھر آتے آتے دو بج جاتے۔ وہ کھانے کے بعد بچی کی دیکھ بھال میں لگ جاتی۔ اس کے علاوہ اسے شام کے کھانے کی تیاری بھی کرنی ہوتی تھی۔ ثمینہ بھی اس کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹاتی لیکن اسے بہت سی چیزیں بنانی نہیں آتی تھیں اس لیے کچن کا زیادہ کام اسے ہی کرنا پڑتا لیکن وہ اس میں بھی خوش تھی۔ اب اس نے رات کے کھانے پر سکندر کا انتظار کرنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ اب بھی پہلے کی طرح باہر سے کھانا کھا کر آتا تھا۔

نوشین کو پہلی تنخواہ ملی تو اس نے اپنے لیے دو جوڑے اور بیٹی کے لیے کچھ فراکیں خریدیں اور ساس کے ہاتھ پر پانچ ہزار رکھے تاکہ وہ بھی اپنے اور بیٹیوں کے لیے کپڑے بنا سکیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ کافی عرصہ سے ان لوگوں کو نئے کپڑے نصیب نہیں ہوئے سکندر کی ماں نے پہلے تو پیسے لینے سے انکار کیا پھر بھرّائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''تمہارا بہت بڑا دل ہے ورنہ آج کل کون ساس نندوں کی پروا کرتا ہے۔''

''یہ کہہ کر آپ مجھے شرمندہ مت کریں۔'' نوشین بولی ''جب ہم ایک گھر میں رہتے ہیں تو یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ایک دوسرے کا خیال رکھیں۔''

جب سکندر کو معلوم ہوا تو وہ کہنے لگا۔ ''اتنی دریا دلی دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ ان لوگوں کے پاس کپڑوں کی کوئی کمی نہیں اور پھر فہیم انہیں ہر مہینے اچھی خاصی رقم دیتا ہے ضرورت پڑنے پر وہ خود بھی اپنے لیے کپڑے بنا سکتی ہیں۔''

''فہیم جو پیسے دیتا ہے۔ ان سے گھر کا خرچ ہی بمشکل پورا ہوتا ہے۔ کپڑے جوتے کہاں سے خریدیں گی۔'' نوشین نے جواب دیا۔

نوشین کا خیال تھا کہ اسے ملازمت کرتا دیکھ کر شاید سکندر کی غیرت جاگ جائے اور وہ کسی کام دھندے کے بارے میں سوچے لیکن اس نے تو بے حسی کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ نوشین کو کام پر جاتے ہوئے تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ ثمینہ نے ایک معمولی سی بات کو بہانہ بنا کر نیا شوشہ چھوڑ دیا۔ ہوا یوں کہ اسے دیر تک سونے کی عادت تھی۔ وہ رات کو دس بجے کے قریب اپنے کمرے کا اے سی آن کرتی جو اگلے روز بارہ ایک بجے تک چلتا رہتا جس کی وجہ سے بل بہت بڑھ گیا تھا۔ اس پر ایک دن سکندر کی ماں نے اسے ٹوک دیا اور کہا کہ وہ صبح کے وقت اے سی بند کر دیا کرے۔

اس پر ثمینہ نے خوب نمک مرچ لگا کر فہیم کے کان بھرے اور کہا کہ وہ اتنی پابندیاں برداشت نہیں کرسکتی۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ لوگ الگ ہوجائیں۔ ویسے بھی یہ گھر چھوٹا پڑ رہا ہے اور یہاں اتنی جگہ بھی نہیں کہ وہ اپنے جہیز کا سامان سیٹ کرسکے۔ فہیم اس کی باتوں میں آگیا۔ نارتھ ناظم آباد میں ان کا ایک فلیٹ کرایہ پر اٹھا ہوا تھا۔ وہ اس نے خالی کروایا اور وہاں شفٹ ہوگیا۔ اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے یہ نہیں سوچا کہ کیا وہ دو گھروں کا خرچ برداشت کرسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے ماں کو دینے والے پیسوں میں کٹوتی کردی۔

اب سکندر کی ماں کے لیے گھر کا خرچ چلانا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ انہوں نے سکندر کو پوری صورتِ حال بتائی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ وہ الٹا فہیم سے لڑنے کارخانہ پہنچ گیا اور کہا کہ یہاں سے ہونے والی آمدنی میں وہ بھی برابر کا شریک ہے اس لیے اسے منافع میں نصف حصہ ملنا چاہیے۔

فہیم نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی اور کارخانہ کی چابیاں اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم یہ کارخانہ چلاؤ۔ میں کوئی اور کام دیکھ لیتا ہوں تم مجھے میرا حصہ دیتے رہنا۔''

یہ سن کر سکندر کی سٹی گم ہوگئی اور اس نے کہا۔ ''میں نے کارخانہ کی چابیاں نہیں مانگیں بلکہ صرف اپنے حصے کا مطالبہ کیا ہے۔''

''بھائی۔ میں اب بھی اس سے کچھ زیادہ ہی دے رہا ہوں۔ تم چاہو تو حساب چیک کرلو۔''

''دیکھو فہیم۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' سکندر نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے الگ ہوجانے سے ہماری

مشکلات بڑھ گئی ہیں اور گھر کا خرچ چلانا مشکل ہو رہا ہے۔"

"اس کی دو صورتیں ہیں" فہیم نے کہا۔ "اپنا کوئی کام شروع کر دو یا پھر میرے ساتھ کارخانہ میں بیٹھنا شروع کر دو۔ ہم دونوں مل کر کام کریں گے تو آمدنی بڑھ جائے گی جس کا فائدہ تمہیں بھی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر سکندر وہاں سے چلا آیا۔ فہیم کی باتوں سے اسے بڑی مایوسی ہوئی تھی اور وہ سمجھ گیا تھا کہ فہیم نے کام کرنے کا مشورہ دے کر اسے ٹالنے کی کوشش کی تھی اور دوسرے لفظوں میں اسے جتا دیا تھا کہ جو کچھ وہ دے رہا ہے، اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ سکندر کے لیے فہیم کی تجاویز پر عمل کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اپنا کاروبار شروع کرنے کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ اس کا انتظام وہ کہاں سے کرتا اور کارخانہ میں بیٹھنا اس کے مزاج اور طبیعت کے خلاف تھا۔

سکندر کے حالات دن بہ دن خراب ہوتے جا رہے تھے۔ مالی تنگی نے اسے بے حد چڑچڑا بنا دیا تھا۔ وہ ماں سے سگریٹ کے لیے پیسے مانگتا تو اسے جواب میں دس باتیں سننے کو ملتیں۔ مجبوراً اس نے نوشین کے آگے ہاتھ پھیلانا شروع کر دیا۔ نوشین کی تنخواہ میں بھی اب گزارہ نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اب وہ گھر کے اخراجات پورے کرنے میں بھی ساس کی مدد کر رہی تھی۔

جن دوستوں کی خاطر سکندر نے اپنی زندگی برباد کی، وہ بھی اب اس سے کترانے لگے تھے۔ ایک وقت تھا جب وہ اس کے ایک اشارہ پر دوڑے چلے آتے تھے لیکن اب بار بار فون کرنے پر بھی وہ اس کو جواب نہ دیتے کیونکہ سکندر کی جیب خالی ہو چکی تھی اور وہ انہیں ہوٹلوں میں کھانا کھلانے یا تفریح کروانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اس کا سب سے گہرا دوست راشد تھا۔ ان دونوں کا بیشتر وقت ایک ساتھ ہی گزرتا سکندر نے جب کبھی اسے کسی کام سے بلایا تو وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا لیکن کئی ہفتوں سے اس نے بھی شکل نہیں دکھائی تھی اور نہ ہی اس سے فون پر رابطہ ہو رہا تھا۔ سکندر کو اس کا گھر معلوم نہیں تھا اور ان کی ملاقات چوک میں واقع پٹھان کے ہوٹل میں ہوتی تھی۔ سکندر نے وہاں کے کئی چکر لگائے لیکن وہ نظر نہیں آیا۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ سکندر کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ راشد کو کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا۔ وہ راشد کے بارے میں جاننے کے لیے ہر روز پٹھان کے ہوٹل کا چکر لگاتا پھر ایک دن وہ اسے نظر آ گیا۔ سکندر اپنے معمول کے مطابق پٹھان کے ہوٹل پہنچا تو راشد کونے کی میز پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ سکندر اسے دیکھتے ہی تیر کی طرح اس کے پاس پہنچا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "کہاں چلا گیا تھا شہزادے۔ اتنے دنوں سے تیری کوئی خبر ہی نہیں ملی۔"

"جانا کہاں ہے سکندر بھائی۔" وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ "دراصل میں نے ملازمت کر لی ہے۔"

"تجھے ملازمت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" سکندر حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "تیرے باپ کے پاس تو بہت پیسا ہے۔"

"ہاں لیکن وہ میرا نہیں ہے۔ مجھے اپنی ہر ضرورت کے لیے باپ کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ کل کو ان کی آنکھیں بند ہو گئیں تو میری ضرورتیں کون پوری کرے گا۔ ہر کوئی تمہاری طرح خوش قسمت نہیں ہوتا۔ تمہیں پڑھی لکھی بیوی مل گئی ہے جو ملازمت کر کے تمہیں اور تمہارے گھر کو سپورٹ کر رہی ہے۔ تھوڑے عرصہ بعد میری شادی ہونے والی ہے لیکن میں اپنی بیوی کو کام نہیں کرنے دوں گا۔ یہ مرد کی ذمے داری ہے کہ وہ کمائے اور پورے گھر کو کھلائے۔"

سکندر کو یوں لگا جیسے راشد نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ اس سے پہلے کبھی کسی نے اسے یہ طعنہ نہیں دیا تھا۔ اس کے پاس راشد کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر ہوٹل سے باہر آ گیا۔

دوسرے دن وہ صبح سویرے بیدار ہو گیا۔ اس نے غسل کرنے کے بعد لباس تبدیل کیا اور ناشتے کی میز پر آ گیا۔ نوشین اس کی تیاری دیکھ کر حیران رہ گئی اور بولی۔ "خیریت تو ہے۔ آج اتنی جلدی اٹھ گئے۔ کیا کہیں جا رہے ہو؟"

"ہاں" وہ توس پر جیلی لگاتے ہوئے بولا۔ "کارخانہ جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ جب تک کوئی اور بندوبست نہیں ہوتا۔ کیوں نہ میں فہیم کے ساتھ مل کر کارخانہ میں کام کروں۔ اب مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ دنیا بھی اسی کو سلام کرتی ہے۔ جس کی جیب میں پیسے ہوں۔"

نوشین نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بالآخر سکندر کو بھی اپنی ذمے داری کا احساس ہو گیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ اس تھپڑ کا اثر تھا جو کسی کو نظر نہیں آیا لیکن اس کی کسک رات بھر سکندر اپنے گال پر محسوس کرتا رہا۔

++

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

خواب

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

ایک سچ بیانی ارسالِ خدمت ہے۔ انسان خواب دیکھتا ہے مگر تعبیر انہیں ملتی ہے جو اسے تعبیر دینا جانتے ہیں۔ وہ لوگ جو بغیر سوچے سمجھے زندگی گزارنا چاہتے ہیں ان کی قسمت میں صرف اندھیرا ہوتا ہے۔ یہ سچ بیانی اسی کی عکاس ہے۔ نوید کے گھر والے اگر عقل سے کام لیتے تو باقی بھائی بہنوں کا یہ حشر نہ ہوتا۔

اعتزاز سلیم وصلی
(فیصل آباد)

''اماں دیکھیں، بھائی آیا ہے ویڈیو کال پر۔'' نوید کی چھوٹی بہن سلمٰی نے اسکرین پر نوید کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔

اماں نے نظر کی عینک کو آنکھوں سے اتارا اور سلائی مشین کی ٹھک ٹھک کو روکا۔ چارپائی سے اترتے وقت جوتا پہننے کا کوئی خیال نہ رہا۔ ننگے پاؤں ہی چلتی ہوئی سیڑھیوں کے اس جانب بڑھی جہاں سلمٰی کے خیال میں انٹرنیٹ تیز چلتا تھا۔ موبائل کی اسکرین پر نظر آنے والا نوید کا چہرہ سانولا محسوس ہوا، ماں نے موبائل کو چوم لیا۔

''اونہہ اماں..... کیوں خراب کرتی ہو اسکرین؟'' سلمٰی جھنجلائی لیکن اس کی جھنجلاہٹ ماں کی محبت پر کوئی اثر نہ چھوڑ سکی۔ اماں نہ رکی اور چومتی چلی گئی۔

''اماں، اب سلائی مشین پر نہ کام کیا کر، پیسے تو بھیج دیتا

ہوں میں۔'' نوید کی آواز میں ماں کے لیے پیار تھا۔

''پتر، نکلی نہیں رہ سکتی میں، محلے والوں کے کپڑوں کی سلائی کر کے جو پیسے بنتے ہیں اس سے عابدہ کا جہیز بناؤں گی۔'' اماں پرانے خیالات کی مالکن تھی، بس لیے نوید اپنی بات نہ منوا سکا۔ اس کا حال چال پوچھ کر اماں تو واپس بیٹھ گئی مگر سلمٰی کی فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

''بھائی آپ نے عابدہ باجی کو نئے موبائل کے لیے پیسے دیئے ہیں، میرے پاس نہیں ہیں پیسے.....''

''ابھی ایک ماہ پہلے تو یہ موبائل لیا تھا تم نے۔'' وہ حیران ہوا۔

''پر اب اس کی ایل سی ڈی پر داغ آ گیا ہے۔'' اس نے نم آنکھوں سے بتایا۔ ''مجھے نہیں پتا، نیا موبائل لینا ہے مجھے۔''

''ٹھیک ہے..... اگلے ماہ الگ سے پیسے بھیجوں گا، منیر بھائی سے کہنا مجھے یاد دلوا دیں۔'' نوید کی بات سن کر وہ خوش ہو گئی۔

''اپنا خیال رکھنا بھائی۔'' اس نے مسکرا کر ویڈیو کال بند کر دی اور اگلے ماہ تک انتظار کی سولی پر لٹک گئی۔ اسی دوران گیٹ کھلا اور عابدہ اندر داخل ہوئی۔ وہ ایم اے کر رہی تھی۔ یونیورسٹی میں اس کا آخری سال تھا۔ اس کا رشتہ اپنی پھپھو کے بیٹے سے طے تھا۔ امتحانات کے بعد شادی متوقع تھی۔

''سلمٰی، بہن کو پانی دو۔''

''خود پی لے گی، نیچے اتروں گی تو نیٹ بند ہو جائے گا..... بھائی سے کہہ کر وائی فائی لگواتی ہوں، جان چھوٹے اس فضول نیٹ ورک کی سلو انٹرنیٹ اسپیڈ سے۔'' سلمٰی کا تعلیم میں دل نہیں لگتا تھا۔ بمشکل ایف اے پاس کر کے وہ گھر بیٹھ گئی تھی۔ اب اسے نت نئے فیشن اور سہیلیوں کے درمیان بیٹھ کر شوخیاں کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔

''شرم کرو، بڑی بہن تھک کر آئی ہے اور تجھے نیٹ کی پڑی ہے۔'' اماں نے جوتا اٹھایا مگر سلمٰی پر کوئی اثر نہ پڑا۔

''رہنے دیں اماں، میں خود پی لیتی ہوں..... اس لاڈلی کو نہ چھیڑ۔'' عابدہ نے تھکے لہجے میں کہا اور فریج کی طرف بڑھ گئی۔ سلمٰی نے منہ بنا کر دونوں کو دیکھا اور دوبارہ وائس ایپ کھول کر کسی نامعلوم نمبر سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی۔ عصر کی اذان بلند ہوئی تو سورج کی چمک کچھ ماند پڑ گئی۔ بہار کا موسم تھا۔ دھوپ میں جون جولائی والی حرارت نہ سہی لیکن ایک چبھن ضرور تھی۔ سورج کی واپسی کا سفر اب تیزی سے طے ہونے لگا۔ مغرب کی اذان سے پہلے منیر گھر میں داخل ہوا۔ سلمٰی اسے دیکھتے ہی نیچے اتر کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ تیس بتیس سال کا ہلکی داڑھی والا شخص تھا جس کا چہرہ اس کے غصیلے مزاج کی گواہی دیتا تھا۔

''کچھ جلدی نہیں آ گیا منیر؟'' عابدہ کو پانی لانے کا اشارہ کر کے اماں نے پوچھا۔ منیر ابھی صوفے پر بیٹھا تھا کہ اماں نے سوال کر دیا جسے سن کر وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا۔

''تو کیا کروں اماں..... ساری رات تو دکان چلا نہیں سکتا۔''

''پر شہر میں تو لوگ رات کو ہی سامان خریدنے نکلتے ہیں پھر یہ کون سا سردیوں کے دن ہیں..... موسم ٹھیک ہے۔ میں تو اکثر دیکھتی ہوں بازار رات گئے تک کھلے ہوتے ہیں۔''

''اماں آتے کے ساتھ ہی تقریر سننے کا موڈ نہیں ہے۔'' وہ بیزار لہجے میں بولا۔ ''خود تو نوید صاحب باہر بیٹھ گئے اور میرے ذمے یہ دکان لگا دی۔''

''ہاں، باہر تو جیسے وہ سیر پاٹے کرنے گیا ہے ناں؟'' اماں کو تپ چڑھی۔ ''کمانے گیا ہے۔ سارا دن وہ پائپوں سے جڑا رہتا ہے، وزن اٹھاتا ہے پھر جا کر اتنا کماتا ہے کہ تم لوگ آرام سے بیٹھ کر کھا رہے ہو۔''

''ہاں ہاں وہ کماؤ ہے اور میں نکما، اب خوش؟'' وہ کھڑا ہوا۔ ''دو منٹ سکھ کا سانس نہ لینے دینا۔'' یہ کہہ کر وہ لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ اماں بھی سب جانتی تھی، اس لیے بڑبڑاہٹ کمرے میں داخل ہوتی عابدہ کے کانوں میں پڑی۔

''تجھے یہاں سکھ کا سانس آنا بھی نہیں منیرے، باہر جا کر تھڑے پر بیٹھے گا، سگریٹ کا دھواں ہوا میں چھوڑے گا اور اپنے جیسے نکموں میں بیٹھ کر آتی جاتی لڑکیوں کو تاڑے گا، خبیث۔'' اماں نے دانت پیسے۔ وہ سب اس معمول کے عادی تھے۔ ان کے لیے نئی بات نہیں تھی اس لیے گھر میں خاموشی رہی۔

☆☆☆

محلے میں موجود اکلوتی دکان کے مالک احمد علی نے ساری زندگی صبر و شکر سے گزار دی۔ بیوی بھی خدا کے کرم سے صبر والی ملی تھی، اس لیے ہاجرہ کے ساتھ اس کی جوڑی خوب رہی۔ اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑا منیر جو پڑھنے میں انتہائی نکما اور محنت کرنے سے انکاری تھا۔ اس کے بعد عابدہ جو پڑھنے میں تیز اور کسی حد تک گھریلو حالات کو سمجھنے والی لڑکی تھی۔ عابدہ کے بعد نوید تھا جسے پڑھنے کا شوق تھا اور

www.pakistanipoint.com

اس کے بعد سلمیٰ تھی جس کی دنیا خود سے شروع ہو کر خود پر ختم ہو جاتی تھی۔ زمانے کے حالات بدلتے رہے اور ان دو لڑکوں اور دو لڑکیوں پر اپنے اپنے انداز میں اثر کرتے چلے گئے۔

نجانے کب اور کیوں جگر کے کینسر نے احمد علی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو ساری جمع پونجی اور دکان کا سامان بک گیا لیکن اس کا علاج ممکن نہ ہو سکا۔ ایک کمانے والا تھا۔ دکان یا گھر بیچنے کی نوبت آئی تو اس نے صاف انکار کر دیا اور اپنی اولاد کی خاطر جان قربان کر دی۔ احمد علی چل بسا۔ اب گھر کی روزی روٹی چلانے کے لیے منیر کو کچھ کرنا تھا لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ ہاجرہ نے سلائی مشین چلانی شروع کر دی۔ اس کے خیال میں نوید یا عابدہ میں سے کوئی پڑھ لکھ کر نوکری پر لگ جائے گا لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ گھر کے حالات بگڑتے چلے گئے۔ مالی مشکلات نے اس سفید پوش گھرانے کو ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیا مگر نوید سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ وہ چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ بڑا کرنے کا سوچنے لگا۔ انہی دنوں ان کے ایک دور کے رشتے دار سے اس کی ملاقات ہوئی۔ یہ انکل کافی دنوں سے دبئی میں تھے اور ایک پائپ بنانے والی فیکٹری میں ملازمت کر رہے تھے۔ انہیں اپنے ماتحت کام کرنے والے کچھ ورکرز کی ضرورت تھی۔ انہوں نے نوید کی زبانی اس کے حالات سنے تو اس کو اپنے ساتھ دبئی آنے کی دعوت دی۔ اس کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ پاسپورٹ وغیرہ بنوانے کا تمام خرچ وہ خود دے رہے تھے۔ ماں کے مشورے سے اس نے تیاری پکڑی اور آنکھوں میں کئی خواب سجا کر دبئی آ بسا۔ جس طرح لوگ سمجھتے تھے کہ بیرونی ممالک میں پیسے درختوں پر لگے مل جاتے ہیں، اس طرح ہرگز نہیں تھا۔ نوید کو بھی یہاں آ کر اس بات کا اندازہ ہوا لیکن وہ محنتی بندہ تھا۔ اپنے سینئرز کی گالیاں سن کر، مالک کی جھڑکیں کھا کر بھی ڈٹا رہا اور کام کرتا رہا۔ کمائی اچھی تھی۔ گھریلو حالات تبدیل ہونے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ نوید نے دن رات محنت کی۔ ایک نوکری کے ساتھ ساتھ وہ رات کو پارٹ ٹائم جاب بھی کرنے لگ گیا۔ رات سات آٹھ بجے تک پائپ بنانے والی فیکٹری میں کام کرنے کے بعد وہ دو گھنٹے آرام کرتا اور پھر ایک اسٹور پر چلا جاتا۔ اس کے پاس سونے کے لیے بمشکل تین گھنٹے ہوتے تھے۔ کھانے پینے کا ہوش نہ تھا۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ یہاں دو تین سال گزار کر اتنا کما لے کہ اپنے ملک میں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار سیٹ کر لے لیکن جس طرح گھر والوں کے حالاتِ زندگی تبدیل ہوئے، ویسے ہی ذہن بھی بدل گئے۔

نوید نے منیر کو ابا کی دکان بیچنے کا کہا جسے بیچ کر مین بازار میں دکان خرید کر دی گئی۔ ٹوٹل خرچا نوید نے کیا تھا۔ منیر پیسوں کا تقاضا کرتا چلا گیا اور اسے پورا کرنا نوید کی مجبوری تھی۔ وہ خاموش پسند اور اپنے کام سے کام رکھنے والا تھا، اس لیے بڑے بھائی کے سامنے کچھ نہ بولا۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ نکما بھائی بھی اب کچھ کمانے لگے گا مگر یہ اس کی غلط فہمی تھی۔

منیر ہر ماہ دکان کی سیل کم ہونے کا رونا رو کر اسے مزید پیسے بھیجنے کا کہہ دیتا۔ اس کے لیے پیسے بچا کر رکھنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ سلمیٰ اور عابدہ کی الگ فرمائشیں تھیں۔ نوید کے لیے دکھ کی بات یہ تھی کہ عابدہ جسے وہ باقی دونوں سے مختلف سمجھتا تھا، اب اپنا رہن سہن مکمل تبدیل کر چکی تھی۔ پڑھی لکھی تھی مگر دولت ایسی چیز ہے جو انسان کے انداز بدلنے میں زیادہ وقت نہیں لگاتی۔ نئے موبائل، نئے فیشن کے کپڑے، پرانے محلے والا گھر چھوڑ کر نیا گھر، اچھا کھانا پینا..... سب کچھ میسر تھا اب ان لوگوں کو۔ غرور تھا کہ گردن اونچی رکھنے پر مجبور کرتا اور بھری جیب تھی کہ جو غرور کو بڑھانے میں مدد دے رہی تھی۔ ایسے میں نوید کا خیال کون کتنی دیر تک رکھتا؟ سب اپنی اپنی دنیا بساتے چلے گئے۔ خیال تھا تو بس ہاجرہ بی بی کو جو دن بہ دن اس کے کمزور ہوتے وجود اور سانولی رنگت کو لے کر پریشان ہوتی رہتی تھیں۔ اس کی اپنی عمر اب آرام کرنے کی تھی مگر سلائی مشین نکال کر آنکھوں پر نظر کی عینک لگائے وہ محلے والوں کے کپڑوں کی سلائی کرنے میں مصروف رہتی۔ سلمیٰ اور عابدہ کو اس پر اعتراض تھا کہ محلے والے انہیں درزن کی بیٹیاں کہتے ہیں لیکن وہ شاید بھول گئی تھیں کہ احمد علی کے بعد جب فاقوں کی نوبت تھی تب اسی درزن کی کمائی سے ان کے پیٹ کا جہنم سرد ہوتا تھا۔ نوید کو البتہ ماں پیاری تھی اس لیے وہ بار بار اسے آرام کرنے اور ہر ماہ ڈاکٹر کو چیک اپ کروانے کا کہتا رہتا۔ ہاجرہ کو بچوں کی شادی کی فکر تھی، سب سے پہلے منیر کی باری تھی جس کو رشتے داروں میں سے کوئی اپنی بیٹی دینے کو تیار نہ تھا کیونکہ سب اسے نکما تصور کرتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ یہ بھائی کی دولت پر عیش کرنے والا بندہ ہے۔ آج نہیں تو کل نوید واپس آئے گا اور اس کے بعد یہ غرور سے اکڑی گردن جھکے گی ضرور۔

منیر اس بات سے واقف تھا اس لیے بڑھتی عمر کے خیال سے اس نے پیسے کا لالچ دکھا کر دکان پر آتی ایک پرائیویٹ اسکول کی استانی کو پھانسا۔ زلیخا اس اسکول میں

پڑھاتی تھی جہاں تعلیم سے زیادہ خوبصورتی اور ادائیں دیکھی جاتی تھیں۔ میٹرک تک بچوں کو اردو پڑھانا اس کی ذمّے داری تھی۔ پورے پیریڈ میں کچھ بچوں سے ہنس کھیل کر اور کچھ میٹرک میں موجود جوانی کی طرف بڑھتے قدموں والے لڑکوں کو ادائیں دکھا کر وہ اسکول مالکان کی ضروریات کو پورا کر رہی تھی اور ملنے والی تنخواہ سے اپنے کپڑے بنوالیتی تھی۔ گھر کے مالی حالات اچھے تھے اس لیے یہ ملازمت شوقیہ تھی۔ خدا جانے شادی کا شوق یا جوانی کے تقاضے، اپنے سے آٹھ سال بڑا منیر اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ شروع میں موبائل نمبر کا تبادلہ پھر واٹس ایپ پر ویڈیو کال اور آخر میں ایک رازدار سہیلی کے گھر میں چھپ کر ملنے والے یہ دو لوگ خود پر قابو نہ رکھ سکے اور قدم بہکتے چلے گئے۔

منیر نے اماں سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے جذبات اب ایک آدھ ملاقات سے ٹھنڈے ہونے والے نہیں تھے۔ زلیخا کا صرف زبان سے ''چھوڑیئے ناں، کوئی آ جائے گا۔'' کہنا اب وہ بار بار سننا چاہتا تھا۔ حقیقت میں وہ کیا چاہتی تھی یہ منیر کو خوب علم تھا۔ ہاجرہ نے اس کی پوری بات دھیان سے سنی اور آخر میں نرم لہجے میں بولی۔ ''دیکھ منیر، گھر میں سب سے بڑا تو ہے۔ تیری جو دلہن آئے گی میرے بعد اس گھر کی سربراہ وہی ہوگی اور میری عمر ایسی ہے کہ رات کو سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے صبح آنکھ کھلے گی یا نہیں، اس لیے سوچ سمجھ کر اس لڑکی کو جانچ لے، اگر وہ تیرے اور تیری بہنوں کے ساتھ چل سکے، نبھا سکے تو مجھے کیا اعتراض؟ پر پتر یہ پسند کی شادیاں وقتی جنون ہوتی ہیں..... سال ڈیڑھ سال بعد رنگ بدل جاتا ہے تو سب بوجھ لگنے لگتا ہے۔''

''اماں! زلیخا ایسی نہیں ہے۔ پڑھی لکھی ہے، استانی ہے سمجھدار ہے۔'' اماں کی عمر ایسی ہرگز نہ تھی کہ چھپ چھپ کر ملنے والی اس لڑکی کی سمجھداری کو نہ جان سکتی۔ چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹیاں بجائیں اور دل نے زلیخا کے خلاف ہزار گواہیاں دیں مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟ منیر ویسے بھی جوانی عبور کر کے اب ادھیڑ عمر میں داخل ہو رہا تھا اس لیے اس کی بات ٹالنا مشکل تھا۔ زلیخا کے گھر وہ، عابدہ اور سلمیٰ گئیں۔ عابدہ اور سلمیٰ کو تو جدید فیشن اور نئے ڈرامے فلموں کی کہانیاں سناتی بھائی کی یہ دلہن اچھی لگی تھی، ہاں ہاجرہ بی بی کو اپنے دل کی گواہی سچی محسوس ہوئی..... خیر..... میاں بیوی راضی تھے، منگنی ہوئی اور عید پر نوید کی آمد کے ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی لیکن نوید کو چھٹی نہ مل سکی۔ اسے عید پردیس میں گزارنی تھی۔ ویسے بھی شادی کے موقع پر نوید سے زیادہ اس کے بھیجے گئے روپوں کی ضرورت تھی اور وہ بھی بھائی کے لیے جان تک لٹانے کو تیار تھا..... پیسے تو کما ہی رہا تھا اور بھیج بھی رہا تھا۔

منیر دھوم دھام سے زلیخا بیاہ لایا۔ اگلے کئی دن رنگوں بھرے تھے۔ دکان کا ہوش کسے رہتا؟ منیر کے کمرے کا دروازہ تو بس کھانے کے اوقات میں چند منٹ کے لیے کھلتا تھا۔ اس کے بعد بند ہی رہتا۔ زلیخا کی اسکول کی چھٹیاں ختم ہونے تک دونوں نے شادی کے اوّلین دنوں سے خوب لطف اٹھایا۔ جذبات کچھ قابو میں آئے تو دونوں اپنے اپنے کام پر لوٹ گئے لیکن جہاں اتنے دن دکان بند رکھی جائے وہاں پرانے گاہک بھی نئی دکان ڈھونڈ لیتے ہیں۔ کاروبار پہلے بھی نفع نہیں کما رہا تھا..... اب بھی نقصان میں تھا پر پرواہ کسے تھی؟ کمانے کے لیے بھائی تھا ناں دبئی میں۔

☆☆☆

عابدہ کی شادی اس کی پھوپھو کے بیٹے ارسلان سے طے تھی۔ ارسلان اتنا پڑھا لکھا تو نہیں تھا مگر کچھ رشوت اور کچھ سفارش کی مہربانی سے گورنمنٹ کے ایک ایسے محکمے میں کلرک تھا جہاں پیسے کمانا بہت آسان تھا اس لیے اس نے ملازمت کے لیے جتنے پیسے دیئے تھے صرف تین ماہ میں اس سے دوگنا کما لیے۔ کہتے ہیں حرام کا پیسا انسان کو آرام دیتا ہے اور نہ ہی اس کا پیٹ بھرتا ہے..... پھر ارسلان کی فطرت میں لالچ تھا اس لیے وہ جو کام بھی کرتا، فائدے کے لیے کرتا تھا۔ عابدہ کا پہلے وہ نام بھی نہیں لیتا تھا۔ اس کے گھر تک جانا ارسلان کو گوارا نہ تھا لیکن جیسے ہی نوید نے قسمت کی بازی پلٹی اور وہ پرانے محلے سے کہیں بہتر علاقے میں ایک اچھا گھر لے کر ادھر شفٹ ہوئے، ارسلان کے ساتھ ساتھ پھپھو کو بھی اپنے مرحوم بھائی کی اولاد یاد آنے لگی۔ ہاجرہ کو اس بات کا علم تھا مگر جوان بیٹی کو کب تک گھر بٹھاتی؟ خاندان سے باہر شادی وہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ادھر ارسلان نے بھی اپنی کوشش جاری رکھی۔ شروع میں عابدہ کو یونیورسٹی کے بس اسٹاپ پر اکیلا کھڑا دیکھ کر وہ 'اتفاق' سے ادھر آ جاتا۔ راستے میں کسی اچھے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا پینا اور باتیں..... وقت کے ساتھ ساتھ موبائل پر رات گئے تک چیٹ اور پھر کالیں۔ عابدہ کے دل میں بس ارسلان بسنے لگا تھا۔ ہاجرہ اندھی ہرگز نہ تھی کہ بیٹی کا یہ شرمانا اور دروازے کی اوٹ سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ارسلان کو دیکھنا، دیکھ نہ سکتی۔ بات بڑوں میں طے ہوئی تو ارسلان کے نام کی انگوٹھی عابدہ کو پہنا دی گئی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

منیر کے بعد عابدہ کی باری تھی۔ ہاجرہ کو جلدی تھی اور وہ تھوڑا تھوڑا کر کے کافی سامان اس کے لیے جوڑ چکی تھی۔ منیر کی شادی کے چھ ماہ بعد عابدہ کی شادی کی تیاریوں نے بھی زور پکڑا۔ اب کی بار بھی نوید کو چھٹی نہ ملی۔ وہ بس پیسے کمانے والی مشین تھا۔ شاید وہ اپنی حیثیت سمجھ بھی چکا تھا اس لیے اس نے اپنے لیے بچائے گئے پیسے بھی بہن کی شادی کے لیے بھیج دیئے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ارسلان کی ماں نے جہیز میں کار کا مطالبہ کیا تھا۔ ہاجرہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''بہن اتنا کچھ تو دے رہی ہوں۔'' مطالبہ سن کر اس کے منہ سے نکلا تھا۔

''ارے یہ تو فرنیچر وغیرہ ہے، اس لکڑی کا کیا فائدہ ہوگا بچوں کو؟ کار ہو تو آنا جانا آسان رہے گا پھر آج کے زمانے میں یہ سواری بھی تو ضروری ہے۔'' پھپھو کے اس جواب کے مقابلے میں ہاجرہ کے پاس کئی دلیلیں تھیں لیکن یہ بحث فضول ہی رہی۔

''مگر......'' اس نے کچھ کہنا چاہا مگر پھپھو نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔

''اگر مگر کیا ہاجرہ بھابی، ماشا اللہ اب تو عابدہ کے دو بھائی کمانے والے ہیں، نوید کی کمائی تو پھر باہر کے ملک کی ہے۔ کار تو معمولی چیز ہے۔'' باہر کے ملک میں وہ کیسے کماتا تھا، یہ پھپھو کو بتانے والا کوئی نہیں تھا۔ ہاجرہ نے جھجکتے ہوئے یہ بات عابدہ کو بتائی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے ہرگز نہیں تھی جو یہ مطالبہ سن کر انگوٹھی اٹھا کر پھینکتی اور کہتی۔ ''مجھے نہیں کرنی ان لالچی لوگوں میں شادی۔'' اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ''تو ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں پھپھو، اب تو سب لڑکیوں کو جہیز میں گھر اور گاڑی ملتی ہے، میں نے تو پھر کوئی مطالبہ نہیں کیا جو دے رہے ہیں، آپ لوگ اپنی مرضی سے دے رہے ہیں۔''

ہاجرہ کو یہ سن کر بہت دکھ ہوا لیکن عابدہ کی بڑھتی عمر نے اس دکھ کی شدت کو بڑھنے نہ دیا۔ نوید سے جب انہوں نے فون پر بات کی تو اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے...... میں کوشش کرتا ہوں۔''

وہ کوشش کر سکتا تھا کیونکہ وہ محنت کرنے والا بندہ تھا۔ اس نے اپنی قسمت کو بنانا سیکھا تھا۔ مالک سے بات کر کے اس نے ڈیل فائنل کی۔ اب وہ مزید ڈیڑھ سال تک پاکستان نہیں جا سکتا تھا اور آٹھ ماہ کی ایڈوانس سیلری لے کر اس نے عابدہ کے جہیز کے لیے گاڑی کا بندوبست کر دیا تھا۔

شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ عابدہ پرائے گھر جا بسی۔ چند ہفتے خوشی کے گزرے تھے کہ اچانک کسی بدنیت کی نظر لگ گئی...... ہاں، نظر ہی لگتی ہے ناں تیزی سے بڑھتی دولت کو؟ اس دن ارسلان جلدی گھر واپس آ گیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ عابدہ نے پانی کا گلاس دیا تو کانپتے ہاتھوں سے پینے کی کوشش میں نیچے گر کر ٹوٹ گیا۔

''خیر تو ہے ارسلان؟ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟''

''عابدہ، بہت مشکل میں پھنس گیا ہوں...... نوکری اور عزت دونوں خطرے میں ہیں، یا خدا...... مجھے تو کوئی نوکری بھی نہیں ملے گی اس کے بعد۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''ہوا کیا ہے؟ کچھ بتائیں تو۔'' وہ جھنجلائی۔ ہانپتے کانپتے ارسلان نے جو بتایا اس کا خلاصہ یہ تھا۔

کچھ دن پہلے اس کے دفتر میں ایک شخص آیا تھا۔ وہ ایک پلاٹ کی ملکیت کی فائل پار کروانا چاہتا تھا کیونکہ پلاٹ پر اس کا غیر قانونی قبضہ تھا اور زمین گورنمنٹ کی تھی۔ ارسلان نے پچاس ہزار لے کر یہ فائل اڑا لی مگر پھنس گیا۔ وہ شخص کسی نیوز چینل کا صحافی تھا اور اس کا کام ہی ایسے ملازمین کو پھنسانا تھا۔ اس کے پاس ارسلان کی ویڈیو بطور ثبوت تھی۔ اب وہ ارسلان سے پانچ لاکھ روپے مانگ رہا تھا۔ نہ دینے کی صورت میں وہ بری طرح پھنس سکتا تھا۔ عابدہ پریشان ہوگئی۔

''کیا کروں، کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''پانچ لاکھ کا بندوبست تو کسی طرح کر لیں گے لیکن اس کے بعد بھی اگر اس نے بلیک میل کیا تو؟'' یہ سوال اہم تھا مگر ارسلان کو تسلی تھی۔

''نہیں، وہ میرے سامنے ویڈیو ڈیلیٹ کرے گا۔'' ارسلان کی ماں کو بھی رات کے کھانے پر خبر ہوئی۔ خبر ملتے ہی اس نے واویلا مچا دیا۔ پہلے اس نے ارسلان کے لتے لیے۔

''ایسے کام ہاتھ پیر بچا کر کیئے جاتے ہیں، تم تو اندھا دھند ہاتھ ڈال دیتے ہو، اب بھگتو۔'' اس کے بعد عابدہ کی باری آئی۔ ''ہائے ہائے میرے معصوم بچے کی زندگی میں اس منحوس کی آمد کے ساتھ ہی ہنگامہ مچ گیا۔ اب لے آ منحوس، لے آ کہیں سے پانچ لاکھ۔'' عابدہ اور ارسلان نے شادی کے موقع پر ملنے والے سلامی اور عابدہ کے سونے کی کل قیمت کا حساب لگایا...... تین لاکھ تک بن گئے تھے۔ دو لاکھ کے لیے عابدہ کی آخری اُمید اپنا بھائی ہی تھا...... بھائی نوید...... دبئی میں تھا ناں؟

بہن کے آنسو وہ برداشت نہ کر سکا۔

''میں کچھ کرتا ہوں۔'' دولاکھ کا بندوبست کچھ قرض اور کچھ تنخواہ ملا کر خود کو مشکل میں ڈال کے کرلیا تھا لیکن نوید غلط تھا۔ یہ بس شروعات تھیں، ابھی چپ چاپ دوسروں کے کام آنے کے امتحان اور بھی تھے۔ صحافی نے پیسے لیے اور ایمانداری سے ویڈیو ڈیلیٹ کردی۔ عابدہ نے سکھ کا سانس لیا۔ خود پر لگنے والا منحوس کا داغ وہ مٹانے میں کامیاب ہوچکی تھی۔

☆☆☆

سلمٰی کی اپنی دنیا تھی۔ ایف اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے آگے داخلہ لینے کا رسک نہ لیا۔ گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کا فائدہ اس نے خوب اٹھایا۔ ہر ماہ نیا موبائل لے کر وہ سوشل میڈیا پر چھائی رہی۔ کئی دوستیاں کیں اور کئی لوگوں کو دھوکے دیئے۔ محبت کا یہ کھیل گھر میں بیٹھ کر بہ آسانی کھیل لیا جاتا۔ دن یہ دن گزرتے چلے گئے۔ منیر اور عابدہ کی شادی کے بعد سلمٰی پر سے پابندیاں مزید کم ہوگئیں۔ وہ لوگ اپنی دنیا میں مگن تھے۔ نوید باہر تھا..... ایسے میں خیال تھا تو بس ہاجرہ کو مگر موبائل نام کی اس آفت کے بارے میں وہ پرانے زمانے کی خاتون کیا جانے؟ ہر شخص پیدائشی عقل مند ہوتا ہے نہ ہی اس میں شعور ہوتا ہے۔ ماحول اور تعلیم شعور دیتے ہیں ورنہ انسان تو مہذب دنیا کے نام پر آباد اس جہان کے توازن کو ایک منٹ بھی قائم نہ رہنے دے۔ سلمٰی میں عقل کی کمی تھی۔ وہ کچی تھی اور تعلیم ادھوری چھوڑنے کے نتیجے میں اس کا دماغ کبھی وسیع نہ ہوسکا۔

واٹس ایپ اور فیس بک پر شروع شروع میں انجان لوگوں سے دوستیاں کرکے اس نے روپے پیسے لیے اس کے بعد وہ ان سب کو چھوڑ کر ایک اور چکر میں پھنس گئی۔ وہ ایک نامعلوم شخص تھا مگر اس کی تصویریں دیکھ کر سلمٰی کا دل بہک گیا۔ اس میں واقعی کوئی ایسی بات تھی کہ سلمٰی کا دل بے قابو ہو گیا۔ وہ بھی اسے فیس بک پر ملا تھا۔ یہ دوستی فیس بک سے واٹس ایپ اور پھر موبائل کال پر منتقل ہوئی تو سلمٰی کی زندگی بدلتی چلی گئی۔ صرف ایک ماہ میں وہ اس سلمان نامی شخص کو اپنی بہت سی تصویریں دے چکی تھی، ساتھ ہی اپنے محبوب کے مطالبے کی خاطر سلمٰی نے کپڑوں سے باہر آکر چند اخلاق سے گری ہوئی تصویریں بھی اسے دے دیں۔ جدید دور میں یہ فحش باتیں اور تصویریں عام تھیں مگر سلمٰی کی زندگی میں اس دن طوفان برپا ہو گیا جب سلمان نے اسے ملنے کا کہا۔ وہ اس کے محلے میں آکر اس سے ملنا چاہتا تھا۔ سلمٰی نے انکار کیا مگر سلمان کی ضد بڑھتی چلی گئی۔ آخر اسے ہتھیار ڈالنا پڑے اور اپنے محلے کی بجائے سلمان کے دیئے گئے پتے پر جب وہ پہنچی تو یہ ایک پرانی عمارت کا پتا ثابت ہوا جہاں وہ طالب علم رہتے تھے جنہیں شہر کے کالج کے کسی ہوسٹل میں داخلہ نہ ملتا تو وہ متبادل کے طور پر یہاں رہائش اختیار کرتے۔ سلمٰی جیسے ہی اپنے مطلوبہ کمرے تک پہنچی، اندر سے برآمد ہونے والا شخص ہرگز اس کا سلمان نہ تھا۔ وہ تو کوئی لمبے بالوں کا مالک تیس بتیس سال کی پختہ عمر کا شخص تھا جس کے چہرے پر زخم کا پرانا نشان تھا۔

''سلمٰی، اندر آجاؤ۔'' سلمٰی کو خوفزدہ دیکھ کر اس نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ گھر سے جھوٹ بول کر نکلی تھی۔ اب نامعلوم شخص کو دیکھ کر اس کے ڈر میں اضافہ ہوا تھا۔

''سس سلمان کہاں ہے؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بھی آجاتا ہے۔'' اس نے عجیب لہجے میں جواب دیا۔ سلمٰی نے جیسے ہی قدم اندر رکھا، اس شخص نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ چونک کر مڑی اور دوبارہ پوچھا۔

''سلمان کدھر ہے؟''

''میں ہی سلمان ہوں۔'' وہ ہنس پڑا۔

''جھوٹ مت بولو۔'' وہ چیخی۔

''ہاں سلمٰی میڈم..... میں ہی سلمان ہوں۔''

''وہ فیس بک کی تصویریں؟'' سلمٰی کے دماغ میں پہلا سوال یہی آیا تھا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد اس شخص نے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔

''وہ جعلی ہیں، کہیں سے اٹھائی تھیں۔''

''میں چلتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر باہر جانے لگی تھی کہ اس شخص نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''چھوڑو مجھے۔'' وہ کراہی۔

''چھوڑ دیتا ہوں..... جاؤ۔'' خلاف توقع اس نے سلمٰی کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ سلمٰی نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔ ''جاؤ مگر یاد رکھنا، تمہاری ساری ننگی تصویریں میرے پاس محفوظ ہیں، میں انٹرنیٹ پر دے دوں گا۔'' سلمٰی کے قدم رک گئے۔ سلمان نے پرندہ آزاد کردیا تھا مگر پر کاٹ دیئے تھے۔ اب وہ اس کی مرضی کے خلاف اڑ نہیں سکتا تھا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟''

''تمہیں۔'' اس نے یک لفظی جواب دیا۔ اب اس کا ہاتھ بڑھا مگر اس بار نہ تو اس نے سلمٰی کا ہاتھ تھاما تھا اور نہ ہی سلمٰی اسے روک سکی تھی۔ اس کی کمر سے پکڑ کر وہ اسے قریب لے

www.pakistanidigest.com

آیا۔اس کے منہ سے تمباکو کی بو آ رہی تھی۔سلمٰی مزاحمت نہ کر سکی۔وہ بس سسکتی رہی۔ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ اپنا سب کچھ گنوا کر باہر نکلنے لگی تھی تب سلمان نے پکارا۔

''سنو......میں تمہیں اپناؤں گا،بدنام نہیں کروں گا۔''

''اور کیسے کرتے ہیں بدنام؟'' وہ تلخی سے بولی تھی۔

''رشتہ بھیجوں گا تمہارے گھر،تیار رکھنا گھر والوں کو۔''اس نے اجازت ہرگز نہیں مانگی تھی بس بتایا تھا لیکن یہ سلمٰی کے لیے بڑا مشکل کام تھا۔ایک ایسا شخص جس کا کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے ہے اور کیا کرتا ہے؟اس کا رشتہ ہاجرہ کیسے منظور کرتی لیکن اب سلمٰی کو کچھ کرنا تھا۔اپنے سے بڑی عمر کے اس شخص کے رشتے کے لیے ماں کو تیار کرنا مشکل تھا ناممکن نہیں۔خود سلمٰی کافی حد تک سمجھ چکی تھی کہ یہ رشتہ اب اس کی مجبوری بھی ہے اور ضرورت بھی......

کافی سوچ سمجھ کر اس نے ہاجرہ کو آدھی بات بتادی۔

''میری سہیلی کا بھائی ہے عمر تھوڑی زیادہ ہے۔''

''شرم کرو۔'' وہ چیخ اٹھی۔''اب اپنے لیے رشتہ تم خود ڈھونڈو گی،ڈوب مرو بے حیا۔''سلمٰی ہاجرہ کو کیسے بتاتی کہ رشتہ اس نے ڈھونڈا نہیں تھا بلکہ وہ اس رشتے میں پھنسی تھی۔

''اماں......شادی میں کروں گی تو بس سلمان سے۔''اسے اپنا بچاؤ کرنا تھا اور جب جان بچانی ہو تو پھر ہر ڈوبتا انسان ہاتھ پیر مارتا ہے۔سلمٰی نے بھی خوب ہاتھ پیر چلائے۔سلمان کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔بس ایک خالہ تھی۔

وہ ایک دو بار ان کے گھر آئی اور دبے لفظوں میں سلمٰی کے رشتے کا ذکر بھی کیا لیکن ہاجرہ کا جواب صاف انکار تھا۔لاڈ پیار سے پلی سلمٰی کی ایک پان کی دکان چلانے والے سے شادی کرنا بے وقوفی تھی۔ہاجرہ یہ بات جانتی تھی مگر سلمٰی بھی اپنی جگہ درست تھی۔وہ یہ شادی نہ کرتی تو پھر پھنس جاتی۔سلمان بھی تیز تھا۔سلمٰی سے پہلے جال میں جکڑے جانے والی لڑکیاں غریب گھروں سے تھی مگر اس بار اس نے پوری ہوشیاری سے معلومات اکٹھی کر کے ہاتھ ڈالا تھا۔ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔اگلے دو تین ہفتوں میں سلمٰی نے ناکام خودکشی کی دو کامیاب کوششیں کیں اور دونوں بار بچ نکلی لیکن اس کا منصوبہ کامیاب ہوگیا۔دوسری کوشش کے بعد جب وہ اسپتال سے واپس گھر آئی تو ہاجرہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''آخر تو چاہتی کیا ہے؟میں تو اس زلیخا کی باتیں سن سن کر تنگ آ گئی ہوں پورے محلے میں بدنامی کر چکی ہے۔''زلیخا نے بالکل روایتی بہو کا کردار ادا کیا تھا۔سلمٰی کس لیے خودکشی کر رہی ہے اس حوالے سے اس نے مرچ مسالہ لگا کر بہت سے گھروں میں بتا رکھا تھا۔ہاجرہ کے کانوں میں باتیں پڑی تھیں۔

''اماں سلمان سے میری شادی کردے۔''ہاجرہ کو اسی جواب کی توقع تھی۔

''ٹھیک ہے۔بول اس کی خالہ سے کہ رشتہ لے آئے۔''گہری سانس لے کر اس نے بات ختم کردی۔منیر اور زلیخا کی مخالفت کے باوجود ہاجرہ نے سلمٰی کا رشتہ طے کر دیا۔نوید کو خبر ہوئی تو اس نے الگ ہنگامہ کیا مگر بہن کے جہیز کی خاطر خوب محنت کرتا رہا اور آخر تین ماہ بعد سلمٰی بھی اپنے گھر چلی گئی۔گھر،دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان جہاں اس کے جہیز کا سامان بڑی مشکل سے پورا آیا تھا۔جہاں پہلی رات کے بعد اس کی حیثیت ایک نوکرانی جیسی تھی۔جہاں روز کسی نہ کسی بات پر مار پڑتی تھی اور پھر سلمان کے ہاتھ ایک دلچسپ مشغلہ لگ گیا۔وہ سلمٰی کو نوید سے پیسے مانگنے پر مجبور کرتا،کبھی پانچ ہزار،کبھی دس تو کبھی بیس......مل جاتے تو سلمٰی کے چند دن سکون سے گزر جاتے ورنہ کمر پر لگنے والی پانی کے پائپ کی ضربیں رات اسے بہت تکلیف دیتیں۔

☆☆☆

نوید کو چھٹی مل گئی۔وہ کئی سال بعد اپنے ملک جا رہا تھا۔اپنے شہر۔اپنے گھر۔ماں سے ملنے کی خواہش زور پکڑنے لگی لیکن قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ہاجرہ کئی دنوں سے بیمار تھی مگر زلیخا اور منیر اپنی دنیا میں مگن تھے اس لیے اس کا چیک اپ کروانے کا کسی نے تکلف نہ کیا اور آخر ایک رات وہ سوئی پھر اٹھی ہی نہیں۔دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے وہ اپنے خالق کی جانب پلٹ گئی تھی۔یہ وہی وقت تھا جب نوید کے جہاز نے ائیرپورٹ پر لینڈ کیا تھا۔ماں کے لیے خریدی گئی شال اس نے بیگ میں سنبھال کر رکھی ہوئی تھی اور ماں کفن میں لپٹی ہوئی قبرستان کی طرف سفر طے کر رہی تھی۔نرم دل رکھنے والے کئی لوگوں نے ماں کی میت سے لپٹ کر روتے اس نوجوان کو دیکھا تھا جس کا......چہرہ اور ہاتھ کڑی......محنت سے کرخت ہو چکے تھے۔وہ سانولا ہو گیا تھا اور پہلے کی نسبت دبلا بھی۔

ہاجرہ کی کہانی ختم ہوئی مگر نوید کو کئی دن کسی بات کا ہوش نہ رہا۔قدرت نے وقت کو مرہم بنا کر زخموں پر لگانے کا جو قانون بنایا ہے یہ اگر نہ ہوتا تو جانے والوں کے ساتھ کئی اور بھی چلے جاتے۔آہستہ آہستہ وہ سنبھلنے لگا تھا۔اردگرد چیزوں پر توجہ دینا شروع کر دی تھی۔سب سے پہلے وہ ارسلان سے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ملا۔عابدہ کے اس شوہر کی لالچی فطرت سے وہ واقف تھا مگر بہن کی خاطر خاموش رہا۔سلمان اس سے زیادہ گھٹیا ثابت ہوا۔سلمٰی کا حال بھی برا تھا۔منیر اور زلیخا جتنے خوش دکھائی دیتے تھے اتنے ہرگز نہیں تھے۔وہ چند ماہ ادھر رہا مگر اسے لگا جیسے وہ نفسیاتی مریض بن جائے گا۔یہ اردگرد موجود انسان ہرگز وہ انسان نہ تھے جنہیں اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔یہ لالچی درندے تھے جو اس کا خون چوس رہے تھے۔وہ پھر دبئی چلا گیا اور چند ماہ بعد سب کچھ الٹ گیا۔

اس کے جانے کے دو ماہ بعد ان سب کو ویسے ہی ان کے مطالبوں کے مطابق پیسے ملتے رہے۔دو ماہ بعد منیر کو اطلاع ملی۔نوید کا دبئی میں ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور وہ شدید زخمی تھا۔وہ سب پریشان ہو گئے، بھائی کی محبت سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ جو ان سب کا خرچ ... چلا رہا تھا، وہ ختم ہو جاتا۔منیر نے ایمرجنسی میٹنگ بلائی۔اس میٹنگ میں اس کی دونوں بہنیں اپنے شوہر حضرات کے ساتھ حاضر ہوئی تھیں۔ارسلان نے ایکسیڈنٹ کا سنتے ہی بیان جاری کیا۔

”میرا دوست ہے وہاں دبئی میں، ابھی پتا کرواتا ہوں۔“ وہ دوست سے رابطے میں مصروف ہو گیا جبکہ عابدہ اور سلمٰی دونوں بھائی کی خیریت کی دعائیں مانگنے لگیں۔منیر کو نوید کے جس دوست نے کال پر ایکسیڈنٹ کا بتایا تھا وہ اب اس سے رابطے میں مصروف تھا لیکن ابھی تک ناکامی ہوئی تھی۔تھوڑی دیر بعد ارسلان نے بھی منہ لٹکا کر جواب دیا۔”وہ کہہ رہا ہے مذکورہ اسپتال اس کے علاقے سے دور ہے۔“ ظاہر ہے محنت مزدوری کرنے کے لیے پردیس جانے والے بندے کے پاس اسپتال جا کر کسی کی خیریت معلوم کرنے کا وقت کہاں تھا اس لیے سب کو یہ بہانہ ہضم نہ ہوا۔

”آپ کا کوئی دوست نہیں ہے؟“ سلمٰی نے سلمان سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے یک لفظی جواب دیا۔دوسروں کے سامنے عزت بنانے کا یہ موقع بھی سلمٰی کے ہاتھ سے ضائع ہو گیا تھا۔سب پریشان رہے مگر مسئلے کا کوئی حل نہ مل سکا۔آخر......نوید سے ان کا رابطہ مکمل طور پر ٹوٹ گیا۔ایک ماہ تک وہ مسلسل اس کی کھوج میں رہے مگر وہ دبئی میں کھو گیا تھا۔ایک ماہ بعد انہیں ایک حادثے کی تفصیل ملی جس میں دو پاکستانی مرے تھے۔انہیں یقین ہو گیا کہ اب نوید ان میں نہیں رہا......وقت نے اڑان بھری تھی......کرداروں کی زندگی بدلنے لگی، آہستہ آہستہ......

☆☆☆

عابدہ کے منہ پر زوردار تھپڑ پڑا۔اس نے حیرت سے ارسلان کی طرف دیکھا۔یہ پہلا موقع تھا جب اس نے عابدہ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔”ارسلان؟“ حیرت اور دکھ کے مارے اس کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔

”یہ گھر تیرے پیسوں سے نہیں چلتا، میرے پیسوں سے چلتا ہے، آئندہ یہ مہنگے کپڑے خریدنے کے لیے مجھ سے اجازت لینا۔“ یہ صرف ایک سوٹ لینے کی وجہ سے اسے مار پڑی تھی۔اس کے بعد یہ اکثر ہونے لگا، کسی ادنیٰ کی غلطی سے عابدہ کو تھپڑ کھانے پڑتے۔اسے نوید کی یاد ستانے لگی تھی۔وہ ایک ایسا درخت تھا جس کی چھاؤں نے ان سب کو دھوپ سے بچا رکھا تھا۔افسوس......انہوں نے صرف اسے بینک اکاؤنٹ سمجھا۔کبھی اس کے بارے میں کچھ نہ سوچا۔آخر عابدہ کو خود راستہ تلاش کرنا پڑا۔

پرائمری اسکول ٹیچر کے لیے اس نے اپلائی کیا اور ملازمت کے لیے نکل پڑی۔ارسلان خوش تھا اور بیوی کی کمائی کو ساتھ ملا کر وہ لالچی شخص اپنی دولت کی بھوک کو مٹا رہا تھا مگر سکون پھر بھی اس کی قسمت میں نہ آیا۔نئی حکومت کے آتے ہی اس جیسے کئی رشوت خور چنگل میں پھنسنے لگے۔ایک بڑی فائل اس کے خلاف تیار ہو چکی تھی...اس سے پہلے کہ وہ لمبے عرصے کے لیے جیل جاتا، ملازمت سے استعفیٰ دے کر گھر بیٹھ گیا۔اب گھر چلانا عابدہ کی ذمے داری تھی۔وہ نبھا بھی رہی تھی آرام سے بیٹھ کر کھانے والی عابدہ کو اب صبح صبح اٹھ کر اپنا ناشتا بنانا پڑتا اور اس کے بعد لوکل بس کے دھکے کھا کر وہ دن بھر اسکول کے بچوں کو پڑھاتی۔شام کو جب لوٹتی تو پھر گھر کا سارا کام، ساتھ میں دو بچوں کو سنبھالنا۔یہ زندگی اب وہ سزا کی طرح کاٹ رہی تھی۔

☆☆☆

سلمٰی کی گھر میں پیسوں کی وجہ سے جو عزت تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔نوید بچھڑ گیا تو سلمان نے اس کا جینا حرام کر دیا تھا۔وہ خود کچھ نہیں کرتا تھا بس اسی کو کمانے کے لیے کہتا تھا۔آخر سلمٰی تنگ آ گئی۔چپ رہ کر مار کھانے کی بجائے ہاتھ پیر چلانے لگی۔گھر میں یہ لڑائی روز ہونے لگی۔

”ذلیل عورت...... پیسے لے آ کہیں سے۔“ وہ چیختا تو سلمٰی اس سے بھی اونچی آواز میں چلاتی۔

”مرد بن اور خود کما۔“ مار تو پڑتی مگر اب اسے برابر لڑنے میں مزہ آنے لگا تھا۔سستے نشے نے سلمان کو بالکل لاغر

Naqar Azeem www.pakistanipoint.com

کر دیا تھا۔سلمٰی نے نوکری کر لی۔ایک شاپنگ مال میں سیلز گرل بن کر وہ سارا دن کام کرتی، کچھ ادھر اُدھر سے ناز و ادا دکھا کر کما لیتی اور گھر لے آتی۔سلمان کے ہاتھ دینے کی بجائے خود ڈٹ کر کھاتی۔اس کا گھر میں داخل ہوتے ہی بو سے دماغ پھٹنے لگتا۔صفائی کرتا بھی تو کون؟ سگریٹ اور چرس کی بو ہر جگہ پھیلی ہوتی۔سلمٰی اپنی زندگی میں مگن ہوتی چلی گئی۔ایک دن سلمان کو ایک تیز رفتار گاڑی کچل گئی۔اسے سکون مل گیا۔اب راتیں گزارنے کے لیے اس کے پاس اور بہت آتے تھے۔سلمان کے ساتھ رہ کر سگریٹ کی عادت تو اسے پڑ گئی تھی لیکن اب ساتھ میں کبھی کبھی وہ نشہ کر لیتی تھی تو کبھی اس کا کوئی بوائے فرینڈ ساتھ لے آتا تھا۔یہ چیزیں اسے اندر سے بالکل ختم کر رہی تھیں۔صرف تین سال میں نوجوان سلمٰی کسی پکی عمر کی خرانٹ عورت کی طرح لگتی تھی۔یہ سزا اس کے لیے قدرت نے منتخب کی تھی۔رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ ایک بھری سگریٹ کے بدلے میں اس کے جسم کا حصول ممکن ہو گیا تھا اور جلد اسے تڑپ تڑپ کر مر جانا تھا۔

☆☆☆

”وہ لڑکا کون تھا؟“ منیر نے غور سے زلیخا کا چہرہ دیکھا۔

”کون؟“ اس نے انجان بن کر پوچھا۔

”وہی جس کے پیچھے بیٹھی تھی موٹر سائیکل پر۔“

”کزن تھا میرا۔“ کمال بے نیازی سے جواب دیا گیا۔منیر نے لپک کر اس کے بال پکڑے اور اٹھا کر بیڈ سے نیچے پھینکا۔ان کے بیٹے نے رونا شروع کر دیا تھا۔”اتنے سالوں سے وہ کزن مجھے تو دکھائی نہیں دیا اب کون سی تیری ماں نے پیدا کر دیا۔“ اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکلا۔

”کتے خود کما کر لاتا نہیں تو کسی کا سہارا تو ڈھونڈوں گی...... دکان بھی بیچ دی تو نے حرامی۔“ زلیخا چپ رہنے والوں میں سے نہیں تھی۔اس نے برابر کا مقابلہ کیا۔گھر کم اور اکھاڑا زیادہ لگ رہا تھا۔مالی پریشانیوں نے انہیں ذہنی طور پر تباہ کر دیا تھا۔

”کما لاؤں گا...... جلد کمانا شروع کروں گا۔“ وہ مارتا بھی اور ساتھ ساتھ چیختا بھی۔اس کے پاس بس ایک حل رہ گیا تھا، جو ہار گیا سو پار گیا۔قرض اکٹھا کر کے وہ بھی نوید کی طرح باہر چلا گیا۔یہاں آ کر اسے اندازہ ہوا۔گھر بیٹھ کر کھانا آسان تھا اور شدید گرمی میں مزدوری کر کے کمانا مشکل۔

زلیخا کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔اس کو ملنے والے بہت تھے۔توازن قائم نہ رہ سکا۔رہتا بھی تو کیسے؟ کچھ گناہوں کی سزا زندگی خود دیتی ہے۔اس کے لیے یوم حساب کا انتظار نہیں کیا جاتا......

☆☆☆

نئی نویلی گاڑی گیٹ پر آ کر رکی۔پانچ سال کے بچے نے گیٹ سے باہر جھانکا۔ایک بارعب شخص ڈرائیونگ سیٹ سے اترا تھا۔فرنٹ سیٹ سے اس کی بیوی نیچے اتری جس نے بڑی سی چادر سے خود کو لپیٹ رکھا تھا۔اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔انہوں نے اس پانچ سال کے بچے کو باہر بلایا۔”تمہارے پاپا کہاں ہیں؟“ اس شخص نے بچے سے پوچھا تھا۔

”وہ تو نہیں ہوتے۔“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”مما؟“

”وہ ہیں، میں بلاتا ہوں۔“ وہ بھاگ کر اندر چلا گیا۔کچھ دیر بعد زلیخا باہر آئی۔اس شخص کو دیکھ کر زلیخا کی آنکھیں پھیل گئیں۔اسے لگا وہ چکرا کر گر پڑے گی۔

”نن......نوید بھائی آپ؟“

”جی میں......“ نوید نے سرد لہجے میں جواب دیا۔”مردہ تھا۔اب زندہ ہو گیا ہوں۔“

”ہم نے بہت ڈھونڈا آپ کو......آپ کی کچھ خبر نہیں ملی۔“

”میری خبر سے زیادہ تم سب لوگوں کو پیسے کی ضرورت تھی، میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ تم سب کو سبق سکھاؤں گا......خاص کر تمہیں اور منیر بھائی کو، میری ماں کا علاج تک کروانا گوارا نہیں کیا تم سب نے۔“ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

”آپ تھے کہاں؟ اندر آیئے۔“

”میں دبئی سے انگلینڈ چلا گیا تھا۔اب وہیں کام کرتا ہوں اپنا اسٹور ہے۔یہ میری بیوی ہے فرحت۔“ اس نے گہری سانس لی۔”بس اپنا گھر دیکھنے آیا تھا......ویسے تو ہم فرحت کے گھر والوں سے ملنے آئے تھے سوچا ادھر چکر لگا لوں۔“ اس نے عجیب نظروں سے گھر کو دیکھا تھا۔”آج ہم نے واپس جانا ہے۔سب کو میرا سلام دے دینا اور بتا دینا میں زندہ ہوں۔“ یہی کہہ کر وہ واپس مڑ گیا۔زلیخا اس کی گاڑی کو دیکھتی رہی۔اس نے خواب دیکھے تھے۔وہ محنتی تھا اور خدا کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا اس لیے اسے ان خوابوں کی تعبیر مل گئی۔

++

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

سرپرائز

محترم مدیر

السلام علیکم!

کوئی اگر سرپرائز دے تو لوگ چونک جاتے ہیں مگر مجھے ایسا سرپرائز دیا گیا کہ میری زندگی خوشگوار ہوگئی۔ جی ہاں عرصہ تین سال سے میں ایک بھولی بھالی، بیوی کا شوہر بن کر زندگی کو قریب سے انجوائے کررہا ہوں۔ میں عرصہ دراز سے سرگزشت کا قاری ہوں۔ دراصل، سیلف میڈ ہوں اس لیے معلومات کا شائق ہوں اور سرگزشت علم و عقل والوں کے لیے ہے۔ ایک سچ بیانی پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ اپنی حالاتِ زندگی بھی لکھ دوں تاکہ لوگ سبق حاصل کریں

محمد امجد

(کراچی)

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

میں کلاس ختم ہونے کے بعد یونیورسٹی گیٹ سے باہر آیا تو دیکھا کہ میری کلاس فیلو نورین اپنی کار کے پاس کھڑی ہے۔ وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی، میں سمجھ گیا کہ اس کی کار میں کوئی مسئلہ ہوگیا ہے۔ وہ بار بار اپنے موبائل پر کوئی نمبر ملا رہی تھی لیکن رابطہ نہیں ہورہا تھا جس کی وجہ سے وہ کچھ جھنجلائی ہوئی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ خاموشی سے اپنے راستے پر چل دوں کیونکہ وہ کافی مغرور اور بدمزاج تھی اور کلاس کے سبھی لڑکے اس کے قریب جانے یا بات کرنے سے گھبراتے تھے۔ اگر وہ خود کسی سے بات کرے تو ٹھیک ورنہ اپنی طرف سے کوئی پہل نہیں کرتا تھا۔ وہ لڑکیوں کو بھی منہ نہیں لگاتی تھی۔ کلاس میں صرف دو تین لڑکیوں سے ہی اس کی بات چیت تھی، وہ بھی اس کی طرح امیر گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایسی لڑکی سے بات کرنا یا اس سے ہمدردی جتانا اپنی شامت بلانے کے مترادف تھا۔

یونیورسٹی تقریباً خالی ہوچکی تھی۔ اس وقت وہ سڑک پر اکیلی بار بار اپنے موبائل پر ہاتھ مار رہی تھی میں نے ایک دو بار اسے غصہ اور جھنجلاہٹ کے عالم میں زمین پر پاؤں مارتے ہوئے بھی دیکھا اس کی یہ پریشانی دیکھ کر مجھے گوارا نہ ہوا کہ اسے اس حالت میں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ میں نے سوچا کہ اس سے پوچھنا تو چاہیے کہ مسئلہ کیا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ مجھے جھڑک دے گی۔ کوئی بات نہیں، میں اس کی جھڑکی سن لوں گا لیکن کم از کم یہ افسوس تو نہیں ہوگا کہ میں نے ایک لڑکی کو مشکل میں دیکھ کر اس کی مدد نہیں کی۔

میں ڈرتے ڈرتے اس کے پاس گیا اور آہستہ سے کہا۔ ”کیا بات ہے، گاڑی میں کوئی مسئلہ ہوگیا ہے کیا؟“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری۔ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”ہاں۔ پچھلا ٹائر پنکچر ہوگیا ہے۔ اتنی دیر سے ڈرائیور کو فون کررہی ہوں لیکن وہ نہ جانے کہاں مرگیا۔ فون ہی نہیں اٹھا رہا۔“

”کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات سگنل کا مسئلہ ہوجاتا ہے یا اس کے فون کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی ہو۔ آپ کے پاس فالتو ٹائر ہے؟“

”ہاں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”آپ ڈکی کھولیں۔ میں ٹائر بدل دیتا ہوں؟“

وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں ٹائر بدلنا آتا ہے؟“

”یہ کون سا مشکل کام ہے۔ صرف چار نٹ ہی تو کھولنے ہوتے ہیں۔“

اس نے ڈکی کی چابی مجھے پکڑائی۔ میں نے اس سے فالتو ٹائر اور جیک پانا نکالا ہاتھ مار کر ٹائر کی ہوا چیک کی اور قمیص کی آستین اوپر کرکے کام میں لگ گیا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد میں نے پرانا ٹائر اور دوسرا سامان ڈکی میں رکھا اور اسے لاک کرکے چابی اس کے حوالے کردی۔ وہ حیرانی اور تعجب سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی، جب اسے یقین ہوگیا کہ میں نے واقعی ٹائر تبدیل کردیا ہے تو وہ مسکراتے

ہوئے بولی۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ! اس وقت تم نے میری بہت بڑی مشکل آسان کردی ورنہ شاید مجھے گاڑی یہیں چھوڑ کر ٹیکسی میں گھر جانا پڑتا۔''

''کوئی بات نہیں۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔'' میں نے انکساری سے جواب دیا۔

''چلو میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔'' اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ آپ کو بہت دور پڑے گا کیونکہ میں سرجانی میں رہتا ہوں اور آپ کی رہائش غالباً ڈیفنس میں ہے۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن کل کی ٹریٹ میری طرف سے۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا جو لڑکی کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی وہ مجھے ٹریٹ دینے کا کہہ رہی تھی۔ مجھے اپنی اوقات کا پتا تھا، اس لیے میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟''

''نہیں بھئی تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ اس کا بدلہ تو چکانا ہے نا۔''

میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے بھی بڑے لوگ اپنی بات منوانے کے عادی ہوتے ہیں اگر میں انکار کرتا تو وہ ناراض بھی ہوسکتی تھی اس لیے اسے خدا حافظ کہہ کر بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔

میں گھر پہنچا تو اماں دروازے پر کھڑی میرا انتظار کررہی تھیں۔ میں نے گھڑی دیکھی مجھے گھر پہنچنے میں ایک گھنٹے کی دیر ہوگئی تھی۔ دونوں چھوٹی بہنیں بھی ان کے ساتھ کھڑی میری راہ تک رہی تھیں۔ اماں نے مجھے غصے سے دیکھا اور بولیں۔ ''کہاں رہ گئے تھے؟''

میں انہیں دیر سے آنے کی وجہ نہیں بتا سکتا تھا اس لیے جھوٹ بولنا پڑا۔ ''اماں میں لائبریری میں بیٹھا پڑھ رہا تھا، کل ٹیسٹ ہے ناں، پھر بس بھی دیر سے ملی۔''

وہ بے چاری سیدھی سادی عورت تھیں۔ انہوں نے میرے جھوٹ پر یقین کرلیا اور پیار سے میرے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹا اگر دیر سے آنا ہو تو بتا کر جایا کرو۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ شہر کے حالات کتنے خراب ہیں۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ ذرا سی دیر میں کیا ہو جائے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔'' میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''ابا سو گئے؟''

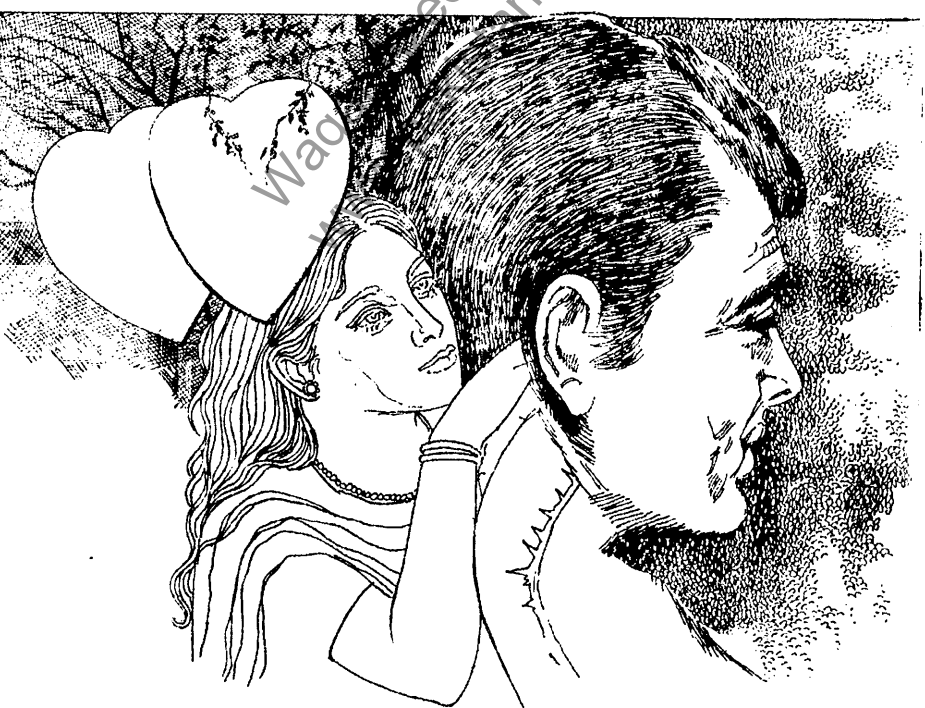

''ہاں۔ دن بھر پھیری لگا کر تھک جاتے ہیں اس لیے کھانا کھاتے ہی سو گئے۔ ویسے بھی آج کل ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ چلو تم بھی منہ ہاتھ دھولو۔ میں تمہارے لیے کھانا نکالتی ہوں۔''

میں جانتا تھا کہ اس عمر میں ٹھیلا لے کر گلی گلی پھرنا کتنا مشکل کام ہے۔ میری شدید خواہش تھی کہ چار پیسے جمع ہو جائیں تو ابا کے لیے ایک دکان کا بندوبست کر دوں جہاں وہ آرام سے بیٹھ کر اپنا سودا بیچ سکیں لیکن فی الحال اس خواہش کے پوری ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میرے پاس کچھ بچتا ہی نہیں تھا کہ دکان کے لیے جوڑ سکوں۔ ابا کی ہوائی روزی تھی، کبھی دن میں دو تین سو کی آمدنی ہو جاتی اور کبھی سو روپے بھی نہ بچتے، اس لیے گھر کا آدھے سے زیادہ خرچ مجھے اٹھانا پڑ رہا تھا اس کے علاوہ بجلی اور گیس کے بل دینا بھی میری ذمے داری تھی۔ یونیورسٹی کی فیس، بس کا کرایہ اور دیگر متفرق اخراجات۔

میں کولہو کے بیل کی طرح کام کر رہا تھا، صبح اٹھتے ہی دفتر چلا جاتا۔ وہاں دن بھر فائلوں اور رجسٹروں میں سر کھپاتا پھر شام کو یونیورسٹی، جہاں سے واپسی رات نو بجے کے قریب ہوتی۔ یہ میرا بی بی اے کا پہلا سیمسٹر تھا۔ اس کورس کے مکمل ہونے کے بعد مجھے اچھی ملازمت ملنے کی توقع تھی۔

میں نے بہت چھوٹی عمر میں کام شروع کر دیا تھا۔ اماں کی بڑی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں۔ میٹرک تک تو کوئی مسئلہ نہیں ہوا کیونکہ سرکاری اسکول میں تعلیم مفت تھی اور کتابیں بھی وہیں سے ملتی تھیں لیکن میٹرک کے بعد میرے لیے آگے پڑھنا ممکن نہ تھا کیونکہ ابا کی اتنی آمدنی نہیں تھی کہ وہ میرے تعلیمی اخراجات برداشت کر سکیں۔ اس کے علاوہ مالی تنگی کی وجہ سے ہم اپنی بہت سی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر تھے اس لیے میں نے آگے پڑھنے کا خیال ترک کر کے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ میں نے کئی دفتروں کے چکر لگائے لیکن میٹرک پاس کو کون ملازمت دیتا۔ مجبوراً میں نے جوتوں کی ایک دکان میں سیلز مین کی نوکری کر لی۔

وہاں کی ڈیوٹی بڑی سخت تھی۔ صبح گیارہ بجے سے رات نو بجے تک، دکان بند کرتے کرتے دس بج جاتے تھے اور تنخواہ صرف آٹھ ہزار اس میں سے بھی ناغہ کے دنوں کے پیسے کٹ جاتے تھے۔ وہ اسٹور طارق روڈ پر تھا۔ وہاں سے سرجانی آنے جانے کے لیے دو بسیں بدلنا ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے کرایہ میں بھی اچھے خاصے پیسے خرچ ہو جاتے تھے۔ دن بھر گاہکوں سے سر کھپانا ہوتا تھا۔ ان میں کئی گاہک خاص کر خواتین ایسی تھیں جنہیں کوئی جوتا پسند ہی نہیں آتا تھا۔ وہ دس دس جوڑے نکلوا کر دیکھتیں اور کچھ خریدے بغیر ہی چلی جاتیں۔ ایسے گاہکوں کی وجہ سے میرا بہت وقت ضائع ہوتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ ملازمت کے ساتھ ساتھ میں اپنی پڑھائی بھی جاری رکھوں گا اور پرائیویٹ امیدوار کے طور پر اپنی رجسٹریشن کروالوں گا لیکن میرا سارا وقت تو دکان کی نذر ہو رہا تھا، امتحان کی تیاری کیسے کر سکتا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ کوئی دوسری ملازمت تلاش کر سکتا۔ یوں لگ رہا تھا کہ میرا تعلیمی سفر یہیں رک گیا ہے اور میں اس سے آگے نہیں جا سکوں گا۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ میرا ایک پرانا دوست ہماری دکان پر جوتے خریدنے آیا۔ اس نے میرے ساتھ ہی میٹرک کیا تھا۔ اس کے بعد ہمارا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ وہ مجھے جوتوں کی دکان پر کام کرتا دیکھ کر حیران رہ گیا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ کیا امجد؟ تم یہاں۔ کیا پڑھائی چھوڑ دی؟''

''ہاں'' میں نے مختصر جواب دیا۔

وہ سمجھ گیا کہ میں دکان میں اس سے زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ اس نے اپنی پسند کا جوتا لیا اور بولا۔ ''میں اتوار کو تمہارے گھر آؤں گا۔'' اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دیا۔ ''تم مجھے اس نمبر پر فون کر کے اپنے گھر کا پتا سمجھا دینا۔''

وہ اتوار کو حسبِ وعدہ آ گیا۔ ہمارے گھر میں کوئی ڈرائنگ روم تو تھا نہیں اس لیے میں اسے ایک قریبی ہوٹل میں لے گیا۔ اس کے لیے چائے منگوائی اور اسے اپنے گھر کے حالات بتائے جن کی وجہ سے میں اپنی پڑھائی جاری نہ رکھ سکا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ ''میں سمجھ گیا امجد۔ تمہیں ایک ایسی ملازمت کی ضرورت ہے جس کے ساتھ تم آگے بھی پڑھ سکو۔''

''میری بھی یہی خواہش تھی کہ اگر نو سے پانچ کی جاب مل جائے تو میں شام کے کالج میں داخلہ لے لوں لیکن کوشش کے باوجود ایسا نہیں ہو سکا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ آج کل میٹرک پاس کو کون پوچھتا ہے۔''

www.pakistanipoint.com

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "خیر تم فکر نہ کرو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو بہتر ہی ہوگا۔ تم مجھے دو تین دن بعد فون کرنا۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنے یقین سے یہ بات کیوں کہہ رہا ہے لیکن میں نے اس سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا تین دن بعد اسے فون کیا۔ وہ پُرجوش آواز میں بولا۔ "امجد۔ میں نے تمہاری ملازمت کی بات کرلی ہے۔ کل تم دکان سے چھٹی کرو۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کہاں؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ابا کے ایک جاننے والے ہیں۔ ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے۔ میں نے ان سے تمہارا ذکر کیا تھا وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

دوسرے دن احسان مجھے اپنے ساتھ لے کر ہاشمی صاحب کے پاس گیا۔ ان کا آفس بہت شاندار تھا۔ کئی میزوں پر لوگ بیٹھے کام کر رہے تھے، ان میں کچھ خواتین بھی تھیں۔ احسان نے استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو اپنا نام بتایا۔ اس نے انٹرکام پر ہماری آمد کی اطلاع دی اور ہاشمی صاحب نے ہمیں فوراً ہی بلالیا۔

وہ ایک شاندار شخصیت کے مالک تھے، سرخ وسفید بارعب چہرہ، ہونٹوں پر مسکراہٹ اور سلیقہ سے جمے ہوئے بال جن میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ انہوں نے مجھ سے دو چار باتیں کیں پھر اپنے منیجر کو بلا کر کہا۔ "صدیقی صاحب، انہیں کسی کام پر لگادیں۔ یہ ابھی ناتجربہ کار ہیں۔ انہیں کام کو سمجھنے اور سیکھنے میں کچھ وقت لگے گا۔"

پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ "فی الحال آپ کو دس ہزار ماہانہ ملیں گے۔ تین ماہ بعد آپ کی کارکردگی دیکھ کر اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔"

میرے لیے یہی بہت تھا کہ انہوں نے مجھے اپنے ہاں ملازمت دے دی۔ اب میں اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتا تھا۔
صدیقی صاحب نے مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "فی الحال آپ میرے ساتھ کام کریں گے۔ دفتر کی ساری فائلیں آپ کی تحویل میں ہوں گی۔ ان کی ایک فہرست بنالیں۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جو بھی کاغذ آپ کو دیا جائے۔ اسے متعلقہ فائل میں لگا کر اس پر صفحہ نمبر ڈال دیں اور اس کی ایک کاپی ماسٹر فائل میں بھی لگادیں۔ بظاہر یہ کام آسان لیکن بہت ذمے داری کا ہے۔ اگر کوئی کاغذ بھی اِدھر اُدھر ہوگیا تو اس کی پوچھ گچھ آپ سے ہوگی۔"

"جی بہت بہتر۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ "میں پوری احتیاط کروں گا۔"

"ایک بات اور" صدیقی صاحب میرے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "یہ ایک تجارتی فرم ہے اور ہمارا مقابلہ کئی دوسری کمپنیوں سے ہے اس لیے رازداری شرط ہے۔ دفتر کی کوئی بات باہر نہیں جانی چاہیے۔"

"جی، میں سمجھ گیا ایسا ہی ہوگا۔"

"گڈ۔ تمہیں شام تک لیٹر مل جائے گا۔ فی الحال تم اسی کمرے میں بیٹھ جاؤ ساری فائلیں اس کیبنٹ میں ہیں۔" انہوں نے کونے میں رکھے ہوئے ایک کیبنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "تمہیں کمپیوٹر آتا ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا تو انہوں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ سیکھ جاؤ گے یہ اتنا مشکل نہیں ہے لیکن اس کا سیکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ اب یہ ہر شخص کی ضرورت بن گیا ہے؟"

اس کے بعد انہوں نے میرے لیے چائے منگوائی اور کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے جب انہیں میرے گھریلو حالات کا علم ہوا تو انہوں نے نرم لہجہ میں کہا۔ "دیکھو بیٹا۔ قدرت نے تمہیں ایک موقع دیا ہے، اب یہ تمہارے اوپر ہے کہ تم اس سے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہو۔ ہم تمہاری ہر طرح مدد کریں گے لیکن آگے بڑھنے کے لیے پہلا قدم تمہیں ہی اٹھانا ہوگا۔"

اس کے بعد انہوں نے چپڑاسی کو بلا کر کچھ ہدایات دیں اور تھوڑی دیر بعد ہی فائل کیبنٹ کے ساتھ میری میز لگ گئی پھر انہوں نے انٹرکام کا بٹن دبا کر کسی کو بلایا اور چند سیکنڈ بعد ہی ایک اسمارٹ شخص کمرے میں داخل ہوا۔ صدیقی صاحب نے اس سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "سعید۔ ان کا نام امجد ہے اور انہوں نے آج ہی ہمارا دفتر جوائن کیا ہے فی الحال انہیں فائلنگ کلرک کی ذمے داری دی گئی ہے لیکن آگے چل کر ان سے اور بھی کام لینا ہے۔ تم انہیں کمپیوٹر آپریٹ کرنے کا طریقہ سکھاؤ گے۔"

سعید نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "آپ روزانہ لنچ کے بعد ایک گھنٹا میرے ساتھ بیٹھیں گے۔ کمپیوٹر کا کمال یہ ہے کہ یہ خود آپ کو سکھاتا ہے۔ اس پر جتنا زیادہ کام کریں گے، آپ کی مہارت بڑھتی جائے گی۔"

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اس کے جانے کے بعد صدیقی صاحب نے مجھے ایک فولڈر دیتے ہوئے کہا۔ ''اس میں وہ کاغذات ہیں جنہیں فائلوں میں لگانا ہے۔ تم اللہ کا نام لے کر شروع کردو۔ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لینا۔ میں آج ہی تمہارے لیے کمپیوٹر کا بندوبست کردیتا ہوں تاکہ تم فارغ وقت میں اس پر کام کرتے رہو۔''

میں وہ فولڈر لے کر اپنی میز پر آگیا۔ میرے اعتماد میں کئی گنا اضافہ ہوچکا تھا۔ ایک دن پہلے تک میں جوتوں کی دکان پر سیلز مین تھا۔ صبح سے شام تک گاہکوں کو جوتے پہناتا اور ان کے نخرے برداشت کرتا لیکن ایک ہی دن میں کایا پلٹ گئی تھی۔ اب میں ایک بڑی تجارتی فرم کا ذمے دار کارکن تھا۔ میں نے دل میں عہد کرلیا کہ جن لوگوں نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔ انہیں کبھی مایوس نہیں کروں گا بالخصوص ہاشمی صاحب کو جنہوں نے ایک مسٹرک پاس اور ناتجربہ کار شخص کو باعزت ملازمت دی۔

شام تک میری میز پر کمپیوٹر آگیا اور مجھے تقرری کا پروانہ بھی مل گیا۔ اس لیٹر کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس میں جو شرائط اور مراعات دی گئی تھیں ان کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میری ابتدائی تنخواہ دس ہزار روپیا ماہانہ مقرر کی گئی تھی جس میں اضافہ میری کارکردگی سے مشروط تھا۔ میں تین ماہ کی آزمائشی مدت میں کوئی چھٹی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے بعد مستقل ہونے کی صورت میں ایک سال کے دوران دس اتفاقی، دس میڈیکل اور بیس سالانہ چھٹیوں کی اجازت تھی۔ میرا علاج کمپنی کی ذمے تھا اور ایک سال کی سروس پوری ہونے پر مجھے ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر عید بونس بھی ملتا۔

مجھے یوں لگا جیسے میری لاٹری نکل آئی ہو۔ دفتر سے چھٹی ہونے کے بعد میں سیدھا جوتوں کی دکان پر آگیا اور منیجر کو بتایا کہ مجھے ایک بڑی کمپنی میں ملازمت مل گئی ہے، اس کے لیے یہ اطلاع غیر اہم تھی کیونکہ وہاں آئے دن لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ اس نے مجھے مبارکباد دی اور میں اس سے الوداعی مصافحہ کرکے گھر کے لیے روانہ ہوگیا۔

راستے میں ایک جگہ رک کر میں نے مٹھائی لی اور چھ بجے کے قریب گھر پہنچ گیا۔ اماں مجھے وقت سے پہلے دیکھ کر حیران بلکہ پریشان ہوگئیں۔ وہ سمجھیں کہ شاید میری طبیعت خراب ہے، میری نوکری ختم ہوگئی ہے لیکن میرے چہرے پر مسکراہٹ اور ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا دیکھ کر انہیں یقین ہوگیا کہ میرے پاس کوئی اچھی خبر ہے۔ جب میں نے اپنی نئی ملازمت اور تنخواہ کے بارے میں بتایا تو ان کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ بکھر گئے۔ انہوں نے دعا کے انداز میں اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور آسمان کی طرف منہ کرکے بولیں۔ ''یا اللہ۔ تیرا شکر ہے کہ تو نے ہم غریبوں کی بھی سن لی۔''

ابا اس وقت تک نہیں آئے تھے۔ اماں نے ایک پلیٹ میں تھوڑی سی مٹھائی مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''جا بیٹا۔ چچا کو بھی یہ خبر سنادے۔ وہ خوش ہوجائیں گے۔''

چچا کا گھر ہمارے پڑوس میں تھا۔ وہ بھی ہماری طرح نچلے متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کے حالات ہم سے کچھ بہتر تھے۔ وہ گیٹ جالی کا کام کرتے تھے اور دونوں بیٹوں کو بھی اپنے ساتھ شریک کرلیا تھا جبکہ بیٹی ساجدہ نے میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی اور چچی نے اسے گھر کے کاموں میں لگالیا تھا۔ وہ اسے امور خانہ داری کی تربیت دے رہی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ لڑکیوں کو زیادہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے شادی کے بعد بھی انہیں چولھا ہانڈی ہی کرنی ہے۔

جب میں نے چچا کو اپنی نئی ملازمت کے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ''بیٹا۔ محنت اور ایمان داری سے کام کرنا۔ اللہ نے چاہا تو تم بہت ترقی کرو گے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے بڑی حسرت سے اپنے بیٹوں کی طرف دیکھا جو لاتعلقی انداز میں اپنے اپنے موبائل سے کھیل رہے تھے۔ چچا کی بڑی خواہش تھی کہ وہ دونوں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں لیکن ان کا شروع سے ہی پڑھائی میں دل نہیں تھا۔ وہ اسکول جانے کی بجائے محلے کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتے پھرتے، دونوں میں سے کوئی بھی آٹھویں جماعت سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ مجبور ہوکر چچا نے انہیں اسکول سے اٹھا کر اپنے ساتھ کام پر لگالیا۔

میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد گھر واپس آگیا لیکن میں نے ایک بات نوٹ کی کہ اس دوران ساجدہ میرے اردگرد منڈلاتی رہی۔ اس نے میرے لیے چائے بھی بنائی اور پانی کا گلاس اس طرح پکڑایا کہ اس کا ہاتھ میری انگلیوں سے مس ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اس نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی تھی۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''اب تم بڑے آدمی ہوگئے ہو، ہم غریبوں کو مت بھول جانا۔''

www.paksociety.com

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے ابھی بہت سا سفر طے کرنا ہے۔''

''نیت صاف ہو تو ہر منزل آسان ہو جاتی ہے۔'' وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔

میں اس کے رویے پر حیران رہ گیا۔ یہ وہی ساجدہ تھی جس نے کبھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ وہ میری کزن ضرور تھی لیکن ہمارے درمیان کبھی ہائے ہیلو سے زیادہ بات نہیں ہوئی۔ شاید یہ اس کا احساس برتری تھا اور وہ ہم لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھتی تھی لیکن آج اس کا رویہ یکسر بدل گیا تھا اور وہ بڑی لگاوٹ اور خلوص کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ شاید چڑھتے سورج کی پوجا کرنا اسی کو کہتے ہیں حالانکہ میں اب بھی اس کے غریب تایا کا بیٹا تھا لیکن میری حیثیت بدل گئی تھی اور میں سلیز مین کی بجائے ایک بڑی کمپنی کا سفید پوش ملازم بن گیا تھا۔

میں نے چند ہی دنوں میں کمپیوٹر سیکھ لیا۔ صدیقی صاحب کی ہدایت تھی کہ میں اپنی ٹائپنگ اسپیڈ بہتر بناؤں۔ میں نے اس جانب پوری توجہ دی اور فارغ وقت میں ٹائپنگ کی مشق کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں میری اسپیڈ بہت اچھی ہوگئی اور صدیقی صاحب سارے خطوط مجھ سے ٹائپ کروانے لگے۔

اب میں فائلنگ کلرک کے ساتھ ساتھ ٹائپسٹ کی ذمے داری بھی نباہ رہا تھا جس کی وجہ سے مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی تو پورا دن ہی خطوط ٹائپ کرتے اور فائلوں میں کاغذ لگاتے ہوئے گزر جاتا تھا لیکن مجھے کوئی شکایت نہیں تھی۔ میں پوری تندہی اور لگن سے کام کر رہا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ اس کا صلہ ضرور ملے گا اور وہی ہوا۔ تین مہینے بعد جب مجھے کنفرمیشن لیٹر ملا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی میری تنخواہ میں پانچ ہزار کا اضافہ ہوگیا تھا۔

نیا تعلیمی سال شروع ہوتے ہی میں نے شام کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ میں دفتر سے سیدھا وہیں چلا جاتا اور واپسی رات نو بجے کے بعد ہی ہوتی۔ اب میں نے اپنے لیے کچھ گول متعین کر لیے تھے۔ پہلے مجھے بی کام اور اس کے بعد بی اے کرنا تھا تاکہ کوئی اچھی ملازمت مل سکے۔

دو سال پلک جھپکتے گزر گئے۔ میں نے انٹر کامرس کر لیا تو صدیقی صاحب نے مجھے ایک اور ذمے داری سونپ دی۔ ہوا یوں کہ ہمارا اکاؤنٹس کلرک بیمار ہوگیا۔ اسے یرقان ہوگیا تھا۔ وہ ایک مہینے کی چھٹی پر چلا گیا تو صدیقی صاحب پریشان ہوگئے۔ دفتر میں اور کوئی ایسا شخص نہیں تھا جسے یہ کام دیا جاتا چنانچہ صدیقی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں عارضی طور پر اکاؤنٹس کا کام دیکھ لوں۔

ایک مہینے بعد بھی وہ نہیں آیا بلکہ اس نے اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ وہ دبئی جا رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کا تقرر کیا جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ مجھے ہی یہ ذمے داری مستقل طور پر سونپ دی گئی البتہ میری تنخواہ میں مزید پانچ ہزار کا اضافہ ہوگیا۔ یہ بہت ذمے داری کا کام تھا۔ اس بارے میں صدیقی صاحب نے میری رہنمائی کی۔ مجھے روزانہ کی بنیاد پر کمپنی کی آمدنی اور خرچ کا حساب رکھنا تھا۔ اسے کمپیوٹر میں فیڈ کرکے اس کا اسٹیٹمنٹ ہاشمی صاحب کو دینا ہوتا تھا۔ ادائیگیوں کے چیک بنانا اور کمپنی کے نام پر آئے ہوئے چیک بینک میں جمع کرانا بھی میرے فرائض میں شامل تھا۔

اس کام کے سلسلے میں میری تقریباً روزانہ ہی ہاشمی صاحب سے ملاقات ہو رہی تھی۔ وہ میرے کام سے مطمئن تھے اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جب میرا بی کام ہو جائے گا تو وہ میری تنخواہ میں مزید اضافہ کر دیں گے۔ میری پوری کوشش ہوتی تھی کہ انہیں یا صدیقی صاحب کو شکایت کا کوئی موقع نہ دوں۔

ہمارے گھر کے حالات میں نمایاں بہتری آگئی تھی۔ میری چھوٹی بہن باقاعدگی سے اسکول جا رہی تھی، میری خواہش تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں تاکہ ان کی اچھی جگہوں پر شادیاں ہو جائیں۔ میں تو یہ بھی چاہتا تھا کہ ابا ٹھیلا لگانا چھوڑ دیں اور آرام سے گھر بیٹھ جائیں لیکن وہ نہیں مانے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تو وہ بیمار پڑ جائیں گے۔ میں نے سوچا کہ اگر ابا کے لیے ایک دکان کا بندوبست ہو جائے تو وہ گلیوں میں پھیری لگانے سے بچ جائیں گے لیکن دکان کا ایڈوانس دینے کے لیے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی جس کا مجھے انتظام کرنا تھا۔

وقت پر لگا کر اُڑ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو سال اور گزر گئے، میں نے بی کام کرنے کے بعد بی بی اے میں داخلہ لے لیا اور اس کے چند روز بعد وہ واقعہ پیش آگیا جس کا ذکر میں شروع میں کر چکا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ اس نے ٹریٹ والی بات یونہی رواداری میں کہہ دی ہوگی۔ صبح ہونے تک اسے یاد بھی نہیں رہے گا لیکن وہ بھولی نہیں تھی۔

www.pakistanidigest.com

[illegible] ان آخری کلاس ختم ہوتے ہی وہ میرے پاس آئی اور بولی۔ ''چلو''

''کہاں؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''یاد نہیں۔ میں نے کل تمہیں ٹریٹ دینے کا کہا تھا۔''

''لیکن کیفے ٹیریا تو بند ہو گیا ہوگا۔'' میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہوا۔ شہر کے ریسٹورنٹ تو کھلے ہیں۔''

وہ مجھے لے کر گلستان جوہر کے ایک پوش ریسٹورنٹ میں آئی اور کونے کی ایک میز پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیا لو گے؟''

''صرف چائے'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

''ہونہہ صرف چائے۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں اس لیے یہاں لے کر نہیں آئی، چائے تو ہم کسی ڈھابے پر بیٹھ کر بھی پی سکتے تھے۔ میں خود ہی کچھ منگوا لیتی ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھا ہوا مینو اٹھایا اور ویٹر کو بلا کر چائے اور دیگر لوازمات کا آرڈر دے دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ دونوں کہنیاں میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''کل تم نے جس طرح میری مدد کی، اس سے میں بہت متاثر ہوئی ہوں۔ تم یقیناً کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ کیا تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟''

''آپ بار بار یہ بات کہہ کر مجھے شرمندہ کر رہی ہیں......''

''آپ نہیں تم۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''جب تم مجھے آپ کہتے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے میں ساٹھ سال کی بوڑھی عورت ہوں۔ بھئی ہم کلاس فیلوز ہیں یہ آپ جناب کا تکلف غیروں میں چلتا ہے۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تم پر احسان نہیں کیا بلکہ یہ میرا فرض تھا۔ میں ایک اکیلی لڑکی کو مصیبت میں چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا۔ اپنے بارے میں صرف یہی بتا سکتا ہوں کہ میں ایک غریب گھرانے کا فرد ہوں اور ملازمت کر کے اپنے گھر والوں کو سپورٹ کر رہا ہوں۔ ہم دو کمروں کے مکان میں رہتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ٹی وی، فریج، اے سی وغیرہ کچھ بھی نہیں اور نہ ہی اتنی جگہ کہ کسی مہمان کو بٹھا سکیں۔''

''تم واقعی ایک اچھے انسان ہو، تم نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ حالانکہ جھوٹ بھی بول سکتے تھے۔''

''جھوٹ بولنے سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ میری حیثیت تو نہیں بدل جاتی اور پھر جھوٹ ایک دن کھل ہی جاتا ہے۔ اس کے بعد جو شرمندگی ہوتی ہے، اس کے مقابلے میں سچ بولنا زیادہ بہتر ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ واقعی جھوٹ بول کر آدمی مشکل میں پڑ جاتا ہے۔'' وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم مجھ سے دوستی کرو گے؟''

''ہم اب بھی دوست ہی ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا۔ تم جیسے سچے اور مخلص انسان سے دوستی کرنا میرے لیے باعث فخر ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے تمہارا دوست بننا منظور ہے لیکن میں تمہیں اس طرح کے پوش ریسٹورنٹ میں ٹریٹ نہیں دے سکتا۔''

''دوستی میں، یہ سب نہیں دیکھا جاتا ڈیئر۔ تم مجھے ایک کولڈ ڈرنک پلا دو گے وہی میرے لیے بہت ہے۔''

اتنی دیر میں ویٹر چائے اور دیگر لوازمات لے کر آ گیا۔ نورین نے کئی چیزیں منگوائی تھیں ان میں سینڈوچ، سموسے، پیٹز، شامی کباب، نمکین اور میٹھے بسکٹ، گلاب جامن اور پیسٹریز وغیرہ شامل تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ بڑے لوگ کس بے دردی سے پیسے خرچ کرتے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اتنا زیادہ نہیں کھا سکتا۔ اس کے باوجود اس نے آنکھ بند کر کے ان چیزوں کا آرڈر دے دیا اور ایسا ہی ہوا۔ ہم دونوں نے اپنی پلیٹ میں ایک سینڈوچ، شامی کباب اور گلاب جامن رکھی باقی سارا سامان واپس چلا گیا۔

ہم ریسٹورنٹ سے باہر آئے تو اس نے ایک بار پھر مجھے گھر چھوڑنے کی پیشکش کی لیکن میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ میری فکر نہ کرے۔ میں بس سے چلا جاؤں گا۔

''یہاں سے تمہیں سرجانی کے لیے کوئی بس نہیں ملے گی۔'' وہ بولی۔ ''میں تمہیں آگے تک چھوڑ دیتی ہوں۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ وہاں سے مجھے سرجانی کے لیے رکشا کرنا پڑتا جس میں اچھے خاصے پیسے خرچ ہو جاتے اس لیے میں خاموش رہا، اس نے مجھے دس منٹ میں اگلی چورنگی تک چھوڑ دیا اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

رات کو میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو وہ میرے خیالوں میں چلی آئی۔ گو کہ ایک دن پہلے ہی اس سے میرا باقاعدہ تعارف ہوا تھا لیکن مجھے یوں لگا کہ اس سے برسوں کی جان پہچان ہو۔ وہ بے حد خوبصورت اور پُرکشش تھی اسے لباس پہننے کا سلیقہ آتا تھا۔ وہ جب ہنستی تو لگتا جیسے کوئی جھرنا بہہ رہا ہو لیکن میں کیوں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ وہ آسمان اور میں زمین۔ اس کا اور میرا کیا جوڑ، میں یہ دوستی افورڈ نہیں کرسکتا اس نے کہا تھا کہ تم ایک کولڈ ڈرنک پلا دو وہی بہت ہے۔ میں اسے کیا بتاتا کہ میرے بجٹ میں اس کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ اس سے رسمی سلام دعا کے علاوہ کوئی تعلق نہیں رکھوں گا اور اس کے ساتھ کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں بالکل نہیں جاؤں گا۔

میں بھول گیا تھا کہ بڑے لوگوں کو اپنی بات منوانے کی عادت ہوتی ہے، نورین بھی انہی میں سے ایک تھی۔ اس کی فطرت میں حاکمیت کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسے ایک دوست کی نہیں بلکہ ایک تابعدار مصاحب کی ضرورت تھی جو اس کے اشاروں پر چلتا رہے اور اسے مجھ میں وہ مصاحب نظر آ گیا۔

اگلے روز کلاس ختم ہونے کے بعد میں لائبریری چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر نوٹس بنانے لگا لیکن وہ وہاں بھی پہنچ گئی اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیا کررہے ہو؟''

''نوٹس بنا رہا ہوں۔'' میں نے مختصر جواب دیا

''چلو اچھا ہے۔ اس ویک اینڈ پر یہ نوٹس مجھے دینا۔ میں فوٹو کاپی کروا کر واپس کردوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''تم اپنے نوٹس خود کیوں نہیں بناتیں؟''

''مجھے کیا ضرورت ہے سر کھپانے کی۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے نوٹس سے ہی کام چلالوں گی۔''

وہ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ ''کتنا کام باقی ہے؟''

''کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ ''یہ چیپٹر پورا کرکے ہی اٹھوں گا۔''

''اچھا تو پھر میں چلتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''کل ملاقات ہوگی۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آسانی سے جان چھوٹ گئی، اس کے جانے کے بعد میں نے بھی کاغذات سمیٹے اور گھر کے لیے روانہ ہوگیا۔ ساجدہ اپنے دروازہ پر کھڑی میرا انتظار کررہی تھی، مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ''ابھی کھانا مت کھانا، میں نے تمہارے لیے کڑھی بنائی ہے، وہ لے کر آتی ہوں۔''

اسے نہ جانے کیسے معلوم ہوگیا کہ میں کڑھی شوق سے کھاتا ہوں۔ میں اکثر اماں سے فرمائش کرکے یہ ڈش بنوایا کرتا تھا۔ بہرحال میں نے اس بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے آم کھانے سے مطلب تھا۔ پیڑ گننے میں کیوں وقت ضائع کرتا۔ پانچ منٹ بعد ہی وہ ایک ڈونگے میں کڑھی لے کر آ گئی۔ واقعی اس کا ذائقہ بہت اچھا تھا۔ میں نے اس کی تعریف کی تو وہ خوش ہوگئی اور کہنے لگی۔ ''اتوار کو میں مٹر پلاؤ بناؤں گی۔ تمہیں پسند ہے نا؟''

''ہاں۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''مجھے سب پتا ہے کہ تمہیں کھانے میں کیا پسند ہے اور کیا نہیں۔''

سید حسنین بن احسان

(1931ء...1988ء)

امروہہ کے مشہور شاعر سید علی احسان، احسان امروہوی کے فرزند سید حسنین بن احسان نے حسنین تخلص اختیار کیا۔ شاعری اپنے والد سے نہ صرف ورثہ میں حاصل کی بلکہ اصلاح بھی والد ہی سے لی۔ محلہ بنگلہ امروہہ میں آپ کی ولادت 1930ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم امروہہ میں حاصل کرنے کے بعد والدین کے ساتھ ہجرت کرکے کراچی آئے اور محکمہ ٹیلی فون میں ملازمت حاصل کرلی۔ حسنین بن احسان کی شاعری کا ذخیرہ شاعری نعت، منقبت اور قصیدوں پر مشتمل ہے۔ کراچی میں منعقد ہونے والی محافل مقاصدہ میں آپ باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے اور دلنشین ترنم کے ساتھ اپنا کلام نذرِ سامعین کرتے تھے۔ 1988ء میں کراچی میں آپ کا انتقال ہوا۔

www.pakistanipoint.com

''اچھا تو تم میری جاسوسی کرتی ہو۔''

''اس میں جاسوسی والی کیا بات ہے؟'' وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہاری کزن ہوں اور پڑوسن بھی، اس لیے ایسی باتیں خود بخود معلوم ہو جاتی ہیں۔''

''پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ مجھے وقت ضائع کرنا بالکل پسند نہیں اس لیے اب تم چلتی پھرتی نظر آؤ۔ مجھے پڑھنا ہے۔''

''بڑے بے مروت ہو۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہارے لیے اتنی محنت سے کڑہی بنائی اور تمہارے پاس مجھ سے باتیں کرنے کے لیے چند منٹ بھی نہیں۔''

''دیکھو۔ میں پڑھائی سے فارغ ہو جاؤں پھر تم چاہے گھنٹوں باتیں کرنا۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

جمعہ کے روز آخری کلاس ختم ہوئی تو نورین نے مجھ سے نوٹس لے لیے اور کہنے لگی کہ ان کی فوٹو کاپی کروا کر پیر کو واپس کر دے گی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے نوٹس دے دیے لیکن ڈر رہا تھا کہ وہ انہیں ادھر اُدھر نہ کر دے۔ وہ شاید چہرہ پڑھنا بھی جانتی تھی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بے فکر رہو۔ میں انہیں سنبھال کر رکھوں گی۔''

اتوار کے دن ساجدہ نے میرے لیے مٹر پلاؤ بنایا۔ اس کے ساتھ رائتہ اور سلاد کا بھی اہتمام کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کھانا پکانے میں ماہر تھی اور اس کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت تھا۔ میں نے دل کھول کر تعریف کی تو وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

''خالی تعریف ہی کرتے رہو گے یا مجھے کوئی انعام بھی دو گے۔''

''بولو کیا چاہیے؟'' میں نے حاتم طائی بنتے ہوئے کہا لیکن دل میں ڈر رہا تھا کہ کوئی مہنگی فرمائش نہ کر دے جسے پورا کرنا میرے بس سے باہر ہو۔

''تم مجھے وہ رسالہ لا دو جس میں کھانا بنانے کی ترکیبیں ہوتی ہیں پھر دیکھنا میں تمہیں کیسے مزے مزے کے کھانے کھلاتی ہوں۔''

مجھے اس کی فرمائش سن کر ہنسی آ گئی۔ بے چاری پڈل کلاس لڑکی۔ کتنی محدود سوچ ہوتی ہے ان کی۔ یہ لڑکیاں کبھی اپنے خول سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ ان کی ساری زندگی کھانا پکانے اور بچے پالنے میں گزر جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے نورین کا ہنستا مسکراتا روشن چہرہ آ گیا۔ اس کی خود اعتمادی اور حاکمانہ انداز دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ دنیا کو فتح کرنے نکلی ہے۔

پیر کے روز نورین نے وعدے کے مطابق مجھے نوٹس واپس کر دیے اور بولی۔ ''تم نے بہت زبردست نوٹس بنائے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کوئی کتاب دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ چلو اسی خوشی میں تمہیں اچھی سی آئس کریم کھلاتی ہوں۔''

میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانی اور مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر آئس کریم پارلر لے گئی۔ اس بار اس نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کون سی آئس کریم کھانا پسند کروں گا بلکہ اس نے خود ہی بیرے کو بلا کر اپنی مرضی کے فلیور کا آرڈر دے دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں کی آئس کریم بہت مزے دار تھی۔ میرا دل چاہا کہ ساجدہ اور اپنی بہنوں کے لیے بھی پیک کروالوں لیکن یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ نورین مجھے اس کی پیمنٹ نہیں کرنے دے گی اور میں اس کا احسان لینا نہیں چاہتا تھا۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ وہ مجھ سے ہر جمعہ کو نئے نوٹس لیتی اور پیر کے دن انہیں واپس کرنے کے بعد مجھے آئس کریم کھلانے لے جاتی اور جب میں ٹال مٹول کرتا تو وہ ناراض ہو جاتی اور کہتی ''تم کیسے دوست ہو امجد۔ تمہیں ذرا سا بھی میرا احساس نہیں۔ جانتے ہو کہ مجھے آئس کریم کتنی پسند ہے اگر میرے ساتھ چلے جاؤ گے تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا۔''

اس کے بعد میرے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہ ہوتی اور میں سر جھکائے کسی تابعدار غلام کی طرح اس کے ساتھ چل دیتا پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں ایک دن معمول کے مطابق اکاؤنٹس چیک کروانے کے لیے ہاشمی صاحب کے کمرے میں گیا تو ان کی کرسی پر نورین بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''تم؟''

''ہاں میں'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بیٹھ جاؤ۔ آج پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے انہوں نے مجھے بھیج دیا۔''

''تم۔ تم ہاشمی صاحب کی بیٹی ہو؟'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''کیا تمہیں یقین نہیں آ رہا؟''

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''لیکن تم نے کبھی بتایا نہیں۔''

''تم نے پوچھا ہوتا تو بتاتی۔ ویسے بھی دوستوں کا حسب نسب معلوم نہیں کیا جاتا۔ کیا میں نے کبھی تمہارے والد صاحب کا نام پوچھا؟''

میں لاجواب ہوگیا اور اکاؤنٹ اسٹیمنٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ روزانہ کی آمدنی اور اخراجات کا حساب ہے۔ اسے دیکھ لو۔''

''تم نے بنایا ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔'' وہ کاغذ ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔ ''تم یہاں کتنے عرصے سے کام کررہے ہو؟''

''میں نے میٹرک کرنے کے بعد ہی یہاں ملازمت کرلی تھی، اس سے پہلے کچھ عرصہ جوتوں کی دکان پر سیلز مین بھی رہا۔''

''تم تو خطرناک حد تک سچے اور کھرے انسان ہو۔ یہ سیلز مین والی بات بتانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''کیونکہ یہ بھی میرے ماضی کا ایک حصہ ہے۔ اب تم پاس کی کرسی پر بیٹھی ہوئی ہو اس لیے تمہیں میرے بیک گراؤنڈ کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔ سچ پوچھو تو ہاشمی صاحب نے یہ ملازمت دے کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے ورنہ میں اپنا تعلیمی سفر جاری نہیں رکھ سکتا تھا اور شاید آج بھی اس دکان پر سیلز مین ہی ہوتا۔''

''پاپا کو انسانوں کی پرکھ ہے۔ انہوں نے تمہارے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں کی اور تم ان کے اعتماد پر پورا اترے۔ اب میری ایک بات غور سے سن لو۔ اس دفتر میں کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم یونیورسٹی میں میرے کلاس فیلو ہو۔ یہاں ہمارا تعلق باس اور ماتحت کا ہی رہے گا۔ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو اور کوئی بھی ایسی ویسی بات دیکھو یا سنو تو مجھے ضرور بتانا۔''

''کیوں؟ کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟''

''ابھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن مجھے لگتا ہے کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ تمہارے آنے سے پہلے ٹینڈر کی فائل کھولی رہی تھی۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ گزشتہ چند ماہ سے ہمیں سپلائی کا کوئی آرڈر نہیں ملا اور ہمارے ٹینڈر مسلسل مسترد ہورہے ہیں۔ تم یہ فائل لے جاؤ۔ اسے اسٹڈی کرو اور مجھے بتاؤ کہ ایسا کیوں ہورہا ہے۔''

میں فائل دیکھے بغیر بھی اس کی وجہ بتا سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ریٹ دوسری پارٹی کے مقابلہ میں زیادہ تھے اس لیے ہمارا ٹینڈر منظور نہیں ہورہا تھا لیکن میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ فائل پڑھے بغیر اپنی رائے کا اظہار کردوں۔ اپنے کمرے میں آکر میں نے اس فائل کا بغور مطالعہ کیا تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ہمارے اور مخالف پارٹی کے ریٹس میں بہت معمولی فرق تھا یعنی اگر ہم نے کسی چیز کی قیمت سو روپے لگائی تھی تو انہوں نے 99 روپے لگا کر اس کی سپلائی کا آرڈر لے لیا۔ یہ سلسلہ گزشتہ کئی ماہ سے چل رہا تھا اور ہاشمی صاحب نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ آخر ہمارے ریٹس دوسری پارٹی سے زیادہ کیوں ہوتے ہیں۔

مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ ہماری انفارمیشن لیک ہورہی ہیں اور ہمارے دفتر کا کوئی آدمی انہیں ہمارے ریٹس کے بارے میں بتا رہا ہے۔ وہ لوگ اسی میں معمولی کمی کرکے اپنا ریٹ ڈال دیتے اور وہ آرڈر انہیں مل جاتا تھا۔ وہ آدمی کون ہوسکتا ہے جبکہ ٹینڈر کا سارا کام صدیقی صاحب خود کرتے تھے تو کیا ان کی بے پروائی کی وجہ سے یہ انفارمیشن لیک ہورہی تھیں۔ اس بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ پہلے اس کی تصدیق کرلی جائے۔

شام کو یونیورسٹی میں نورین سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے اپنی ریسرچ کے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔ ''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ پاپا، صدیقی صاحب پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں اس لیے کسی ثبوت کے بغیر ان سے یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے ثابت کیسے کیا جائے۔''

میرے ذہن میں اس کا حل موجود تھا لیکن میں نے اپنی زبان سے کہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ''پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ شاید چند روز تک دفتر نہ آئیں اس لیے مجھے ہی اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ اگلا ٹینڈر کب ہے؟''

''یہ تو صدیقی صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کل صبح ان سے بات کرتی ہوں پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔''

یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد میں گھر پہنچا تو اماں نے ایک نیا موضوع چھیڑ دیا، میں کھانا کھانے کے بعد اپنے معمول کے مطابق پڑھنے بیٹھا تو وہ میرے پاس بیٹھتے

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

بولیں۔ ''امجد بیٹا۔ تمہاری پڑھائی کب ختم ہوگی؟''

میں نے چونک کر انہیں دیکھا اور سوچنے لگا کہ انہیں اچانک میری پڑھائی کے بارے میں تشویش کیوں ہونے لگی۔ میں نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ''اماں۔ ابھی تو ڈیڑھ سال باقی ہے۔ اس کے بعد ہوسکتا ہے کہ میں ایم بی اے میں داخلہ لے لوں۔''

''ارے بیٹا۔ تو کیا ساری عمر پڑھتے ہی رہو گے۔ کچھ اپنی فکر بھی ہے؟''

میں ان کا اشارہ سمجھ گیا پھر بھی انجان بنتے ہوئے کہا۔ ''کیسی فکر؟''

''میں تمہاری شادی کی بات کررہی ہوں۔'' اماں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے سر پہ سہرا دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''اتنی جلدی کیا ہے، پہلے میں کسی قابل تو ہو جاؤں۔''

''مجھ سے زیادہ تمہاری چچی کو جلدی ہے۔ وہ بیمار رہنے لگی ہیں اور چاہتی ہیں کہ اپنی زندگی میں ہی اس فرض سے سبکدوش ہوجائیں۔''

''اماں۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔ کھل کر بات کریں۔''

''دراصل ہم نے بچپن میں ہی تمہارا رشتہ ساجدہ سے طے کردیا تھا، میرا خیال تھا کہ وقت آنے پر تمہیں بتادوں گی اور اب وہ وقت آگیا ہے، ساجدہ مجھے بھی پسند ہے۔ خوبصورت، سلیقہ شعار، گھر داری میں ماہر، میرا خیال ہے کہ تمہیں بھی اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

میں نے سن رکھا تھا کہ لڑکیاں، گائے بھینس ہوتی ہیں اور والدین اپنی مرضی سے انہیں جس کھونٹے پر چاہے باندھ دیتے ہیں لیکن کچھ گھروں میں لڑکوں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ میری ماں اور چچی نے رشتہ کرتے وقت یہ نہیں سوچا کہ ہمارے بڑے ہونے کا انتظار کرلیا جائے، نہ جانے اس وقت حالات کیا رخ اختیار کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا اور ساجدہ کا کوئی جوڑ نہیں تھا، ہمارے درمیان سب سے بڑا فرق تعلیم کا تھا اور ہماری ذہنی سطح میں بھی کوئی مطابقت نہیں تھی لیکن میں یہ بات اماں سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ البتہ انہیں ٹالنے کے لیے اتنا ضرور کہا۔

''اماں، میں فی الحال شادی نہیں کرسکتا، ورنہ میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ آپ یہ بات چچی کو بھی سمجھا دیں اور اگر انہیں بہت جلدی ہے تو اپنی بیٹی کا رشتہ کہیں اور کردیں۔''

''فضول باتیں مت کرو۔'' اماں خفا ہوتے ہوئے بولیں۔ ''ٹھیک ہے تم اپنی تعلیم مکمل کرلو لیکن تمہاری شادی ساجدہ سے ہی ہوگی۔''

دوسرے دن نورین نے صدیقی صاحب سے اگلے ٹینڈر کے بارے میں معلوم کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی اس میں پندرہ دن کا وقت ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے نورین کے سامنے چھٹی کی درخواست رکھ دی۔ ان کی بیٹی کی شادی تھی، اس کے لیے وہ ایک ہفتہ کی رخصت مانگ رہے تھے۔

''ٹھیک ہے۔'' نورین نے کہا۔ ''آپ یہ کام امجد کے حوالے کردیں تاکہ آپ کی غیر موجودگی میں وہ ٹینڈر کی تیاری مکمل کرلے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے۔'' صدیق صاحب بولے۔ ''ایک ہفتہ کی تو بات ہے میں واپس آکر ٹینڈر داخل کردوں گا۔''

نورین پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے کبھی غور کیا کہ گزشتہ کئی ماہ سے ہمارے ٹینڈر کیوں مسترد ہورہے ہیں اور دوسری پارٹی کم قیمت لگا کر آرڈر پکڑ رہی ہے اس لیے ہمیں اپنے ریٹس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ امجد مارکیٹ سروے کرکے تمام آئیٹمز کے موجودہ ریٹس معلوم کرے اور ہم اس میں اپنا منافع شامل کرکے ٹینڈر داخل کردیں۔ اس طرح یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ ہم سے کیا غلطی ہورہی ہے۔''

صدیقی صاحب منہ لٹکائے واپس آئے اور ٹینڈر کی فائل مجھے دیتے ہوئے بولے۔ ''مس نورین نے ان آئیٹمز کا مارکیٹ سروے کرنے کے لیے کہا ہے۔ تم میرے آنے تک یہ کام مکمل کرلینا تاکہ ہم وقت پر ٹینڈر داخل کرسکیں۔''

مارکیٹ سروے کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نیٹ پر تمام آئیٹمز کے ریٹ موجود تھے۔ اس کے باوجود میں نے مختلف دکانوں پر جاکر ان سے کوٹیشنز لیں اور جب ان کا موازنہ پرانے ٹینڈر سے کیا تو معلوم ہوا کہ ہم مارکیٹ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ریٹ لگا رہے تھے۔ نہ جانے یہ صدیقی صاحب کی بے پروائی تھی یا کاہلی کہ انہوں نے کبھی مارکیٹ سروے کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ بہرحال میں نے نورین سے مشورہ کرکے نئے ریٹ لگائے اور صدیقی صاحب کے آنے سے پہلے ہی ٹینڈر جمع کروادیا۔ نتیجہ میری توقع کے مطابق رہا اور سب سے کم ریٹ ہونے کی وجہ سے وہ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

آرڈر ہمیں مل گیا۔

نورین کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ بھی جان گئی تھی کہ ماضی میں ہماری ناکامی کی وجہ کیا تھی۔ ہمارے دفتر سے انفارمیشن لیک ہو رہی تھی۔ اس بار میں نے اپنے ریٹس خفیہ رکھے اور کسی کو اس کی ہوا نہیں لگنے دی اس لیے مخالف پارٹی کو موقع نہیں ملا کہ وہ ہمارے یہاں سے ملنے والی انفارمیشن کی بنیاد پر ہم سے کم ریٹ کا ٹینڈر داخل کر سکے۔

اس ڈرامے کے مرکزی کردار صدیقی صاحب تھے لیکن نورین نے ان سے کچھ نہیں کہا اور ٹینڈر کا کام مستقل طور پر میرے حوالہ کر دیا۔ اب صدیقی صاحب کے پاس صرف کمپنی کے انتظامی امور رہ گئے تھے۔ اس روز دفتر کا وقت ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے نورین نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بولی۔ ''میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟''

''ہم کسی اچھی جگہ بیٹھ کر اس کامیابی کا جشن منائیں گے۔''

وہ مجھے اسی آئس کریم پارلر پر لے گئی جہاں کی آئس کریم اسے بہت پسند تھی۔ اس نے آئس کریم کا آرڈر دیا اور بولی۔ ''تمہاری وجہ سے کمپنی کو لاکھوں کا فائدہ ہوا ہے تم نہیں جانتے کہ یہ آرڈر ہمارے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ میں پاپا سے تمہاری ترقی کی سفارش کروں گی فی الحال میری طرف سے یہ ایک چھوٹا سا تحفہ قبول کرو۔''

میں نے وہ ڈبا کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک قیمتی اسمارٹ فون تھا۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''نورین۔ یہ تو بہت قیمتی ہے۔''

''ہوگا'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''لیکن تم نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔''

''تم بار بار اس کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ مت کرو۔ میں نے صرف اپنی صلاحیت اور عقل کا استعمال کیا ہے۔''

''تم واقعی جینیس ہو۔ میرا بس چلے تو کبھی تمہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دوں۔''

''کیا؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''کیا کہا تم نے؟''

''اوہ کچھ نہیں۔'' وہ جھینپتے ہوئے بولی۔ ''دراصل میں سوچ رہی تھی کہ بی بی اے کرنے کے بعد تمہیں کسی اچھی کمپنی میں جاب مل جائے گی اور تم ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔''

''وہ منزل ابھی دور ہے۔ ہمیں کل کی بجائے آج کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''اچھا تم آج ہی اس موبائل میں سم ڈلوا لینا تاکہ تم سے بوقت ضرورت بات ہو سکے۔''

نورین کی نوازشات بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس نے ہاشمی صاحب سے بات کر کے ایک ہفتے بعد ہی مجھے اسسٹنٹ منیجر کے عہدہ پر ترقی دے دی۔ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ جس روز مجھے ترقی کا پروانہ ملا۔ وہ مجھے شام کو یونیورسٹی کی کلاس ختم ہونے کے بعد ڈنر کے لیے لے گئی۔ یہ وہی ریسٹورنٹ تھا جہاں اس نے پہلی بار مجھے ٹریٹ دی تھی۔ ہم ایک کونے کی میز پر بیٹھ گئے۔ اس نے بیرے کو کھانے کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔ ''امجد شاید میں چند روز دفتر نہ آسکوں۔ لندن سے کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ میں ان کے ساتھ مصروف ہو جاؤں گی۔ البتہ پاپا کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔ وہ کچھ دیر کے لیے دفتر آئیں گے لیکن اب تم کو ہی سب کچھ دیکھنا ہے۔ میں روزانہ رات کو فون کر کے تم سے صورتِ حال معلوم کرتی رہوں گی۔''

مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے سر سے سایہ ہٹ گیا ہو اور میں کھلے آسمان کے نیچے چلچلاتی دھوپ میں کھڑا ہوا ہوں۔ میں اس کا عادی ہو گیا تھا اور اس سے دور رہنا مجھے گوارہ نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کیفیت کو کیا نام دوں کیا وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ اب تک اس کا رویہ میرے ساتھ بہت دوستانہ تھا اس نے قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔ وہ بہانے بہانے مجھے کبھی ہوٹل کبھی آئس کریم پارلر اور کبھی آؤٹنگ کے لیے لے جاتی۔ وہ رات کو دیر تک مجھ سے فون پر باتیں کرتی۔ ان سب باتوں کا کیا مطلب تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ میری ذات میں دلچسپی لے رہی تھی ورنہ کون اپنے ملازم کو اتنی اہمیت دیتا ہے۔

اس کے باوجود میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ ہم دونوں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل تھی۔ میری اور اس کی حیثیت میں نمایاں فرق تھا۔ وہ ایک کروڑ پتی باپ کی بیٹی تھی اور میرا باپ گلیوں میں پھیری لگا کر سبزی بیچتا تھا۔ اس کا ڈیفنس میں ہزار گز کا بنگلا تھا اور میں سرجانی ٹاؤن کے ایک نیم پختہ دو کمروں کے مکان میں رہتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اس کے باپ کی کمپنی میں معمولی ملازم تھا۔ اس خلیج کو صرف نورین ہی پاٹ سکتی تھی۔ اگر اس کے دل میں میرے لیے کوئی نرم گوشہ ہے یا وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے تو وہ حیثیت کے فرق کے باوجود اپنے والدین کو اس رشتہ کے لیے

www.paksociety.com

راضی کرسکتی ہے لیکن ایسا صرف فلموں میں ہوتا ہے۔

اس خلیج کو کم کرنے کے لیے مجھے اپنا قد بلند کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے میں اپنی تعلیم مکمل کروں۔ مجھے کوئی اچھی ملازمت مل جائے اور اس قابل ہوجاؤں کہ کسی اچھے علاقے میں مکان لے سکوں۔ میرے پاس اپنی گاڑی ہو جب ہمارے درمیان مالک اور ملازم کا رشتہ ختم ہوجائے گا تو میں برابری کی سطح پر اس سے بات کرسکوں گا اور اسے بھی اپنے والدین کو راضی کرنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔

میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو چکا تھا کہ جب بھی اس کے سامنے حال دل بیان کروں گا تو وہ بلا کسی جھجک میرا پروپوزل قبول کرے گی کیونکہ اگر وہ مجھے پسند کرتی ہے تب بھی پہل مجھے ہی کرنا ہوگی۔ اس کے لیے مجھے مناسب موقع کا انتظار تھا۔

نورین کو دل میں بسانے کے بعد میں ساجدہ سے بے اعتنائی برتنے لگا۔ میری کوشش ہوتی کہ اس سے کم از کم سامنا ہو۔ وہ میرے لیے کوئی چیز بنا کر لاتی تو میں جھوٹے منہ بھی اس کی تعریف نہ کرتا۔ وہ کوئی بات کرتی تو ہوں ہاں، میں جواب دیتا۔ اس نے بھی میری بے رخی کو محسوس کرلیا اور ایک دن کہنے لگی۔ ''کیا بات ہے امجد۔ تم مجھ سے سیدھے منہ بات کیوں نہیں کرتے؟''

''یہ تمہارا وہم ہے ساجدہ'' میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ ''بس پڑھائی کی مصروفیت ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ امتحان ہونے والے ہیں۔''

وہ سیدھی سادی لڑکی میری وضاحت سے مطمئن ہوگئی۔ اب مجھے نورین کا انتظار تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ اس سے ملاقات ہو تو اسے ٹٹولوں کہ وہ میرے لیے کیا جذبات رکھتی ہے۔ اسے یونیورسٹی آئے ہوئے پندرہ دن ہوگئے تھے لیکن اس نے مجھے ایک بار بھی فون نہیں کیا حالانکہ اس نے کہا تھا کہ وہ روزانہ رات کو فون کرکے دفتر کی صورتِ حال معلوم کرتی رہے گی۔ یہ ایک تشویش کی بات تھی، میں نے ایک دو مرتبہ اسے فون کرنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے مہمانوں میں مصروف ہو اس لیے اسے ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں۔

پندرہ دن بعد وہ یونیورسٹی آئی تو بہت خوش نظر آرہی تھی۔ آخری کلاس ختم ہوتے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ''چلو''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''آئس کریم کھانے اس کے علاوہ مجھے ایک سرپرائز بھی دینا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہیں چل کر بتاؤں گی۔''

وہ مجھے اسی آئس کریم پارلر پر لے گئی جہاں ہمیشہ جاتے تھے۔ اس نے ایک کونے کی میز کا انتخاب کیا اور آئس کریم کا آرڈر دینے کے بعد بولی۔ ''کام کیسا چل رہا ہے؟''

''بالکل ٹھیک۔''

''میں چاہتی ہوں کہ تم بی بی اے کرنے کے بعد بھی ہماری کمپنی میں کام کرتے رہو۔ صدیقی صاحب ریٹائر ہونے والے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد تمہیں منیجر کی پوسٹ پر پروموٹ کردیا جائے گا۔ تمہیں وہی تنخواہ اور مراعات ملیں گی جس کی دوسری جگہ پر توقع کرسکتے ہو۔''

''یہ باتیں ہم بعد میں بھی کرسکتے ہیں۔ پہلے تم بتاؤ، وہ کیا سرپرائز ہے جو تم مجھے دینا چاہ رہی ہو؟''

''اوہ ہاں'' وہ جھینپتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھو'' اس نے اپنا ہاتھ میرے سامنے کردیا جس میں ایک ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔

''یہ۔ یہ کیا ہے.....؟''

''ہاں میں جانتی تھی کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ یہ صرف تمہارے لیے نہیں بلکہ میرے لیے بھی سرپرائز ہے۔ دراصل پھوپی اپنے بیٹے عدنان کے ساتھ لندن سے آئی ہوئی تھیں۔ مجھے خود بھی ان کی آمد کا مقصد معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے اچانک ہی غیر متوقع طور پر میرا رشتہ مانگا اور پاپا نے میری رضامندی معلوم کرنے کے بعد عدنان سے میری منگنی کردی۔ وہ لوگ کل ہی واپس گئے ہیں، چھ ماہ بعد ہماری شادی ہے۔ میں بھی لندن چلی جاؤں گی اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تم ہماری کمپنی میں ہی رہو۔ میرے جانے کے بعد پاپا کو تمہارے سہارے کی ضرورت ہوگی۔''

''مبارک ہو'' میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تمہارا کہنا نہیں ٹال سکتا جب تک اس کمپنی کو میری ضرورت ہے میں یہاں کام کرتا رہوں گا۔''

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ نورین کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا اور دل کی بات دل میں رہ گئی۔ اس نے عدنان سے رشتہ جوڑ کر میری اوقات یاد دلادی تھی۔ اب مجھے ساجدہ سے شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

++

خضرِ راہ

محترم ایڈیٹر

السلام علیکم!

ایک نئی سچ بیانی ارسال کررہی ہوں۔ اُمید ہے سرگزشت کے مزاج کی ثابت ہوگی اس سچ بیانی میں ایک مخفی سبق ہے اگر قارئین نے اسے سمجھ لیا تو زندگی سنور جائے گی۔

مونا شہزاد

(کیلگری، کینیڈا)

ہوا میں خنکی تھی، عجب سی اداسی رچی ہوئی تھی۔ گلِ نرگس کی مسحور کن خوشبو چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ سفید اور زردی میں گھلا خوبصورت گلِ نرگس۔ اس نے اپنے جسم کے گرد گرم چادر لپیٹی اور سوچنے لگی۔ ''دسمبر کی شامیں ہمیشہ سے بہت اداس ہوتی تھیں یا اب مجھے اداس لگنے لگی ہیں؟''

وہ اپنی لایعنی سوچ پر خود ہی مسکرا اٹھی۔ اس نے اپنی ہتھیلی کو پھیلایا، دور کہیں سے ہوا کے دوش پر اڑتا ایک زرد پتا اس کی ہتھیلی پر آن ٹھہرا۔ اس نے بہت ملائمت سے پتے کو سہلانا چاہا، مگر پتا شاید بالکل زرد ہو چکا تھا۔ اس میں سے زندگی کی تازگی رخصت ہو چکی تھی۔ پتا اس کے چھوتے ہی بکھر سا گیا۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں یک دم آنسو آ گئے۔ اس نے پتے کی باقیات کو بہت احتیاط سے ٹیرس کی ریلنگ پر رکھ دیا۔ اچانک ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا۔ وہ جانتی تھی کہ اب پتے کی باقیات بھی ریلنگ پر موجود نہیں رہی ہوں گی۔ اسے لگا جیسے وہ پتا اور اس کی زندگی ایک دوسرے سے بہت مماثلت رکھتے تھے۔ اس کے اوپر شدید

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

یاسیت چھا گئی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی سوچ کے دھارے کو دوسری سمت میں بدلنا چاہا مگر اس کی سوچ کا پرندہ شاید آج بغاوت پر آمادہ تھا۔ اس نے سوچا۔ ''یہ پتے کس خوف سے زرد پڑ جاتے ہیں؟'' پھر خود ہی وہ آہستہ سے بولی۔ ''شاید بچھڑتے سال کی جدائی کا خوف انھیں زرد کر دیتا ہے۔ وہ جدائی کی چاپ سن سن کر لرزتے رہتے ہیں اور اسی خوف سے چرمرا جاتے ہیں۔''

اچانک اسے القا ہوا جیسے اس نے پتے کے پیرائے میں اپنی حالت زار بیان کر دی ہے۔ اس نے سر کو جھٹکا اور بڑبڑائی۔ ''محبت کے سوال کا جواب اگر نفی میں آئے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ سورج ڈھل جائے تو سائے دراز ہو ہی جاتے ہیں۔''

اس کے جسم پر کپکپاہٹ سی طاری ہوئی۔ وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ''سردی بہت بڑھ گئی ہے۔ مجھے اب اندر جانا چاہیے۔''

اچانک اس کی توجہ ساتھ والوں کے ٹیرس پر کھڑے نو بیاہتا جوڑے کی آوازوں پر مبذول ہوگئی، دلہن شرماتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''چھوڑیں جی! میرا ہاتھ نہ پکڑیں۔ لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟''

الفاظ اگرچہ کچھ اور کہہ رہے تھے مگر اس کے لہجے کی شوخی کچھ اور ہی پیغام دے رہی تھی۔

نایاب کے قدم جم سے گئے۔ اس کے دل کے نہاں خانوں میں پنپتی تمام حسرتیں، خواب، ارمان...... ایک دم جاگ سے گئے۔ کبھی وہ بھی تو کسی کی چاہت کی بارش میں پور پور بھیگتی رہتی تھی۔ اس کے دل سے ایک درد کی لہر اٹھی۔

لڑکے نے شاید کوئی اور پیش قدمی کی تھی۔ لڑکی لجا کر بولی۔ ''آپ کو تو حیا آتی ہی نہیں۔ باز تب آئیں گے جب محلے والے آپ کی شکایت لے کر امی ابا جی کے پاس آئیں گے۔

ارے دیکھیں! ساتھ والے ٹیرس پر کھڑی لڑکی ہماری طرف ہی گھور گھور کر دیکھ رہی ہے۔''

اس کے ہاتھوں کی چوڑیوں کی کھنک بتا رہی تھی کہ بلما گستاخیوں پر آمادہ تھا۔ اچانک لڑکا بولا۔ ''میری جان! تم نایاب کی فکر مت کرو! شاید تم جانتی نہیں وہ بچاری تو اندھی ہے۔''

لڑکی جیسے چکرا سی گئی بہ دقت تمام بولی۔

''واقعی میں اندھی ہے! چچ چچ...... بیچاری! کتنی خوبصورت ہے مگر کتنی بدنصیب ہے۔ ہائے! اسے کبھی کسی کا پیار نصیب نہیں ہوگا۔ اس اندھی سے بھلا کون شادی کرے گا؟''

نایاب کا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا، اس کا دل کیا کہ وہ چیخ کر کہے۔ ''میں اندھی ضرور ہوں مگر بہری نہیں۔ خدارا! مجھ پر ترس مت کھاؤ۔ مجھے تمہارے رحم کی بھیک نہیں چاہیے۔''

مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ پائی۔ سردی میں بھی اس کا ماتھا پسینے سے بھر گیا۔ وہ الفاظ نہیں آتش فشاں کا بہتا لاوا تھا جنھوں نے اس کی ہستی جلا کر خاکستر کر دی تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے تیزی سے مڑی اور اپنی چھڑی سے راستہ محسوس کرتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس نے پھرتی سے ایسے دروازہ بند کیا جیسے سیکڑوں بدروحیں اس کے تعاقب میں ہوں۔ اس کی ٹانگیں بے دم سی ہوگئی تھیں۔ وہ راستہ ٹٹولتی، مشکل سے اپنے بستر تک پہنچی اور اس پر ڈھیر ہوگئی۔ اس کی بند آنکھوں کے آگے یادوں کے دریچے کھل گئے۔

اسے پچھلے سال اپریل کی وہ رات یاد آگئی جس نے اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے بدل ڈالی تھی۔ اس کی بند آنکھوں کے آگے جیسے فلم سی چل پڑی۔

☆☆☆

پورا بنگلا برقی قمقموں سے سجا جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ ہر طرف رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ قہقہوں کا ایک طوفان تھا جو امڈا جا رہا تھا۔ وسیع و عریض لان میں پکتے پکوانوں کی خوشبو سے پورا بنگلا مہک اٹھا تھا۔ ہر چہرے پر خوشی و شادمانی کا رنگ نمایاں تھا۔ آخر کار شادی والا گھر تھا۔ وہ پارلر سے تیار ہو کر کب کی آچکی تھی۔ سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس وہ نہایت حسین لگ رہی تھی۔ طلائی زیورات اس پر بہت جچ رہے تھے۔ اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو خود ہی لجا گئی۔ اس کا روپ حوروں کو بھی شرما رہا تھا۔ اس کی سکھیاں اسے چھیڑ رہی تھیں۔ وہ شرم سے سرخ پڑتے ہوئے کسمسا رہی تھی۔ اس کی ہتھیلیوں پر حنا کا رنگ خوب سرخ آیا تھا۔ سب سکھیوں کا کہنا تھا۔ ''نایاب کی ساس اور میاں ہمیشہ اس پر مہربان رہیں گے۔''

اس کے سپنوں کی دنیا آباد تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک عجب سا سحر تھا۔ اچانک پکار مچی کہ برات پہنچ چکی ہے۔ سب سکھیاں باہر ٹیرس کی جانب بھاگیں.. مگر وہ سب کا راستہ روک کر بولی۔ ''میرے دلہا راجا مجھے لینے آئے ہیں اس لیے سب سے پہلے برات تو میں دیکھوں گی۔''

وہ سرخ لہنگا سنبھالے شوخی سے مسکراتی باہر کی جانب

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

بھاگی۔ اس کی سکھیاں "نہیں، نہیں" چلاتی اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑیں اور نہ جانے کیسے، اس کا پاؤں رپٹا اور دوسرے لمحے وہ ریلنگ کے پار تھی، اس کے کانوں میں اس کی اپنی چیخ کی بازگشت سنائی دی۔ وہ بے یقینی سے خود کو سلوموشن میں دوسری منزل سے نیچے گرتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں چلائے مگر کوئی سہارا، کوئی چیز ایسی نہیں تھی، جسے وہ تھام سکتی۔ آن واحد میں اس کا نازک وجود اسی پھولوں سے سجی گاڑی سے آٹکرایا جس میں اس کا ہونے والا دلہا بیٹھا تھا۔ اس نے بند ہوتی آنکھوں سے دیکھا اس کے ہونے والے ساس، سسر اور دلہا سب چلاّ رہے تھے۔ اس کا ڈوبتا ہوا ذہن سمجھ نہیں پایا کہ آج خوشی والے دن وہ کیوں چیخ رہے تھے؟ اچانک اس کے دماغ پر تاریکی چھاگئی اور وہ بے ہوش ہوگئی۔

نایاب کو جب ہوش آیا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے پتا نہیں کتنی صدیاں گزر گئی تھیں، اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا، اس کے سر میں شدید قسم کا درد تھا۔ اس نے بے اختیار ہی اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کیا ہوا تھا؟ مگر سب کچھ دھندلا دھندلا سا تھا۔ اس نے لمبے لمبے سانس لیے اور اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کی۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھیں کھولیں مگر یہ کیا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر ہنوز تنی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر بے اختیار ہی اٹھ بیٹھی۔ اچانک امی کی آواز آئی۔

"شکر ہے رب العالمین کا...... میری چندا کو ہوش آگیا۔"

"صدیقی صاحب دیکھیں! چندا کو ہوش آگیا۔ یاسر کو بھی بلا لیجیے اس کی منگیتر کو ہوش آگیا۔"

نایاب گم صم سی بیٹھی، امی کی آواز سن رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ ایسی فلم دیکھ رہی ہے جس میں صرف آواز آرہی تھی جب کہ مناظر کسی تکنیکی خرابی کے باعث نظر نہیں آرہے تھے۔ اس نے تیزی سے آنکھیں جھپکیں مگر اس کی آنکھوں کے آگے سے تاریکی ختم نہیں ہوئی۔ اس نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی مگر امی نے اسے روک دیا۔ انھوں نے کہا۔ "نایاب چندا! تمھاری ٹانگ کی سرجری ہوئی ہے، پلستر چڑھا ہوا ہے۔ تم اٹھ نہیں سکتیں۔"

اسی وقت کمرے میں بہت سے لوگ داخل ہوئے۔ نایاب نے آوازوں سے اندازہ لگایا کہ اس کے بابا، بہن بھائی، یاسر اس کا منگیتر، اس کے ساس سسر سب اس کے اردگرد ہی موجود تھے۔ اس نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری اور کہا۔

"بابا! مجھے کچھ نظر نہیں آرہا۔ آپ کمرے میں لائٹ جلا دیجیے تاکہ میں سب کو دیکھ سکوں۔"

اس کی بات سن کر کمرے میں سکوت چھا گیا۔ نایاب کو ایسا لگا جیسے وہ تنہا رہ گئی تھی۔ کمرے میں موجود لوگ شاید سنگی مجسموں میں بدل گئے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی اور ذی روح شاید وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"کیا ہوا؟ سب کہاں گئے؟"

اس کے سوال کے جواب میں کافی دیر بعد بابا بولے۔ "بیٹا! تم آرام کرو۔ ہم سب پھر تم سے ملنے آئیں گے۔ اس وقت تمھیں صرف آرام کی ضرورت ہے۔"

نایاب کا دل لرز اٹھا۔ اسے احساس ہوا کہ انہونی ہوچکی تھی۔ اس نے آنکھیں جھپکیں اور خاموشی سے سسکی بھر کر لیٹ گئی۔ اس کی آنکھوں کے آگے مہیب اندھیرا ہنوز قائم تھا۔ وہ اپنے دل کی بیقرار دھڑکن خود اپنے کانوں سے سن سکتی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند ہوگیا۔ اسے احساس ہوا کہ اب وہ کمرے میں بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ اس کا وجدان اسے بتا رہا تھا کہ کچھ بہت برا اس کے ساتھ ہوچکا تھا۔ حادثہ اپنا خراج اس سے وصول کرچکا تھا۔ اس کا دل مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب ابھر رہا تھا۔

دن پر دن گزرتے گئے، اس کی آنکھوں کے آگے چھایا اندھیرا مستقل اس کا ساتھی بن گیا تھا۔ اب اسے رات و دن، صبح و شام کی تمیز ختم ہوگئی تھی۔ وہ اکثر سونے سے پہلے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی کہ صبح جب وہ سو کر جاگے تو اس کی آنکھوں کے آگے چھایا اندھیرا اچھٹ چکا ہو اور وہ پھر سے اس کی بنائی دنیا دیکھ سکے، مگر اس کی آنکھ کھلنے پر بھی اندھیرا اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ ہر نئے ٹیسٹ پر اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ وہ آس و نراش کے بیچ ڈولتی رہتی۔ رفتہ رفتہ ڈاکٹرز بھی تھک سے گئے۔ ان کے تسلی بخش لہجے کھوکھلے ہوتے گئے۔ شروع شروع میں چند دن یاسر اور اس کے والدین اس سے ملنے آتے رہے، مگر جب انھیں احساس ہوا کہ ان کی ہونے والی بہو مستقل طور پر اندھی ہوچکی ہے تو انھوں نے ملنے آنا بھی بند کردیا۔ نایاب کو اندازہ تھا کہ یاسر نے اپنا دامن جھٹک دیا تھا۔ مگر وہ اپنے دل کو بہلائے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

رکھتی۔ ''بھلا اتنے سالوں کی پرانی منگنی وہ کیسے توڑ سکتا ہے؟'' پھر وہ تو اس سے محبت کرتا ہے۔ محبت کرنے والے بیچ راستے میں تنہا تو نہیں چھوڑ جاتے۔ وہ تو اس کے لیے آسمان سے ستارے تک توڑ کر لانے کا دعویدار تھا۔ وہ کیسے اپنے وعدے اور قسمیں بھلا سکتا ہے؟ وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے کہتی۔

''محبت کوئی موسم تھوڑی ہے۔ جو بدل جائے گا۔''

وہ دل ہی دل میں اس کی غیر حاضری کی توجیہات گھڑتی۔

''وہ ضرور مصروف ہوگا۔''

''والدین بیمار ہوگئے ہوں گے۔''

''گھر میں مہمان داری ہو رہی ہوگی۔''

اس نے بہنوں کو کہہ کر کئی دفعہ اس کا نمبر ملایا مگر کبھی بھی اس نے اس کی کال ریسیو نہیں کی۔ میسج چھوڑنے کے باوجود جوابی فون نہیں آیا۔ وہ بیکل ہوا تھی۔ وہ خود کو جھوٹے دلاسے دے دے کر تھکنے لگی تھی۔ اُمید کے جگنو ایک ایک کر کے بجھنے لگے تھے۔ اب تو اس کی آنکھوں میں بسا گھور اندھیرا بھی چپکے چپکے اس سے سرگوشی کرتا۔ ''پگلی! کیا آنکھوں کے ساتھ ساتھ دماغ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا ہے؟ تم سچ کیوں نہیں تسلیم کر لیتی؟ تم اندھی کو وہ کب کا چھوڑ کر جا چکا ہے۔''

آنے والے دنوں نے اس کے خدشات درست ثابت کر دیئے۔ آخر کار ڈاکٹرز نے اسے بتا دیا کہ وہ اپنی بینائی ہمیشہ کے لیے کھو چکی ہے۔ وہ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آ گئی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد یاسر کے والدین اسے ملنے کے بہانے آئے۔ اسے پتا تھا کہ وہ کس مقصد کے تحت آئے تھے، وہ ذہنی طور پر خود کو اس روز کے لیے بہت پہلے ہی تیار کر چکی تھی۔ وہ اپنی چھڑی ٹیکتی ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہ دونوں اس کے والدین کو اس سے رشتہ توڑنے کی خبر سنا رہے تھے۔ وہ خاموشی سے سلام کر کے یاسر کی والدہ کے برابر بیٹھ گئی۔

یاسر کے والد نے کھنکھارتے ہوئے کہا۔ ''ہم بہت شرمندہ ہیں، مگر آپ بھی سوچیں! اندھی لڑکی کے ساتھ زندگی تو نہیں گزاری جا سکتی۔ اب تو خود نایاب ہر کام کے لیے دوسروں کی محتاج ہے۔ یاسر ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ ہمیں ایسی بہو چاہیے جو ہمارے بڑھاپے میں ہمیں بھی سنبھال سکے۔''

وہ بظاہر کہہ رہے تھے کہ وہ اور یاسر اس فیصلے سے بہت دکھی ہیں مگر ان کے الفاظ اور لہجہ ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس کے والدین یہ انکشاف سن کر ان کی منت وسماجت کر رہے تھے۔ اس کے بابا نے تو ان کے پاؤں تک پکڑ لیے تھے۔ اسے یاد آیا کہ بڑے بھیا غصے سے چیخ کر بولے تھے۔ ''اگر یہ حادثہ یاسر کے ساتھ پیش آتا؟ کیا تب بھی آپ رشتہ توڑتے؟''

نایاب کو وہاں بیٹھے اپنا آپ بہت ارزاں سا لگا۔ اس نے دل کڑا کر اپنے آنسو صاف کیے اور اپنی انگلی سے منگنی کی انگوٹھی اتار کر اپنے برابر بیٹھی یاسر کی والدہ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولی۔

''پلیز بابا! بھیا! خدارا مجھے مزید ارزاں مت کیجیے۔ میں خوش ہوں کہ اس ایک حادثے نے مجھے میری حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کر دیا۔ میں انکل کے بقول اب صرف محتاج ہوں۔ میں یاسر کے محبت کے دعوؤں کی حقیقت سمجھ گئی ہوں۔ میں نابینا ضرور ہوئی ہوں مگر شاید اس کمی نے میری حقیقت میں آنکھیں کھول دی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ یاسر، آنٹی، انکل کا اصل روپ میں نے ابھی دیکھ لیا ہے۔ اگر شادی کے بعد میں نابینا ہو جاتی تو یہ تو مجھے کچرے کی طرح گھر سے نکال دیتے۔ اس لیے آنٹی! انکل آپ اس رشتے سے آزاد ہیں۔ اب کسی وضاحت، کسی توجیہہ، کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

پورے ڈرائنگ روم میں سکوت طاری ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی چھڑی پکڑی اور راستہ ٹٹولتی باہر کی جانب نکل گئی۔ باورچی خانے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے کانوں میں اس کی جان سے پیاری دونوں بھابیوں کی باتوں کی آواز پڑی۔

بڑی بھابی کہہ رہی تھیں۔ ''میں تو سوچ سوچ کر ہول رہی ہوں کہ اب یہ نایاب نامی ڈھول ساری زندگی ہمیں پیٹنا پڑے گا۔ اس اندھی سے اب کون شادی کرے گا؟ یہ ساری زندگی ہمارے سینوں پر ہی مونگ دلتی رہے گی۔''

دوسری بھابی برتن پٹخ کر بولیں۔ ''اماں، باوا خود تو قبروں میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ ہمارے سروں پر اس مصیبت کو چھوڑ جائیں گے۔ اب ہم بچوں کو سنبھالیں، گھر داری کریں یا اندھی نند کے ناز اٹھائیں۔''

نایاب کی فصیل ذات منہدم ہی ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جن بھابیوں کی خدمت اس کا شعار رہی تھی۔ ان کے لیے اب وہ اندھی ہو کر بے مصرف اور بوجھ بن چکی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی چھڑی سے راستہ محسوس

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کرتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وہ تلخی سے مسکرائی اس کے اندھے پن نے اس کے سامنے بہت سے بظاہر محبت کرنے والوں کے خوبصورت چہروں کو بے نقاب کر دیا تھا۔

آنے والے دنوں میں اس پر دنیا اور اس کے باسیوں کی حقیقت واضح ہوگئی تھی۔ اسے ہر ایک سے عجیب و غریب باتیں سننے کو ملیں۔ محلے والے، دوست احباب سب اس کے سامنے اسے اندھی، معذور، بیچاری، محتاج کہہ دیتے۔ کچھ محلے والی خواتین کا خیال تھا کہ یہ اس کے والدین کے ماضی کے گناہ تھے جن کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑ رہا تھا۔ کچھ کا خیال تھا کہ اس کے اپنے گناہ تھے جن کے باعث اللہ تعالیٰ نے اسے یہ دن دکھایا تھا۔ بعض اوقات اس کی سہیلیاں اس سے ملنے آتیں تو وہ بھی بہت معنی خیز انداز میں لایعنی سوالات اس سے پوچھتیں۔ ”نایاب! تم کپڑے کیسے پہنتی ہو؟“

”تمھیں رنگوں کا تو اب احساس نہیں۔ پھر میچنگ کپڑے کیسے نکالتی ہو؟“

”اب تو تم ٹی وی بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کوئی کتاب نہیں پڑھ سکتی پھر تمھارا دن کیسے گزرتا ہے؟“

کبھی کبھی نایاب کا دل کرتا کہ وہ چیخ چیخ کر سب کو بتائے۔

”میں تو صرف آنکھوں سے نابینا ہوئی ہوں، مگر تم لوگ تو شاید انسانیت سے ہی محروم ہوگئے ہو۔ میری ایک کمزوری کو تم لوگوں نے میرے لیے طعنہ بنا دیا ہے..... مجھ پر زندگی کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ خدارا! مجھ ستم رسیدہ پر مزید ستم تو مت توڑو۔“

مگر وہ کچھ نہ کہہ پاتی۔ لبوں پر مہر لگائے بس بے حس بنی سب کچھ سنتی رہتی۔ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ وہ لوگوں سے ملنے سے پرہیز کرنے لگی۔ اب کوئی بھی گھر آتا تو وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی۔

نایاب کی آنکھوں سے آنسو نکلے تو وہ یک دم ماضی سے حال میں آگئی۔ اس نے سختی سے آنسو صاف کیے۔ اس کا دل یک دم خالی سا ہوگیا تھا۔ اس کے دل میں جینے کی آرزو یکسر ختم ہوگئی تھی۔ اس نے ایک فیصلہ کیا اور اپنی چھڑی ٹیکتی کمرے سے نکل گئی۔ وہ دبے پاؤں سیڑھیوں سے اتری تو اسے احساس ہوا کہ تمام گھر والے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ وہ اپنی چھڑی ٹیکتی گھر سے باہر نکل آئی۔ سردی کی شدت اور بڑھ گئی تھی۔ دور کہیں کتے بھونک رہے تھے مگر آج اسے کوئی خوف، کوئی ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ چھڑی سے ٹٹولتی ہوئی چل پڑی۔ وہ راستے میں دو تین بار بری طرح گری۔ اس کی کہنیاں اور گھٹنے بری طرح چھل گئے مگر وہ ایک عزم سے چلتی رہی۔ اس کے ذہن میں دلہن کے کہے ہوئے جملوں نے ایک ہیجان برپا کیا ہوا تھا۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ اپنی چھڑی ٹیکتی ہوئی اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئی۔ اس نے پٹریوں کو ٹٹولا اور ان پر لیٹتے ہوئے بڑبڑائی۔ ”ہاں! مجھے پتا ہے کہ اس معذور معاشرے میں بسے معذور عوام الناس کے بیچ ہم جیسے خاص لوگ ہمیشہ تنہا ہی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہمیں جیون ساتھی بنانے کی ہمت کسی میں نہیں ہوتی۔ ہم جیسے لوگوں کو بظاہر تم لوگ ترحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہو، مگر ہمیں معذور، بے چارہ محتاج قرار دے کر ہماری عزت نفس کی دھجیاں تک بکھیر دیتے ہو۔ آج میں اس اذیت بھری، بیچارگی کی زندگی کا خاتمہ کر کے دم لوں گی۔ مجھے یہ سسکتی ہوئی زندگی منظور نہیں ہے۔“

اس نے گہری سانس لی اور خاموشی سے آنکھیں بند کرلیں۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ وہاں تنہا نہیں تھی۔

ایک سیاح تفریح کی غرض سے چین چلا گیا۔ اتفاقاً انہی دنوں چین کی تین مشہور اور معزز شخصیتوں کا انتقال ہوگیا۔ جب پہلی تدفین ہونے لگی تو بے شمار چینی خواتین آگے بڑھیں اور جنازے کے ساتھ روٹی، چاول، چکن، شراب اور مختلف اشیاء بھی رکھنے لگیں۔

”یہ سب چیزیں رکھنے کا کیا فائدہ ہے؟“ سیاح نے پوچھا۔

”یہ ہماری روایات ہیں۔“ ایک سوگوار رشتہ دار نے جواب دیا۔ ”یہ سب ہم اس لیے مردے کے ساتھ بھیج دیتے ہیں تاکہ اس کو بھوک پیاس نہ ستائے۔“

دوسرے مردے کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا مگر جب تیسرے کی باری آئی تو اس کے ساتھ صرف ایک پیالہ چاول کا رکھ دیا گیا۔

”اس قدر کم مقدار اس بے چارے کو کیوں دیا گیا ہے؟“ سیاح نے حیرت سے پوچھا۔

مرنے والے کے بیٹے نے جواب دیا۔ ”میرے والد صاحب ان دنوں ڈائٹنگ کر رہے تھے۔“

Waqar Azeem pakistanipoint.com

کوئی اور امی روح بھی اس کے بہت قریب ہی موجود تھا۔ اس کا دل خوف سے دھڑک اٹھا مگر پھر وہ یکدم کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔ ''تم کون ہو؟ کتنی عجب بات ہے کہ زندگی کے سفر میں مجھے سب نے تنہا چھوڑ دیا اور آج جب میں اس کا اختتام کرنے آئی ہوں اور تنہائی چاہتی ہوں تو میں تنہا نہیں ہوں۔''

اس کے قریب سے ہی بیزار مردانہ آواز آئی۔ ''خودکشی کرنے آئی ہو تو خاموشی سے کرو۔ مجھے تنگ مت کرو۔''

نووارد چند اوزاروں کے ساتھ ٹرین کی پٹریوں کے ساتھ نبرد آزما تھا۔

نایاب کو ہنسی آ گئی وہ بولی۔ ''مرد ہو کر خودکشی کا راستہ چن رہے ہو۔ حیرت کی بات ہے۔''

وہ شخص بیزاری سے بولا۔ ''محترمہ! خودکشی مرد اور عورت دونوں پر حرام ہے، اس کے باوجود ہم دونوں اس پٹری پر موجود ہیں۔ براہ مہربانی مجھے مردانگی کا طعنہ مت دیجیے۔''

نایاب ایک دم خاموش ہو گئی اور بولی۔ ''میں حرام موت مرنا نہیں چاہتی، مگر اس دنیا کے لوگ مجھے جینے بھی نہیں دے رہے۔ میں اندھی کیا ہوئی لوگوں کے کریہہ چہرے اور رویے مجھ پر عیاں ہو گئے۔ میری منگنی ٹوٹ گئی کیونکہ انھیں محتاج بہو نہیں چاہیے تھی۔ یقین کرو میری جھولی کھوکھلی ہمدردی، طعنوں سے تار تار ہو چکی ہے۔ ہر شخص مجھے محتاج، معذور اور بیچاری قرار دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میرے اندھے ہونے کا سبب میرے گناہ یا میرے والدین کے گناہ ہیں اس لیے اب میں مزید نہیں جینا چاہتی۔ میں اپنے بھائیوں، بھابیوں پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی۔''

وہ نووارد ہنکارا بھر کر بولا۔ ''تو یوں کہو نا کہ تم نہ صرف بزدل ہو بلکہ واقعی ذہنی طور پر معذور بھی ہو۔ تم غلط کہہ رہی تھی کہ تم خاص ہو۔ ہر شخص تمھارے منگیتر کی طرح ذہنی طور پر دیوالیہ نہیں ہوتا۔ مجھے ایک خاص لڑکی کا ساتھ منظور ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ رب کی شکر گزار ہو۔''

''اگر تم رب کی رضا میں راضی رہنا جانتیں تو کبھی یقین کی ڈوری سے جدا نہیں ہوتیں۔ تم جانتی ہو ہیلن کیلر پیدائشی اندھی تھی۔ اس نے کبھی بھی ایک دن کے لیے بھی دنیا کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا مگر اس نے اپنے محسوسات سے دنیا کو محسوس کیا تھا۔ اس کا مضمون Three days to see پڑھا ہے؟''

نایاب کو یک لخت وہ مضمون اپنے سیاق وسباق کے ساتھ یاد آ گیا۔ اس کا ماتھا ٹھنڈے پسینے سے بھر گیا۔ اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ ''وہ مغرب کی عورت تھی۔ اسے ان پریشانیوں اور مسائل کا سامنا نہیں تھا جن کا سامنا مجھے کرنا پڑ رہا ہے۔''

وہ شخص طنزیہ انداز میں ہنسا اور بولا۔ ''اچھا صحیح! 1933 کی مغربی دنیا کسی طور ایک اندھی عورت کے لیے آسان نہیں تھی اور تم اکیسویں صدی میں بسنے والی پڑھی لکھی عورت کیا کر رہی ہو.....؟ تم تو مصائب سے بھاگ کر موت کے دامن میں چھپانے چلی آئی ہو.....؟'' تم پیدائشی اندھی نہیں ہو۔ جب تک تمھارے پاس آنکھوں کی نعمت موجود تھی۔ تم نے کتنی بار رب سے اس کا شکر ادا کیا تھا؟ اچھا یہ بتاؤ! جو نعمتیں باقی بچی ہیں ان کے متعلق تم نے کبھی سوچا ہے؟ کبھی ان کا شکریہ ادا کیا ہے؟''

نایاب ایک لمحے میں ہی لاجواب ہو گئی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی بے وقوفی بلکہ گناہ عظیم کی مرتکب ہونے والی تھی۔ زندگی رب کی عطا تھی، وہ ایک نعمت کی محرومی سے اس قدر رنجیدہ ہو گئی تھی کہ وہ باقی نعمتوں کو بھی ٹھکرانے والی تھی۔ اسے ادراک ہوا کہ وہ ابھی بھی سن سکتی تھی، بول سکتی تھی، محسوس کر سکتی تھی اسے ابھی بھی بہت سے لوگ محبت کرتے تھے، اسے اپنے محبت کرنے والے والدین یاد آئے۔ اسے اپنے بھائیوں اور بہنوں کی محبت یاد آئی۔ وہ ایک ناکام محبت جو درحقیقت محبت تھی ہی نہیں، اس کے پیچھے سب نعمتوں سے منہ موڑنے والی تھی۔ وہ بے اختیار ہی سسک سسک کر رو پڑی۔

نوجوان نرمی سے بولا۔ ''چلیں! ٹرین آنے والی ہے۔ میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ میں آپ کے ساتھ گھر تک چلتا ہوں۔''

نایاب کو احساس ہوا کہ وہ نووارد خودکشی کے ارادے سے پٹری پر موجود نہیں تھا، بلکہ وہ ریلوے کا ملازم تھا جو پٹری میں کسی خرابی کی مرمت کے لیے وہاں اس پہر موجود تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی روح پر چھائے مایوسی اور خودترسی کے بادل چھٹ چکے تھے۔ اب مطلع صاف تھا۔ وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے محسوس کیا کہ نووارد نے اس کا ہاتھ تھام لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ہوا تھا۔ اس نے بلا جھجک اس کا ہاتھ تھام لیا، وہ جانتی تھی اسے خضر مل چکا تھا، ایک نئے سفر کی ابتدا ہو چکی تھی۔

++

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

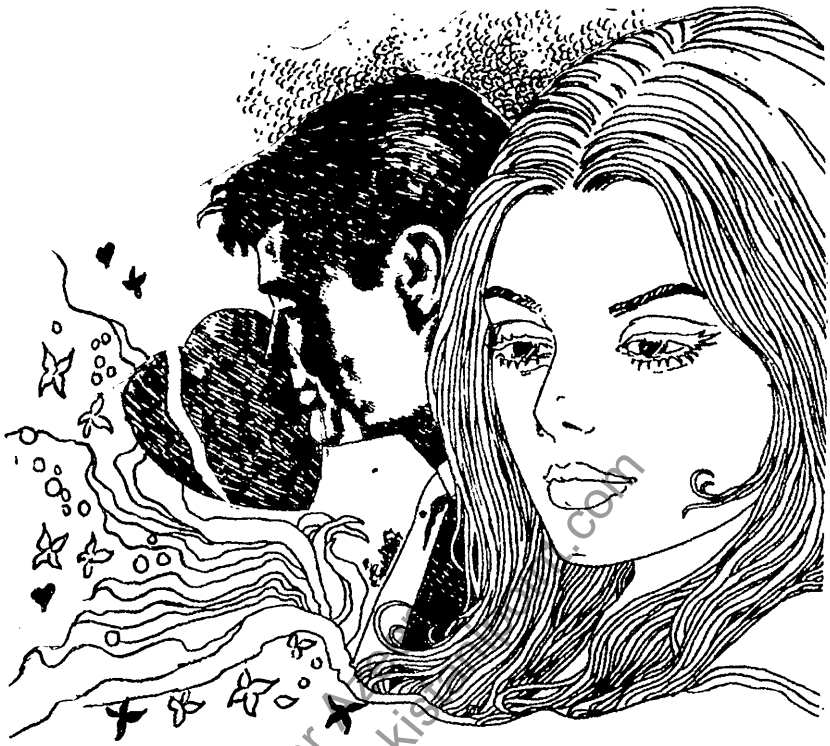

گول میز

جناب مدیر اعلی سرگزشت
سلام تہنیت!
مہوش کی روداد میں نے من وعن لکھ دی ہے۔ یہ سبق بھری روداد ہے، انسان کی زندگی کیسے کیسے رنگ بدلتی ہے اسی کا تذکرہ ہے۔

علی عمران ممتاز
(ملتان)

رات کی گھن گرج کے ساتھ ہونے والی بارش کے بعد صبح فجر سے پہلے آسمان پر منڈلاتے بادل تیز ہوا کے زور پر منتشر ہو گئے تھے اور موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا سورج کی چمکتی کرنیں زمین پر بکھر رہی تھیں۔ آسمان حسین لگ رہا تھا، شہر بھر کے در و دیوار رات کی بارش سے دھل گئے تھے۔ فروری کا آخری جمعہ تھا، اس موسم میں دن ٹھنڈے میٹھے اور رات سرد ہوتی ہے۔ یہ ہی وہ دن ہوتے ہیں جب موسم بہار اپنی آمد کا اعلان کرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے

[illegible] آ [illegible] ہیں۔ ان ہی دنوں [illegible] موسم پر زیادہ دیر تک پڑتی ہیں تو [illegible] یاں کی [illegible] ہوتا ہے۔ جب تیز ہوا کا جھونکا جسم سے ٹکراتا ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے سرد ہوا کی یہ لہریں سورج کی کرنوں کو سردی کی موجودگی کا احساس دلا رہی ہوں۔ ایسے خوشگوار موسم میں 4 بجے مجھے چائے کی دعوت پر جانا تھا۔ موسم کے مطابق میں نے اچھا سا لباس زیب تن کیا اور وقت مقررہ پر اس جگہ پر موجود تھا جہاں کچھ دیر بعد ایک خوبصورت پُرتکلف دعوت تھی، میں اس بنگلے کے سامنے تھا جہاں مجھے آنے کی دعوت دی گئی تھی۔

بنگلا کیا تھا شاہی محل سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ بنگلے کی دیواروں کے چاروں اطراف خوبصورت پھولوں کے پودے تھے۔ مین گیٹ بھی اپنی مثال آپ تھا میں بھی خود کو تو کبھی بنگلے کی شان و شوکت کو دیکھتا چند لمحے بنگلے کا بغور جائزہ لینے کے بعد میں نے بنگلے کے مین گیٹ کے ساتھ دیواروں میں لگی گھنٹی کا بٹن دبایا اور پھر... مخالف سمت والی کوٹھی دیکھنے لگا، چند لمحوں بعد گیٹ کھلا بنگلے کے اندر سے ایک چوکیدار باہر آیا۔ اس نے پوچھا۔ ”جی بھائی صاحب کس سے ملنا ہے؟“

میں دوسری کوٹھی دیکھنے میں مگن تھا جب چوکیدار کی آواز میرے کانوں میں ٹکرائی تو میں نے مڑ کر اسے دیکھا اور جلدی سے پوچھا ”عبدالحق صاحب یہیں رہتے ہیں۔“

”جی یہیں رہتے ہیں ....!“ اس نے جواب دیا۔

”آپ کامران اکرم صاحب ہیں۔“

اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میں چونک پڑا اور بولا۔

”جی...... مجھے کامران اکرم کہتے ہیں۔“

”اندر آیئے آپ کا ہی انتظار ہو رہا ہے۔“ چوکیدار مسکرا کر بولا اور بنگلے کے اندر چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے ہولیا مختلف راہداریوں سے ہوتے ہوئے وہ مجھے ایک خاص کمرے میں لے آیا جسے گیسٹ روم کہتے ہیں۔ میں گیسٹ روم میں صوفہ پر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ عبدالحق صاحب اپنی مسز کے ساتھ گیسٹ روم میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ عبدالحق صاحب گرم جوشی سے گلے ملے اور میرے سامنے والے صوفے پر اپنی مسز کے ساتھ براجمان ہوگئے۔ حال واحوال پوچھنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ میرے افسانے بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور حال ہی میں میری شائع ہونے والی کتاب ”نورِ عالم“ کا تیسرا ایڈیشن بھی انہیں پسند آیا ہے اسی لیے انہوں نے کتاب سے فون نمبر لے کر مجھے فون کیا اور چائے کی دعوت دی۔ وہ مجھے داد بھی دینے لگے کہ میں نے ایک شاہکار کتاب لکھی ہے۔ عبدالحق صاحب سے بہت دیر تک گفتگو ہوئی اسی گفتگو کے دوران ان کی ملازمہ نے آکر بتایا کہ میز پر چائے لگا دی گئی ہے۔ عبدالحق صاحب نے مجھ سے کہا۔ ”آئیں چائے پیتے ہیں اور ساتھ ہی باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔“

ہم چائے کے لیے میز کے اردگرد اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ میز پر سات قسم کے بسکٹ، مٹھائیاں، فروٹ، سموسے اور کیک رکھے ہوئے تھے۔ خوبصورت مگوں میں چائے پی گئی۔ ساتھ ہی باتیں ہوتی رہیں۔ تقریباً چھ بجے میں نے ان سے واپسی کی اجازت لی اور گھر آ گیا۔

اگلے دن مجھے ایک اور فون کال آئی۔ وہ فون کسی خاتون کا تھا۔ کہنے لگی مجھے آپ کی کہانیاں اور افسانے بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ کی نئی کتاب بھی بہت زبردست ہے۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو مہربانی کر کے آج شام میرے گھر آئیں مجھے آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے پر میں گھر سے باہر نہیں جاسکتی گھر پر ہی رہتی ہوں، میرے ابو مجھے کتابیں لا دیتے ہیں۔

میں نے ان سے گھر کا پتا پوچھا جو انہوں نے مجھے بتا دیا۔ میں نے اس خاتون سے کہا ٹھیک ہے آج شام میں ضرور آؤں گا۔ آپ مجھے اتنی عزت دے رہی ہیں تو مجھے آپ کے ہاں ضرور آنا چاہیے۔

شام کو میں اس خاتون کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا تھا۔ ان کے گھر کے پاس ایک مزار تھا وہیں میں کھڑے ہو کر ان کے ابو کا انتظار کرنے لگا جو کچھ ہی دیر میں مجھے لینے آ گئے۔ اس خاتون کے ابو کی عمر لگ بھگ 75 کے قریب تھی۔ سر پر ٹوپی اور کپڑے میلے کچیلے پہنے ہوئے تھے۔ سر کے بال سفید اور بکھرے ہوئے تھے۔ وہ مجھے مزار کے صحن سے ہو کر دوسرے گیٹ سے ایک گلی میں لے آئے۔ اسی گلی میں ان کا گھر تھا۔ اب میں ان کے گھر کے سامنے تھا۔ گھر بالکل بوسیدہ اور پرانے زمانے کا تھا۔ گھر کی دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ وہ بزرگ مجھے گھر کے اندر لے گئے، گھر کا صحن چھوٹا سا تھا اور مختلف قسم کی ٹوٹی ہوئی لکڑیوں سے بھرا پڑا تھا۔ کمرے کے اندر داخل ہوا تو حیرت ہوئی کہ صرف ایک کمرے میں وہ باپ بیٹی رہتے تھے اور کمرا... بھی ایسا کہ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

چاروں اطراف کپڑے کی بڑی بڑی پوٹلیاں پڑی تھیں۔ جگہ صرف اتنی تھی کہ ایک چارپائی رکھی جاسکے۔ اس کے ساتھ ہی فرش پر ایک چھوٹی سی چٹائی تھی جس پر وہ خاتون بیٹھی تھیں۔ کمرے کی حالت دیکھ کر میں حیرت زدہ تھا سمجھ سے باہر تھا کہ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔

خاتون نے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا، ابھی بھی حیرت کے مارے میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بولوں اور کیا نہ بولوں؟

خاتون کے ابا جان نے بتایا کہ وہ باپ بیٹی اس گھر میں رہتے ہیں جو کسی نے انہیں رہنے کے لیے دی ہے۔ مکان مالک ہم سے کوئی کرایہ نہیں لیتے۔

بزرگ کچھ دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر بولے آپ میری بیٹی سے باتیں کریں میں ابھی آیا۔ بزرگ چلے گئے میں ان کی بیٹی سے باتیں کرنے لگا۔ خاتون نے اپنا نام مہوش بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ چل پھر نہیں سکتیں پولیو کا شکار ہیں، امی ان کے بچپن میں ہی اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں۔ ایف اے تک تعلیم حاصل کی، ان کے ابو ہی ان کے لیے سب کچھ ہیں۔ ناول، شاعری اور کہانیاں پڑھنے کا شوق ہے اس لیے ابو جان کتابیں لا دیتے ہیں۔ ابھی گفتگو جاری تھی کی مہوش کے ابو جان سلور کی ایک گول تھال میں تین کپ چائے اور ایک پلیٹ میں کیک رس لے آئے۔ تھال میرے سامنے چارپائی پر رکھ دی۔ میں نے ان سے کہا کہ انہوں نے تکلف کیا ہے۔ مہوش بولی "کیسا تکلف؟ مانتے ہیں کہ یہ آپ کے شایان شان نہیں ہے۔"

میں بولا "ایسی بات نہیں ہے، آپ لوگ خوامخواہ تکلف میں پڑ گئے ہیں۔"

بزرگ تھال کے بارے میں بولے "یہ ہم غریبوں کی کھانے کی گول میز ہے۔"

میں نے دونوں باپ بیٹی کو یقین دلایا اور ان کے ساتھ اس سلور کے تھال سے کپ اٹھا کر چائے پینے لگا۔ اس دوران کل والی عالی شان دعوت کے مناظر میری آنکھوں میں گھومنے لگے۔

میں جتنی دیر اس غریب باپ بیٹی کے گھر رہا بہت پُرسکون رہا، کوئی نمود و نمائش نہیں تھی صرف خلوص تھا، پیار تھا، عزت تھی۔ کافی دیر ان پیارے لوگوں کے پاس بیٹھنے کے بعد میں واپس اپنے گھر آ گیا۔

مہوش کا اس دنیا میں واحد سہارا اس کے ابو تھے اور

سید محمد جعفری

(1907ء...1972ء)

''شوخی تحریر'' مزاحیہ نظموں اور قطعات کے شاعر سید محمد جعفری کو اردو کے طنزیہ و مزاحیہ شعراء میں اہم مقام حاصل رہا ہے۔ راجپوتانہ کی ایک ریاست بھرت پور میں 27 دسمبر 1907ء کو سید محمد علی جعفری کے گھرانے میں جنم لینے والے سید محمد جعفری کا تعلق پہر سر کے سادات خاندان سے تھا۔ سید محمد جعفری کے دادا سید مرتضیٰ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ ''بیدار'' تخلص تھا۔ سید محمد علی جعفری 1906ء کو لاہور کے اسلامیہ کالج کے پرنسپل بنے تو انہوں نے اپنے بیٹے سید محمد جعفری کو بلوالیا۔ جہاں سے انہوں نے 1922ء میں میٹرک اور 1928ء میں ریاضی، کیمسٹری اور فزکس میں بی ایس سی آنرز کی ڈگری لی۔ مصوری، ڈرائنگ اور خوش خطی کا شوق انہیں میو اسکول آف آرٹس (موجودہ نیشنل آرٹس کالج) لاہور لے گیا۔ ان کے استاد و رہنما مصور شرف عبدالرحمن چغتائی اور فیروز الدین تھے۔ علم و فن کے سارے شعبوں پر دسترس رہی۔ جہلم اور فیصل آباد کے اسکول و کالج میں مدرس رہے۔ 1940ء میں اطلاعات و نشریات کے شعبے سے منسلک رہے۔ بعد ازاں کراچی میں محکمہ اطلاعات کے افسر اعلیٰ بنے۔ ایک زمانے میں تہران میں کونسلر بن کر گئے۔ 1966ء میں ریٹائر ہوئے 7 جنوری 1976ء میں وفات ہوئی کراچی میں آسودۂ خاک ہیں۔ جب خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم تھے عید الضحیٰ کے موقع پر کراچی پولو گراؤنڈ میں نماز کا اہتمام کیا گیا۔ صف اوّل میں وزراء کے مصلے محفوظ تھے۔ اسی نماز کے دوران کسی نے خواجہ صاحب کے محافظوں میں سے کسی کی جیب بھی چرالی تھی۔ سید محمد جعفری نے اس موضوع پر ایک مسدس علامہ اقبال کے ''شکوہ'' کی پیروڈی میں لکھی اس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

مولوی لوگ بھی تھے ان میں گنہ گار بھی تھے
عجز والے بھی تھے مستِ مئے پندار بھی تھے

☆☆☆

www.paksitanipoint.com
Waqar Azeem

لوئی ر شتہ دار ... لھا مہوش 35 سال کی تھی، پولیو اور ... لی ... اس کے گھر کوئی رشتہ نہ آیا، اپنے باپ کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ خوددار لوگ تھے۔ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ وہ بزرگ چائے کے ہوٹل پر کام کرتے تھے.. وہاں سے جو خرچا ملتا اسی پر گزر بسر ہو رہی تھی۔

کچھ دن بعد میں نے ان کے ہوٹل پر کال کی اور بتایا کہ میں ملنے آرہا ہوں۔ وہ اور اس کے ابو گھر پر ہی تھے۔ دونوں ہی اداس تھے۔ چارپائی پر وہی سلور کی تھال رکھی تھی۔ پریشانی کی وجہ پوچھی تو پتا چلا کہ مہوش کے لیے ایک رشتہ آیا تھا، گھر کی حالت زار دیکھ کر لڑکے والے واپس چلے گئے اسی لیے مہوش اور اس کے ابو اداس تھے۔ میں نے انہیں حوصلہ دیا اور کہا اللہ پاک سب اچھا کرے گا۔ اداس ہونے سے پریشانی ختم نہیں ہوسکتی۔ مایوسی گناہ ہے، اللہ پاک وہ کرے گا جو آپ کے لیے اچھا ہوگا۔

مہوش اور اس کے ابو خوش ہوگئے اس موقع پر میں نے کہا" یہ خلوص بھری چائے ان مہمانوں کے نصیب میں نہیں تھی بلکہ یہ ہمارے نصیب میں لکھا تھا کہ ہم پئیں گے۔" اس پر مہوش ہنس پڑی۔

کچھ دن میں اپنے معاملات میں مصروف رہا مہوش کی طرف جانا نہ ہوسکا۔ ایک دن اس کے ابو کی کال آئی کہ مہوش نے بلایا ہے۔ جب ان کے گھر پہنچا تو مہوش بولی بھائی آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔

"اس کے ابو نے بتایا کہ کئی سال قبل قسطوں پر ایک تین مرلے کا پلاٹ لیا تھا، قسطیں مکمل ہونے کے بعد دن رات کی محنت سے اس پلاٹ پر سر چھپانے کے لیے مکان بنانے کی کوشش کی آج مکان مکمل ہوگیا ہے اس جمعے ہم اپنے اس گھر میں شفٹ ہوجائیں گے۔"

میں نے کہا" یہ تو واقعی خوشی کی خبر ہے۔ مہوش کے ابو نے مٹھائی کھلائی۔ مہوش بھی بہت خوش نظر آرہی تھی۔ مجھے بھی خوشی ہوئی اور یقین بھی ہوگیا کہ اب مہوش کا رشتہ بھی آئے گا اور گول میز بھی رشتہ دیکھنے والوں کی سوچ کے مطابق ہوگی۔ مہوش کا بھی گھر بس جائے گا۔"

☆☆☆

جمعرات کی رات 12 بجے میں اپنے کمرے میں بیٹھا ایک کہانی لکھ رہا تھا کہ میرے موبائل پر ایک میسج آیا، موبائل چارجنگ پر لگا تھا اس لیے میں نے میسج نظر انداز کیا اور کہانی لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ کہانی مکمل کر کے میں سو گیا۔ یاد ہی نہ رہا کہ موبائل پر آنے والا میسج چیک کروں۔

صبح سو کر اٹھا، فریش ہو کر موبائل اٹھایا اور میسج باکس میں گیا جہاں مہوش سمیت دیگر دوستوں کے پیغام میری توجہ کے منتظر تھے۔ سب سے پہلے مہوش کا میسج پڑھا تو میرے پاؤں سے زمین نکل گئی، بات ہی ایسی تھی کہ جس کی توقع نہ تھی ویسا ہوگیا۔ میسج پر لکھا تھا" ابو فوت ہوگئے۔"

میں فوراً اپنی بائیک پر مہوش کے پرانے گھر پہنچا۔ وہاں محلے داروں کا رش تھا۔ جنازہ ابھی نہیں ہوا تھا۔ جنازہ بعد نماز ظہر تھا۔ سو میں جنازے کی ادائیگی تک وہیں رہا۔

قدرت بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے جس بارے میں وہم و گمان میں نہ ہو وہ کام ہو جاتا ہے۔ ابو کی یہ سوچ تھی کہ مہوش کا کیا بنے گا، اسے کون سنبھالے گا۔ آج تو انہوں نے اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونا تھا۔ وہ گھر مہوش کے ابا کو نصیب نہ ہوا۔ بس جاتے جاتے اپنی بیٹی کے لیے سر چھپانے کی جگہ دے گئے۔

سوئم کے دن مہوش اپنے نئے گھر میں شفٹ ہوگئی، وہاں اکیلے رہنا اس کے لیے ممکن نہ تھا مگر اس کے ابو کے ہاتھ سے بنا گھر اس کے ابو کی موجودگی کا پتا دیتا تھا۔ یہ ہی سوچ لے کر وہ اس نئے گھر میں شفٹ ہوئی تھی۔ میں نے بھی اس کی جہاں تک ممکن ہوا مدد کی۔ اس نے گھر کو بچوں کی دینی درس گاہ بنا دیا اور محلے کے بچوں کو ناظرہ قرآن مجید پڑھانے لگی اور باجی مہوش کی بجائے باجی اللہ والی مشہور ہوگئی۔ اس کا سہارا صرف اللہ پاک تھا۔ وہ اللہ کی مصلحت کو سمجھ گئی تھی کہ اسے کسی سہارے کے بغیر اللہ پاک کے لیے اس دنیا میں دوسروں کی مدد کرنی ہے اور دنیا کو رب کی پہچان کروانی ہے۔

ایک دن میں اس کے گھر گیا، اس نے اسی سلور کی تھال والی گول میز میں چائے رکھ کر پیش کی اور ساتھ ہی کہا" یہ گول میز میرے ابو کی تخلیق ہے اور اب اسی گول میز پر میرے پاس ناظرہ پڑھنے والے ننھے بچے کھانا کھاتے ہیں اور یہ گول میز صرف خالص دل والے لوگوں کے لیے ہے۔ یہاں رشتہ دیکھنے والوں کی کوئی جگہ نہیں ہے میں نے اپنی ساری زندگی اللہ پاک کے لیے وقف کردی ہے۔"

++

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کون بہتر

محترمی ایڈیٹر
السلام علیکم!
میں کوئی قلمکار تو نہیں ہوں لیکن پڑھنے کا شوق ہے۔ کافی عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ ایک پرانے واقعہ کو کہانی کی شکل میں لکھ کر بھیجوں۔ کئی ماہ کی کوشش سے کہانی لکھ تو لی اسے اگر آپ سرگزشت میں جگہ دے دیں تو نوازش ہوگی۔
محمد اکرام انصاری
(کراچی)

بارش کا موسم ایک خوبصورت موسم ہے۔
لیکن یہ کبھی کبھی عذاب بھی بن جاتا ہے۔ بقول شاعر
بارش ہوئی تو گل کے بدن چاک ہو گئے..... موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہو گئے۔
یا پھر جن کے مکان کچے ہوتے ہیں۔ وہ اسی پر خوش ہوتے رہتے ہیں کہ چھت ٹین کی تھی ٹوٹ کے برسی جو کل گھٹا ..... بارش کے ساتھ ساتھ بجے جل ترنگ بھی۔
ایسی تیز بارش تھی کہ سامنے کی چیزیں بھی دکھائی نہیں

دے رہی تھیں۔ نگاہوں کے سامنے پانی کی ایک چادر سی تن گئی تھی۔ ایسے موسم کی میں نے بہت سی کہانیاں پڑھی ہیں کہ جب کوئی حسینہ بارش میں بھیگتی ہوئی کسی سہارے کی تلاش میں چاروں طرف دیکھ رہی ہوتی ہے اور اس وقت کوئی کار سوار اسے لفٹ دے کر محبت کی ایک نئی کہانی کا آغاز کر دیتا ہے۔

لیکن اس بارش میں میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی البتہ ایک کتا دکھائی دے گیا۔

جی ہاں یہ کہانی اسی کتے کی ہے۔ وہ ایک اعلیٰ نسل کا کتا تھا۔ میں کتوں کی زیادہ پہچان تو نہیں رکھتا لیکن اتنا ضرور اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ السیشن ہے۔ کتے پالنے والے شوقین جانتے ہیں کہ اس نسل کے کتے کتنے وفادار اور سمجھ دار ہوا کرتے ہیں۔

وہ کتا اس وقت فٹ پاتھ پر کھڑا بارش میں بری طرح بھیگتا ہوا ہر گزرنے والی کار کے پیچھے دوڑ رہا تھا اور بھونک رہا تھا۔ میں نے یوں ہی تجسس میں اپنی گاڑی اس کے پاس لے جا کر روک دی۔ اس نے اپنا چہرہ اٹھا کر دو تین بار زور سے آواز نکالی اور ایک طرف چلنے لگا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ وہ کچھ آگے جا کر رک گیا اور پیچھے مڑ کر اس طرح دیکھنے لگا جیسے اسے یہ اُمید ہو کہ گاڑی والا اس کے پیچھے آ رہا ہوگا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو گیا کہ اس کتے کو کسی کے واسطے مدد کی ضرورت ہے۔ اپنے لیے نہیں بلکہ کسی اور کے لیے۔ شاید اس کا مالک اس طوفانی بارش میں کہیں پھنس گیا تھا۔ اس قسم کے بے شمار واقعات میں نے پڑھے اور نیشنل جغرافک جیسے چینلز میں دیکھے تھے۔

میں نے اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ وہ واقعی کسی خاص ڈائریکشن کی طرف مجھے لے جا رہا تھا۔ رک رک کر میری رہنمائی بھی کرتا جا رہا تھا۔ میرا بھی نہ جانے کون سا جذبہ بے دار ہو گیا تھا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

میرے خدا۔ وہ مجھے جس جگہ لے آیا تھا وہاں سوائے بربادی کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی بستی تھی جو کچے مکانوں کی تھی اور یہاں ہر طرف بربادی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

نہ جانے کتنے مکانوں کی دیواریں گر چکی تھیں۔ کوئی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید یہاں کے مکین بستی خالی کر گئے تھے۔ راستے میں ہر طرف کیچڑ پھیلی ہوئی تھی۔ بے تحاشہ بدبو تھی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔

کتا دوڑ کر میرے پاس آیا اس نے میری پینٹ کا پائنچہ پکڑ لیا۔ وہ مجھے ایک طرف گھسیٹ رہا تھا۔ کھینچ کر لے جا رہا تھا۔ ویسے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ سمجھدار کتا نقصان نہیں پہنچائے گا بلکہ کسی کی مدد چاہتا ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ چلتا رہا۔ گری ہوئی دیواروں کے ملبے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیسی بے حسی ہے ابھی تک اس علاقے میں امدادی ٹیمیں نہیں پہنچ سکی ہیں۔ ویسے تو دعوے ہو رہے تھے کہ ہم نے پورا انتظام کر رکھا ہے۔ اب کوئی پریشانی نہیں ہوگی لیکن میں جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ بہت حیران کر دینے اور دکھ دینے والا تھا۔

وہ کتا مجھے اسی طرح کھینچتا ہوا ایک ٹوٹے ہوئے مکان میں لے آیا۔ اس کی دیواریں گری ہوئی تھیں۔

اب تو یقین ہو گیا تھا کہ یہ کتا نقصان نہیں پہنچائے گا۔ بلکہ مدد کا طلب گار ہے۔ وہ بھی اپنے لیے نہیں بلکہ کسی اور کے لیے، اور وہ کوئی اور کون ہو سکتا تھا۔ گری ہوئی دیواروں کا ملبا میں کیسے اٹھا سکتا تھا۔ اگر کوئی ہوا بھی تو اس ملبے کے نیچے ہی ہوگا۔

آس پاس کوئی تھا بھی نہیں کہ اس سے مدد لے سکتا۔

میں نے اللہ کا نام لے کر ملبا ایک طرف کرنا شروع کر دیا۔ خدا نے میرا ساتھ دیا۔ اس کتے ہی نے میری رہنمائی کی تھی۔ وہ ایک جگہ کھڑا ہو کر بھونک رہا تھا۔

میں نے اسی جگہ کی دیواریں ہٹائیں اور کوئی دکھائی دے گیا۔ اس کی ٹانگیں نظر آئی تھیں۔ میں کسی طرح اسے باہر کھینچ لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ ایک عورت تھی۔ ایک بوڑھی عورت جو اس وقت بے ہوش تھی۔ ایک تو بوڑھی پھر زخمی۔ وہ کتا بار بار اس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی میرے پیروں سے اپنے جسم کو رگڑنے بھی لگتا تھا۔ میں اس کتے کی وفاداری اور اس کی ہوشیاری دیکھ کر حیران ہوا جا رہا تھا۔

میں کسی نہ کسی طرح اس بوڑھی کو اپنی گاڑی تک لے آیا تھا۔ ایسا تجربہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ میں کسی کو ریسکیو کر بھی رہا تھا تو کن حالات میں۔ بہر حال میں نے اس عورت کو کسی نہ کسی طرح گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔

اب اسے اسپتال پہنچانا تھا لیکن پرابلم یہ تھی کہ اس کتے کا کیا کرتا۔ اسے کیسے لے جاتا؟ ویسے اتنی دیر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔

میں نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول دیا۔ وہ کسی ہوشیار

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

فرد کی طرح کود کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے گاڑی اسپتال کی طرف دوڑا دی۔ واہ کیا خدا کی شان ہے۔ جس کا کوئی نہ ہو اس کا خدا ہوتا ہے۔ یہ بات اس دن سمجھ میں آئی تھی۔

"میں اس عورت کو ایک اسپتال لے آیا۔ اس وقت ایک لمحے کے لیے ذہن میں یہ بھی آیا تھا کہ یہ میں کس جنجال میں پھنس گیا ہوں۔ میرا اس عورت سے واسطہ ہی کیا ہے۔ اگر میں اس کتے پر دھیان نہیں دیتا تو کون سی قیامت آجاتی؟"

لیکن نہیں شاید ایسا ہونا ہی تھا۔ ایک بزرگ کی باتیں یاد آگئیں وہ کہا کرتے تھے کہ خدا جس سے کام لینا چاہتا ہے اس کی ڈیوٹی لگا دیتا ہے کہ تم کو یہ کرنا ہے۔ اس راستے سے گزرنا ہے۔ اس آدمی کی مدد کرنی ہے۔ اس کے ساتھ یہ کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ خدا نے میری ڈیوٹی لگا دی تھی کہ مجھے اس عورت کی مدد کرنی ہے اسی لیے میں اس سڑک سے گزرا، اسی لیے میں اس کتے کو دیکھ کر رک گیا تھا، اسی لیے میں اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔ اسی لیے یہ سب ہوتا رہا تھا۔

میں نے اسپتال میں اس عورت کو داخل کرا دیا۔ اب پرابلم یہ تھی کہ وہ کتا کہاں جائے؟ آپ یقین کریں میں نے اپنی زندگی میں اتنا سمجھدار کتا نہیں دیکھا تھا۔ اسپتال کے گیٹ پر پہنچ کر وہ گیٹ ہی پر رک گیا تھا۔ شاید اس نے یہ جان لیا تھا کہ وہ اندر نہیں جا سکے گا۔

کون اتنی سمجھ دیتا ہے۔ کون ایسی رہنمائی کرتا ہے۔ واہ۔ کیا شان ہے۔

بڑی بی کو داخل کر لیا گیا۔ میں نے اس کی فیس ادا کر دی تھی۔ یہ سب کچھ میں ایک انجانے جذبے کے تحت کیے جا رہا تھا۔ کسی کے ان دیکھے ہاتھ میری پشت پر تھے۔ کوئی مجھے تھپ تھپا رہا تھا کہ شاباش، تمہیں یہ سب کرنا ہے کیوں کہ یہ تمہاری ڈیوٹی ہے، اور میں یہ سب کر رہا تھا۔

اس عورت کو صرف کمزوری تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ایک تو یہ کہ ان کی عمر زیادہ ہو چکی ہے پھر زخمی ہو گئیں ہیں۔ جسم سے خون بہہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا معدہ خالی ہے۔ شاید انہوں نے کھانا نہیں کھایا۔

پھر میں نے اس ڈاکٹر کو بتایا کہ ڈاکٹر صاحب۔ اس عورت کو میں جانتا بھی نہیں ہوں یہ جن حالات میں مجھے ملی ہے وہ بہت حیرت انگیز ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

ڈاکٹر حیران رہ گیا تھا۔ "آفرین ہے آپ پر۔ لیکن اس کتے پر زیادہ حیرت ہو رہی ہے۔ اس نے تو حق ادا کر دیا ہے۔"

"جی ڈاکٹر صاحب۔ وہ کتا ہی اصل میں شاباشی کا مستحق ہے۔ کیا وفاداری ہے۔ ایسی باتیں میں نے صرف کتابوں میں پڑھی تھیں۔

"کیا میں اس کتے کو دیکھ سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ اس کو تو میں اپنے ساتھ ہی لایا ہوں۔ وہ گیٹ پر بیٹھا ہوگا۔"

"آئیں چلتے ہیں۔"

میں اس ڈاکٹر کو لے کر گیٹ پر پہنچ گیا۔ وہ گیٹ پر ہی تھا۔ وہ چونکہ ایک شاندار نسل کا شاندار کتا تھا اسی لیے لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے آس پاس ایک بھیڑ سی لگی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میرے پاس آگیا۔ اس نے اپنا جسم میرے پیروں سے اس طرح رگڑنا شروع کر دیا جیسے وہ اپنی مالکن کا حال دریافت کر رہا ہو۔

میں نے اس کے جسم کو تھپکی دی۔

"واقعی کمال ہے۔" ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی۔

"ڈاکٹر صاحب۔ ایک درخواست کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں فرمائیں"

"کیا ایسی کوئی صورت ہو سکتی ہے کہ یہ کتا اپنی مالکن ہی کے کمرے میں رہے۔ اس کے پاس ورنہ یہ بے چین ہوتا رہے گا اور گیٹ پر پڑا رہے گا۔"

"ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔ یہ اسپتال کے اصولوں کے خلاف ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن یہ ایک اسپیشل کیس ہے اس کے لیے انتظامیہ سے بات کرنی ہوگی۔"

"پلیز۔ بات کر لیں۔" میں نے درخواست کی۔

"میں خود بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ایسا ہونہیں سکتا لیکن بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

میں نے کتے کو تھپکی دی۔ اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اسی جگہ رہے میں اس کی مالکن کو دیکھ کر آتا ہوں۔

وہ کتا میرے اندازے سے کہیں زیادہ ذہین اور سمجھدار تھا۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

مجھ سے کہیں زیادہ وہ ڈاکٹر متاثر ہو رہا تھا۔ "بھائی۔ اس کو بہت اچھی طرح ٹرین کیا گیا ہے۔ آپ یہ بتا رہے ہیں کہ اس ٹوٹے ہوئے مکان میں اس عورت کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔"

"جی ڈاکٹر صاحب۔ کوئی نہیں تھا۔ وہ بے ہوش تھی

اسی لیے اس سے کچھ معلوم کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ میں اسے سیدھا اسپتال لے آیا۔''

ہم دونوں چلتے ہوئے اسپتال کے کوریڈور میں پہنچ گئے۔ اسی وقت ایک نرس دوڑتی ہوئی آئی۔ اس نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب۔ اس پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔''

''اوہ۔'' ڈاکٹر نے اطمینان کی سانس لی۔ ''گڈ۔'' پھر میری طرف دیکھا۔ ''چلیں۔ اسے ہوش آ گیا ہے۔''

ہم کمرے میں پہنچے تو وہ ہوش میں تھی۔ اسے ڈرپس لگی ہوئی تھیں۔ اس نے ہمیں دیکھ کر کچھ کہنا چاہا لیکن اتنی نقاہت تھی کہ اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ ڈاکٹر نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔ ''کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

میں بھی پاس جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''یہ آپ کو وہاں سے نکال کر لائے ہیں۔ آپ ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے بے ہوش تھیں۔''

اس عورت نے میری طرف دیکھا پھر بولی۔ اس بار اس کی آواز صاف سنائی دی تھی۔ ''منا۔ میرا منا۔ وہ کہاں ہے؟''

''میں نے آپ کے پاس کسی اور کو نہیں دیکھا۔'' میں نے بتایا۔ ''آپ اکیلی تھیں۔ البتہ ایک کتا تھا جو مجھے سڑک سے آپ کے پاس لے کر آیا تھا۔''

''ہاں۔ ہاں وہی۔ وہی میرا منا ہے۔ وہ کہاں ہے۔''

میں نے اور ڈاکٹر نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

''ان کو تسلی دیں۔'' ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

''دیکھیں۔ آپ کا منا بالکل خیریت سے ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ باہر بیٹھا ہے۔''

''مجھے اس کے پاس لے چلیں۔'' اس نے کہا۔ اب اس کی آواز میں پہلی جیسی نقاہت نہیں تھی۔

''دیکھیں آپ کو ڈرپ لگی ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ کو بستر سے اٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''مجھے اپنے منے کو دیکھنا ہے۔'' اس نے کہا۔

میں نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ ''ڈاکٹر صاحب کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اس کتے کو یہیں لے آئیں۔ اس طرح دونوں کو تسلی ہو جائے گی۔''

''آپ ان کے پاس ہی رہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں انتظامیہ سے بات کر کے آتا ہوں۔''

ڈاکٹر چلا گیا۔ میں اس عورت کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ''محترمہ۔ میں نے جس وقت آپ کو نکالا ہے۔ آپ اکیلی تھیں۔ کیا اور کوئی آپ کے ساتھ نہیں رہتا؟''

''نہیں'' اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''نہیں اس گھر میں میں اکیلی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''کیا ایسا کوئی ہے جس کو آپ کے بارے میں بتایا جا سکے۔'' میں نے پوچھا۔

''دو۔ دو بیٹے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''کہاں ہیں وہ؟ کیا ملک سے باہر ہیں؟''

''نہیں تو وہ اسی شہر میں ہیں۔''

ڈاکٹر اجازت لے کر آ گیا۔ ''اجازت مل گئی ہے۔ اس کتے کو یہاں لا سکتے ہیں۔ یہ ایک اسپیشل کیس ہے اسی لیے سب ہی متاثر ہیں۔ سب ہی اس کتے کو دیکھنا چاہتے ہیں جس نے وفاداری کی مثال قائم کی ہے۔''

میں فوراً ہی گیٹ کی طرف چلا گیا۔ کتا اب ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے پکارا۔ ''منا۔'' وہ فوراً میرے پاس آ گیا۔ اس کا نام مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ ''منا'' میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ میرے ساتھ ساتھ آ جائے۔

اس نے میرا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ میں اسے اس کمرے میں لے آیا جہاں اس عورت کو رکھا گیا تھا۔

پھر ان دونوں کے ملاپ کا منظر دیکھنے والا تھا۔ وہ کتا بے قراری سے بستر کے گرد چکر لگا رہا تھا اور کبھی اپنی تھوتھنی اس عورت کے پیروں پر رگڑنے لگتا اور یہی حال اس عورت کا تھا۔ وہ بھی اتنی ہی بے قرار تھی۔ وہ کبھی اس کو پیار کرتی کبھی اس سے باتیں کرتی۔

ہم سب یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔ انسان اور جانور کے درمیان ایسی محبت کی مثال ذرا کم ملتی ہے۔ اس وقت مجھے ایک پرانی کہانی یاد آ رہی تھی۔ ''خواجہ سگ پرست'' ایک بار پھر ویسا ہی منظر دہرایا جا رہا تھا۔

اس کمرے میں اس ڈاکٹر کے علاوہ دو تین اور ڈاکٹر اور نرسیں بھی موجود تھیں۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ اس کتے کو باہر بھیج دیں۔ اب بڑے ڈاکٹر کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں نے اس عورت سے کہا۔ ''محترمہ۔ اپنے منے کو باہر بھیج دیں۔ اس سے کہیں باہر چلا جائے۔ ڈاکٹر وزٹ کرنے والے ہیں۔''

''میرا منا کہاں رہے گا؟'' وہ اس وقت بھی کتے کے لیے بے چین تھی۔

www.pakistanipoint.com

"میرا خیال ہے کہ یہ مجھ سے مانوس ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس کو ساتھ لے جاؤں گا ورنہ یہ یہاں گیٹ پر پڑا رہے گا۔ اس کے کھانے پینے کا بھی دھیان رکھنا ہوگا۔"

اس نے اس کتے کو پاس بلایا۔ اس کو تھپکیاں دیں۔ اس کو کچھ سمجھاتی رہی۔

اس کے بعد میں نے اس کتے کو منا کہہ کر بلایا تو میرے پاس آگیا۔

میں اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ بارش تو رک چکی تھی لیکن سڑکیں تباہی کا شکار تھیں۔ میں نے کتے کو اس بار پچھلی سیٹ پر بیٹھا دیا تھا۔ میرے گھر میں میرے علاوہ میری بیوی اور دو چھوٹے بچے بھی تھے۔

وہ سب میری وجہ سے پریشان ہو رہے تھے۔ کیوں کہ بارش کی وجہ سے موبائلز کے سگنلز نہیں مل رہے تھے اسی لیے ان کا مجھ سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ میرے ساتھ کتے کو دیکھ کر سب حیران رہ گئے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" میری بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ "ارشد! یہ کیا لے آئے بھگائیں اس کو۔"

دونوں بچے کتے کو دیکھ کر ایک طرف سہم کر کھڑے ہوگئے تھے۔ وہ کتا بھی ایسا ہی شاندار تھا کہ اس کو دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔

"تم لوگ اس سے ڈرو نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس کا نام منا ہے۔ اس کی کہانی بعد میں سناؤں گا۔ پہلے اس کے لیے کھانے کا بندوبست کرو لیکن اس سے پہلے تم لوگوں کی اس سے دوستی کرا دیتا ہوں۔" میں اپنی بیوی کا ہاتھ تھام کر منا کے پاس لے آیا۔ "منا یہ اس گھر کی مالکن ہیں۔" میں نے کہا۔ پھر اپنے بچوں کو اس سے ملوا دیا۔

شروع شروع میں تو سب خوف زدہ رہے لیکن جب اس کا رویّہ دیکھا تو سب کا خوف ختم ہوگیا۔

اور جب میں نے اس کتے اور اس بوڑھی عورت کی کہانی سنائی تو سب ہی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ خاص طور پر میری بیوی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ "خدا کی پناہ۔ یہ ایسا کتا ہے؟"

"ہاں۔ میں نے اس سے زیادہ وفاداری اور محبت اس سے پہلے کسی میں نہیں دیکھی تھی۔ ویسے تو یہ جس نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نسل کے کتے سمجھدار ہوتے ہیں لیکن یہ بہت ذہین اور غیر معمولی کتا ہے۔"

زندگی میں بیزاری اور مایوسی سے بچنے کا ایک مؤثر طریقہ مقاصد اور ارادوں کی مستقل تلاش بھی ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے مقصد کی موجودگی بہت ضروری ہے یہ مقصد کوئی فضول سا، بے جان مقصد نہیں ہونا چاہیے بلکہ بھرپور عزم، بلند دماغی اور ذہانت کا حامل ہونا چاہیے جس میں کسی فرد کی مکمل شخصیت جھلکتی ہو۔ مقصد کے تعین میں اس بات کی نشاندہی ضروری ہے کہ آپ اپنی قوت فیصلہ کو کام میں لائیں اور مضبوطی سے کیے جانے والے فیصلے پر ڈٹ جائیں۔ بوریت سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کا ہر عمل ذہنی پختگی اور استحکام کا مظہر ہو اور آپ کو معلوم ہو کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ ان فیصلوں کے سلسلے میں کسی ابہام اور شک و شبہے کا شکار نہ رہیں۔ جب آپ بوریت کے خاتمے کے لیے اپنے مقصد کو متعین کرلیں تو پھر اسے دماغ کے اسٹور میں ڈال دیں اور بھول جائیں۔ وہ مقصد خود کار عمل کے تحت خود بخود آپ کے اعصاب پر سوار ہو جائے گا۔ آپ کا پختہ ارادہ رفتہ رفتہ مقصد کو دماغ کی اوپری سطح سے نکال کر لاشعور کی گہرائیوں میں لے جائے گا اور پھر وہ وہاں جم جائے گا۔ ایسے ہی جیسے بارش کا پانی زمین کی سطح سے رستا، جگہ بناتا، جذب ہوتا ہوا گہرائی تک پہنچ جاتا ہے اور نئی کونپلوں کو جنم دیتا ہے۔ آپ کا مقصد بھی اندر پہنچ کر کرشمے دکھائے گا اور خوشیوں، کامیابیوں و مسرتوں کی نئی، کونپل کو چٹخنے پر مجبور کردے گا۔

مرسلہ: روبینہ ناز۔ سیالکوٹ

"یہ تو واقعی بہت زبردست ہے۔" میرے بڑے بچے نے کہا۔ اس کی عمر بارہ برس تھی۔ "ابو۔ اب ہم اس کو اپنے گھر میں رکھیں گے۔"

"نہیں بیٹا۔ یہ اس عورت کی امانت ہے۔" میں نے کہا۔ "اس اکیلی کا سہارا ہے۔ ہم کبھی کبھی جا کر مل لیا کریں گے۔"

میرے کہنے پر بڑے بیٹے نے اسے منا کہہ کر پکارا تو وہ اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ اسے لے کر برآمدے میں چلا گیا تھا۔ بیوی نے اس کے لیے ایک پرانے گدے اور کھانے کا بندوبست کر دیا تھا۔

دوسری صبح ہم نے منا کو گھر پر ہی رہنے دیا۔ بچے اب اس سے خوفزدہ نہیں تھے بلکہ اس سے مانوس ہوگئے تھے۔ وہ بھی بچوں کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ بچے صبح کو اسے محلے میں

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ٹہلانے بھی لے گئے تھے۔ وہ اتنا سدھا ہوا تھا کہ اس کے گلے میں رسی وغیرہ باندھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ آوارہ کتے اسے دیکھ کر بھونکتے مگر وہ ان کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ ایک ہی آواز پر وہ دوڑا چلا آتا تھا۔

میں اپنی بیوی صوفیہ کو لے کر اسپتال پہنچ گیا۔ اس بوڑھی کی حالت پہلے سے بہتر تھی لیکن کمزوری ابھی باقی تھی۔

''منا کہاں ہے میرا؟'' اس نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

''آپ اس کی طرف سے بے فکر رہیں۔'' صوفیہ نے کہا۔ ''وہ ہمارے گھر بہت آرام سے ہے۔ بچوں سے اس کی دوستی ہوگئی ہے۔''

''ہاں۔ وہ ایسا ہی ہے۔'' اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی۔ ''وہ محبت کرنے والوں کو پہچانتا ہے۔''

''آپ نے بتایا تھا کہ آپ کے دو بچے اسی شہر میں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا انہیں آپ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم؟''

''پتا نہیں بیٹا۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''ہوسکتا ہے کہ انہیں نہ معلوم ہو۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' صوفیہ بھڑک اٹھی۔ ''کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ بارش نے آپ کا علاقہ تباہ کردیا ہے۔ ان کو خبر تو لینی چاہیے تھی۔''

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

''آپ مجھے ان کے نام اور پتے بتائیں'' میں نے کہا۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں چند لمحوں تک سوچتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔ ''بڑے کا نام راشد ہے اور چھوٹے کا نام حامد ہے۔ دونوں ہی نارتھ ناظم آباد میں رہتے ہیں۔ دونوں کے گھر آس پاس ہیں۔''

''اور مکان نمبر کیا ہیں؟'' صوفیہ نے پوچھا۔

اس نے ان دونوں کے ایڈریس بتادیے پھر اپنے کتے کی خیریت معلوم کرتی رہی۔ میں اور صوفیہ دونوں ہی اسے تسلی دیتے رہے تھے۔ ہم کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر آگئے۔ صوفیہ بھی بہت متاثر تھی۔ ''خدا کی پناہ۔ کیسے بے حس لوگ ہیں۔ ان کو احساس ہی نہیں ہے کہ ماں کس حال میں ہے۔''

''اس ٹائپ کی بہت سی کہانیاں ہمارے معاشرے میں ہیں۔'' میں نے کہا۔

''جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

لیکن دوسرے دن میں اپنے کاموں میں الجھا رہا اسی لیے نہیں جاسکا۔ البتہ اس عورت کو دیکھنے اسپتال چلا گیا تھا۔ اس کی حالت بہت بہتر تھی۔ اسے اپنے کتے کی طرف سے بھی اطمینان ہوگیا تھا۔ اس دن اس نے اپنا نام عالمہ بتایا تھا۔

میں گھر پہنچا تو وہ کتا میرے پیروں سے اپنے جسم کو رگڑنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی مالکن کی خیریت معلوم کررہا ہو۔ میں نے اسے تھپکی دی۔ ''سب ٹھیک ہے۔ تمہاری مالکن اب بالکل ٹھیک ہے۔ کل تم کو ان کے پاس لے جاؤں گا۔ شاباش۔''

نہ جانے اس نے کیا سمجھا تھا لیکن وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ میرے بڑے بیٹے نے آکر بتایا۔ ''ابو۔ یہ کتا تو بہت زبردست ہے۔ پورے محلے کے بچوں کا دوست بن گیا ہے۔ سب اس سے پیار کرنے لگے ہیں۔''

''ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ ایسا ہی ہے۔''

صوفیہ نے بتایا۔ ''میں مارکیٹ کی طرف گئی تھی۔ منا میرا مطلب ہے یہ کتا بھی میرے ساتھ ہولیا۔ ایسا لگا جیسے میری حفاظت کرتا چل رہا ہو۔ میرا گارڈ بنا ہوا تھا۔ بڑا مزہ آیا۔ ہاں۔ یہ بتائیں۔ ان کا کیا حال ہے؟ ویسے میں نے ایک بات سوچی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''کیوں نا ان خاتون کو اپنے یہاں ہی رکھ لیں۔'' صوفیہ نے کہا۔ ''ویسے بھی ان کا کوئی نہیں ہے۔ اس گھر میں ایک بزرگ کی کمی ہے۔ ان کے آنے سے پوری ہوجائے گی۔ بچے بھی ان سے مانوس ہوجائیں گے۔''

''صوفیہ۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ جیسا میرا مزاج ہے ویسا ہی تم نے بھی پایا ہے۔ انشاءاللہ ہم عالمہ بی بی کو اپنے یہاں لے آئیں گے لیکن ایک بار مجھے ان کے بیٹوں کے پاس جانا ہے۔ دیکھوں تو سہی۔ وہ کیا کہتے ہیں۔''

دوسرے دن میں نارتھ ناظم آباد کے بلاک ایل میں پہنچ گیا۔ یہاں بہت بڑے بڑے اور قیمتی مکانات بنے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کے بڑے بیٹے راشد کا گھر تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔

وہ ایک بڑا مکان تھا۔ دو منزلہ۔ گیٹ پر ایک گارڈ بھی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا یہی راشد صاحب کا مکان ہے؟''

''ہاں صاحب یہی ہے۔'' اس نے بڑے سلیقے اور

www.pakistanipoint.com

JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS

Convey Your Message to
Millions of Our Readers,
World Wide
Through

MONTHLY SARGUZASHT

63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.
PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551
Email : jdpgroup@hotmail.com

ادب سے جواب دیا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی تھی کہ میں اس کے سامنے اپنی گاڑی سے اترا تھا ورنہ پیدل کو تو یہ گارڈ قسم کے لوگ گھاس بھی نہیں ڈالتے۔

''ان سے کہہ دو۔ کوئی ان سے ملنے آیا ہے۔'' میں نے کہا۔

پانچ منٹ بعد میں اس گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک موٹا سا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔

نہ جانے کچھ لوگ ایسے کیوں ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر ان سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ ایک گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ شاید وہ اندر سے اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ ان سے راہ و رسم بڑھائی جائے۔ یہ بھی ان ہی میں سے تھا۔

وہ میرے پاس آ گیا۔ اس کی کینہ توز نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ''جی فرمائیں؟ اس نے پوچھا۔'' میرا خیال ہے کہ میری آپ سے پہلے بھی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔''

''جی ہاں۔ ہم بھی نہیں ملے۔'' میں نے کہا۔ ''میں آپ کے پاس عالمہ بی بی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ وہ آپ دونوں کو یاد کر رہی ہیں۔''

''عالمہ'' اس نے اس طرح انجانے پن سے کہا جیسے اسے یاد ہی نہ ہو کہ عالمہ کون ہے۔

''میرا خیال ہے کہ عالمہ شاید آپ کی والدہ کا نام ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ ہاں وہ میری والدہ ہیں۔'' اس نے کہا۔

''لیکن آپ کا ان سے کیا تعلق؟''

''جب اپنے تعلق نہ رکھیں تو غیر ہی اپنے ہوتے ہیں راشد صاحب۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''کام کی بات بتائیں۔'' اس نے کہا۔

''کام کی بات یہ ہے کہ ان پر بارش کے دوران ان کے گھر کی دیوار گر پڑی تھی۔ اتفاق سے میں پہنچ گیا اور ان کو اسپتال میں ایڈمٹ کرا دیا۔ اب آپ کی مرضی ہے۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میرے ساتھ پرابلم یہ ہے کہ میں کل صبح بنکاک جا رہا ہوں۔ آپ ایسا کریں، مجھ سے ان کے اخراجات لے جائیں۔ میں واپس آ کر لے لوں گا۔''

''آپ کی اس دریا دلی کا بہت شکریہ۔ میرے حالات خدا کے فضل سے ایسے ہیں کہ میں اس بے سہارا عورت کا سہارا بن سکوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ اپنے پیسے اپنے پاس رکھیں۔ بنکاک میں کام آئیں گے۔ خدا حافظ۔''

میں اس سنگ دل شخص پر لعنت بھیجتا ہوا اس کے مکان سے باہر آ گیا۔ اس کے چھوٹے بھائی کے پاس بھی جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بھی ایسا ہی ہوتا۔ مجھے اس عورت کی بے چارگی پر رونا آ گیا تھا۔ کیسے بے حس لوگ تھے اور کیسا تھا وہ کتا جو اولاد کی طرح اس کا ساتھ دے رہا تھا۔

میں نے واپس آ کر بہانہ کر دیا کہ وہ لوگ نہیں ملے لیکن عالمہ بی بی کو شاید ادراک ہو گیا تھا۔ وہ صرف ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

اس دن کے بعد سے اس کی طبیعت بگڑنے لگی۔

اس کا سفر شاید ختم ہو گیا تھا۔

میری بیوی اور بچوں کو بھی اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ وہ ہمارے گھر میں ایک مہربان اور شفیق ہستی کی طرح تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیسے بدقسمت ہوتے ہیں جن کے یہاں بزرگ ہوتے ہیں لیکن انہیں ان کی پرواہ نہیں ہوتی۔

یہ بزرگ تو امن، سکون اور محبت کی چھاؤں ہوا کرتے ہیں۔

میں نے اپنے طور پر ان کا ممکن حد تک علاج کروایا لیکن انہیں جانا تھا۔ وہ دن بہ دن کمزور اور مایوس ہوتی چلی گئیں۔ اس دوران کتے منا کا کردار دیکھنے والا تھا۔ شاید قدرت کی طرف سے اسے یہ پتا چل گیا تھا کہ اس کی مالکن اب جانے والی ہے۔

وہ اس کی چارپائی کے گرد چکر لگاتا رہتا۔

ایک طرف بیٹھ کر دیکھتا رہتا۔ یا روتا رہتا۔

ہم سب دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے۔ ایک دن وہ اماں اس دنیا سے رخصت ہو ہی گئی۔ خدا جانے کتنی حسرتیں لیے گئی ہوگی۔

اس کے جانے کے بعد بھی وہ کتا اس خالی چارپائی کے گرد گھومتا رہتا تھا اور ایک دن وہ بھی اسی چارپائی کے پاس مر گیا۔

اب ہمارے گھر میں نہ تو وہ عورت تھی اور نہ ہی وہ کتا تھا۔ گھر خالی ہو گیا تھا۔

یہ کہانی زندگی کی ہے اور زندگی اسی قسم کے تماشے دکھایا کرتی ہے۔ اگر انسانیت کی تذلیل نہ ہو تو میں کہوں گا کہ وہ کتا اس عورت کے بیٹوں سے کہیں زیادہ اچھا تھا۔

++

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

جنونِ عشق

محترم مدیر
السلام علیکم!
ایک اور سچ بیانی ارسال کررہا ہوں، یہ سچ بیانی جبران کی ہے۔ اس نے جو غلطی کی وہ کوئی اور نہ کرے یہی سمجھانے کے لیے میں نے جبران کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ لکھا ہے۔ قارئین کو بھی یہ سچ بیانی پسند آئے گی۔

خلیل جبار
(کراچی)

''امی جان نے کہا ہے کہ ابا کو کام ہے، اس لیے وہ تمہاری دکان پر سودا لینے نہیں آئیں گے۔'' کومل نے مجھے بتایا۔

''میں نے سودا تیار کر دیا ہے۔''

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ سودا تم گھر پہنچادو۔''

''ہاں میں پہنچادوں گا مگر جب انکل دانش دکان پر آئیں گے۔'' میں نے کہا۔ انکل دانش شام کو چار بجے دکان پر آتے تھے اس لیے میں نے یہ بات کی تھی۔

''چار بجنے میں ویسے بھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ انکل کے آنے پر سودا پہنچا دینا۔'' کومل نے کہا۔

''بے فکر ہو جائیں شام کو سودا گھر پہنچ جائے گا۔'' میں نے کہا۔

میں کسی کے گھر مہینے کا سودا نہیں پہنچاتا تھا لیکن آج کومل کے کہنے پر میں تیار ہو گیا تھا اور اس کے گھر مہینے کا راشن لے جانے میں بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔ کومل نے مجھے اپنے گھر جانے کا موقع جو فراہم کر دیا تھا۔

میری عادت تھی میں لڑکیوں کو آتا دیکھ کر اپنی نظریں نیچی کر لیا کرتا ہوں۔ مگر میں کوئی شرمیلا لڑکا نہیں ہوں۔ دراصل میں احترام کے طور پر نظریں جھکا لیتا ہوں۔

کومل کے چہرے میں ایک ایسی بات تھی کہ خود بخود میرا دل اس کو دیکھنے کو چاہتا تھا مجھے اس کے چہرے پر ایک کرب سا محسوس ہوتا تھا جیسے سارے زمانے کا درد اس کے چہرے پر سمٹ آیا ہے۔ میری اس میں دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی ایسا بہانہ نہیں مل رہا تھا کہ اس سے بات چیت کا سلسلہ نکل آئے۔ قسمت کو میری اس بے بسی پر رحم آ گیا۔ ہوا یہ کہ انکل دانش کو گھر کا راشن لے کر جانا تھا لیکن اچانک کسی کام سے شہر سے باہر جانا پڑ گیا اور اس طرح کومل نے آ کر راشن پہنچانے کی بات کر دی۔ میں دکان پر اسے کچھ دیر اور روکنا چاہتا تھا مگر میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔

انکل دانش کے دکان پر آ جانے پر میں مہینے کا راشن لے کر کومل کے گھر پہنچ گیا۔ آنٹی پروین مجھے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

''جبران بیٹے میں تمہیں یہ زحمت نہ دیتی تمہارے انکل کامران کو آج حیدر آباد جانا پڑ گیا ہے۔ کومل کے بھائی رات دیر گئے کام سے لوٹتے ہیں۔''

''آنٹی زحمت کیسی، ہماری دکان سے اس گھر کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ مہینے میں ایک بار راشن دے دینے میں کون سا فرق پڑ جائے گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کومل کو دیکھا۔

میرے دروازہ پر دستک دینے پر کومل نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی دل خوش ہو گیا تھا ایک طرح سے گھر تک راشن لانے کی محنت وصول ہو گئی تھی۔

''جبران بیٹے تمہاری سوچ بہت اچھی ہے لیکن ایسا کون سوچتا ہے۔''

''آنٹی احساس کرنا چاہیے، جو لوگ مہینے کا راشن لیتے ہیں ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''جبران بیٹے تمہارا بہت بہت شکریہ جو سامان گھر تک لائے۔'' آنٹی پروین نے کہا۔

''مجھے بیٹا بھی کہہ رہی ہیں اور شکریہ ادا کر کے شرمندہ بھی کر رہی ہیں۔ مجھے حکم دیں میں ہر ماہ راشن گھر دے جایا کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''ارے نہیں بیٹے تمہارے انکل ہیں نا سامان لانے کو تم بالکل فکر نہ کرو۔''

''آنٹی مجھے بیٹا کہہ کر غیروں جیسی بات نہ کریں، مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ اس عمر میں انکل گھر کا سودا لے کر آئیں۔''

''یہ مجبوری ہے کہ انکل کو راشن لانا پڑتا ہے۔''

''کیسی مجبوری ہے! کیا وہ اپنے بیٹوں پر اعتبار نہیں کرتے۔'' میں نے پوچھا۔

یہ بات میں نے اس لیے کہی تھی کہ دکان میں کام کرتے ہوئے کئی بار میں نے یہ بات محسوس کی تھی کہ بعض لوگ اپنی اولاد پر اعتبار نہیں کرتے۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ ان کے بچے سودے میں سے پیسے بچا لیتے ہیں اس لیے خود گھر کا سودا سلف لے کر جاتے ہیں۔

''ایسی بات نہیں ہے ان کو اپنے بچوں پر اعتبار ہے۔ میرے تینوں بیٹوں کا کام ایسا ہے کہ وہ رات گئے گھر لوٹتے ہیں۔''

''آنٹی بس بے فکر ہو جائیں میں خود ہر ماہ گھر کا راشن دے جاؤں گا۔ انکل کو بالکل بھی زحمت نہ ہو گی۔'' میں نے کہا۔

میں کومل کے گھر آنے کا سلسلہ بنانا چاہتا تھا اس طرح ان کے گھر آنے اور جانے پر کوئی اعتراض بھی نہیں کرتا۔ اور میں اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہو جاتا۔ میں اپنی اس ترکیب میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ کومل کے گھر راشن دینے کے بہانے آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ گھر میں وہ دونوں ماں بیٹی زیادہ تر اکیلی ہی ہوتی تھیں۔ انکل کامران زیادہ تر دوستوں سے گپ شپ لگانے گھر سے باہر رہتے تھے۔

میں مختلف بہانوں سے کومل سے باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ بھی مجھ سے بغیر کسی جھجک کے بات کرنے لگی تھی۔ کومل سے بات کر کے جب میں دکان پر لوٹتا تھا تو میرے دل میں خوشی ناچ اٹھتی تھی۔ یہ بات انکل دانش بھی محسوس کرتے تھے مگر مجھ سے کچھ کہتے نہیں تھے۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ جب تک

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

مقصد میں کامیابی حاصل نہ کرلوں یہ بات کسی کو پتا نہ چلے۔

ایک دن میں کومل کے گھر پہنچا وہ اکیلی تھی۔ میں نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور اس سے پوچھ ہی لیا۔ ''کومل تم اتنی اداس کیوں رہتی ہو؟''

''تم میرے درد کا احساس نہیں کرسکتے۔'' وہ بولی۔

''کیوں کیا میں انسان نہیں ہوں۔''

''میں نے کب کہا تم انسان نہیں ہو۔''

''جب میں انسان ہوں تو تمہارے درد کا احساس کرسکتا ہوں۔''

''تمہاری شادی ہوچکی ہے؟''

''نہیں ابھی کنوارا ہوں۔''

''میں شادی شدہ ہوں اور میری مجبوری کو ایک شادی شدہ انسان ہی سمجھ سکتا ہے۔''

''اسکول سے واپسی پر جب تم میری دکان کے سامنے سے گزرتی ہو، تمہارے چہرے پر بہت اداسی ہوتی ہے۔ اس اداسی کو دیکھ کر میرا دل بے چین ہوجاتا ہے اور میرے دل میں آتا ہے کہ تم سے اس اداسی کا سبب معلوم کروں۔''

''میرے اسکول سے واپسی پر تم مجھے دیکھتے ہو۔'' کومل نے پوچھا۔

''میں اس بات سے انکار نہیں کرسکتا۔ واقعی میں تمہیں روزانہ دیکھتا ہوں لیکن میں کسی غلط نظر سے نہیں دیکھتا۔ میں نے کسی بھی شادی شدہ عورت کے چہرے پر ایسی اداسی نہیں دیکھی جیسی تمہارے چہرے پر ہوتی ہے۔ یہ اداسی ہی ہے تمہارے چہرے کی جو تمہیں دیکھنے پر مجھے مجبور کردیتی ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو بتادو کہ تمہیں کیا مسئلہ درپیش ہے۔''

''کیا کرو گے میرے غم کو جان کر؟'' اس نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''انسان کی فطرت ہے وہ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوجاتا ہے۔ یہ تجسس ہی ہے جو میں تمہاری طرف مائل ہوا ہوں۔ انسان کو ایک دوسرے سے اپنے مسئلے پر بات چیت کرلینی چاہیے اس طرح بہت سے مسائل حل ہوجاتے ہیں۔''

''میرا مسئلہ اس نوعیت کا نہیں ہے، میں اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہتی ہوں۔''

''طلاق لینا چاہتی ہو۔'' مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

''ہاں میں طلاق لینا چاہتی ہوں لیکن میرا شوہر طلاق دینا نہیں چاہتا ہے۔

''تمہاری ایک بچی کرن بھی ہے پھر بھی شوہر سے.....''

''میں جیسی یہاں ہوں ویسی ہی شوہر کے پاس رہتی رہی ہوں۔''

''تقریباً سب ہی اپنے گھر میں جیسی رہتی ہیں ویسے ہی شوہر کے گھر میں رہتی ہیں۔''

''میں نے کہا نا کہ تم کنوارے ہو، میری بات کی تہہ تک آسانی سے پہنچ نہیں پاؤ گے۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں، انسان کو بتانا پڑتی ہیں اور کچھ انسان کو خود سمجھنا پڑتی ہیں۔'' کومل نے کہا۔

اس کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ لڑکی شادی کرکے اسپیشل نہیں ہوجاتی۔ چند دن اچھے گزرتے ہیں پھر وہی رات دن پرانے آجاتے ہیں۔ جیسا وہ اپنے گھر میں کام کرتی ہے۔ اسی طرح وہ سسرال میں کام کرتی ہے۔ میرا یہی مشاہدہ تھا جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھا تھا۔

کوئی ایسی بات ضرور تھی جو وہ میرے سامنے نہیں کرپا رہی تھی۔ بعض اوقات مرد یا عورت کی زندگی میں ایسے مراحل آجاتے ہیں جو وہ کسی کے سامنے نہیں بتا سکتا ہے۔ موبائل پر ہی بات آسانی سے کہہ جاتا ہے۔ میرے دل میں یہ خیال آتے ہی میں نے اس سے کہا۔

''کیا تم مجھے اپنا موبائل فون نمبر دے سکتی ہو، اگر مجھ پر اعتبار ہے۔''

''تم موبائل فون نمبر لے کر کیا کرو گے۔'' کومل چونکی۔

''بے فکر رہو میں تمہارے نمبر نہیں بانٹوں گا۔''

''مجھے تم پر اعتبار ہے۔ تمہیں ہمارے گھر آتے ہوئے تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ہوگیا ہے۔ کبھی تم نے کوئی ایسی گری حرکت نہیں کی جس سے تمہارے کردار پر شک ہو۔'' کومل نے کہا۔

''سچی بات یہ ہے کہ میرا دل تم سے باتیں کرنے کو چاہتا ہے، میں تمہاری یہ اداسی دور کرنا چاہتا ہوں۔''

''تمہارے دل میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی۔'' کومل نے پوچھا۔

''تم ہنستے ہوئے بہت اچھی لگتی ہو۔''

''تم نے مجھے کب ہنستے ہوئے دیکھ لیا۔'' کومل نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''جب تم اسکول جایا کرتی تھیں۔ اسکول سے واپسی پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنستی مسکراتی میری دکان کے سامنے

WaqarAzeem www.pakistanipoint.com

سے گزرتی تھیں۔'' میں نے کہا۔

میرے اس انکشاف پر وہ چونکی۔ ''اچھا تم مجھے اسکول کے دور میں بھی دیکھا کرتے تھے۔ لڑکیوں کو اس طرح دیکھنا بری بات ہے۔''

''میں جان بوجھ کر تمہیں نہیں دیکھتا تھا بس اتفاق سے نظر پڑ جاتی تھی۔''

''اتفاق سے نظر پڑ جاتی تھی پھر ٹھیک ہے۔'' اس کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

کومل کی مسکراہٹ نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ میرے کردار سے مطمئن ہے اور وہ اپنا موبائل نمبر دے دے گی۔ کومل کا موبائل نمبر لے کر میں ایسے خوش ہو رہا تھا کہ جیسے میرا پرائز بونڈ کا نمبر قرعہ اندازی میں نکل آیا ہے۔ اس کا موبائل نمبر آ جانے پر میں نے بات کرنے کا وقت بھی طے کر لیا تھا کہ کس وقت اس سے بات کرنا مناسب رہے گا۔

رات کو کھانا کھا کر میں چھت پر چلا گیا۔ اس وقت گھڑی رات کے دس بجا رہی تھی۔ میں نے کومل کا نمبر ملایا۔

''ہیلو کون؟''

''میں جبران بات کر رہا ہوں۔''

''تم اپنا نام نہ بتاتے میں پھر بھی تمہاری آواز سے پہچان گئی تھی کہ مجھ سے مخاطب ہونے والا جبران ہے۔''

''کومل میرے اس نمبر کو کسی لڑکی کے نام سے محفوظ کر لینا۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''گھر والوں کی میرے نمبر پر نظر پڑنے پر وہ اس نمبر کو لڑکی کا سمجھیں۔''

''میں شادی شدہ ہوں گھر والے یہ نمبر دیکھ کر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ میں نے دکان سے سامان منگوانے کو موبائل میں محفوظ کیا ہے۔''

''ہاں یہ بات بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

کومل سے اس طرح بات چیت کرنے کا سلسلہ چل نکلا۔ میں فوراً سے اصل موضوع پر نہیں آنا چاہتا تھا۔ موبائل پر کومل سے بے تکلفی چاہتا تھا تاکہ وہ مجھ پر بھروسا کر کے اپنی اداسی کا سبب بتا دے۔

وہ کبھی کوئی سامان منگوانے کے بہانے بات کر لیتی تھی۔ کبھی فرصت ہونے پر بھی بات کر لیتی تھی۔ اس سے دوران گفتگو میں کوئی دلچسپ لطیفہ یا کوئی ایسی بات کہتا جس کو سن کر بے ساختہ ہنسی نکل جائے۔ میری اس حرکت پر کومل حیران بھی ہوتی تھی، وہ کہتی۔

''جبران میں تم کو بہت سنجیدہ اور بور قسم کا لڑکا سمجھتی تھی۔''

''کیا واقعی؟'' میں نے کہا۔

''تم دکان پر آنے والی لڑکیوں اور عورتوں کو زیادہ فری نہیں کرتے تھے نا اس لیے میں نے تمہارے بارے میں یہ رائے رکھی ہوئی تھی۔'' کومل نے کہا۔

''ہر لڑکی یا عورت خاص نہیں ہوتی اس لیے میں ان سے زیادہ فری نہیں ہوتا۔''

''اس کا مطلب ہے میں خاص ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں تم یہ کہہ سکتی ہو۔'' میں نے کہا۔

''یعنی میں خاص نہیں ہوں۔''

''یہ میں نے کب کہا کہ تم خاص نہیں ہو، تم خاص ہو جبھی میں تم سے باتیں کرتا ہوں۔ تمہیں لطیفے سناتا ہوں۔''

''اگر میں خاص نہ ہوتی تو.....''

''تو میں کسی خاص لڑکی کو تلاش کرتا۔'' میں نے کہا۔

''میرے مل جانے پر تم کسی لڑکی کو تلاش کرنے سے بچ گئے ہو۔'' وہ زور سے ہنسی۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ میں محنت و مشقت کرنے سے بچ گیا ہوں، ورنہ دکان میں پھنس جانے پر کسی کے پاس وقت ہوتا ہی کہاں ہے، رات میں پڑھتا ہوں۔''

''اچھا کیا تم نے تعلیم سے رشتہ نہیں توڑا ہے۔''

''ہاں اس دور میں تعلیم حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ میٹرک کر کے میں نے پرائیویٹ طور پر تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہر دور میں ہی تعلیم لڑکے اور لڑکی دونوں کے لیے بہت ضروری رہی ہے۔'' کومل نے کہا۔

''تم نے تعلیم حاصل کی آج وہ کام آ رہی ہے صبح بچوں کو اسکول پڑھانے جاتی ہو، شام میں گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہو۔''

''اگر یہ مصروفیت نہ ہو تو میں گھر میں بور ہو جاؤں۔''

''تمہارے شوہر شاہد سے کشیدہ تعلقات میں کوئی کمی آئی۔''

''وہ طلاق دے دے پھر اس سے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں۔''

''ہر عورت چاہتی ہے کہ اس کا گھر بسا رہے اور ایک تم

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ہو کہ طلاق مانگ رہی ہو۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟''

''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میرے چہرے پر کرب اور اداسی ساری زندگی رہے۔''

''میں کبھی ایسا نہیں چاہوں گا تم ہر وقت خوش رہو یہی میری آرزو ہے۔''

''جبران، میری شادی ہونے کا مجھے سہاگن بننے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

''کیا تمہارا شوہر گرم مزاج ہے۔''

''شاہد کے گرم مزاج ہونے پر میں اسے برداشت کر لیتی۔ وہ میرا شوہر تھا ہی کب۔''

''شوہر نہیں تھا۔''

''ہاں میں یہ سچ کہہ رہی ہوں، وہ کسی اور کا تھا، میرا نہیں تھا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

''میرے والدین نے شاہد کی اچھی نوکری دیکھی اور ہاں کردی تھی۔ اس وقت میں بیس سال کی تھی اور شاہد چالیس سال کا۔ بالکل بے جوڑ رشتہ تھا۔ کہتے کہتے اس نے آنکھوں پر ہتھیلی رکھی اور سسکنے لگی پھر بولی۔ ''میں یہ سب باتیں تم کو نہ بتاتی لیکن تم اچھے انسان ہو۔ مجھ سے ہمدردی رکھتے ہو۔''

''کیا میں اچھا انسان ہوں۔'' میں اس کی بات پر چونکا۔

''ہاں تم اچھے انسان ہو، مجھے اداس دیکھ کر تمہارا پریشان ہو جانا۔'' میرے دکھ کو جاننے کو بے چین ہو جانا۔ یقین کرو میں اندر سے بہت دکھی ہوں لیکن اپنا دکھ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی۔ میں نے شاہد کے گھر میں ہوتے ہوئے بھی راتیں انگاروں پر گزاری ہیں۔''

''انگاروں پر راتیں گزاری ہیں۔'' میں چونکا۔

''ہاں میں رات کو بستر پر اکیلی ہوتی تھی اور میرا شوہر کسی اور کی باہوں میں پناہ ڈھونڈ رہا ہوتا۔''

''تمہارے سسرال والوں نے اسے ایسا کرنے سے روکا نہیں۔''

''کون روکتا، ساس، سسر کا انتقال ہو چکا تھا۔ جیٹھ قاسم سعودی عرب میں ملازمت کرتا ہے۔ وہ سال میں کبھی دو سال میں ایک ہفتے کے لیے آتا ہے، ایک ہفتہ گزار کر واپس سعودی عرب چلا جاتا ہے۔''

''تمہارا جیٹھ کیسا شوہر ہے، جو اپنی بیوی بچوں سے دور رہتا ہے۔ وہ ان کو سعودی عرب کیوں نہیں بلا لیتا۔'' میں نے کہا۔

''اس کی صرف بیوی ہے، بچے نہیں ہیں دراصل میری جٹھانی صائمہ بانجھ ہے میرے جیٹھ قاسم کو یہی دکھ ہے۔ اس نے وہاں دوسری شادی کر لی ہے، اور دوسری بیوی سے اس کے بچے بھی ہیں۔ پاکستان میں وہ رسمی طور پر آتا ہے تاکہ لوگ اسے طعنے نہ دیں کہ وہ کیسا شوہر ہے جو اپنی بیوی سے سال میں ایک بار بھی ملنے نہیں آتا۔''

''یہ تمہاری جٹھانی کے ساتھ بڑا ظلم ہے۔''

''ہاں ظلم ہے جبھی اس نے تنہائی کا ساتھی کہیں باہر تلاش کرنے کی بجائے گھر میں ہی ڈھونڈ لیا ہے۔''

''تمہارے کہنے کا مقصد ہے اس نے اپنے دیور کے ساتھ تعلقات بنا لیے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بالکل یہی بات ہے۔''

''پھر اس نے اپنے دیور شاہد کی شادی کیوں کرائی۔''

''میرا شوہر اپنی بھابی کا دیوانہ ہے۔ وہ کبھی بھی مجھ سے شادی کو تیار نہ ہوتا۔ جب چالیس کا ہو جانے پر انگلیاں اٹھنے لگیں تو بھابی نے لوگوں کی زبانیں بند کرانے کا فیصلہ کیا اور میرے شوہر کو شادی کرنے پر آمادہ کر لیا۔ مجھ سے شادی ہو جانے پر بھی وہ اپنی بھابی کو ایسے چاہتا تھا جیسے شادی سے پہلے چاہتا تھا۔''

''جب وہ تمہارے پاس نہیں آتا تھا پھر تمہاری بچی کرن کیسے پیدا ہوئی۔'' میں نے کہا۔

''ایک رات نہ جانے اس کے اندر کا بھیڑیا کیسے بیدار ہو گیا اور میں ایک بچی کی ماں بن گئی۔ یہ بھی اس کی مہربانی تھی ورنہ میں جٹھانی کی طرح بانجھ مشہور ہو جاتی۔''

''تم نے اپنے گھر والوں سے شوہر کی شکایت نہیں کی، میرا مطلب ہے اپنی والدہ سے۔''

''کی تھی۔''

''پھر ان کا کیا رویہ رہا۔''

''میرے شکایت کرنے پر امی جان نے پہلے اپنا سر تھام لیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹی یہ مرد ذات بڑی بے وفا ہوتی ہے۔ ان کو گھر میں پکے کھانے پر بھی ہوٹل کے کھانے کا شوق ہمیشہ رہتا ہے۔ بہت کم شوہر ہوتے ہیں جو ایسا نہیں کرتے، تمہارا شوہر ایک دن ضرور راہ راست پر آ جائے گا۔ تم بس ہمت و حوصلے سے کام لینا۔''

میں نے بہت صبر کیا لیکن چند سال ساتھ گزارنے پر بھی وہ راہ راست پر آنے کو تیار نہ تھا۔ جب بات برداشت

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

سے باہر ہوگئی تو میں پھٹ پڑی۔

''میں تمہاری بیوی ہوں گھر کی ماسی بن کر نہیں آئی ہوں جو تم میرے ساتھ ایسا سلوک کررہے ہو۔''

''تمہارے ساتھ اس گھر میں اتنا اچھا سلوک کیا جارہا ہے پھر بھی تمہیں شکایت ہے۔''

''کوئی بیوی یہ برداشت نہیں کرے گی کہ اس کا شوہر کسی دوسری عورت سے منہ کالا کرے۔''

''زبان سنبھال کر بات کرو، آج تم نے یہ کہہ دیا، آیندہ مت کہنا۔''

''کیوں نہ کہوں، تم میرے شوہر ہو کر بھی میرے نہیں ہو۔''

''تم سے شادی کرنے میں میری کوئی رضا مندی شامل نہیں تھی پھر بھی بھابی نے یہ رشتہ کرادیا ہے۔''

''جب شادی کرلی ہے، پھر اس رشتے کو نبھاؤ۔''

''میں رشتہ نبھا ہی رہا ہوں جبھی تم اس گھر میں ہو ورنہ کب کا تمہیں چلتا کردیتا۔''

وہ کسی صورت مجھے بیوی کا درجہ دینے کو تیار نہ تھا۔ میں نے جب اسے دھمکی دی کہ اس کا راز فاش کردوں گی تو وہ مجھ پر تشدد کرنے لگا پھر ایک دن نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ مجھے مار پیٹ کر یہاں چھوڑ گیا، جب سے میں میکے میں رہ رہی ہوں۔''

''اس نے تمہیں دوبارہ لے جانے کی کوشش نہیں کی۔''

''ہاں اسے یہ خوف لاحق ہے کہ کہیں اس کا راز نہ کھل جائے اس لیے وہ مجھے گھر لے جانے کو آیا مگر میں نے شرط عائد کردی کہ میں اس گھر میں نہیں جاؤں گی جہاں میرے ارمانوں کا خون ہوتا ہے۔ دوسرے گھر میں رکھنے پر میں تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں۔'' لیکن وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔

قطعی تیار نہ ہوا کہ بھابی کو چھوڑ کر کسی دوسرے گھر میں رہے اس لیے میں آج تک میکے میں ہوں۔''

''تم نے اب کیا سوچا ہے؟''

''وہ ڈھیٹ ہے مجھے چھوڑ سکتا ہے لیکن بھابی کو نہیں، اس لیے میرے لیے یہی بہتر ہے کہ خلع لے لوں۔'' اس نے بتایا۔

وہ واقعی مظلوم تھی۔ یہ کتنے دکھ اور افسوس کی بات تھی کہ اسے طلاق دیا نہیں گیا، اس نے خلع لیا تھا۔

کومل کو کورٹ سے خلع ہوجانے پر وہ اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتی تھی۔ ہمسفر کا انتخاب کرسکتی تھی۔ موبائل کی سہولت نے ہم دونوں کو قریب کردیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ محبت کے بندھن میں بندھ چکے تھے اور شادی کرکے ایک ہوجانا چاہتے تھے لیکن شادی کے لیے والدین کی رضا مندی ضروری تھی۔ کومل کے والدین کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ اور علاقے کے لوگ مجھے انکل کا بھتیجا سمجھتے تھے اور میرے کردار سے بھی واقف تھے۔ اس لیے اعتراض کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔

مجھے اپنے والدین کو تیار کرنا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے مجھے امی جان سے بات کرنا تھی۔ ایک دن موقع دیکھ کر میں نے امی جان سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''امی جان میں کچھ دن سے ایک بات کہنا چاہ رہا ہوں۔''

''ہاں بولو بیٹے کیا بات ہے؟'' امی جان نے کہا۔

''سمجھ میں نہیں آرہا ہے کس طرح بات کروں۔''

''جس طرح بات کی جاتی ہے۔'' امی جان نے کہا۔

''امی آپ کامران کو جانتی ہیں؟''

''کون کامران۔''

''جس محلے میں ہماری دکان ہے اسی محلے میں رہتے ہیں۔''

''اچھا اچھا وہ تو نہیں جس کی بیٹی کو طلاق ہوچکی ہے۔'' امی جان نے کہا۔

''ناز یہ بتا رہی تھی کہ وہ بہت خوبصورت ہے۔''

''ہاں میں اسی کومل کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا اس کا کوئی رشتہ آیا ہے؟'' امی جان نے پوچھا۔

''ہاں اس کے لیے ایک بہت ہی اچھا رشتہ آگیا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''امی جان یہ نہیں پوچھیں گی کہ اس سے شادی کرنے پر کون تیار ہوگیا ہے۔''

''کسی رنڈوے کا ہی رشتہ آیا ہوگا۔'' امی جان نے پالک کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت سبزی کا سالن تیار کرنے کی تیاری کررہی تھیں۔

''امی جان یہ کیسی بات کہہ رہی ہیں۔'' میں بری طرح چونکا۔

Anwar Azeem www.pakistanipoint.com

''جن لڑکیوں کی جوانی میں طلاق یا ان کے خاوند کا انتقال ہو جائے پھر ان کے لیے کسی رنڈوے کا ہی رشتہ آتا ہے۔ کوئی کنوارا ان سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔'' امی جان نے کہا۔

''امی جان اس سے جو شادی کرنے کو تیار ہوا ہے، وہ کنوارا ہے۔''

''ان کا کوئی عزیز ہوگا، کومل پر ترس کھا کر شادی کرنا چاہ رہا ہوگا۔''

''امی جان یہ پوچھو اس سے کون شادی کو تیار ہوا ہے۔''

''کون تیار ہوا ہے؟'' امی جان نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''میں، میں اس سے کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا فضول کی بکواس کر رہا ہے۔'' امی جان نے غصے سے مجھے دیکھا۔ ''ایسی اول فول زبان سے مت نکالو۔''

''امی جان مجھے کومل کی طلاق کا بہت دکھ ہے۔''

''دکھ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے شادی کر لی جائے۔''

''امی جان میں نے کومل سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''میری ایک بات کان کھول کر سن لو، کومل سے ہمدردی تک بات صحیح ہے لیکن اس سے شادی کا سوچنا بھی نہیں، تمہاری شادی وہاں ہوگی جہاں ہم چاہیں گے۔''

''زندگی مجھے گزارنی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ زندگی بہتر گزرے اس کے لیے کومل سے بڑھ کر کوئی اچھی لڑکی نہیں ہو سکتی۔''

''وہ لڑکی نہیں، عورت ہے اور ایک بچی کی ماں ہے۔''

''میں یہ بات جانتا ہوں، اس لیے ہمدردی کرتے ہوئے اس سے شادی کو تیار ہوا ہوں۔''

''تم ہی کیوں، کوئی اور کیوں نہیں، سچ سچ بتا دو کیا چکر ہے، کہیں اس نے تمہیں پیار کے چکر میں پھنسا تو نہیں لیا؟'' امی جان نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''امی یہ حقیقت ہے، اس نے نہیں، میں نے اسے پیار کے جال میں پھنسایا ہے۔''

''یہ گڑیا اور گڈے کا کھیل نہیں ہے، ہم اپنی زندگی گزار چکے اور تمہیں ایک طویل زندگی گزارنی ہے، اس لیے شادی کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا۔''

''امی، میری بات کا یقین کریں، میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔''

''تمہارا یہ فیصلہ مجھے کیا اس گھر میں کسی کو بھی پسند نہیں آئے گا۔''

''کیوں؟''

''وہ ایک طلاق یافتہ ہے، تمہیں کیا پتا کہ اسے طلاق کیوں ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا چال چلن اچھا نہ ہو اس لیے شوہر نے طلاق دی ہو۔''

''نہیں امی، وہ بہت شریف ہے میں اس کی گواہی دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا تم شادی سے پہلے اور شادی کے بعد اس کے ساتھ ساتھ رہے ہو جو اس کی گواہی دینے کو تیار ہو گئے ہو؟''

''امی میں کیسے یقین دلاؤں کہ وہ.....''

''بس، بس مجھے یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں نے جب ایک دفعہ کہہ دیا کہ تمہاری شادی اس طلاق یافتہ سے نہیں ہو سکتی پھر نہیں ہو سکتی، ویسے بھی تمہاری ابھی پڑھنے کی عمر ہے۔ اپنی تعلیم مکمل کرو پھر شادی کے متعلق سوچیں گے۔'' امی جان کو جیسے جلال آ گیا تھا۔ انہیں اس قدر غصے میں دیکھ کر اپنی خیریت اسی میں جانی کہ فی الحال اس موضوع پر گفتگو نہ کی جائے۔ میں فوراً ہی گھر سے باہر نکل گیا تاکہ جب میری واپسی ہو وہ سو چکی ہوں۔

گھر سے نکل کر میں محلے کے ہوٹل میں گیا اور بیرے کو ایک کپ چائے کا آرڈر دیا پھر سوچ میں گم ہو گیا۔ امی سے بات چیت کر کے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے حل نہیں ہوگا۔ گھر میں ابا کی نہیں چلتی، سارا حکم امی کا چلتا تھا اس لیے کومل سے شادی کے لیے امی کو راضی کرنا ضروری تھا ورنہ یہ رشتہ ہونا ممکن نہ تھا۔

بیرا چائے کا کپ دے کر چلا گیا تھا۔ میں بظاہر چائے کے گھونٹ لے رہا تھا لیکن ذہن اسی طرف تھا۔ اچانک مجھے اپنے بہنوئی کا خیال آیا۔ میرے بہنوئی اختر بہت ذہین تھے۔ بڑے، بڑے معاملات کو منٹوں میں سلجھا دیتے تھے اسی لیے خاندان سمیت پوری برادری میں ان کی بڑی عزت تھی۔ وہ میرا یہ مسئلہ آسانی سے حل کر سکتے تھے۔ امی اور ابو ضرور ان کی بات رکھیں گے، یہ خیال آتے ہی میں ان کے پاس چلا گیا۔ جب میں نے ان کو پوری بات بتائی تو وہ گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ''جبران تمہیں اپنی تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیے۔''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''میں تعلیم کی طرف سے بالکل بھی غافل نہیں ہوں میری تعلیمی اسناد اس بات کی گواہ ہیں کہ میں کتنی محنت کر رہا ہوں۔''

''شادی کے چکر میں پڑ کر تم اپنی تعلیم پر بھرپور توجہ نہ دے پاؤ گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں شادی سے میری تعلیم پر کچھ فرق نہیں پڑے گا۔''

''جبران تم مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہو، تمہیں زندگی کو پرکھنے کا کچھ بھی تجربہ نہیں ہے۔''

''عمر بڑھنے پر تجربے میں اضافہ ہو جائے گا۔''

''جبران تمہاری اور کومل کی مثال میں اس طرح دے سکتا ہوں کہ جیسے فرض کرو تم کسی دوسرے شہر میں جاتے ہو۔ اپنے شہر کی گلیاں راستے تم جانتے ہو لیکن دوسرے شہر کے راستوں سے واقف نہیں ہوتے۔ اسی طرح کومل کی مثال ہے، وہ شادی شدہ تھی اس لیے... شوہر کے متعلق بھی کچھ جانتی ہے۔ کنواری ہونے پر تم میں کوئی کمزوری ہونے پر بھی گزارا کر لیتی... کیونکہ اسے کچھ پتا ہی نہیں ہوتا۔''

وہ اور بھی کچھ کہہ رہے تھے لیکن اس وقت میری سمجھ میں ان کا فلسفہ نہیں آ رہا تھا۔ میں جو چاہ رہا تھا وہ بھی اس بات کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی بھی امی جیسی خواہش ہے کہ میری شادی کنواری سے ہو اس لیے میں خاموشی سے اٹھ کر چلا آیا۔ وہ مجھے روکتے ہی رہ گئے۔

میں کسی صورت کومل کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو اتنا چاہنے لگے تھے کہ دوری برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ میرا ذہن مسلسل اس بات میں گم تھا کہ کسی بھی طرح نکاح ہو جائے۔ سوچتے سوچتے مجھے انکل دانش کا خیال آ گیا۔ وہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے تھے۔ ابا جان ان کی بات مان لیا کرتے تھے۔ انکل دانش تیار ہو جائیں تو میرا مسئلہ حل ہونا یقینی تھا۔ گھر میں امی کا ہی حکم چلتا تھا لیکن کسی بات پر ابا جان اڑ جائیں پھر وہ بات امی کو مان لینی پڑتی تھی۔ اگر انکل دانش نے ابا کو قائل کر لیا تو پھر امی بھی کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ خیال آتے ہی میں کچھ مطمئن سا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''انکل میں ایک ضروری بات کرنا چاہ رہا ہوں، مگر ہمت نہیں کر پا رہا ہوں۔'' میں نے دکان میں موقع دیکھ کر انکل سے بات کی۔

''بولو کیا بات ہے، کیا پیسوں کی ضرورت ہے۔'' انکل نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''پیسوں کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر کون سی بات ہے۔''

''انکل مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔''

''کیا کسی سے محبت ہو گئی ہے۔'' انکل بے ساختہ ہنس دیے۔

''ہاں انکل لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''جبران بیٹے یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے، مجھے بھی تمہاری چاچی سے محبت ہو گئی تھی اور تب میں تمہاری ہی عمر کا تھا۔''

''انکل میں اسی لیے بات کرنا چاہ رہا تھا۔''

''جس لڑکی سے تم پیار کر رہے ہو گھر والے اس سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہوں گے۔''

''ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

''میرے گھر والے بھی تمہاری چاچی سے شادی کرنا نہیں چاہتے تھے۔''

''پھر یہ رشتہ کیسے طے پایا۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''میں نے جب ضد کی تو وہ اس رشتے پر تیار ہو گئے۔''

''اس کا مطلب ہے مجھے بھی ضد کرنا پڑے گی۔''

''ہاں بھئی کچھ معاملات زندگی کے ایسے ہوتے ہیں جو ضد کرنے سے حل ہوتے ہیں۔''

''میرا معاملہ ایسا ہے کہ بغیر ضد کے حل ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''اگر ابا جان کو تیار کر لیں۔''

''تمہارا ابا اس معاملے میں ڈٹا ہوا ہے۔''

''نہیں امی۔''

''پھر ان کو تیار کرنا ہو گا۔''

''ابا کو کسی طرح اس رشتے پر تیار کر لیا جائے پھر امی کچھ نہیں کہیں گی۔'' میں نے کہا۔

''میں سمجھ گیا تم یہ چاہ رہے ہو کہ میں تمہارے ابا احتشام کو اس رشتے کے لیے تیار کر لوں۔''

''ہاں۔''

''جبران بیٹے تم نے پیار کیا ہے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں تمہارے ابا سے ضرور بات کروں گا اور ان کو رشتے کے لیے قائل کروں گا۔''

www.pakistanipoint.com

''انکل [illegible] بہت بڑا احسان ہوگا۔''

''احسان کیا، دو پیار کرنے والوں کو ملا دینا بھی ثواب کا کام ہے، ویسے یہ تو بتاؤ وہ لڑکی ہے کون؟''

''وہ انکل کامران کی بیٹی ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کامران کی ایک ہی بیٹی تھی جس کی شادی ہوچکی ہے۔''

''ہاں کومل کی شادی ہوئی تھی مگر طلاق ہوگئی۔''

''اس کے طلاق ہوجانے کی مجھے خبر ہے، کیا تم اس طلاق یافتہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' انکل میری بات سن کر فکرمند سے ہوگئے۔

''انکل میں کومل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔'' میں نے کہا۔

''جس عمر سے تم گزر رہے ہو، میں گزر چکا ہوں، یہ عمر ہی جذباتی پن میں گزرنے والی ہوتی ہے۔''

''جذبات میں کیا اچھے فیصلے نہیں ہوتے۔'' میں نے کہا۔

''بعض خراب بھی ہوجاتے ہیں۔ تمہارے والدین کو دو باتوں پر اعتراض ہوگا کہ وہ طلاق یافتہ اور ایک عدد بچی کی ماں ہے۔''

''انکل میں کومل کی بیٹی کو اپنی حقیقی بیٹی سمجھوں گا، کبھی بھی اسے باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔''

''جبران بیٹے، اچھی طرح سوچ لو کہیں ایسا نہ ہو تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے۔''

''میں نے بہت سوچ اور سمجھ کر کومل سے شادی کرنے کا ارادہ کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

میری بات پر انکل خاموش ہوگئے۔ ان کے خاموش ہوجانے پر میں بھی خاموش ہوگیا۔

چند دن گزر گئے۔ انکل سے میری اس موضوع پر پھر کوئی بات نہ ہوئی لیکن ایک دن وہ خود ہی مجھ سے بولے۔

''تیرے ابا سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ کومل سے رشتہ کرنے کو بالکل بھی تیار نہیں ہیں۔ انہیں پہلا اعتراض کومل کے طلاق یافتہ ہونے پر اور دوسرا اس کی بچی پر ہے۔''

''انکل کسی عورت کا طلاق یافتہ ہونا یا ایک بچی کی ماں ہونا جرم ہے؟''

''جرم بالکل نہیں ہے۔''

''پھر میرے والدین اس رشتے پر تیار کیوں نہیں ہیں۔''

''تم ابھی نوجوان ہو، پانچ، سات سال بھی شادی نہ کرو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سات سال گزرنے پر بھی تم خاندان کی جس کنواری لڑکی کی طرف اشارہ کرو گے گھر والے اس سے تمہاری شادی کرنے کو تیار ہوجائیں گے۔''

''دوسری ہی کیوں کومل میں کیا خرابی ہے۔''

''جب کسی لڑکی پر طلاق کا داغ لگ جائے، ہر کسی کی انگلی اس پر اٹھنے لگتی ہے۔ طرح طرح کی باتیں لوگ بناتے ہیں کہ لڑکی میں ضرور کوئی خرابی تھی اسی لیے طلاق ہوئی ہے۔''

''میں کومل پر لگے داغ کو دھونا چاہتا ہوں، میں لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر طلاق یافتہ لڑکی میں عیب ہو۔''

''جبران بیٹے یہ سب کتابی باتیں ہیں، کتابوں میں اچھی لگتی ہیں۔ زندگی تلخ تجربات کا نام ہے۔ ہم وہ کچھ دیکھ لیتے ہیں جس کا تصور بھی نہیں کرتے۔''

''اس کا مطلب ہے میں یہ سمجھوں کہ آپ بھی میرا ساتھ دینے کو تیار نہیں۔''

''میں بھرپور طریقے سے ساتھ ہوں جو تم بولو گے میں کرنے کو تیار ہوں مگر جس رشتے میں والدین کی مرضی شامل نہ ہو وہ کسی لحاظ سے بھی اچھا نہیں ہوتا۔'' انکل نے کہا۔

''کومل کے والدین کی مرضی سے اس کی شادی ہوئی لیکن دیکھ لیں اس پر طلاق کا داغ لگ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

انکل دانش میری بات پر لاجواب ہوگئے تھے اس لیے خاموشی اختیار کرلی۔ وہ اپنے اولاد کے نہ ہونے پر مجھے ہی اپنا بیٹا تصور کرتے تھے۔ مجھے اتنا اندازہ ہوگیا تھا میرے اصرار پر وہ کچھ نہ کچھ کردیں گے جو میرے حق میں ہوگا۔ میری کوشش رنگ لائی اور وہ مجھ سے ایک دن کہنے لگے۔

''جبران بیٹے تم جس کام کو آسان سمجھ رہے ہو وہ اتنا آسان نہیں ہے۔''

''اسی لیے میں نے اس کام کے لیے آپ کا انتخاب کیا۔''

''تمہاری خوشی کی خاطر مجھے جھوٹ بولنا پڑے گا جبھی یہ کام ہوسکتا ہے۔''

''جھوٹ...... کیسا جھوٹ۔''

''کامران میاں کو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ تم میرے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

مرحوم بھائی کے بیٹے ہو اور میرے پاس رہتے ہو۔ نکاح ہوجانے پر تم کامران کو اصل حقیقت بتا دینا کہ والدین اس رشتے کو تیار نہ تھے اس لیے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔'' انکل دانش نے کہا۔

''انکل کامران کو میرے والدین کے بارے میں علم ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''ان سے اس موضوع پر کبھی بات نہیں ہوئی، وہ مجھے تمہارے بارے میں یہی کہتے ہیں کہ تمہارا بھتیجا نظر نہیں آرہا ہے جس پر میں ان سے کہہ دیتا تھا کہ کام سے گیا ہے۔''

''ہم دوسرے علاقے میں رہتے ہیں اس لیے یہاں کے لوگوں کو میرے والدین کے بارے میں پتا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے والدین کے بارے میں ایک نہ ایک دن بتانا پڑے گا اس لیے وقتی طور پر یہ بات چھپا لیتے ہیں۔ نکاح ہوجائے پھر دیکھا جائے گا۔ یہ بھی احتیاط کے طور پر کہہ رہا ہوں۔''

''میں سمجھ رہا ہوں انکل، مجبوراً ہمیں کرنا پڑے گا ورنہ وہ لوگ اس بات پر اصرار کریں گے کہ نکاح کے وقت گھر والوں کو بھی لے کر آؤ تاکہ ان کی بیٹی کو تحفظ حاصل رہے۔''

''پوزیشن ایسی ہے کہ وہ کسی صورت نکاح کے وقت نہیں آئیں گے۔''

''جی ہاں، گھر کا کوئی بھی فرد اس رشتے پر تیار نہیں ہے۔ صاف کہہ دیا ہے کہ کومل سے رشتہ ہونے پر اپنے رہنے کا بندوبست بھی نہیں اور کرلینا۔'' میں نے بتایا۔

''یہ وقتی غصہ ہوتا ہے۔ جذبات میں آکر گھر والے ضرور کہہ دیتے ہیں مگر کچھ وقت گزرنے پر غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے اور گھر والے بلا لیتے ہیں۔''

''انکل میں سمجھ لوں کہ کومل سے میری بات پکی ہونے والی ہے۔''

''میری بات ذہن میں رکھنا میں تمہیں اپنے مرحوم بھائی کا بیٹا ظاہر کروں گا۔''

''کومل کو پانے کے لیے ہر شرط مجھے منظور ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں آج ہی کامران سے تمہارے لیے بات کرتا ہوں۔'' انکل دانش نے کہا۔

انکل دانش کے ساتھ دینے پر کومل سے میرا رشتہ طے پا گیا۔ میں اس رشتے پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ نکاح کی رسم سادگی سے کی جانی تھی میں خود بھی یہ چاہ رہا تھا کہ جب تک نکاح نہ ہوجائے ہمارے علاقے کے کسی شخص کو خبر نہ ہو۔ ممکن ہے یہ کام بگڑ جائے۔ میں نے اپنے چند دوستوں کو نکاح میں شریک ہونے کی دعوت دے دی تھی۔ ان دوستوں میں فاروق بھی شامل تھا وہ ان دنوں حیدر آباد میں کام کرنے کی غرض سے رہ رہا تھا۔

قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی جس کام کو میں مشکل سمجھ رہا تھا وہ انکل دانش کی مہربانی سے آسان ہوگیا تھا۔ انکل دانش نے مجھے کہہ دیا تھا کہ جب تک گھر والے مجھے نہ بلائیں میں ان کے گھر میں کومل کے ساتھ رہوں گا۔

میں والدین سے کٹ کر رہنا نہیں چاہتا تھا اس لیے وقتی طور پر ان کی ناراضگی دور ہونے تک انکل دانش کے گھر رہنا منظور کرلیا تھا۔ یہ میری زندگی کی سب سے اہم تقریب تھی اور میں کسی کو شریک نہیں کرسکتا۔ کراچی میں رہ رہے لوگوں کو بتا نہیں سکتا اور دل تھا کہ مسلسل کہے جا رہا تھا سب کو شریک کراؤں، کافی غور وفکر کے بعد ایک نام سمجھ میں آیا۔ عارف میرے بچپن کا دوست اور کراچی میں رہتا بھی نہیں تھا۔ اس لیے اسے بلانے کا سوچ لیا۔

نکاح کی تقریب میں تین دن باقی تھے۔ فاروق حیدر آباد سے میرے پاس پہنچ گیا اسے دیکھ کر دل کو خوشی ہوئی کہ وہ میرے نکاح کی تقریب میں شرکت کی غرض سے آیا ہے۔ اس وقت دوپہر ہونے کی وجہ سے دکان پر کوئی گاہک نہ تھا وہ مجھ سے بے تکلفی سے ملا۔

''یار سنا ہے کہ تمہاری شادی ہورہی ہے وہ بھی ایک طلاق یافتہ سے۔'' فاروق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں اس کے طنز کو برداشت کرگیا۔ طنز کرنا اس کی پرانی عادت تھی۔

''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے اسی لیے میں نے نکاح میں شریک ہونے کی دعوت دی ہے تاکہ تم اس تقریب سے محروم نہ ہو۔'' میں نے کہا۔

فاروق مجھ سے بچپن ہی سے جیلس رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر کھیل میں اس سے میں سبقت لے جاتا تھا۔ جب بھی ہم کرکٹ یا فٹبال اور دیگر کھیل کھیلتے تھے۔ فاروق کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ مجھے کسی طرح شکست دے دے لیکن وہ اس کوشش میں کبھی کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ فاروق پورے محلے میں فسادی کے نام سے مشہور تھا۔ دو دوستوں کو آپس میں لڑانے اور ایک دوسرے کے خلاف کان بھرنے کا بہت شوق

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

تھا۔ فاروق کی اس حرکت کی وجہ سے اس کے دوست تبدیل ہوتے رہتے تھے۔
فاروق اب چھوٹا بچہ نہیں تھا جوان ہوگیا تھا اور حیدرآباد میں ایک آفس میں ملازمت کررہا تھا۔ وقت کے ساتھ تو اس میں بردباری آگئی ہوگی یہ سوچ کر ہی میں نے اسے شادی کی دعوت دی تھی۔
''یار یہ کیسی تمہاری شادی ہورہی ہے، لگ ہی نہیں رہا کہ شادی ہورہی ہے۔''
''یہ بات تم کیسے کہہ رہے ہو۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''جس گھر میں شادی ہو وہاں شور، شرابہ، مہمانوں کی آمد، گانے بجانے ہوتے ہیں۔ تمہارے گھر میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔''
''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو، واقعی ایسا کچھ نہیں ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔
''کیوں؟''
''گھر والے اس رشتے کو تیار نہیں ہیں۔''
''پھر یہ شادی کیسے ہوگی اور اس شادی کے لیے کیوں تیار نہیں ہیں۔''
''گھر والوں کی خواہش ہے میں فی الحال تعلیم حاصل کروں اور تعلیم مکمل ہونے پر کسی کنواری لڑکی سے شادی کروں۔''
''بات ان کی بالکل درست ہے۔ تمہیں تعلیم مکمل کرنی چاہیے پھر شادی کے متعلق سوچنا چاہیے۔'' فاروق نے کہا۔
''جب تک کومل کی شادی کسی اور سے ہوجائے گی۔'' میں نے کہا۔
''اچھا یہ بات ہے، کیا ہماری بھابی بہت خوبصورت ہے۔'' فاروق نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔
''وہ بہت خوبصورت اور نیک سیرت بھی ہے۔''
''یہ بڑی اچھی بات ہے، عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جو خوبصورت ہو وہ بہت مغرور ہوتی ہے۔''
''سچی بات پوچھو تو میں نے نیکی کی غرض سے نکاح کرنے کا سوچا ہے۔ جب اس کے قریب ہوا تو اندازہ ہوا اس کی سیرت بھی صورت کی طرح ہے۔'' میں نے کہا۔
''یہ محبت کی شادی ہے۔'' فاروق نے کہا۔
''ہاں واقعی یہ محبت کی شادی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''جب تمہارے گھر والے اس رشتے پر تیار نہیں پھر لڑکی والے کیسے تیار ہوگئے۔''
''یہ دکان دیکھ رہے ہو۔''
''دیکھ بھی رہا ہوں اور اس دکان میں بیٹھا بھی ہوں۔'' فاروق نے کہا۔
''وہ اس دکان اور میری شرافت کو دیکھ کر متاثر ہوئے ہیں۔''
''تمہاری شرافت کی میں بھی گواہی دے سکتا ہوں لیکن اس دکان سے تمہارا کیا تعلق یہ دکان تو انکل دانش کی ہے۔'' فاروق نے کہا۔
''میں بچپن سے اس دکان پر کام کررہا ہوں، لوگ یہی سمجھتے ہیں انکل دانش حقیقت میں میرے سگے انکل ہیں۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے اس لیے مجھے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ یہ تمہارا بیٹا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بھائی کا بیٹا بھی اپنا ہوتا ہے۔ انکل دانش کی مہربانی سے یہ رشتہ طے پاگیا ہے۔''
''وہ کیسے؟''
''گھر والے اس رشتے کو تیار نہ تھے انکل دانش نے ان کو سمجھایا لیکن وہ نہ مانے پھر انکل دانش نے کومل کے والد سے جھوٹ بولا کہ میں ان کے مرحوم بھائی کا بیٹا ہوں اور اس طرح رشتہ طے پاگیا۔''
''یار یہ دھوکا نہیں ہے، تم انکل دانش کے بیٹے بھی نہیں ہو اور بھتیجے بھی نہیں۔ اور انکل دانش نے تمہیں اپنے مرحوم بھائی کا بیٹا بنالیا ہے۔ جب انکل کامران کو اس بات کا پتا چلے گا تو ان پر کیا گزرے گی کہ تم دھوکے باز ہو۔''
''انکل دانش اور میرے درمیان یہ بات طے ہوئی ہے کہ نکاح ہوجائے پھر ہم سب کچھ انکل کامران اور ان کے گھر والوں کو بتادیں گے۔''
''تم اپنے سسر کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتے کہ یہ شادی نہیں ہوسکتی۔ دولھا دھوکے باز ہے۔'' فاروق نے زوردار قہقہہ لگایا۔
''ایک بار نکاح ہوجائے میں سب کچھ صاف صاف اپنے سسر کو بتادوں گا اور یہ بھی کہہ دوں گا کہ میں نے یہ جو کچھ کیا ہے مجبوری کی وجہ سے کیا ہے۔''
''تم بہت بڑا رسک لے رہے ہو، نکاح ہوجانے پر بھی بات بگڑ سکتی ہے، وہ اپنی بیٹی کو روک سکتے ہیں اور شرط لگا سکتے ہیں کہ پہلے اپنے والدین کو لے کر آؤ ہم ان سے بات

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کر کے لڑکی کو تمہارے ساتھ رخصت کریں گے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا انکل کامران اور ان کے گھر والے اچھے لوگ ہیں۔ رہی بات والدین کی وہ بھی آہستہ آہستہ نکاح ہو جانے پر کومل کو اپنی بہو تسلیم کر لیں گے۔''

''نکاح ہو جانے پر تم کومل کو کہاں رکھو گے۔''

''انکل دانش کے گھر پر رکھوں گا۔''

''وہ مان جائیں گے۔''

''انکل دانش نے ہی یہ آفر کی ہے۔'' میں نے بتایا۔

میری بات سن کر فاروق سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''تم نے بہت بے صبری کا مظاہرہ کیا ہے۔''

''تم سمجھ رہے ہو میں نے گھر والوں کو اس رشتے پر راضی نہیں کیا یعنی بھرپور کوشش نہیں کی۔'' میں نے کہا۔

''تم کو ڈٹ جانا چاہیے تھا پھر دیکھتے کہ کیسے وہ نہیں مانتے۔''

''میں نے اپنے بہنوئی تک سے بات کی تھی۔''

''وہ کیا بولے؟''

''ان کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔''

''پھر بھی وہ کیا بولے۔''

''وہ کہنے لگے جب تم کسی دوسرے شہر جاتے ہو وہاں کے راستے تمہیں معلوم نہیں ہوتے جو جیسا کہے گا تم اس پر عمل کر کے چلتے رہو گے۔ اس کے برعکس تم اپنے شہر کے راستوں سے خوب واقف ہو گے کوئی تمہیں راستہ بھٹکا نہیں سکتا۔'' میں نے بتایا۔

''اس بات میں کون سا فلسفہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔'' فاروق نے کہا۔

''بالکل ٹھیک میں نے ان سے یہی بات کی تھی۔''

''اچھا پھر کیا سمجھایا۔''

''میرے بہنوئی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ لڑکی کی مثال نئے شہر کی ہے اور اپنے شہر کی مثال شادی شدہ عورت کی ہے۔''

''اچھا میں سمجھ گیا، تمہارے بہنوئی نے بڑے کام کی بات کی ہے ان کو تمہاری مردانگی پر شک ہے، اسی لیے ایسی بات کر دی ہے۔'' فاروق نے زوردار قہقہہ لگایا۔

اس کا ایسے قہقہہ لگانا مجھے بہت برا لگا تھا لیکن میں برداشت کر گیا۔

''یہ وقت بتائے گا کہ مجھ میں کیا، کیا صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔'' میں نے بات ٹالنے کو کہا۔

''ہاں وقت آنے پر بہت بڑے بڑے راز افشا ہو جائیں گے۔'' فاروق نے کہا۔

دوسرے دن جب میں دکان پر پہنچا۔ انکل دانش کو سخت پریشان پایا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولے۔ ''یہ فاروق کون ہے؟''

''وہ میرے بچپن کا دوست ہے۔''

''دوست ہے یا دشمن ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے سب بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ہے۔''

''کھیل بگاڑ دیا۔'' میں چونکا۔

''ہاں بیٹے! فاروق نے کومل کے والد کامران کو سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''کیا!!'' مجھے ایک جھٹکا لگا۔

''رات تمہارے جانے پر وہ میرے پاس آئے تھے۔''

''وہ کیا بول رہے تھے۔''

''وہ کہنے لگے ہمیں نہیں پتا تھا جبران ہمارے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کرے گا، جو شادی سے پہلے اتنا بڑا فریب ہمیں دے اس سے مستقبل میں کیا اُمید رکھیں گے۔''

''تم نے ان کو سمجھایا نہیں کہ یہ سب ہم نے کیوں کیا ہے؟''

''میں نے ان کو بھرپور سمجھانے کی کوشش کی تھی وہ مجھ پر بگڑ گئے۔''

''کیوں؟''

''وہ کہنے لگے تم سے مجھے ایسی ہرگز اُمید نہ تھی کہ اس دھوکے میں جبران کا ساتھ دو گے۔ ان کے منہ میں جو آیا بکتے چلے گئے۔''

''میں فاروق کو اچھی طرح جانتا ہوں، اس نے خوب میرے خلاف الٹا سیدھا انکل کامران کو بھر دیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''برسوں سے میری ان کی نظروں میں عزت تھی وہ دھڑام سے گر گئی۔''

''تم فکر نہ کرو، میں جا کر بات کو سنبھال لوں گا۔''

''اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''وہ رشتے کی بات کو ختم کر کے چلے گئے ہیں۔''

''مم..... میں..... ان کو سمجھاؤں گا۔''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''میں نے بھی ان کو سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی مگر وہ نہ مانے تمہیں اور مجھے دھوکے باز اور جھوٹا کہتے رہے۔''

''انکل وہ کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے ان سے جھوٹ بولا ہے لیکن وہ مصلحتاً بولا تھا میں ان کو پوری بات سمجھاؤں گا۔ اس معاملے میں کومل بھی میرا ساتھ دے گی۔''

''وہ عورت ہے، مجبور ہے کومل اپنے والد کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائے گی۔''

''وہ مجھ سے سچی محبت کرتی ہے، میرے کہنے پر ضرور اپنے والد کو سمجھائے گی۔''

''تم کوشش کر کے دیکھ لو، شاید معاملہ بن جائے۔'' انکل دانش نے کہا۔

کومل سے شادی کا انکار سن کر میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا یہ سب کیوں ہو گیا ہے۔ مجھے ایک ہلکی سی اُمید تھی کہ شاید بات بن جائے۔ میں جب کومل کے گھر گیا۔ اس وقت گھر میں وہ اکیلی تھی۔ انکل اور آنٹی کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔

''انکل دکان پر گئے تھے۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' کومل نے کہا۔

''انکل، دانش سے کہہ کر آئے ہیں کہ ہماری رشتے کی بات ختم ہے۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔''

''تم نے ان کو سمجھایا نہیں۔''

''کیا سمجھاتی جب تم اپنے والدین کو قائل نہیں کر سکے پھر میں عورت ہو کر کیسے ان کو سمجھاتی۔''

''نکاح نہ ہونے پر لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔''

''یہ سب پہلے سوچنے کی باتیں تھیں اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میرے والد بھی ضدی ہیں۔ وہ کسی صورت اب نہیں مانیں گے۔'' کومل نے کہا۔

ہم دونوں میں ابھی بات چیت جاری تھی کہ انکل کامران اور پروین آنٹی گھر میں داخل ہوئے۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک لمحے کو چونکے اور پھر بولے۔ ''لگتا ہے تمہاری دانش میاں سے ملاقات نہیں ہوئی ہے؟''

''میں انکل دانش کے پاس سے ہی آ رہا ہوں۔''

''تو انہوں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا، پھر کیوں یہاں آئے ہو۔''

''میں یہ سمجھانے آیا ہوں کہ اس رشتے کو ختم نہ کریں۔''

''اچھا اب تم ہمیں سمجھاؤ گے۔ بھلا ہو فاروق کا جس نے تمہاری ساری اصلیت ہمارے سامنے کھول کر رکھ دی۔''

''فاروق ایک نمبر کا جھوٹا ہے۔''

''یہ بھی جھوٹ ہے کہ تمہارے والدین زندہ ہیں اور تم دانش کے مرحوم بھائی کے بیٹے نہیں ہو۔''

''میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔ یہ سچ ہے۔''

''اس کا مطلب ہے فاروق سچا ہے اور تم جھوٹے اور دھوکے باز ہو۔''

''میں وقت آنے پر سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔''

''جب تم بتا دینا چاہتے تھے پھر بتایا کیوں نہیں، مجھے سب خبر ہے اس معاملے پر تم نے دانش کو بھی بلیک میل کیا ہے تبھی وہ تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوئے۔''

''ایسی بات نہیں ہے انکل میں.....''

''فاروق بہت اچھا انسان ہے اس نے تمہاری اصلیت بتا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔''

''اس نے نہ جانے میرے خلاف کیا کیا بھر دیا ہے۔''

''میں نے اس کی بات کا قطعی اعتبار نہیں کیا تھا بلکہ خود گیا ہوں تمہارے محلے میں اور اس نے جو باتیں کہیں تھیں ان کی تصدیق کر کے آیا تھا تبھی میں نے یہ رشتہ ختم کیا ہے۔''

''انکل میں نے جو کچھ کیا ہے اس کی معافی چاہتا ہوں۔ یقین کریں آئندہ مجھ سے اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ملے گی۔'' میں نے کہا۔

''مجھے تمہاری اس گھٹیا حرکت پر بہت غصہ ہے اس لیے یہاں سے چلے جاؤ ابھی اور اسی وقت، میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔''

''انکل ٹھنڈے دل سے سوچیں میرے والدین اس شادی پر کیوں راضی نہیں ہیں، پھر بھی یقین کریں کچھ دن گزرنے پر والدین بھی اس رشتے کو تسلیم کر لیں گے۔'' میں نے کوشش کی بات بن جائے۔

''میں اس موضوع پر اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔'' انکل نے غصے سے مجھے دیکھا۔

''میں انکل دانش سے ہر طرح کی ضمانت دلا سکتا ہوں۔''

''اس دھوکے باز شخص کی باتوں پر اب میں کبھی بھی اعتبار نہیں کروں گا۔ اس نے اپنا اعتبار کھو دیا ہے۔''

میں آنٹی پروین اور کومل کو اس گھر میں اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھتا تھا لیکن ان کی نگاہیں نیچی تھیں۔

www.pakistanipoint.com

انکل کامران نے رشتہ ختم کرکے میری دنیا اجاڑ دی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میں کومل کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ میں اس وقت حواس باختہ تھا اس لیے میں نے ان کو دھمکی دے دی۔ ''انکل میرا اگر کومل سے نکاح نہ ہوا تو میں اسی وقت اسی گھر میں خودکشی کرلوں گا۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، میں تمہاری جذباتی باتوں میں آکر اپنی پھول جیسی بیٹی کا نکاح تم جیسے دھوکے باز سے کردوں گا، ہرگز نہیں تمہارے والدین بھی اب آجائیں تو میں ان کی بھی بات بھی نہیں سنوں گا۔''

''انکل میں سچ کہہ رہا ہوں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرڈالوں گا۔''

''تم یہاں سے جاؤ گے یا پڑوسیوں کو بلا کر تمہیں دھکے دلاؤں۔''

میں نے اپنی دھمکی پر عمل کرنے کو ادھر اُدھر دیکھا۔ گھر میں کیڑے مار دوا نظر نہ آئی، جسے پی کر میں اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیتا۔ اچانک میری نگاہ مٹی کے تیل کی بوتل پر پڑی۔ میں نے لپک کر وہ بوتل اٹھالی۔ ''انکل میں مٹی کا تیل پی کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلوں گا۔ اب بھی وقت ہے مان جاؤ۔''

''میاں جو کچھ کرنا ہے اپنے گھر جا کر کرو، ہمیں خدا کے لیے معاف کردو۔'' انکل کامران غصے سے دھاڑے۔

میں نے جب دیکھا کہ وہ میری دھمکی کا کوئی اثر نہیں لے رہے ہیں تو بوتل کا منہ اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ انکل نے کچھ دیر مجھے دیکھا لیکن بوتل کو خالی ہوتا دیکھ کر وہ چونکے جب تک بوتل چھیننے کو میرے نزدیک آتے میں پوری بوتل پی چکا تھا۔ بوتل پینے پر مجھے چکر آیا اور میں وہیں صحن میں گر پڑا، صحن میں گرنے پر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

آنکھ کھلنے پر میں اسپتال کے بیڈ پر تھا۔ انکل کامران بیڈ سے کچھ فاصلے پر ہاتھوں میں تسبیح لیے ٹہل رہے تھے۔ پولیس میرا بیان قلم بند کرنا چاہتی تھی۔ میں بے ہوش تھا اس لیے کچھ دیر بعد آنے کا کہہ کر چلے گئے تھے۔

انکل کامران زیرلب کیا پڑھ رہے تھے مجھے پتا نہیں لیکن اتنا اندازہ ہوگیا تھا وہ میری سلامتی کی دعا کررہے تھے۔ ان کو خطرہ تھا کہ کہیں پولیس ان پر میرے قتل کا مقدمہ درج نہ کرلے۔

مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ تیزی سے میری جانب لپکے۔

''خدا کا شکر ہے، تمہیں ہوش آگیا ہے۔'' وہ بولے۔

''میں کہاں ہوں؟''

''تم اسپتال میں ہو۔''

''مجھے یہاں کیوں لائے، مرجانے دیا ہوتا۔''

''ایسا نہ کہو بیٹے مریں تمہارے دشمن۔''

''فی الحال تو میرے دشمن تم لوگ بنے ہوئے ہو۔'' میں نے زیرلب کہا۔

''کیا کہا بیٹے زرا زور سے بولو۔''

''میں شکریہ ادا کررہا ہوں جو میری جان بچالی۔'' میں نے کہا۔

''جبران بیٹے ہماری عزت تمہارے ہاتھوں میں ہے۔''

''میرے ہاتھوں میں ہے وہ کیسے؟'' میں چونکا۔

''ابھی پولیس آئے گی۔''

''پولیس کیوں آئے گی۔''

''تم نے خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے، خودکشی کرنا قانونی طور پر جرم ہے اس پر تمہیں سزا ہوسکتی ہے۔''

''انسان کو جب کوئی اور راہ نظر نہ آئے اس لیے وہ خودکشی کرتا ہے اور پولیس بچ جانے والے پر قید کرکے مزید ظلم کرنا چاہتی ہے۔''

''یہی نہیں اگر پولیس کو پتا چل جائے کہ خودکشی کرنے پر اسے کسی نے اکسایا ہے تو اسے بھی گرفتار کرلیتی ہے۔''

''یعنی وہ میرے ساتھ آپ کو بھی گرفتار کرے گی۔''

''پولیس کے آنے سے پہلے میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ پولیس کو یہ ہرگز بیان نہ دینا کہ تم نے خودکشی کی ہے۔''

''پھر میں پولیس کو کیا بیان دوں۔''

''تم پولیس سے یہ کہنا کہ تم نے بوتل سمجھ کر مٹی کا تیل پی لیا ہے۔'' اس طرح تم اور ہم بچ سکتے ہیں۔''

''مجھے زندہ رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے اچھا ہے پولیس جیل میں قید کردے میں وہاں بھی خودکشی کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''ایسے نہیں کہتے ہیں جبران بیٹے، دیکھو تم نے کومل سے سچی محبت کی ہے، بولو کی ہے نا۔''

''ہاں کی ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا تم چاہو گے محلے میں کومل کی بدنامی ہو کہ تم نے اس کے چکر میں خودکشی کی ہے۔'' وہ بولے۔

''کیا اب تک محلے والوں کو اس بات کا علم نہیں ہوا

www.pakistanidigest.com

ہے۔''

''نہیں بیٹے ہم نے بات کو دبا دیا ہے۔ محلے میں ہم نے لوگوں سے یہی کہا ہے کہ تم نے غلطی سے کولڈ ڈرنگ سمجھ کر مٹی کا تیل پی لیا ہے۔ پولیس کو بھی تمہیں یہی بیان دینا ہے۔ پولیس اپنے طور پر پوری چھان بین کرے گی۔''

میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کیا کروں۔

''تم میری بات سمجھ رہے ہو نا یہ کومل کی عزت کا معاملہ ہے۔''

مجھے معاملات بنتے نظر آئے۔ انکل کے دل میں میرے لیے ہمدردی کا پیدا ہو جانا خوش آیند تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ سچ بولنے پر قید تو ہوتی کومل بھی ہاتھ سے نکل جاتی جھوٹ بولنے میں فائدہ ہی فائدہ نظر آرہا تھا۔ وہ میرے احسان تلے دب جاتے اور احسان کے بدلے میرا نکاح کومل سے پڑھا دیتے۔

مجھے سوچتا دیکھ کر انکل کامران پھر بولے۔ ''کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو، یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے، پولیس آنے والی ہے۔ بیان دینے کی تیاری کرلو۔''

''انکل جب آپ نے مجھے بیٹا کہہ دیا ہے پھر تو میں بیٹا بن کر ہی دکھاؤں گا۔ بے فکر ہو جائیں جیسا آپ نے کہا ہے میں ویسا ہی بیان دوں گا۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گا کہ کومل کی محلے میں بدنامی ہو۔'' میں نے انہیں بھرپور یقین دہانی کرائی۔

انکل کامران میری یقین دہانی پر مطمئن ضرور ہو گئے تھے لیکن کچھ سہمے ہوئے تھے۔ پولیس کا معاملہ تھا۔ پولیس ہر طرح سے مجھ سے صحیح اگلوانے کی کوشش کرے گی کہ میں ان کی مرضی کا بیان دے دوں۔ ان کی مرضی کا بیان دینے کا مطلب تھا میں جیل جاتا ساتھ میں انکل بھی جاتے۔ انکل کی فیملی کی بدنامی ہوتی اور کومل بھی ہاتھ نہ آتی۔

مجھے انکل سے بات کیے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ پولیس آگئی۔ پولیس کو میں نے وہی بیان دیا جو انکل کامران چاہتے تھے۔ پولیس میرا بیان لے کر چلی گئی۔ انکل کامران میری طرف احسان مندی سے دیکھ رہے تھے۔ اسپتال سے صحت یاب ہو کر میں گھر آگیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ انکل کامران میرے احسان تلے دب گئے ہیں وہ مناسب موقع دیکھ کر میرا نکاح کومل سے کرا دیں گے۔

ایک ماہ گزر گیا تھا۔ انکل نے بالکل خاموش طاری کی

سلیم احمد

(1927ء...1983ء)

''ادبی اقدار'' (1956ء) ''نئی نظم اور پورا آدمی'' (1962ء) ''غالب کون؟'' (1971ء) ''ادھوری جدیدیت'' (1977ء) ''اقبال ایک شاعر'' (1978ء) ''محمد حسن عسکری آدمی یا انسان'' (1982ء) ''اسلامی نظام مسائل اور تجزیے'' کے علاوہ سیکڑوں مضامین، روزنامہ حریت و روزنامہ جسارت کراچی کے اخبارات میں لکھنے، ہفتہ وار تکبیر میں تجزیہ نگاری کرنے والے دانشور و ادیب سلیم احمد 27 نومبر 1927ء کو ضلع بارہ بنکی کے قصبہ کھیولی میں سید شرافت علی کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر شمیم احمد جامعہ بولان کوئٹہ میں اردو کے استاد اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں مگر انہوں نے سلیم احمد کی طرح نہ ریڈیو اور ٹی وی کے لیے ڈراما نگاری کی اور نہ ہی شاعری کی۔ چنانچہ یہ شعبہ سلیم احمد کے پاس ہی رہا۔ جنہوں نے ''بیاض'' (1966ء) ''اکائی'' (1982ء) ''چراغِ نیم شب'' (1985ء) اور ''مشرق'' (طویل نظمیہ 1989ء) جیسے شعری مجموعے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔

سلیم احمد ریڈیو پاکستان میں اور گھر پر بھی شمع محفل اور مرکز بزم رہتے۔ ''حلقۂ اربابِ ذوق''، ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' اور دیگر علمی اور ادبی حلقوں میں بھی پروفیسر حسن عسکری کے نام لیوا اور لائق و فائق ادیب کی حیثیت سے مدعو کیے اور مانے جاتے تھے۔ وہ مکالمے کو پسند کرتے۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور علمی اختلاف سے خوش ہوا کرتے تھے۔ ضیاء الحق دور میں اطلاعات و نشریات کے مشیر بھی رہے۔ تاہم ریڈیو پاکستان کراچی کے پروڈیوسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور یکم ستمبر 1983ء کو خالقِ حقیقی کی بارگاہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے بعد پاپوش نگر قبرستان میں آسودۂ راحت ہو رہے ان کی قبر کتبے پر یہ شعر مرقوم ہے

اِک پتنگے نے یہ اپنے رقص میں آخر کہا
روشنی کے ساتھ رہیے روشنی بن جایئے

www.paksociety.com

ہوئی تھی میں جلد سے جلد کومل سے نکاح کرنے کا خواہشمند تھا۔

ایک دن انکل کامران دکان پر چائے کی پتی لینے آئے۔ اس وقت اتفاق سے کوئی دوسرا گاہک بھی نہ تھا۔

''انکل پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''کس بارے میں؟'' وہ بولے۔

''میری اور کومل کی شادی کے بارے میں۔''

''اس بارے میں سوچنا بھی نہیں۔'' انکل نے کہا۔

''کیوں؟''

''میں نے کومل کا رشتہ خورشید میاں سے طے کر دیا ہے۔ وہ محکمہ ایجوکیشن میں افسر ہے۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ پہلی بیوی سے کوئی بچہ بھی نہیں ہے اس لیے خورشید میاں میری بیٹی اور اس کی بیٹی کو بہت خوش رکھے گا۔

''انکل یہ بات کیسے کہہ رہے ہیں کہ خورشید میاں کومل کو خوش رکھے گا۔'' میں نے کہا۔

''میں نے اور گھر والوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے جن لوگوں کی پہلی بیوی مر جائے یا طلاق دے دی جاتی ہے تو وہ دوسری بیوی کی بہت قدر کرتے ہیں۔ خورشید بھی اس کا بہت خیال رکھے گا۔''

''انکل میں بھی کومل کا بہت خیال رکھوں گا۔ کم از کم مجھے آزما کر تو دیکھیں۔''

''تمہارے پاس ہے ہی کیا جو میری بیٹی کومل کا خیال رکھو گے، تمہارے گھر والے اس رشتے پر تیار نہیں ہیں کہاں رکھو گے کومل کو، تم خود دانش کے پاس ملازم ہو وہ بھی معمولی تنخواہ پر، اتنی کم تنخواہ میں تم کیسے کرائے کے مکان میں کومل کو خوش رکھ سکو گے۔''

''انکل کیا یہ ضروری ہے جس کی نوکری اچھی ہو، بے شمار دولت ہو وہی بیوی کو خوش رکھ سکتا ہے۔ کیا کوئی غریب اپنی محبت و خلوص سے بیوی کو خوش نہیں رکھ سکتا۔''

''میاں یہ سب فلمی باتیں ہیں۔ میرے سامنے نہ ہی کرو تو بہتر ہے میں نے زمانہ دیکھا ہے، اس دور میں جس کے پاس بڑا عہدہ اور دولت ہے وہی کامیاب زندگی گزار سکتا ہے۔ بیوی بچوں کو خوشحال زندگی دے سکتا ہے۔ غریب کی بھی کوئی زندگی ہے۔'' انکل نے کہا۔

وہ چائے کی پتی لے کر چلے گئے لیکن مجھے سوچنے پر مجبور کر گئے تھے۔ میں واقعی ان کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی دینے کو اس لیے تیار ہو گئے تھے کہ وہ مجھے انکل دانش کے مرحوم بھائی کا بیٹا سمجھ رہے تھے۔ انکل دانش کے اولاد نہ ہونے پر ان کا سب کچھ میرا ہی تھا۔

رات گئے جب میں دکان سے گھر گیا۔ میرے بہنوئی اختر آئے ہوئے تھے۔ مجھے افسردہ دیکھ کر بولے۔ ''کیا بات ہے، تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟''

''میری پریشانی سب کے سامنے ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے انکل کامران سے ہونے والی ساری گفتگو ان کے گوش گزار کر دی۔

''انکل کامران کی باتیں تلخ ضرور ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تمہاری پوزیشن بہت کمزور ہے۔ گھر والے بھی اس رشتے کو تیار نہیں، مالی طور پر تم کمزور ہو۔''

''میں کومل کو اتنی محبت دوں گا، جتنا ان کے تصور میں بھی نہیں۔''

''کیا محبت کھانے کو دے گی، کیا محبت سے وہ سب آسائشیں اسے مل جائیں گی جس کی اسے طلب ہو گی۔''

''میں دکان پر نوکری ضرور کر رہا ہوں لیکن پرائیویٹ طور پر تعلیم حاصل کر رہا ہوں مجھے پوری امید ہے کہ تعلیم مکمل کرتے ہی اچھی نوکری مل جائے گی۔''

''کب تعلیم مکمل ہو گی کب اچھی نوکری ملے گی یہ سب وہ کیا جانیں، انہیں مستقبل میں نہیں اس وقت اچھی پوزیشن میں داماد چاہیے اور وہ مل چکا ہے۔''

''میرے اپنے ہوتے ہوئے بھی میرا حوصلہ بڑھانے کی بجائے حوصلہ شکنی کر رہے ہو۔'' میں بے اختیار رو دیا۔

''مرد ہو کر یہ کیا عورتوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو۔'' وہ بولے۔

''میرا گھر بسنے سے پہلے ہی اجڑ گیا ہے، روؤں نہیں تو کیا کروں۔'' میں نے کہا۔

''خدا کا شکر ادا کرو۔''

''خدا کا شکر ادا کروں لیکن کس بات پر۔'' میں چونکا۔

''خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے، وہ لالچی لوگ ہیں ان سے تمہاری اس بہانے جان چھوٹ گئی۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔''

''اس بات میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے کہ میرا گھر نہ بس سکا۔''

''تم بہت جلد باز ہو چاہتے ہو جو تمہارے دل میں آ گیا وہ ہو جائے۔ زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔''

www.pakistanipoint.com

"پھر کیسا ہوتا ہے۔"

"تم عمر میں مجھ سے چھوٹے ہو، زندگی کے معاملات کو فوری طور پر نہیں سمجھ سکتے ہو۔" وہ بولے۔

میں سمجھ گیا وہ ضرور اس موقع پر کوئی فلسفہ بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

"فرض کرو تمہاری شادی کومل سے ہوجاتی ہے۔ اس کی ایک بچی بھی ہے جو اس وقت تقریباً آٹھ سال کی ہے۔ تم نے شادی ہوجانے پر اس کا سابق شوہر تم دونوں کو پریشان کرنے کو طرح طرح کے حربے استعمال کرے گا۔ اپنی بیٹی کو حاصل کرنے کے لیے کورٹ میں گھسیٹے گا، بقول کومل وہ اپنی بیٹی کو بہت چاہتی ہے، وہ کسی صورت اپنی بیٹی سابق شوہر کو نہیں دے گی۔ تب کورٹ آرڈر دے گی کہ جب تک لڑکی اس قابل نہ ہوجائے کہ شوہر کے حوالے کیا جائے سابق شوہر کو تمہیں ہفتے میں ایک بار کورٹ میں بچی سے ملاقات کرانی پڑے گی۔ ملاقات کے وقت سابق شوہر تم پر یا کومل کو کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اگر سابق شوہر لڑکی کو نہ لے پھر تمہیں دس سال گزرنے پر لڑکی کی شادی کرنے کی فکر لاحق ہوجائے گی۔ اس کا سابق شوہر کہہ سکتا ہے کہ اس کی شادی میں اپنی مرضی سے کروں گا۔ کرن کی شادی کی عمر ہونے پر ممکن ہے تمہاری ایسی پوزیشن ہی نہ ہو کہ جہیز کی تیاری اور شادی پر ہونے والے اخراجات پورے کرسکو۔ تم اپنے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کروگے یا اس کی شادی کے لیے رقم جمع کروگے۔ اس طرح کے سو مسائل تمہیں درپیش ہوں گے۔" وہ بولے۔

میرے بہنوئی اختربات اچھی کررہے تھے مگر میرے دماغ پر کومل کی محبت کا بھوت سوار تھا اس لیے ان کی باتیں ذہن قبول نہیں کررہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ کوئی ایسا معجزہ ہوجائے کہ کومل مجھے مل جائے۔

انکل کامران نے ایک مختصر تقریب منعقد کرکے کومل کا نکاح خورشید سے کردیا۔ نکاح ہوجانے پر بھی مجھ پر کومل کی محبت سوار رہی حالانکہ اب یہ ممکن نہ تھا کہ کومل سے میرا نکاح ہوسکے پھر بھی میں کوشش کے باوجود اس کی محبت کو بھلا نہ پایا تھا۔

چند ماہ گزرنے پر محبت کے جذبے میں کمی آنے لگی تھی اور مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ میں نے خودکشی جیسے حرام کام کو کیا تھا۔ قسمت اچھی تھی اس وقت کیڑے مار دوا نہ ملی ورنہ شاید میں اس دنیا میں نہ ہوتا۔ کیڑے مار دوا کھانے والے لوگوں میں سے بہت کم ہی بچ پاتے ہیں۔

کومل اور خورشید میاں کی شادی کو مشکل سے ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ سابق شوہر شاہد نے بیٹی کرن کو اپنی کسٹڈی میں لینے کی درخواست کورٹ میں داخل کردی۔ کئی ماہ مقدمہ چلتا رہا۔ کومل کسی صورت میں اپنی بیٹی سابق شوہر کو دینے پر تیار نہ تھی۔ کورٹ نے اپنا فیصلہ سنادیا کہ کومل اپنے سابق شوہر شاہد سے کرن کی ہفتے میں ایک ملاقات کرائے گی۔

شاہد کو بیٹی نہیں چاہیے تھی وہ بس کورٹ کے ذریعے کومل کو پریشان کرنا چاہتا تھا وہ خورشید کو کومل کی طرف سے بدگمان بھی کرنا چاہتا تھا۔ بیٹی سے ملاقات کے وقت وہ خورشید کے سامنے کومل کی برائی کرے بغیر نہ رہتا تھا۔ اس پر کئی گندے الزام بھی لگائے۔ خورشید ایک سمجھدار اور بردبار انسان تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کومل کے کردار کو داغ دار بنانے کو ایسی باتیں کرتا ہے اس لیے دھیان نہ دیتا۔

دوپہر کا وقت تھا، میں دکان میں گاہکوں کو سودا دینے میں مصروف تھا کہ میں نے دیکھا۔ انکل کامران بدحواسی کی حالت میں بھاگتے ہوئے جارہے ہیں۔ ان کو پریشان دیکھ کر مجھے بھی تشویش ہوئی کہ معاملہ کیا ہے۔ میں جتنی دیر میں ان سے پوچھتا وہ گلی سے نکل کر دور جاچکے تھے۔ میرا تجسس بڑھتا جارہا تھا۔ میں جلد سے جلد اسی بارے میں آگاہی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

شام گئے تک کچھ پتا نہ چلا کہ کیا ہوا ہے۔ میں ابھی دکان بند کرنے کو تھا کہ رفاقت آگیا۔ وہ آتے ہی مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم کو کچھ خبر بھی ہے کیا ہوگیا ہے۔"

"کیا تمہاری شادی ہورہی ہے۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"میری شادی بھی ہوجائے گی ایک نہ ایک دن۔"

"پھر کیا پرابلم ہے؟"

"میں شادی شدہ لوگوں کے حالات پر بڑا فکرمند ہوں۔"

"تم دوسروں کے معاملات پر پریشان نہ ہوا اپنی فکر کرو۔"

"میں محلے سے کٹ کر رہ بھی نہیں سکتا۔"

"محلے میں کیا ہوگیا۔" میں نے پوچھا۔

میرے ذہن سے دوپہر کا واقعہ نکل گیا تھا اس لیے میرا ذہن انکل کامران اور اس کے بیٹوں کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔

"وہی تمہیں بتانے آیا ہوں۔"

"پھر پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو، صاف صاف بتاؤ کہ کیا بات ہے۔" میں نے کہا۔

رفاقت کی عادت تھی وہ معمولی بات کو الجھا کر پیش کرنے کی کوشش کرتا تھا تاکہ سننے والا اسپنس کا شکار رہے۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''میں صدمے میں ہوں۔'' وہ اداس لہجے میں بولا۔
''یہ صدمہ کس نے دیا ہے، ذرا ئع بھی بتادو۔'' میں نے کہا۔
''کومل کے سابق شوہر شاہد نے دیا ہے۔''
''کومل کے سابق شوہر شاہد نے۔'' میں بری طرح چونکا۔ عدالتی حکم پر وہ بیٹی سے شاہد کی ملاقات کرانے کورٹ گئی تھی۔ وہاں شاہد نے کومل کے لیے بہت گھٹیا زبان استعمال کی۔ کئی الزامات لگا ڈالے جس پر کومل نے بھی اسے خوب سنائیں اور یہ تک کہا کہ شاہد کے اپنی بھابی سے ناجائز تعلقات تھے اسی لیے وہ طلاق لینے پر مجبور ہوئی تھی۔ اس بات نے شاہد کو مشتعل کردیا... اور وہ خورشید کو کہنے لگا کہ تم کومل سے دھندا کراتے ہو اور اس سے ہونے والی کمائی سے عیش کررہے ہو۔ اس بات پر خورشید سے صبر نہ ہوسکا وہ اور کومل مل کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ پولیس کی موجودگی میں شاہد کی پٹائی کردی۔ شاہد کو چھڑانے کے لیے پولیس جیسے ہی ان کے نزدیک آئی۔ شاہد نے ایک پولیس والے کی جیب سے پستول نکال کر پہلے خورشید پر گولی چلادی۔ کومل نے خورشید کو بچانے کی کوشش کی اور اس کے آگے آگئی۔ گولی اس کے دل پر لگی تھی اس لیے موقع پر دم توڑ گئی۔ شاہد بچی کو لے کر فرار ہوگیا ہے۔ یہ تھی دوپہر کی خبر اور شام کی خبر یہ ہے کہ شاہد بچی کو اپنی بھابی کو دے کر غائب ہے۔ پولیس اسے گرفتار کرنے کو جگہ، جگہ پر چھاپے مار رہی ہے۔ خورشید بھی اسپتال میں زخموں کی تاب نہ لاکر دم توڑ گیا ہے۔ دونوں میاں بیوی کا پوسٹ مارٹم ہونے پر لاش ورثاء کے حوالے کردی جائے گی۔'' رفاقت نے کہا۔
رات بھر یہ بات میرے ذہن میں سوار رہی میں خورشید اور کومل کے جنازے میں شریک ہوا تھا۔ انکل کامران مجھے بہت دل شکستہ نظر آئے۔
سوئم ہوجانے کے دوسرے دن بہنوئی اختر گھر آگئے۔ ان سے نظریں چار ہونے پر میں نے نظریں جھکالیں۔ انہوں نے جو خدشات ظاہر کیے تھے وہ خورشید کے ساتھ ہوگئے تھے۔ وہ لوگ جو میرے بہنوئی اختر کی عزت کرتے ہیں، ان سے مشورے لیتے ہیں وہ غلطی پر نہیں ہیں۔ میں ہی غلط تھا، جس نے ان کے مشوروں کو اہمیت نہ دی تھی۔
''جبران تم نے دیکھ لیا نا میں نے جس خدشات کا اظہار کیا تھا وہی ہوئے، میں اس لیے منع کررہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ ہمارے حق میں جو بہتر ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ ہمیں صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے فیصلوں پر راضی رہنا چاہیے۔''
میں پہلے ہی لاجواب تھا اس لیے شرمندگی سے گردن جھکالی۔
''میں تسلیم کرتا ہوں آپ نے جو بات کہی تھی وہ درست ثابت ہوئی۔'' میں نے کہا۔
کومل کا سابقہ شوہر شاہد ایک دن گرفتار ہوگیا۔ چند سال مقدمہ عدالت میں زیر سماعت رہا۔ جرم ثابت ہوجانے پر شاہد کو عمر قید اور ایک ایک لاکھ روپے جرمانے کی سزا سنادی۔
میری تعلیم مکمل ہونے میں کئی سال لگے۔ تعلیم مکمل ہوجانے پر میں نے کمیشن کا امتحان دیا۔ کمیشن کا امتحان پاس کرلینے پر مجھے ایک مقامی کالج میں لیکچرار کی نوکری مل گئی۔ سائرہ میری رشتے میں کزن تھی۔ ایک تقریب میں دیکھ کر میں نے اسے پسند کرلیا۔ میں حیران تھا کہ وہ اتنے عرصے میری نظروں سے کیسے اوجھل رہی تھی۔ میں نے جب اپنے بہنوئی اختر سے سائرہ کے متعلق بات کی۔ وہ میری اس خواہش پر اچھل پڑے۔
''بس اتنی سی بات، میں عبدالشکور چچا سے بات کرتا ہوں۔ وہ کبھی انکار نہیں کریں گے۔ ویسے بھی تم اس پوزیشن میں ہو جس لڑکی پر ہاتھ رکھ دو وہ تمہاری ہوجائے گی۔'' وہ بولے۔
سائرہ کے لیے گھر والے بھی انکار نہیں کرسکتے تھے۔ دونوں طرف سے رضامندی تھی اس لیے میری شادی سائرہ سے ہوگئی۔
آج میرے دو لڑکے ذیشان اور کاشان اور ایک بیٹی شمائلہ ہے۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں اگر میری شادی کومل سے ہوجاتی تو میرا انجام بھی خورشید جیسا ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں جو کچھ ہوا وہ کومل کی غلطی سے ہوا ہے۔ وہ اپنی بیٹی سابقہ شوہر کے حوالے کردیتی تو فائدہ میں رہتی۔ وہ کچھ دن بیٹی کو اپنے پاس رکھ کر واپس کومل کو دے دیتا۔ کومل نے بیٹی کی محبت میں ایسا نہیں کیا۔ سابقہ شوہر کی بھابی نے بھی کومل کی بیٹی کرن کو انکل کامران کے حوالے کردیا۔ وہ انکل کامران کے گھر پرورش پارہی ہے۔ میں جب بھی کرن کو دیکھتا ہوں میری پرانی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ کرن اپنی ماں کی ہوبہو کاپی ہے۔

++